سہ ماہی

نیا دور کراچی

شمارہ نمبر

۸۳-۸۴

خاص نمبر

قیمت: ساٹھ روپے

شائع کردہ:- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی

ادارہ

قمر سلطانہ

خاور جمیل

ترتیب

افسانے

افسانے

طویل نظمیں

ابوالفضل صدیقی کی یاد میں (وفات ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء)

جمیلہ ہاشمی کی وفات پر (وفات ۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء)

میراجی: دو نظمیں، ایک گیت:

ن۔م۔راشد: ایک مطالعہ

مشاہیر کے خطوط

حمد و نعت

نظمیں

پانچ نظمیں

چار نظمیں، تین غزلیں

غزلیں

مضامین

اداریہ

ہم نیا دور کے کئی شماروں سے کسی نہ کسی مسئلہ کے حوالے سے، خصوصاً ذہنی و فکری سطح پر معاشرے کی روز بروز گرتی ہوئی حالت اور سب سے زیادہ اجتماعی بصیرت کے زوال پر اظہار رائے کرتے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے انسانی معاملات اور ادبی اقدار بے معنویت کی طرف بڑھ رہے ہیں اور سوچنے کا، اپنی حالت کو بہتر بنانے کا اور موجودہ سطح سے اوپر اٹھنے کا عمل غائب ہو چکا ہے اور ہم سب اپنے اپنے گھروندوں میں مقید، دوسروں سے بیزار، خود سے نامطمئن، ایک مایوسی، منافرت اور خود غرضی کے صحرا میں بھٹک رہے ہیں۔

ہم نے اس احساس اور شعور کا تجزیہ خود بھی کیا اور دوسروں سے بھی کرایا تھا اور پچھلے شمارے میں تو اسی موضوع پر ہم نے پورا ایک مذاکرہ کرا ڈالا تھا، جس میں مختلف الخیال اہلِ قلم نے حالات اور محرکات کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں حال اور پچھلے چالیس سال کے حوالے سے پاکستانی معاشرے کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی، وہاں گذشتہ دو سو سال سے بھی زیادہ عرصہ کے عوامل کا تجزیہ کر کے اس کو شعور کی مختلف سطحوں پر دیکھا، مگر ہمارا مقصد صرف ایک احساس اور اجتماعی عوامل کو شعور میں لانا اور اس کا تجزیہ کرنا ہی نہیں تھا بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب بھی قومی یا اجتماعی طور پر کوئی تھکن یا اضمحلال طاری ہوتا ہے تو اس کا علاج اہلِ دانش ہی تجویز کرتے ہیں۔ یہ اہلِ فکر اور ادیبوں اور شاعروں کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ جب بھی کسی ایسی صورتِ حال میں گرفتار ہو جائیں تو پہلے اس کا تجزیہ کریں اور پھر اس کا علاج بھی تجویز کریں۔ یہ کام اگر اہلِ فکر اور اہلِ قلم انجام نہیں دیں گے تو اور کون دے گا؟

۱۸۵۷ء کے بعد جب ہماری قوم اور اجتماعی عمل کو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تو

اس کے کتنے نسخے ہمارے اہلِ دانش علماء، ادیبوں اور شاعروں نے تجویز کیے تھے اور آپ ہم سب جانتے ہیں کہ ان ہی کوششوں سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی جس کے اندر سید احمد خاں سے لے کر محمد حسین آزاد، حالی، اکبر، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، امیر علی، چراغ علی اور اقبال کے افکار کام کر رہے تھے اور پھر ایک نئی بین الاقوامی صورت حال سے عہدِ جدید کے وہ تقاضے پیدا ہوئے جسے ہم ۱۹۳۶ء کی تحریک کا دور کہتے ہیں، جو کسی نہ کسی طرح آزادی کے ایک عشرے بعد تک سفر کرتا رہا۔ لیکن اب جو صورت پیدا ہوئی ہے کیا ہم اس کا کوئی اچھا بُرا حل نہیں پیش کر سکتے اور کیا یہ سوچنا ہمارا اولین فریضہ نہیں ہے کہ ہم کچھ مشترک اصول وضع کر کے اس چیلنج کو قبول کریں یا کوئی ایسی تحریک شروع کریں جسے ہم سب ادیب اپنی تحریروں میں پیش کر سکیں ؟ یہ اصول کیا ہوں ان پر سوچنا ہم سب کا کام ہے۔ کوئی ایک آدمی اس کا بار نہیں اٹھا سکتا۔

ادارہ "نیا دور" کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ اس مسئلہ پر تشویش میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا آپ سے گذارش ہے کہ 'نیا دور' کے صفحات ایسی تمام تجاویز اور آراء کے لیے حاضر ہیں۔ ہم کو کیا کرنا ہے، اس کا 'طریقۂ کار' کیا ہو اور کیسے ہم ان مشترک اصولوں پر اتفاق سے کام کر سکیں ؟ یہی اس وقت عہدِ حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ آیئے غور کریں !

مطالعۂ کتب کے فروغ اور رہنمائی کے لئے
نیشنل بک کونسل آف پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ "کتاب" لاہور

نگراں: رفیق احمد ڈائریکٹر جنرل

مدیر: ذوالفقار احمد تابش

- ★ کتابی دنیا کے ہر پہلو پر مستند مضامین اور فیچر
- ★ ملک کے چیدہ چیدہ ناشرین کے انٹرویو
- ★ ملک کی قدآور ادبی شخصیتوں کے انٹرویو
- ★ ملکی و غیر ملکی ادب کا تعارف
- ★ کتابی دنیا کے مسائل اور ان کے حل پر خصوصی مضامین اور سروے
- ★ لائبریریوں اور کتب خانوں کے جامع تعارف
- ★ تبصروں اور رفتار اشاعت کے تحت نئی کتابوں کے تعارف
- ★ "بزم کتاب" کے عنوان سے کتاب اور صاحب کتاب پر مضامین و مقالات پیش کئے جاتے ہیں

سہ رنگا سرورق، آفسٹ وڈ اتنک پر باتصویر طباعت کے ۴۸ صفحات پر مشتمل

میراجی وہ شاعر ہے جو کل بھی رجحان ساز تھا اور آج بھی رجحان ساز ہے۔
میراجی کا کلام برسوں سے نایاب ہے اور بہت سا کلام ایسا ہے جو
رسالوں میں بکھرا پڑا ہے یا اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ یہ سب کلام

مُرتّبہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

میں، برسوں کی محنت کے بعد ریزہ ریزہ جمع کرکے یکجا کر دیا گیا ہے

شائع ہو گئی ہے

صفحات ۱۰۸۰ ۔ عمدہ کتابت و طباعت
اعلیٰ کاغذ، بہترین مضبوط جلد، جاذب نظر سرورق
قیمت = ۲۵۰ روپے

ناشر: اردو مرکز لندن

سول ایجنٹ: یونیورسل بکس ۔ ۴۰/اے اردو بازار ۔ لاہور

علمی و ادبی کتابیں

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
بزم خوش نفساں (شخصی خاکے)	شاہد احمد دہلوی۔ مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی	۴۵ روپے
تخلیقی ادب شمارہ ۳	مرتبہ: مشفق خواجہ	۷۵ روپے
اردو قواعد	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۲۰ روپے
بے سمت مسافر (طویل افسانے)	رضیہ فصیح احمد	۲۵ روپے
جائزۂ مخطوطات اردو (جلد اول)	مشفق خواجہ	۱۰۰ روپے
"اقبال" از احمد دین	مرتبہ: مشفق خواجہ	۴۰ روپے
غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	۲۵ روپے
درپن درپن (عالمی ادب کے منظوم تراجم)	شان الحق حقی	۴۰ روپے
غزلیں دوہے گیت (پہلا مجموعۂ کلام)	جمیل الدین عالی	۳۵ روپے
لاحاصل (دوسرا مجموعۂ کلام)	جمیل الدین عالی	۳۵ روپے
خونِ دل کی کشید (فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن)	مرتبہ: مرزا ظفر الحسن	۳۵ روپے
یاد یار مہربان (زیڈ اے بخاری کی شخصیت اور فن)	مرتبہ: مرزا ظفر الحسن	۲۵ روپے
محمد حسن عسکری — انسان یا آدمی	سلیم احمد	۱۵ روپے
کلامِ نیرنگ — میر غلام بھیک نیرنگ	مرتبہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل	۲۵ روپے
پراچین اردو	پروفیسر سید شبیر علی کاظمی	۱۵ روپے
اقبال اور بزمِ اقبال حیدرآباد دکن	عبدالرؤف عروج	۱۸ روپے
آج بھی اس دیس میں (سفرنامہ)	محمد حمزہ فاروقی	۲۰ روپے
زمان و مکان اور بھی ہیں	محمد حمزہ فاروقی	۱۸ روپے
غازی عبدالرحمٰن شہید (سوانح)	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری	۳۵ روپے
سفر نامۂ حجاز مولانا غلام رسول مہر	مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری	۱۵ روپے
آپ بیتی جسٹس سید امیر علی	ترجمہ: جمیل نقوی	۲۰ روپے
تفہیم و تنقید (تنقیدی مقالات)	جمیل نقوی	۴۰ روپے
کیا قافلہ جاتا ہے (شخصی خاکے)	نصر اللہ خان	۴۰ روپے
کاروانِ رفتہ (شخصی و سوانحی خاکے)	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	۳۰ روپے
ن م راشد: ایک مطالعہ	ڈاکٹر جمیل جالبی	۷۰ روپے

مکتبہ اسلوب

پوسٹ بکس ۲۱۱۹، کراچی

عالمی معیار کا بین الاقوامی ایوارڈ یافتہ
تھری اسٹارز سیل
3-STARS
1.5 VOLTS
BATTERY
35 سال سے پاکستان کا سب سے مقبول سیل

ابوالفضل صدیقی

سُود در سُود

لالہ پکوڑی مل کہنے کو ویش یا بنیے اگرچہ مہاجن قومیت کے تعارف، پہچان، تعریف میں
دسیوں قدیم کہاوتیں چلی آتی ہیں جو اس کے ارزل ترین ہونے کی سند ہیں اور مہاجن کا مقام
شُدر کی اُس نیچی سطح "اچھوت" سے بھی پست متعین کرتی ہیں، جو انسانیت سے بھی خارج
ہے۔ دیسے سُود بیاج ہندو شاستروں کی رُو سے جائز ہے لیکن "دام دوپٹ" (اصل دوگنی)
ہو جانے پر در سُود کا پہیہ ٹھہر جاتا ہے اور سادہ سُود چلتا ہے، لیکن مہاجن کا مقروض اُس
کی من مانی شرح اور شرائط پر اُس مکھی کی طرح ہو جاتا ہے جو مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوتی ہے اور
مکڑی جیتی سے لے کر مری تک۔ اسے آہستہ آہستہ چوستی رہتی ہے اور شرح شرائط قرض خواہ کی شدت
ضرورت کی مجبوری اور مہاجن کی مرضی کی منت گیری اندر ہی اندر گھومتے ہیں، چنانچہ منوجی
نے سماج سازی میں مہاجن کو اتنا گرا دیا ہے کہ اس کا مقام جیسے اس بھنگی سے بھی نیچے ہے جو گو کا
بھرا ٹوکرا سر پر اٹھا کر لے جاتا ہے، گویا صیغۂ انسانیت ہی سے خارج کر دیا ہے۔ اگرچہ شہنشاہ
اکبر نے شاید کبھی لے جاتے نظر پڑ جانے پر، اس کی اہم ترین خدمت کے زیرِ نظر اس کو "مہتر"
کے خطاب سے نوازا، اور تین سو برس بعد ان کے شاگردِ رشید بے تاج کے سیاسی تاجدار
نے شدروں کو "ہری جن" (خدا کا بیٹا) پکار کر ہندو قوم کو گنتی کی حد تک ملانے کے لیے
"مرن برتھ" کا سوانگ رچایا، اور ڈاکٹر امبیدکر کو چاروں شانہ چت دے مارا۔ لیکن یہ
من گھڑی بات آج کی نہیں۔ نہ تین سو برس ابھی کل کے مغل دور کی، بات جب کی ہے جب ماتا
پاربتی اور پتا مہادیو نے سمندر متھ کر پانی کے اندر سے پھول پر براجمان ہو کر دن رات صبح شام

بنائے، اور اپنا تولید و تناسل کا کاروبار پھیلایا۔ تو فرائض اور تیوہاروں کی تقسیم ہوئی اور سال
کی تاریک ترین رات "دیوالی" کے تیوہار پر بجز ویش کے اپنے گھر میں کسی کو روشنی کرنے کا حکم و
حق نہ تھا۔ لیکن کرنا ایشور کا ایسا ہوا کہ ایک تیلی نے جس کے گھر کے دو دروازے تھے اپنے
پچھیت والے دروازہ پر چپکے سے ایک دیا بار کر رکھ دیا۔ اور ان ہونی پھر اور ان نیائی ہوئی۔
اسی چراغ کی لو پر لچھمی ماتا گھر کے اندر آ براجیں اور تیلی و لچھمی ماتا کے ملاپ سے ایک نئی کڑی
جنمی، اور یوں ہاتھی کے پانچویں پاؤں کی طرح برہمن چھتری ویش شدر کے بیچ مہاجن آٹپکا:
یوں تو دو ٹانگ پر کھڑا آدمی سا تھا، مگر ماتا لچھمی کے پیٹ کا جنما، دولت اس سے قول ہاری
تھی لیکن ناحق اور انسانیت کے خارج جملہ اوصاف پر پورا اترتا ہوا۔ برہمن، چھتری ویش
اور تو اور ارذل شدر اس کی روائتی اصل و حقیقت کے زیر نظر اس ناچتے مور کو یہ کوتے
اپنے تنگ میں نہ آنے دیتے اور پھر یہ بھی بے لگام دوغلے مقدر خچر کی طرح خودرو ہو گیا اور اپنی
خودسر راہ خود متعین کرلی، لامتناہی شرائط اور لاتعداد شرح بیاج، سماج کی ڈھیل کے تحت دولت
کے سہارے سب کے سب تیوہار خواہ راجپوتوں کا دسہرہ ہو یا ویشوں کی دیوالی یا شدروں
کسانوں کی ہولی، جی کھول کر آپ اپنے میاں مٹھو مناتا، اور ان کے آس پاس پورن ماشیوں،
اماوسوں سے لگے ہوئے اشنان، بڑی دھوم کے ساتھ مناتا یہ اور بات تھی کہ اونچی قومیں اپنے
اپنے پریت برہمن کی دعوتیں پکی روٹی، پوری کچوری پکوان اور لڈو پیڑے اپنے گھر بلا کر کھلایا
کرتے اور مہاجن گھر بلاتا تو کچی جنس، گھی کھانڈ، میدہ اور کیا کیا باندھ کر پوٹلیاں ساتھ کر کے پنڈت
جی سے دعاؤں کا لین دین کراتا اور ان اونچوں سے دو چار اشلوک، آشیرواد کے بول
زیادہ ہی پڑھواتا اور مہاجن کے یہاں سے پنڈت جی، سب سے آخر میں اپنے گھر بھر کے
لیے پوری فصل کے کھانے بھرنے کو لدے پھندے آیا کرتے۔ کیوں کہ مہاجن ارذل مخلوق تھی
اور دولت ستار العیوب۔ اگرچہ، ہر دور میں تنظیم زر اور ہر قدم پر سیاست مدن میں مہاجن
کا مقام سب سے اہم اور از اول تا آخر رہا ہے، اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس کے باوجود روائتی
طور پر مہاجن درشن بگاڑ بھی تصور رہا ہے، اونچی قوموں کی بستیوں میں صبح ہی صبح نہ نکلتا، بڑی
جاتی والوں کی گلیوں میں جوتا پہن کر نہ جاسکتا، گھوڑے پر سوار ہونے کا تو سوال ہی نہیں، اکثر دیہات میں

اپنی چھوٹی بستی اونچی ذات والوں سے میل ڈیڑھ میل بھر علیحدہ ایک جانب کو بساتا۔

یہ بات شہنشاہ جہانگیر اور شہنشاہ شاہ جہان کے دور کی ہے' ابا حضرت وداد حضرت جنت مکانی، شہنشاہ جلال الدین اکبر اپنے ابتدائی دور میں ہیمو بقال کی بغاوت کا سامنا کر چکے تھے۔ جو تاریخ ہند میں اور بڑی حد تک اس وقت تک تاریخ عالم میں بھی یہ عجوبہ اور یہ مظاہرہ مہاجن قومیت کا خرق عادت عمل تھا یوں سراغ ملتا ہے کہ خواہ متوازی نہ ہو تاہم مغل نشاۃ ثانیہ کے زریں حصہ کے اندر جاگیرداری نظام کے ساتھ کیسے ہی نہ کیسے اربابو کار انتظام نہ سہی تاہم کچھ نہ کچھ دھندلی دھندلی صورت نمایاں ہو چکی تھی' ہر دو مغل شہنشاہوں، جہانگیر و شاہ جہاں کے ادوار بڑے امن امان کے ہیں' بغاوتیں معدوم ہو چکی تھیں ایک آدھ سرکشی ہوتی تو نہایت کمزور قسم کی ایک معمولی سی سرکوبی میں دبا دی' ملک کے اندر جاگیرداروں کی چھوٹی چھوٹی پاکٹیں تھیں اور یہی امن امان اور نظم و نسق کے ذمہ دار تھے' ساتھ ملک کا زیادہ رقبہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا جہاں امن و امان کا مسئلہ ذرا زیادہ سنگین تھا یہ جنگل باغیوں کے نہ سہی رہزنوں ڈاکوؤں کی بازی گاہ اور پناہ تھے، پھر چھوٹے چھوٹے جاگیردار، کبھی کبھی سرکشی کا انداز دکھلاتے، مالیہ نذرانہ محاصل ادا نہ کر کے خود مختاری کا نہ سہی خودسری کا انداز پیش کرنے کی کوشش کرتے، ان کی پاکٹوں گھالوں کے درمیان چند اک گاؤں حکومت کی جانب سے مراعات کے ساتھ ان کے مخالف قوم یا کیسے ہی نہ کیسے متضاد خاندانوں کے آباد کر دیے جاتے اور یہ درمیان میں حائل ہو کر سرکشی میں توازن رکھتے، اور یوں حکومت کی پالیسی علاج بالمثل اور کبھی علاج بالضد کی منطق سے کام لیتی' اور سنتے چلے آئے تھے کہ گلاب سنگھ اتراج سنگھ کے پرکھے ناہر سنگھ شیر سنگھ، گھمنڈ سنگھ اس گھنے جنگل کے شیر تھے، اس کے درمیان بڑی کچی اہم شاہراہ گذرتی تھی جو وزیر کے ملک اودھ اور دار السلطنت دہلی کو ملاتی تھی' مسافروں اور سوداگروں کے قافلوں کی تو حقیقت ہی نہ تھی قدم قدم پر روتنا (راہ داری ٹیکس) پکڑ کر وصول کر لیتے، سرکاری فوج کی ذرا کمزوری پر نقل و حرکت میں بھی مخل ہوتے۔ اور یہاں دہلی اور لکھنؤ دونوں حکومتوں کو ذرا لمحہ فکر ہوتا، اس کی سرکوبی کے لیے جانبین میں پہلے تو جنگلوں میں فوجی یلغار کی تو بات وہی ڈھاک کے تین پات رہی، بچارے ڈاکو ظاہر ہے' مغل فوج کے ادنیٰ سے دستے کا بھی کیا مقابلہ کر پاتے لیکن ان کی پناہ گاہیں' نہایت محفوظ

تھیں۔ گھنے جنگل کے اندر اور ناقابلِ رسائی۔ دبک گئے اور پھر فوج کے گشت کے ہٹتے ہی غارت گری اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہونے لگی، تو مغل سیاست وڈپلومیسی بروئے کار آئی، جو اپنے دور کی دنیا کی عظیم سیاستوں وسفارت کاریوں میں سے ایک تھی اور جس سے ان کے بعد آنے والے قابض انگریز بھی کام اور رہنمائی لیتے رہے، یہ آج کی اصطلاح میں "ٹیبل ٹاک" والی بات تھی، چنانچہ صوبہ دار نے ڈاکوؤں کے مقتدرین کو دعوت دی، اور پروانہ شاہی کے ذریعہ، جنگل کے اندر جو تھوڑے تھوڑے جگہ جگہ کاشتہ علاقے تھے وہ انہیں معافی دوام نانکار نسلاً بعد نسلاً بطناً بعد بطناً تفویض کئے، اور "بن کٹی" نام کا پورا رقبہ جتنا جنگل صاف کر سکیں، اس پر پوری ایک نسل تک کے لیے مالیہ معاف کیا، اور انعامات کے ذریعہ عام اعلان کیا، چوہان ٹھاکر راجپوت سب سے اونچا مانا ہوا خاندان تھا جنہوں نے بجائے لوٹ مار کے چاروں طرف میلوں رقبہ پر کاشتہ علاقہ پھیلا لیا اور اس کے بیچوں بیچ اپنا چوہان گڑھ نامی گاؤں بسایا اور چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہوئے جن میں شدر قومیں بسائیں۔

اور اب تو جنگل کا نام ونشان نہ تھا، نام کو یہ پرگنہ بن کٹی کہلاتا، بڑے بڑے زرخیز رقبے پھیلے ہوئے تھے گیہوں کپاس اور گنے کی اعلیٰ فصلیں تھیں، جو بڑے پرانے اور تاریخی گاؤں چوہان گڑھ کے گھروں کا ملحق کاشتہ رقبہ زمیندار کی خود کاشت سے شروع ہوتا تھا۔ بیچوں بیچ گاؤں کی آبادی کے اندر بارہ کمروں پر مشتمل چودہ سیڑھی اونچی چوپال تھی، بقیہ کل آراضی موروثی "دخیل کاروں، موروثی حق داروں اور خالصہ کاشت کاروں میں تقسیم تھی جو دستور دیہی واجب الارض کے مطابق نقد، یا جنس زمیندار کو بطور لگان بٹائی ادا کرتے تھے اور اپنی اپنی مقبوضہ آراضیات کے اردگرد چھوٹے چھوٹے خس پوش ذیلی دیہات بنائے بسے ہوئے تھے چمار، لودھے، کسان، دھانک، جولاہے، جھوجھے، مولازادے پاسی کے سب شدر، لیکن ایک کنارے پر ایک چھوٹی سی بستی، جو سنتے ہیں کبھی جب بسی تھی تو صرف اکیلے ایک ہی گھر کی تھی خاص بڑے گاؤں سے میل ڈیڑھ بھر علیحدہ مہاجن نگری نام کی آبادی تھی، جو ایسے مقام پر واقع تھی جہاں کوئی کچا راستہ بھی نہ جاتا تھا اور تقریباً سب نے ہی اس کا راستہ دیکھا تھا، یہ "کوڑیا مہاجن" کی تاریخی بستی تھی جس کے متعلق دیہاتی معتبر تحقیق تھی کہ چوہان گڑھ کی چوپال کے ساتھ ساتھ

ایک ہی دن میں شاہ جہانی دور میں آباد ہوئی، مہاجن کی چوپال تو خیر چھوٹی تھی اور زیادہ دلچسپ بھی نہیں ہو سکتی تھی، مگر کوڑیا مہاجن کی قدیم حویلی بڑی لق و دق تھی، چو رُخے دالان در دالان، کوٹھریاں، کوٹھریاں، صحنچیاں، اور ذرا تنگ سا صحن، جس کے درمیان میں حویلی کی بنیاد کے ساتھ کا نصب کیا ہوا نیم کا مشہور تین چار سو سالہ، پرانا چھتنار درخت، ساتھ ہی ایسی بستیوں سے ملحق چھوٹے بڑے تالاب ضرور ہوتے ہیں جو ان کی آبادی کے شروع دور کے مٹی اٹھانے کے شاہد ہوتے ہیں پھر سال کے سال میں دو مرتبہ لسائی لپائی کے لیے ان میں سے مضبوط چکنی مٹی اٹھتی رہتی ہے اور یہ تالاب اچھا گہرا تھا اور مہاجن نگری بستی کے کنارے ہی پر لگا ہوا تھا۔

گلاب سنگھ اتراج سنگھ کے یہاں میرا شکار کے سلسلہ میں آنا جانا تھا۔ وہ یہ دونوں بھائی، بارہ ماسی شکاری تھے، گھنے جنگل کا شکار تو گرمیوں اور برسات میں بند ہو جاتا ہے، لیکن کھیتوں کا شکار تمام سال مختلف طریقوں سے چلتا رہتا ہے، جو میدانی ہرنوں کا ہوتا ہے، اور گاہے گاہے بھورے بھیڑیوں کا جو ان پر اور پالتو بکریوں پر گذر کرتے ہیں، چڑیوں کا لے بھورے تیتروں کا، وقت وقت پر کھینے ہفتہ ہفتہ عشرہ عشرہ کے لیے میں ان کے یہاں پہنچا کرتا اور سال پیچھے شہر کے کاموں میں میرے یہاں مہمان ہوا کرتے اور تمام ماحول میرا قدموں کا جانا پہچانا تھا۔ کوڑیا مہاجن کی بستی جو سنتے ہیں صدیوں قبل کبھی ایک اکیلے گھر کی تھی اب بھری پُری چھوٹی سی آبادی تھی۔ مہاجن کے بیٹے تو خیر دو ہی تھے، لیکن مقروض آسامی جن کی موروثی آراضیات کوڑیا کے پاس سُود در سُود کے چکر میں رہن دخلی تھیں اور ادائیگی کی شرائط کا یہ حال ایسا تھا کہ سال کے سال کُل پیداوار سے بھی قرضہ ادا نہ ہو سکتا تھا اس لیے چھوٹے سے گاؤں میں ان کے موروثی کاشت کار آسے تھے ان سے ان ہی کے کھیتوں پر کاشت کراتا اور پھر فصل کے فصل، ماہ بماہ انھیں کھانے کے لیے گھٹیا غلہ، جو گجئی، بیجھڑ، باجرہ، جوار اپنے یہاں سے دیتا رہتا اور حساب جمع خرچ میں لکھتا رہتا۔ سال بھر ادائیگی و وجوب میں سرپٹ دوڑ رہتی۔ جیسا کہ میں رقم قرضہ سُود در سُود کے چکر میں پیداوار سے دوگنی ہو جاتی اور بات وہی ڈھاک کے تین پات جوں کے توں، وہ جو کہاوت ہے، چت بھی میرا، پٹ بھی میرا اور انٹا میرے باپ کا، جنس اعلیٰ پیداوار کے ساتھ ساہوجی کے گھر کا رُخ کرتی، اور پچھیس مانی کوڑیا مہاجن سے قول ہاری تھیں، تاہم سب کچھ واجبی

روائتی استحصال کرنے کی۔

گلاب سنگھ، اتراج سنگھ دونوں بھائیوں کے نزدیک کوڑیا مہاجن کا پوت ساتویں پشت میں بھی لالہ پکوڑی مل نہ تھے بلکہ پکوڑیا مہاجن ہی تھا اور روائتی بے وقعت جنہیں چوہان گڑھ بستی کے اندر جوتا پہن کر کسی گلی میں گذرنے کی اجازت نہ تھی۔ علی الصبح اور سرِ شام چراغوں جلے اونچے طبقہ والوں کے حصّہ میں بستی کے اندر آنے جانے کی احتیاط برتتے، راجپوت خصوصاً ٹھاکر راجپوتوں کی چوپال پر جانا ہوتا تو بالعموم کسی بقایا دار موروثی کاشت کار کو اس کے ذمہ واجب زمیندار کے بالمشافہ اس کو ہاتھ کے ہاتھ قرضہ دیتے سوا اس وقت بھی، ورسب تو علی القدر مراتب حسب روایات تپائی اور سرکنڈوں کے موڑھوں پر بیٹھا کرتے لیکن مہاجن اپنا کیسہ کمر میں باندھے عاجزی کے ساتھ روایتی انداز میں کھڑا رہتا۔ چراگاہوں پر عام کاشت کار اور بے زمین کھیت مزدور اپنے مویشی چرانے اور ہفتہ میں ایک دن کا صرف دودھ زمیندار کے یہاں بھیجتے۔ لیکن مہاجن کو مہینہ ساہوکار کو ایک ہفتہ کا گھی بھی زمیندار کو دینا پڑتا۔ ویسے پکوڑی مل مہاجن کے تھان پر بیل یا کونے میں ہل قسم کی کسی چیز کا وجود نہ تھا تاہم بھینسیں گائیں پالنا ہی پڑتیں۔ اب یہ اور بات تھی کہ ان کی داشت چرائی خوراک اور ٹہل ٹکور کا انتظام ان کے مقروض آسامی کیا کرتے، جو اُن کے چھوٹے سے گاؤں میں گھر کے ارد گرد آباد تھے۔ ان مقروض آسامیوں سے ایک کے بجائے دو بیگار ریں زمیندار کو پہنچتیں ایک زمیندار کی اپنی شد آمد قدیم دستور دیہی واجب الارض کی رو سے اور دوسری مہاجن کی جانب سے روائتی، اور یہ سب قدیم تھیں، مہاجن نگری ہی کھیتی کیاری پھیلنے اور چوہان گڑھ بسنے کے ساتھ آئی تھی اور مہاجن کے منحوس درشن بھی، چنانچہ ہولی، دیوالی، دسہرہ تیوہاروں پر دونی نذریں گذارنا پڑتیں، برہمن پر بیت کو کچّی جنس، لیکن ان تمام خساروں، ذلتوں، خواریوں کو پکوڑی مل مہاجن خندہ پیشانی سے، اور بزرگوں کی روایت ہونے کے باعث فخریہ روایات کا حامل محسوس کرتے، ویسے مہاجن قومیت میں تولید و تناسل بھی نہ معلوم کیوں محدود تھا۔ شدروں اور اونچی قومیت والوں کی طرح بستیاں تو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھیں، لیکن مہاجن ایک آدھ چھوٹا سا چند گھروں والا گاؤں اور نیچی چوپال اور وسیع حویلی والا ہوتا جس کے ارد گرد بالعموم پشتینی مقروض آسامیوں کے خس پوش گھر لگے ہوئے، مویشیوں میں صرف بھینسوں کا اور گئو خانہ کا باڑا اور ساتھ ہی ساتھ دور دور تک پھیلا ہوا قرض بیوپار کا کاروبار پکوڑی مل کے ہاں، حاجت مند، قرض خواہ پیدل

چل کر پہنچا کرتے، ڈھنگ کا کوئی کچا راستہ بھی نہ تھا، لیکن ذی اختیار زمیندار طبقہ کے لوگ انھیں ہنگی قاصد بھیج کر بلوایا کرتے۔

کھیوٹ وفرد حقیقت تو خیر زمینداروں کے بیٹوں کا مقدر اور کاغذات سرکاری میں صرف راجپوت ٹھاکروں کا خانہ تھا، اور لالہ پکوڑی مل کا کوئی تعلق اس سے ناممکن تھا لیکن قرضہ اور سود در سود کے روپیہ کی طاقت سے سنتے ہیں ان کے پرکھوں سے شاہ جہانی دور کی تاریخی بڑی بات اور چھوٹی سی بستی چلی آتی تھی کہ کوڑیا مہاجن نے اس علاقے بھر میں اپنی رقم اور ٹھاکر کے انتظام سے جنگل کٹوائے، کھیت بنائے اور ٹھاکروں کے بیے مالیات کے ذریعہ کاشت پھیلانے میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔ ورنہ گلاب سنگھ اتراج سنگھ ٹھاکروں کے پرکھے گھمنڈ سنگھ بل بیر سنگھ چوہان ڈاکو لٹیرے تھے، ان دونوں بھائیوں کے وقت میں پہنچ کر یہ مہاجن ہارون رشید کا البرامکہ بن گیا ان کا باپ ذرا روائتی ٹھاکر تھا۔ مہاجن اور اپنے درمیان اثر و نفوذ کا روائتی فاصلہ رکھے رہا اور توازن رہا، تاہم ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھنڈورے کی آواز کے مطابق ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا . . . . . رہا، موروثی کاشت کار ایسٹ انڈیا کمپنی اور شہنشاہ دہلی کی دو عملی میں مبتلا رہے۔ اور یہ روایت میں ترمیم بنتی گئی۔ مہاجن کھیتی کے لیے تمام لاگت، بیج فراہم کرتا کاشت کاروں کے ذمہ فصل کے فصل زمیندار کے واجب قرضہ دے کر ادا کرتا۔ کاشت کاروں کو شادی بیاہ، بیماری، موت اور تیوہاروں پر مگر اپنی من مانی شرح سود پر فوری اور نقد قرضہ فراہم کرتا اور پھر اپنے ٹھنڈے اثر و نفود کے ساتھ ساتھ ان پر نرم رویہ رکھتا۔ ساتھ ہی ساتھ زمیندار کے تمام تر روائتی امور جو گوناگوں استحصال اور ذلتیں ہوتیں خوشی خوشی فخر کے انداز میں قبول کرتا، اور نتیجہ میں ان کاشت کاروں کی پیداکی ہوئی اجناس اعلیٰ گندم چنا کپاس کھانڈ گھر میں بھر لیتا اسی طرح دور دور تک ایک نوعیت کے نادر رہن داخلی لین کا دستور رائج تھا، جو ضابطہ دیوانی اسول پروسیجر کوڈ اور ٹیننسی ایکٹ میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ دخیل کار، پشتینی موروثی کاشت کار اپنے مقبوضہ رقبوں پر مہاجن کی لاگت کے ذریعہ کاشت کرتے، اور اسی کے گودام کٹھار سے اپنی خوراک پاتے، اور یوں مہاجن کا کبھی ایک گھر کا چھوٹا سا گاؤں ابھی خاصی چھوٹی سی بستی بن گیا، ویسے حکم تو انہیں دونوں بھائیوں کا چلتا، لیکن یہ چلاتے نہ تھے روایت

اور قانون کے پابند تھے، چنانچہ کسی نہ کسی راستے پیداوار کا بڑا حصہ مہاجن کے گھر میں پہنچتا تھا اور ان کے واجب لگان اسی ذریعہ سے بہ آسانی ادا ہو جاتے۔

گلاب سنگھ میرا دوست تھا اور اتراج سنگھ اس کا چھوٹا بھائی، جیسے دیہاتی خلوص میں میرا بھی حقیقی جیسا، چھوٹا بھائی تھا، پکے اور سچے دیہاتی، اپنے جدِ امجد کی روایات پر نازاں، اور جدِ امجد ہی کے لاقانونی عمل کا ردِ عمل ڈاکوؤں کے بیٹے، لیکن بڑے امن پسند، بڑے روایت پرست اور میں اپنے چھوٹے سے قصبہ کے طول و عرض اور قصبیہی تمدن، نام کے شہر کا نواحی مضافاتی اور میرے دوست، بڑے ضلع کے دور افتادہ اندرونِ دیہات بسے ہوئے روایتی دیہاتی، زمیندار کاشت کار اور یہی میرے ان کے مابین قدرِ مشترک تھی کہ زمیندار تھے، اپنے آبائی مملوکہ گاؤں کی آراضیات پر وہ بھی اپنے ہاتھ اور کھیت مزدوروں کی امداد سے خود کاشت کرنے والے سیر دار اصطلاح میں کہلانے والے زمیندار مالک کاشت کار اور میں بھی کچھ ایسا ہی۔ کلک سا، اور لالہ بکوڑی مل نہ دیہاتی نہ مضافاتی، نہ شہری، اپنی اندرون دیہات اور اس بستی اور نواح کے موروثی کاشت کاروں سے لین دین، کھات خوراک جھینٹ بیگار لینے اور زمیندار کو اپنے ذرائع و معرفت سے ڈُوبی دلوانے کے ذمہ دار، پھر شہر میں کچہری کے اور دیہات میں گاؤں کے دلالوں، عرائض نویسوں اور رجسٹری دفتر کے وثیقہ نویسوں سے خلا ملا بھی رکھنا پڑتا۔ دیہات کے بے کمیشن ہی دلال تو دور کے قرض خواہوں کی ضرورتوں کی شدت کی نوعیت کی خبریں دیتے جن سے لالہ بکوڑی مل اپنی من مانی شرح سود کا ریٹ متوازن رکھتے۔ ایک خاص قسم کے قرض خواہ اور آتے رہتے یہ بالعموم چاندی کے زیور اور گاہے گاہے کبھی سونے کا زیور گروی رکھ کر قرضہ لینے کے لیے ان سے شرح سود بالعموم کم رہتی لیکن ساتھ ہی ساتھ شرائط سخت، فصل پر اگر چھڑانے نہ آتا تو دیہات یا شہر کے سونا ہو یا چاندی سناروں سے بھٹی میں گلوا دیتے اور اینٹوں کی شکل میں مسخ کر کے گھر میں زیرِ زمین دفن کر دیتے اور یہ تمام لالہ بکوڑی مل کو ان کے باپ سے نصیحتیں توریثی سلیقہ سے علم سینہ اور دولت علمِ سفینہ کے انداز میں پہنچی تھی۔ تاہم اس آخر الذکر گروی زیور والے قرضہ کی معاملت سے ڈرتے تھے سود کی شرح بھی کم اور پھر دغدغہ یہ کہیں، ڈکیتی چوری کا مال نہ ہو اور شناخت کر کے پولیس نہ پکڑ لے اس لیے سادہ اسٹامپ نشانی انگوٹھا لگا کر رکھ لیا

تھا اور اُلٹی سیدھی دونوں جانب انگوٹھا ثبت، جتنا چاہو لکھوالو، اور تین تین سال سود کی اندراج وصولیابی کے ساتھ میعاد بڑھالو، اور یوں پشتہا پشت بارہ بارہ چوبیس چوبیس برس تک کام چلالو۔

اور میں جب اپنے راجپوت دوستوں کے یہاں مہمان ہوتا ان مہاجن ذاتِ شریف سے آتے جاتے یاد اللہ ہو ہی جاتی۔ ویسے جاتا تو شکار کے لیے اور شکار بھی یک رُخا صرف میدانی گلہ بنا کر رہنے والے ہرن کے شکار کے لیے جو تمام سال کسی نہ کسی صورت میں چلتا رہتا ہے اور کھیتوں کا شکار ہے فصل سے بھرے اور فصلیں کے کٹے ہر میدانوں کا۔ اونچی فصلوں میں ہانکے کا اور گاہے گاہے ان پر گذر کرنے والے بھیڑیوں کا، جو میدانی ہرنوں کے شیر ہیں یا پھر گلہ بانوں کے چور۔ اور ہرن آدمیوں کے درمیان میں بہنے والا وحشی چرندہ ہے اور اس کے شکار کے طریقے کھیتوں میں فصلوں کے ساتھ متنوع ہوتے رہتے ہیں اور اسی تضاد و تنوع میں اس کی دلچسپیوں کا راز ہے۔
ویسے اکتوبر تا فروری مارچ شمالی پہاڑوں کے پار کے چین، ٹینڈرا اور سائبیریا سے روس کے زمستانوں سے چلی ہوئی قازیں، مرغابیاں بھی تنگ کے تنگ پہنچتی ہیں، اور جھیلیں، جوہڑیں، تالاب، چھوٹی بڑی مرغابی، جنگلی بطخوں سے بھری ہوتی ہیں اور ہر بندوق کا لیسنس دار خواہ ہو نہ ہو شکاری ہو جاتا ہے۔ یوں تو ہم کھیتوں کے اندر بارہ مہینے کے شوقین شکاری تھے۔
صبح ہی صبح ناشتہ کے بعد چوپال کے چبوترہ پر بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ نیچے گلی میں سے پکوڑی مہاجن کی آواز آئی۔ اور بتایا کہ ان کے گاؤں کے قریب بستی کے ملحق جو تالاب ہے اس میں دو تین روز سے سرِ شام سے قازیں آتی ہیں اور رات بھر سنگھاڑہ کیسرو چگ کر گجر دم اڑ جاتی ہیں، شکار کا مژدہ اور مہاجن کے مُنہ سویرے سویرے ہی نحس درشنوں کے ساتھ اور شکاری تو بڑا وہمی ہوتا ہے، انگریز شکاری بھی اچھے برے شگون لیتے ہیں۔ بڑے بھائی نے تو آواز دے کر گلی میں سے اوپر بلا یا لیکن چھوٹے اتراج نے سلام کے بجائے جواب میں گالی بڑبڑائی۔ گلاب سنگھ نے ڈھنگ کے ساتھ بات کی۔ قازوں کے آنے اور جانے کے اوقات پوچھے اور تنگوں کے رُخ دریافت کیے۔ شام کا قاز کا اور شروع سیزن کا شکار اور آسان ہوتا ہے۔ اگرچہ بسیرا اور چگائی کا وقت ہونے کے سبب بڑے شائقین میں اَن اسپورٹنگ خیال کیا جاتا ہے، اور پھر دلچسپی یہ تھی کہ ساری رات

کا مشغلہ تھا قازیں خوبصورت قطاریں بنا کر بولتی گاتی، بجاتی چلتی ہیں اور اپنی آمد کی میلوں دور سے اطلاع دے دیتی ہیں، پھر جہاں جس پانی پر چارہ ہوتا ہے وہاں سبک پر، اونیچی پرواز ہو جاتی ہیں، ایک ایک چکر لگا کر شکاری کو بہترین اور آسان ترین فلائنگ شاٹ کا موقع دیتی ہیں بڑی بات یہ ہے کہ چھوٹے بڑے تنگوں میں گاتی بجاتی آتی رہتی ہیں ایک تنگ پر فیر ہو تو دوسرا تنگ میلوں دور، دراز ہوتا ہے، آنے والوں کو خبر نہیں ہوتی وہ پہنچتا ہے تو اس پانی پر سکون ہوتا ہے جہاں ابھی ذرا دیر قبل آگے آنے والی ہم جنسوں پر قیامت بیت چکی ہوتی ہے اور پھر چانس کی تکرار ہوتی ہے تمام رات کا مشغلہ ہے'' اور یوں بڑا دلچسپ شکار رہے۔ میلوں سے آواز سن کر ایک کے بعد دوسرے تنگ کے استقبال کے لیے بس پانی کے کنارے اک ذرا کے ذرا گڑھے یا گھاس میں دبک جاؤ اور پہلے نیچے اڑتے ہوئے چکر میں فیر کر کے بیگ بھرتے رہو۔ تمام دن کی بھوک ہوتی ہے، یوں بھی اندھلا جاتی ہے، تاہم جہاں بیٹھنا ہوتا ہے اس پانی کا چکر ضرور لیتی ہے اور اسی چکر میں شکار ہو جاتا ہے۔

اور آج اماوس کی اندھیری رات تھی، ہم نے صبح کے مہاجن درشن بگڑے شگون شام کو مزید بگاڑنا مناسب خیال نہ کیا اور پھر بے سود تھا۔ آج ہرن کے شکار کے ہفتہ کے بعد ہمارے آرام کا دن تھا اور آج کی رات WILD GOOSE CHASE انگریزی ضرب المثل کے مطابق قازہی کے شکار کے لیے وقف کر دی اور اندھیرا پڑے کھانا ذرا جلدی کھا کر فارغ ہو گئے رتھو پر سوار ہو کر چپکے سے مہاجن نگری گوشے کے کنارے جھیڑ پر جا کر دبک گئے۔ تینوں ایک محاذ میں، پچاس پچاس گز کے فاصلے پر، جدھر سے اڑتی ہوئی چڑیوں کی آمد ہوتی تھی۔

تمام رات کا پروگرام، کہتے ہیں انتظار ویسے تو موت سے زیادہ شدید ہوتا ہے لیکن امیدوں سے پر ہو تو طرب ہی طرب ہوتا ہے، مگر آج خلاف امید کسی بھی متوقع سمت سے قاز کا تنگ آنا تو درکنار کدھر ہی سے دور کی آواز بھی نہ آئی، سر شام سے گیارہ بج گئے، اور بجز کیچڑ کے پانی کے حشرات کی آوازیں، جو دیہات کی جھیلوں کے کنارے سنائے کا جز ہوتی ہیں صدائے برخاست اور آواز سنائی پڑی تو الو کی جو مہاجن کی چوپال پر ایستادہ نیم پر بول پڑا۔ بڑی امیدوں اور مستند خبر پہ گئے تھے اور سخت ناامید ہوئے، الو خوب رچ رچ کر بول رہا تھا۔ ویرانی اور تباہی کا

نقیب، اپنی کرکٹ ہیبت پھیلانے والا۔ اور ہم خیر خائف تو نہ ہوئے، لیکن ناامیدی اور ناکامی میں ہماری ناامیدی فزوں تر ہوگئی جاڑوں کی طویل رات گیارہویں گھنٹہ تک پہنچ گئی اور احساسِ محرومی زیادہ کہ خلافِ امید تینوں کے تینوں یکایک چونک پڑے، جو ہم کے اس کنارے سے بستی کے گھر لگے ہوئے تھے اور بستی کے اندر یکایک، دھماکوں کی آواز سن لی دی، چونک کر دیکھا تو اندھیری فضا میں ہوائیاں سی چھوٹ رہی تھیں آوازوں اور ان شعلہ باریوں سے پہچان لیا کہ بھرمار بندوق کے ہوائی فیر ہیں، رُخ سے اندازہ ہوا کہ مہاجن کی حویلی کی چھت اور گاؤں کی گلیوں کے ناکوں سے ہو رہے ہیں، اور ہم تینوں اپنی اپنی نشستوں سے اچھل کر جمع ہوگئے مہاجن کے یہاں ڈکیتی پڑ رہی ہے شبہ کی گنجائش نہ تھی، تینوں متفق تھے، اتراج سنگھ نوجوان کا اندر والا ٹھاکر راجپوت جیسے جست لگا کر باہر آگیا۔ بڑے بھائی نے، اطمینان اور ٹھنڈے انداز میں روکا۔

"شانت ہو، ذرا غم کھا، منڈے۔ لڑکے ٹھاکر، مگر میں نے شیخ بیٹھا بیٹھا دیکھ کے بجائے آہستہ سے کہا، بھائیو، کچھ نہ کرو، بہرحال یہ چور ہیں، مثل مشہور ہے چور کے پاؤں نہیں ہوتے، اگرچہ ہمارے رینج سے باہر ہیں لیکن ہم تینوں گراپ کی دو چار والیاں اس چوپال والے نیم کی پھنگیوں کی جانب ماردیں تو یہ بھاگ کھڑے ہوں گے، اور مہاجن لٹنے مرنے سے بچ جائے گا۔ وہ بھی دیکھیں گے خبر، بھگانا ہی نہیں ہمیں تو ان سورماؤں سے نبٹنا ہے جو میرے دنگل میں ڈکیتی مارنے میری مونچھیں جھلسنے آئے ہیں، اور اتراج سنگھ پھر اچھل کر چار پڑا بڑھنے کا انداز بنایا بڑے بھائی نے اس کی بندوق پکڑ لی ابھی وقت نہیں آیا، ذرا اس مہاجن کی اچھی طرح لوٹ مار ہولے تب ان سورماؤں سے بھی نبٹنا ہے جو گھمنڈ سنگھ بل بیر سنگھ کے دنگل میں ڈکیتی مارنے آئے ہیں، پھر اس مہاجن کی گندی ہولے، دنیا لوٹ کر (گالی) نے گھر میں بھرلی، (گالی) بھلا چور کے گھر میں مور، اہے ایشور تیری لیلا! ابھی اتنے نہیں گر پائے ہیں کہ ایسے ویسے لٹیرے ڈکیتی مار کر ثابت نکل جائیں چوہان گڑھ سے! پھر ایک موذی مرلینے دے ذرا اچھی طرح پہلے، کوڑیا مہاجن سے لالہ کوڑی مل ساہ تک کبھی تین سو برس اور چودہ پشت میں کوئی ہل بیل چلاتے نظر پڑا ہے اور دنیا بھر کی پیدا وار نے (گالی) اس گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے، سونے چاندی کے ڈھیر ہیں،

بڑا بھائی بڑبڑایا، اتراج سنگھ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ تاہم نوجوان راجپوت کا خون ذرا مندھیا ضرور اور بندوق نیچی کرلی۔ اور ہم تینوں نے بستی کے شور پر کان لگا دیئے، اب دھماکے بھی ٹھہر ٹھہر کر ہو رہے تھے اور بے تفصیل شور سُنائی دے رہا تھا۔ ایک آدھ چیخنے چلانے سے زیادہ واضح ڈکرانے یا کتے کے بھونکنے جیسی آدمی کی آواز ذرا واضح ہوکر سمجھ میں آجاتی۔ گلاب سنگھ بولا، میاں، میں توان سور ماؤں سے ضرور نبٹوں گا جو میرے دنگل میں ڈکیتی مارنے آئے ہیں پھر ذرا اس بیاج خورے کو (گالی) بھگت لینے دو، میں نے شیخ والی ترکیب پھر پیش کی یار تم میری نہیں مانتے، ہم تینوں ادھر رُخ کرکے ٹھائیں ٹھائیں دو چار گراپ کی والیاں مار دیں، رینج سے ذرا باہر ضرور ہے ویسے ۷۰۳ (تھرّی ناٹ تھرّی) کام بھی کرے شاید اور کچھ نہیں تو چوپال کے نیم پر شاخیں پتیاں ہی ٹوٹیں گی، ڈاکو سمجھیں گے پولیس آگئی — شاید اور یہ شُہر چڑیاں اڑ جائیں گی، چور کے پاؤں نہیں ہوا کرتے .... اور گلاب سنگھ نے بات کاٹ دی "اجی آپ مجھے فلسفہ پڑھا رہے ہیں، میں نے کہا نہیں ایک موذی مرنے دو — اچھی طرح ایک آدھ گھنٹے میں — پھر ان سور ماؤں سے نمٹوں گا۔ تم تماشہ دیکھنا۔ ابھی نکلتے ہی اور پھر بھائی سے مخاطب ہوا، دیکھ بے لڑکے، یہ ادھر پورب کو نکلیں گے، اور دو تین ادھر مخالف رُخ پستارہ ڈالتے ضرور جائیں گے جہاں پیال کے گٹھر پڑے ہیں، میں اس کنارے اور تو اس کنارے نکڑ پر دبک جانا قطار بنا کر نکلیں گے ہی، اندھیرے میں، میں قطار کے سب سے پیچھے والوں دو کو دَن دَن فیروں پر دھر لوں گا اور پستارہ والے دونوں کو دھمک دینا اور پھر پیال کے گٹھروں کی ٹالیں لگی ہیں، لاشوں کو آن کی آن میں دیا سلائی دکھلا کر کریا کرم کر دیں گے۔"

میں نے کہا "ٹھاکر دتم خیر سے راجپوت، میں شیخ، میری مونچھیں نیچی، اس مہابھارت میں پڑنا نہیں چاہتا، معاف کرنا ساتھ چھوڑ رہا ہوں، میں چوپال جاکر سوتا ہوں۔ رہا وہ برگد تلے کھڑا ہے، ناحق چوٹ جلا کھائے گا چھوڑ تماشہ جائے، یہاں قازیں مارنے آئے تھے ڈاکو مارنے نہیں، اور کیوں جی تم دونوں بھائی بھی کوئی تھانہ دار ہو یا شکاری ہو کیوں خطرہ مول لیتے ہو مفت میں ؟"

"نہیں نہیں، مجھے ان سور ماؤں سے نمٹنا ہے، جو میرے دنگل میں ڈکیتی مارنے آئے

تھے، اور میاں یہ ہمارا مسئلہ ہے۔"

میں نے بات کاٹ دی۔" مسئلہ ہے تو انہیں بھگا دو، ابھی، دو تین گراپ کی والیوں میں بھاگ جائیں گے . . . ."

"نہیں نہیں مزہ چکھا کر، اور پھر مہاجن بچہ تو کورا بچ جائے گا۔ سانپ مرے پھر لاٹھی بھی ٹوٹے تب مزہ ہے، یہ سانپ اور دشمن لڑ رہے ہیں، پہلے ان میں ہو لینے دو۔ پھر ہم نپٹیں گے۔"

"کیا جہالت ہے۔ اخیر بھائی میں تو جاتا ہوں، نہ پولیس والا ہوں اور نہ مجھے مہاجن سے مفت کی پرخاش ہے۔"

ادھر شور سمجھ میں آنے لگا۔ بندوقوں کی آوازیں کم ہوتی گئیں۔ ہراس پورا طاری ہو گیا۔ اور میں نے پٹ کر بیں رنگو میں لگائے اور گاؤں کی جانب چل پڑا۔ چوہان گڑھ گاؤں اس چھوٹی سی بستی سے اک ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا، فیروں کی آوازیں وہاں تک پہنچیں تو لوگ گومگو میں تھے، جنہیں اندازہ تھا کہ ہماری بندوقوں کے فیر نہیں ہیں، وہ اور بھی زیادہ پرچول میں تھے اور میں نے پہنچتے ہی حویلی کی ڈیوڑھی پر سنا دی کہ مہاجن کے یہاں ڈکیتی پڑ رہی ہے اور دونوں بھائی مقابلہ کے لیے تیار ہیں۔

سامنے تو آتی نہ تھیں لیکن سرڈھکے چوپال سے ملحقہ گئو خانہ بھینس باڑے میں دودھ کے جانوروں کی دیکھ بھال کرنے اور نوکر نہ ہو تو دودھ کاڑھنے نظر آجایا کرتیں، اور بہوئیں تو آواز کا پردہ کرتی تھیں۔ سو چھوٹے تو چھوٹے بڑے سبحان اللہ، بیٹے خواہ مخواہ کے محاذِ جنگ پر تھے، حویلی میں سے بڑی ٹھکرائن اس گھڑی چیختی ہوئی اس برزخ سے برآمد ہوئیں کہ دوپٹہ راجپوتی بندش مونڈیسے کی طرح سر پر بندھا ہوا اور لہنگا راجپوتی دھوتی کے انداز میں لنگ چڑھا دو پیچ پیچھے کو کسا ہوا، ہاتھ میں سرگہاش خسرا ور بیکنٹھ باشی شوہر اثاث البیت ورثے میں پرانے پرکھوں سے پہنچا ہوا۔ پانچ سیر وزنی شیاموں گوٹوں، موٹھوں منڈھا گز سالٹھ اور قد جیسے ہاتھ بھرا اونچا، مردانہ وارتنی ہوئی اور دونوں بہوئیں دائیں بائیں بغیر گھونگھٹ کے سربلند، ساس بہوئیں، گاؤں کے بیچوں بیچ قدیم کنوئیں کی جگت پر جا دھمکیں۔

اور ساس نے جگت پر تلسی کے پودے پر سے پتے کھسوٹ کر منہ میں رکھے اور وہیں سے

دیہاتی روایت کے بموجب "دوہائی" پکار دی، صدائے امداد، جو مظلوم ہو یا مقتدر آڑا وقت پڑے
مدد کے لیے پکارنے کا مخصوص طریقہ ہے۔ اور چوپالوں پر سے خاتون کی آواز کے ساتھ گھروں
میں سے الاؤوں اور بستروں سے اٹھ اٹھ کر کاشت کار، ذیل کار، موروثی اور رعایا، کھیت مزدور
آواز پر لٹھ لیے چل پڑے، کوار بیر پڑی، تو ادگر رکی ذیلی چھوٹی بستیوں سے، چمار پاسی، مولازادے
پٹھان، جھوجھے، باڑھوں سے کاچھی، جھونپڑیوں میں رہنے والے اور گاڑھا کھدر بننے والے جولاہے
دھنیے، کھیت مزدور، چمار پاسی لودھے، ساتوں قوم ٹھکرائن کے گرد جمع ہو گئے اور آن کی آن
میں بستی کا ایک بھی نوجوان، جوان یا بوڑھا گھر میں نہ رہا جیسے ہر کوئی ایک سے ایک بڑھ کر سر
ہتھیلی پر لیے اپنی بوڑھی مالکن کے گرد موجود تھا اور بوڑھی ٹھکرائن کی آواز ہی جیسے بدل گئی، کڑک کر
لام بندی پکار دی، بغیر مفصل سمجھے کہ مسئلہ کیا ہے اور نہ ایسے وقت ضرورت ہوتی ہے کہ تفصیل سے
بتایا جائے اور سمجھ سے بھی کام لیا جائے اور صرف "کر" کے سلیقہ میں بے ہنگم طور پر ہر کوئی مارنے مرنے
پر تل گیا، چند لفظوں میں بتایا کہ دونوں آقاؤں کا ڈاکوؤں سے مقابلہ ہے کہاں اور کدھر؟ اس
کی شاید اس اندھیری رات میں ضرورت بھی نہ تھی اور ٹھکرائن نے پانچ سو سرفروش لٹھ بند جوانوں
کے ساتھ مہاجن نگری کا رُخ کیا، بستی سے باہر بنجر کے میدان پر اک دو سو گز بڑھے ہی تھے کہ مہاجن
نگری کی جانب سے دَن، دَن دو فیروں کی آواز سنائی دی، جو اب تک کے فیروں سے مختلف تھی اور
ٹھکرائن اچھل پڑیں، وہ بیٹوں کی کارتوسی بندوقوں کی آواز پہچانتی تھیں یک دم بول پڑیں" یہ
میرے اترجا کی برج لوٹ چلی" اور بندوق کی آواز پر مجمع کا جوش فزوں تر ہوا۔ اور قدم تیز اور
چند ہی ساعت بعد دوسرے دَن، دَن فیر ہوئے، اور ٹھکرائن نے پھر اچھل کر کہا " یہ میرے
گلبا کی ٹمن چلی"۔ اور مجمع اور بھی زیادہ مہمیز ہو کر بڑھا اور میں چوپال کے چبوترہ کی منڈیر سے شیخ بیٹھا
بیٹھا دیکھ، باوجود اندھیری رات ہونے کے شروع رات کے منصوبہ کی روشنی میں جیسے روز روشن
میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ڈیڑھ کوس آگے کی نظر آ رہی تھی اور اب تیسرے اقدام کا منتظر تھا، ساتھ
ہی ساتھ فیروں کی آوازوں سے اندازہ کر لیا کہ کلوز رینج سے اور بھر پور بھرے پڑے ہیں، تمام منصوبہ
ابھی ذرا دیر پہلے میرے مواجہ میں جو ہر کنارے بنا تھا اور رابطہ جیسے مشینی انداز میں منصوبہ کے
مطابق تھا اور تیسری شق میں چند منٹ بعد مہاجن نگری کے قریب سے بڑے زور سے آگ بھڑکی جو میرے

علم میں اور دونوں بھائیوں کے منصوبہ کی آخری کڑی تھی۔ اور اب چوپال سے اتر کر میں بھی مجمع کے سوسوا سوگز پیچھے پیچھے ہو لیا۔ دونوں بھائیوں کے آپریشن کی ایک ایک شق میرے ذہن میں تھی اور یہ آخری عمل تھا میدانوں میں تا حدِ نگاہ چاروں طرف روشنی پھیل گئی، وہ جو کہتے ہیں ایک سوئی بھی پڑی ہو تو نظر آجائے، اور اب روزِ روشن کی طرح ہر چیز سامنے تھی، اور دیہاتی ڈکیتیوں میں ایسی آتش زنیاں ڈکیتوں کو فوراً تو بھاگنے پر مجبور، اور لوٹ مار کو ناکام بناتی ہیں پولیس تفتیش کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہیں، ہر صورت میں ڈاکوؤں کی موت کے مترادف ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت تو مخالف سمت فرار ہوتے ہوئے ڈاکوؤں کی لمبی لمبی پرچھائیاں بھی نظر آگئیں اور فرار کے رُخ کا تعین ہو گیا، مجمع اور بڑھا اب روشنی تھی، جیسے دن پھیلا تھا، آدھ فرلانگ بھر میدان میں بڑھ پائے تھے کہ سامنے سے دونوں بھائی دوڑنے اور لپکنے کے بین بین چال بڑھتے نظر آئے، بندوقیں کندھے پر لٹکی ہوئیں تاہم اتنی اہم مہم سر کرنے کے باوجود بدحواس نہیں، مجمع کو شانت کیا، ماں کو تسلی دی اور سب کو واپس کیا۔ کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

اس طرح، بیٹوں کی خاموش منصوبہ بندی، اور ماں کی بےتکی پکار کا یہ ڈرامہ کامیاب ربط ضبط کے ساتھ اختتام پذیر اور ڈراپ سین ہوا۔ مہاجن شاید سمجھا کسی نے پتائی میں آگ لگا دی۔ دونوں بھائیوں کے فیروں کی آواز ماں نے تو دو میل سے سن کر پہچان لی، لیکن مہاجن نگری کی رستخیز میں کون تمیز کر پاتا۔ تاہم ڈکیتی اور لوٹ مار بھی کامیاب رہی، پر خلوص، سادہ مزاج دیہاتی مخلوق مالکن کی پکار پر مارنے مرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے، مالکوں کی ہدایت پر واپس ہو گئے اور اب آدھی رات کھسک چکی تھی، اپنے اپنے ٹھکانوں میں جا سوئے۔ بستی پیچھے ایک آدھ کائیاں ہوتا ہے، ایسے ایک صاحب نے، جو چوہان گوھ کے ملنے ہوئے بولنے والے تھے، شادیاں پٹانے والے غالباً حجام تھے کوئی ایسے ہی ویسے، استفسار اور دریافت حال کرنا چاہا لیکن گلاب سنگھ نے جھڑک دیا اور اتنے بڑے وقوعہ کے ہم تین اصل محرم راز درون پردہ تھے۔ یوں، یہ تمام علاقہ کا، تھانہ اور ضلع کے پورے حلقہ کا اور ہائی کورٹ تک کا راز تھا جسے آتش زدگی اور دھماکوں نے روزِ روشن کا راز بنا دیا تھا۔ لطف یہ کہ اس آتشزدگی میں کارگزاری ایسی پسِ پشت جا پڑی تھی کہ راکھ ہو گئی تھی اور تو اور پیشہ ور تفتیش کرنے کے مجاز سرکاری محکمہ کے علم درسائی سے باہر ہی رہنے کے امکانات روشن تھے اب ہم تینوں

چوپال میں ایک مداخل کمرے کے اندر بیٹھے۔ چلم بھر بھر کر دینے والے چھوکرے کو بھی ہٹا دیا۔ اور میں نے گلاب سنگھ کو اس کے منصوبہ کے لفظ بہ لفظ درجہ بدرجہ کامیاب ہونے پر خراج تحسین پیش کیا، جو میرے علم میں اس طرح تھا، جیسے میرے چلے آنے کے بعد سب کچھ میرے روبرو بیتی ہے، اور گلاب سنگھ نے سرگوشی کے انداز میں رشداد بیان کی "میاں بات سیدھی سادی تھی، جیسے ہرن کے شکار میں ہوا کرتی ہے، کچھ ویسی ہی، وہ پستارہ ڈالنے والے دو (اتراج سنگھ) کے سامنے سے گزرے اور اس نے دھر لیے، اپنی بھاگ بھری کی نوک پر، دَن دَن دو فیروں میں کھوپڑیاں پاش پاش کر دیں، اور ادھر مخالف سمت میرے سامنے سے پوری اڑتیس کی قطار کی قطار گذری، جیسے ہرنوں کی ڈار کے شکاری کی طرح کالا ہرن، چلتا ہے، میں دبکا رہا اور سب سے پیچھے والے جو بالعموم گروہ کے سردار مکھیا ہوتے ہیں جب میرے سامنے پڑے تو میں نے گراپ کے دَن دَن فیروں میں لپیٹ لیے اور تم نے دیکھا ہی تھا پیال پتائی کے جوہر کی پوری دھان کی فصل کے ڈھیر تھے، پہاڑ لگے تھے۔ لاشیں زیادہ گھسیٹنی بھی نہ پڑیں گٹھروں کے بیچ تھیں، وہیں ذرا نکال کر دیا سلائی دکھلا دی آن کی آن میں گٹھر بھڑک اٹھے ڈاکو ادھر بھاگ رہے تھے اور ہم دونوں ادھر اپنے گاؤں کی جانب، سب کچھ روشن تھا۔ اور تم اور ماتاجی لام لے کر ادھر سے بڑھ رہی تھیں، وہ جو کہاوت، سوتے کا چوما، سنان کا نہ باپ کا ہوا۔ بھاگڑ ہی بھاگڑ، یہاں سے واں تک، کوس بھر کے اندر کھلے میدان، اور رن دوپہر اجالا ہونے کے باوجود نہ ڈکیتوں کو معلوم نہ مہاجن ہی کو، اور تو اور نہ اپنے گاؤں والوں کو کہ ہوا کیا! قہقہہ پڑا۔ میں نے کہا، "لیکن سنگین پولیس کیس ہے، تفتیش ہوگی، اور قانون وانون تو نہیں ہے لیکن بندوق کے لیسنس دار کم بخت کی ذمہ داری ہے کہ گورنمنٹ کی مدد کرے، اور اسے پولیس نے اپنا مجاز اور حق بنا لیا ہے، یہاں تک کہ ایسے موقعوں پر پولیس نہ پہنچے تو لیسنس دار بندوق اور سر سے کفن باندھ کر جا پہنچے، ممکن ہے کہ تم سے مطالبہ کریں کہ فیروں کی آواز پر تم کیوں نہیں پہنچے تو کہہ دینا ہم اندر حویلی میں سوئے تھے، ہم نے فیر نہیں سنے، دو تین میل کی بات ہے" اور گلاب سنگھ نے بات کاٹ دی "بھائی آپ اطمینان رکھیں ہم نبٹ لیں گے۔ دھماکوں کی آواز ہوں، شادی میں گولے چلتے ہیں، رہا تپائی پیال ڈھیروں میں سے کچھ جلی لاشوں کی ہڈیوں پھولوں کا معاملہ، کہیں تو اس کو صبح نکلتے نکلتے بغیر ہی ٹھنڈا ہوئے بھوبل کو جو بڑھ

ڈلوا دیں۔"

"اماں لا حول ولا قوۃ! پہلے تو کہیں گے نہیں پولیس والے، اور بفرضِ محال کوئی چیز برآمد کر بھی لیں تو ہم کیا جانیں، ہماری تو موجودگی ہی وہاں کہیں آس پاس نہیں ہے وہ نوکلیا میں گڑ پھوٹ گیا۔"

اور گلاب سنگھ نے بشاش ہو کر کہا "ڈاکوؤں کو بھی مزہ چکھا دیا کر آئے تھے گھمنڈ سنگھ کے دنگل میں ڈکیتی مارنے، اور مہاجن کی بھی پشتوں کی کھائی پی نکل گئی ہو گی، وہ جو کہی تھی، سانپ تو مرا پر لاٹھی بھی ٹوٹی، مزہ ہی آ گیا۔"

"وہ تو سب کچھ ہے، لیکن ہمیں پولیس کے پہنچنے سے قبل پہنچ کر جائزہ لینا ہے، اور مجھے قبل دوپہر چلا جانا بھی ہے، بھئی بے کار میں پولیس کے سوالات جوابات میں کیوں پڑوں، اس بستی سے لام بندی اور مدد مقابلہ کے لیے اجتماع ہوا ہے، اگر پوچھیں تو کہہ دینا کہ ہم تو اندر سوتے رہے۔ بستی والے دھماکوں پر چل پڑے تھے کہ ادھر سے کسی نے آگ لگا دی۔" ہم بقیہ رات باتیں کرتے رہے۔ اتراج سنگھ ہماری چلمیں بھر بھر کر حقوں پر رکھتا رہا۔ اور صبح تڑکے اصطبل سے تینوں گھوڑیاں کس کر بغیر ایک سائیس بھی ساتھ لیے مہاجن نگری پہنچے تو ڈکیتی پڑے ساتواں گھنٹہ تھا اور پوری ہراس بستی جاگ پڑی تھی لیکن لوگ اپنے اپنے گھروں کے اندر سے دروازے بند کیے اور بستی میں موت کا سناٹا اور خوف کا دور دورہ تھا، ہم نے مختصر سی آبادی کا ایک چکر لگایا تنگ نلقیوں اور پتلی گلیوں سے گزرے گھوڑیوں کی چاپ ہوئی اور ہم نے ہمت بندھائی آوازیں دیں تو لوگ گھروں سے نکلے، سراسیمہ، خائف، ہیبت زدہ بدحواس سے، جو رات کے وقوعہ کا فطری ردِ عمل تھا۔ ہم نے ہمت افزائی کی، اور ہراس میں کمی ہوئی، ساتھ ہی ساتھ اندازہ ہوا، جو رات خاموشی میں ڈکیتی شروع ہوتے ہی جو ہڑ پر بیٹھے بیٹھے آوازوں سے ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ مہاجن اپنی حویلی کے اندر سے مدد کے لیے پکار دیتا رہا، لیکن لوگوں نے جاگتے ہونے کے باوجود کروٹ نہ لی تھی۔ حتیٰ کہ مہاجن کی پکار پر آواز بھی کسی ایک آسامی نے نہ دی تھی نہ ہی کسی نے ہمت بندھائی آواز ہی دی تھی، اور مہاجن اپنی بستی میں اکیلا تھا اور میں نے دل ہی دل میں ایک بوڑھی عورت کی "دہائی" اور رات کی صدائے استمداد اور روزی رساں مہاجن

کی مصیبت بیتی آوازوں کا مقابلہ کیا۔ دونوں بھائی گلاب سنگھ اتراج سنگھ کی جانب دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بات ہو گئی، سود در سود کے میزان کل میں یہ مد شرط نہیں آئی ہے مہاجن ٹٹتا رہا، مدد کے لیے مویشی کی طرح ڈکرا ڈکرا کر اپنے آسامیوں کو پکارتا رہا جن کی ۔وزی کا کفیل بھی ہے، لیکن مدد کے لیے گھر سے باہر آنا تو درکنار کسی ایک نے اپنے گھر کے اندر سے ہمت بندھاتی ایک آواز بھی نہ نکالی۔ ورنہ بعض بعض گھر تو حویلی اور چوپال سے اتنے ملحق تھے کہ اپنی نیچی دیواریں پھاند کر اور کچھ نہیں تو مہاجن کی چوپال اور مویشی خانہ کے چھپروں میں ہی آگ لگا سکتے تھے اور بات بن سکتی تھی، ڈاکوؤں کو بھاگتے ہی بن پڑتی، اور ستم یہ کہ اس گھڑی ہمارے پہنچتے ہی سب کے سب ہمارے آس پاس جمع تھے اور یہ سود در سود اور وجوب لگان آراضی دو سال کے سال واجب ہونے والی رقوم کے مثبت منفی ردعمل اور اثرات تھے، خیر ہم مہاجن کی حویلی کی ڈیوڑھی پر پہنچے، تو پیش دروازہ مہاجن کا کتا، جو نسک کی آخری ڈلی اوا کر کے کسی ڈاکو کی گولی کا شکار مرا ہوا پڑا تھا۔ تب حویلی کی چھتوں اور اندر ڈاکو داخل ہو سکے تھے۔ باہر سے مضبوط کواڑوں کی کنڈی لگی ہوئی تھی جو چلتے وقت ڈاکو لگا گئے تھے اور پہنچنے والوں میں ہم تینوں اپنے گھر سے اور بستی والے اپنے اپنے گھروں سے پہلے لوگ تھے اور حویلی میں گھستے گھستے جیسے گلاب سنگھ کا نظریہ میرے ذہن میں گونج گیا، جیسے مہاجن نگری کے کسان اور چوہان گڑھ کا ٹھاکر یہاں سے وہاں تک دونوں اپنی اپنی جگہ پر مہاجن کے معاملہ میں یک رائے متفق تھے۔ اس ظالم نے جوہڑ کے کنارے سے میری تجویز کے مطابق ڈاکوؤں کو فوراً ہی ڈرا کر بھگانے کے لیے دھماکے نذر کرنے دیئے اور یہ سود در سود کے نمک حرام گھروں میں بیٹھے رہے۔

حویلی کے اندر پہنچے تو سب سے پہلے ہمیں گلاب سنگھ کی آرزو کے مطابق صحن میں سادہ تمسکوں اسٹامپوں کے پرزے پڑے نظر آئے جو ڈاکو پھاڑ کر پھینک گئے تھے اور یوں دور دور کے رہنے والے مقروض آسامی گھر بیٹھے بیباق کر گئے تھے۔ میں مہاجن کی حویلی میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ چورخی، دالان در دالان صحنچیوں، کوٹھریوں، کوٹھیوں والی لق و دق دونی حویلی اور صحن میں ایک نیم کا درخت، جو کہتے ہیں تین سو سال پرانا تھا۔ اور سامنے والے دالان سے کراہنے کی آواز سنائی دی، بڑھے تو مہاجن زمین پر پڑا تھا اور رات کی کھدی، تازہ مٹی کی ڈھیری سے لپٹا رو رہا تھا، پاس پہنچے تو کولہوں تو ند اور جسم پر آبلے اور جلے ہوئے لمبے لمبے آبلوں چھوٹے زخم تھے، جنہیں دیکھتے ہی ہم نے اندازہ

کرلیا کہ پیٹوں اور سلاخوں سے داغے گئے ہیں۔

اور دیہاتی ڈکیتیاں ہمیشہ ایک تکنیک پر ہوتی ہیں، چوروں کی طرح بستی میں داخل ہو کر پہلے گلیوں میں نکڑوں پر قبضہ کرتے ہیں پھر کسی نہ کسی طرح جس گھر میں لوٹ مار کرنا ہوتی ہے داخل ہو کر چھت پر قابض ہوتے ہیں اور بندوق کے دھماکوں سے ہراس کی فضا قائم کر کے بالعموم زینہ کے راستے صحن میں اترتے ہیں ڈیوڑھی کی اندر سے کنڈی کھول دیتے ہیں اور گروہ گھر میں داخل ہو جاتا ہے اور مار پیٹ، اذیت کے مختلف ذرائع سے گھر میں بالعموم زیر زمین دفن دولت کا پتہ پوچھتے ہیں، اس عمل داری کے قیام میں کم و بیش دو گھنٹے لگتے ہیں، اور ڈاکو لوٹ مار کر کے فرار ہوتے ہیں، اذیت اور دریافت حال میں مہاجن چمٹوں اور گرم سلاخوں سے گزرا تھا، تب کہیں جا کر ڈاکوؤں کو مطلب و مال برآری ہوئی تھی اور مہاجن کو ان چرکوں اور لپٹوں کے زخموں اور آبلوں کی سوزش کا مطلق احساس نہ تھا۔

تشریح البدن کے ماہرین کی دریافت کے متعلق دماغ اعصاب کا منبع و مخرج ہے، اور اعصاب ذریعۂ خبر و موجب حس ہے، لیکن اس گھڑی معاملہ دل کا تھا اور دماغ ان آبلوں چرکوں سے بے نیاز اور صرف دل ضیاعِ زر کے غم میں مبتلا تھا اور ہم نے اس کی اپنائیت والے انداز میں فریاد و آہ و بکا کو تو ان سوزشوں اور چرکوں پر محمول کیا جو ڈاکوؤں نے زیر زمین دفن دولت کا پتہ ذرائع واقفیت پوچھنے میں استعمال کئے تھے آگ کی لپٹوں پر بٹھایا تھا۔ چمٹوں اور سلاخوں سے داغا تھا تب انکشاف ہوا تھا۔ لیکن مہاجن گڑھے پر بیٹھا اپنی بارہ گرہ زیر زمین دفن اشرفیوں کے نقصان پر یہیں دیکھ کر فریاد کے انداز میں ڈیک مار کر رو رہا ہے گئے! لے گئے! لے گئے! جو یکایک ہماری سمجھ میں بھی نہ آیا اور گلاب سنگھ ہی اطمینان اور خوشی کے فہو المراد ہونکاروں کے ذریعہ سمجھاتا گیا، اور میں سمجھ گیا کہ یہ اس کے رات کے منصوبہ کا آخری عمل اور مشق ہے جو پوری ہوئی اور مہاجن رینگتا لڑھکتا ہوا، دوسرے ایسے ہی گڑھے پر پہنچا، اور وہاں پہنچ کر رات کی کھدی ہوئی مٹی پر دوسرا واویلا مچایا، جیسے باپ کی کریا کے راکھ کے پھولوں پر رو رہا ہے 'لے گئے! لے گئے! سونے کی اینٹیں، پرکھوں کے وقتوں کی دبی ہوئی۔ ہائے ہائے ہائے!' اور مجھے پھر رات کی بات یاد آئی، 'اجی مہاجن کی اچھی طرح کندی ہونے دو، دنیا بھر لوٹ لوٹ کر گھر میں بھر لی ہے' (گالی)

ور پھر گلاب سنگھ ڈاکوؤں کو بھگانے والی ترکیب اور ہم تینوں کی تجویز سے انکار کرتے ہوئے نظر آیا۔
ور اتنے میں مہاجن پھر لڑھکا اور ایک صحنچی میں جا پہنچا، بڑی گولی والے (دام شاہی) ہزار روپیا!
ہزار روپیا! ہزار روپیا! لے گئے! لے گئے! ہائے ہائے سب لے گئے! اور اتنے میں دوسری
جانب سے ایک بھرائی ہوئی نسوانی آواز سنائی پڑی، مہاجنی بین کر اٹھی، اس کے کپڑے تار تار جھریلا
چہرہ پرنیل اور جگہ جگہ اسی قبیل کے جلانے چیکنے اور مارنے کے نشان اور گھسیٹنے کی رگڑ میں، اس
نے فریاد کے انداز میں اپنے کرچے کی رقوم کے حوالے دیتے ہوئے مار کے ساتھ زیر زمین لوٹ کے کھدے
ہوئے نشان دکھا کر فریاد کی، اور سینہ کوبی کرنے لگی، اور مہاجن جورو کو مغلضات گالیاں دینے لگا۔
پتہ نہیں کرچا کرنے پر یا دبا ہوا مال بتانے پر۔ تاہم گلاب سنگھ کا موڈ بدستور رہا بڑبڑایا، ری نیک
بخت تو نے کون سے ہل جوت کر، اور گیہوں بیچ کر جمع کئے تھے، چوری میں موری، تیرے خصم نے
دنیا بھر کو لوٹ کر گھر بھرا اور تو نے (گالی) اس کو چھل فریب دے کر کرچا کیا! لیکن فریاد تو بہرحال
فریاد ہے اور مقتدر ہستیوں کو کیسے ہی نہ کیسے سننا پڑتی ہے، اور اظہار ہمدردی خواہ نوک زبان ہی
سے کیوں نہ ہو کرنا ہی ہوتا ہے، لیکن گلاب سنگھ باوجود شکاری اور اسپورٹس مین ہونے کے زیر
لب گالیوں ملاحیوں کو نہ روک سکا، اور موڈ بدستور رہا، اور اس پہ مجھے اک ذرا جذبہ نفرت سا
ہوا اور چھوٹے بھائی کو شاید بڑے بھائی کے اس رویہ ورد عمل پر انفعال سا ہوا، جیسے یہ سب
انہیں قبلہ کا کیا دھرا ہے، جنہوں نے میری اٹھی بندوق پکڑلی تھی، ورنہ ڈکیتی ہی نہ ہو پاتی، اور نہ
یہ سب ہو پاتا، جو ہم اس گھڑی دیکھ رہے ہیں۔

مہاجن کے گھر میں بقیہ افراد اس کے دو جواں سال بیٹے ایک نوخیز بیٹی اور دو نوجوان
بہوئیں تھیں، اور جب ہم لق ودق حویلی کے اس حصّہ میں پہنچے جہاں نیم کا چھتنار درخت صحن میں
کھڑا تھا تو عجب ہی منظر پایا، نیم کی موٹی شاخوں میں دو لاشیں سی بندھی لٹکتی دیکھیں تو یک نظر
میں تو سمجھ ہی نہ سکے کہ کیا ہے، لیکن فوراً ہی پہچان لیے، موٹی موٹی رسّی سے دونوں بیٹے لٹے
ٹنگے ہوئے ہیں اور زندہ تو ہیں تاہم ناک سے خون رس رہا ہے، ہم نے مہاجن نگری کے آسامیوں
سے اتارنے کے لیے حکم دیا، اور کئی آدمیوں نے چڑھ کر رسان رسان اتارا، مارنے پیٹنے گھسیٹنے
کے بعد لٹکائے گئے تھے، اور سامنے ہی عورتیں خراب کی گئی تھیں، بیہوش تھے، نیم کے نیچے چارپائیوں

پر ڈال دیئے، اور اب تینوں عورتوں کو تلاش کیا تو ذرا اندر صحنچی میں بیہوش پڑی پائیں، اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ مہاجن کی نوجوان بہوئیں، اور نوخیز بیٹی تینوں عورتیں چالیس کے چالیس ڈاکوؤں کی بے تکی اور بے اندازہ ہوس کا نشانہ بنی ہیں، اور یوں چور چور اور بے حال ہیں، مجھے تو ملال اور عبرت ہوئی لیکن یہاں سے گلاب سنگھ کے موڈ نے الٹا موڑ لیا؛ ہائے ہائے، یہ کنیائیں، ناریاں ہائے ہائے کیسی ہوئی، تم نے تو پہلے دھماکے پر کہا تھا، ان کی عصمت بچ جاتی اگر میں بدبخت تمہیں ڈاکوؤں کو بھگانے سے نہ روکتا۔ ہائے ہائے یہ میں نے کیا کیا! یہ معصوم داسیاں شکار ہوئیں، ارے ہم تو ہرنی پر بندوق نہیں اٹھاتے ہیں، اور یہ عورتیں ڈاکوؤں کی ہوس کا نشانہ بنیں۔ اب اپنے کیئے کی پاداش میں میں خود ــــ خودکشی کروں تو بھی یہ کلاپ پورا نہ ہوگا۔ ہائے ہائے! میں نے یہ کیا کیا! اور جوں جوں سال راجپوت پر آثار شدید ہوتے گئے اور اب ہم باہر آگئے اور چل پڑے۔ دن چڑھ گیا تھا، گھوڑیوں پر سوار ہو کر چلے تھے تو ہاتھ میں کوڑے تھے اور بندوقیں چوپال کی ہتھیاروں والی کوٹھڑی میں تھیں اور معاً میرے دماغ میں بجلی سی کوندگئی۔ آثار کی شدت اور جذبات کے چڑھاؤ کا اندازہ کر کے مجھے چھٹی حس نے آواز دی "یہ چوپال میں پہنچتے ہی اپنے بندوق نہ مار لے۔ بیڑھب ہو رہا ہے، لیکن خیریت سے اس کوٹھڑی کی کنجی اتراج کی انٹی میں تھی، وہ اپنی گھوڑی شاہ گام چلاتا ہوا ہم سے ذرا علیحدہ کو ہو گیا۔ میں نے اپنی گھوڑی کی کنوتی ملاتے ہوئے اتراج سنگھ سے زیرلب کہا "دیکھ رہے ہو دداکو بہت ملول ہو رہے ہیں، اور بے حد منفعل۔ بندوقوں کی کنجی مجھے دے دو، ورنہ کچھ کر بیٹھیں ٹھیک نہیں ہے" اور وہ چھوٹے بھائی کی حیثیت سے مجھ سے زیادہ ان کا مزاج آشنا موڈ شناسا تھا اور خود شاید ایسے ہی اندیشہ میں مبتلا تھا۔ گھبرا کر کنجی میرے حوالے کر دی، چوپال پر پہنچتے ہی خونبار آنکھوں سے گلاب سنگھ نے چھوٹے بھائی سے کنجی مانگی، اور چھاتی پھاڑ کر آواز نکالی، ہائے ہائے معصوم کنیا اور باعصمت عورتوں کا یہ انجام، اور میرے قصور میں، ہائے اب مر وں گا۔ اتراج سنگھ رونے لگا۔ اور میں ڈپٹ کیا بکتے ہو جی! تو جذبات میں بھاری بھاری ولایتی تالے پر کھینچ کھینچ کر زور کرنے لگا۔ "کیوں پاگل ہوئے ہو" ہوں نہ تالا ٹوٹے گا نہ تم کو مرنے ملے گا، بیکار بکواس، لونڈے چھوکرے بنے ہو" ہوش میں آؤ، تو بڑے زور سے پچھاڑ کھائی۔ خودکشی کی حد تک پہنچے ہوئے جذبات نے مجبور ہو کر دوسرا راستہ اختیار کیا، بڑے زور سے کوٹھری کے کواڑوں پر سر پٹکا اور نوجوان اتراج سنگھ نے

نے جواں سال برادر معظم کو میرے اشارہ پر قابو کرکے روک لیا۔ اور میں نے ڈپٹ کر ہاتھ پکڑے تو جانا سا چڑھ رہا تھا اور جوش و خروش کا ردعمل تھا۔

اور مجھے گھر پہنچے تیسرا دن تھا اور منتظر تھا کہ اتراج سنگھ پہنچا۔ گلاب سنگھ کا۔ ایک سادہ دستخطی کاغذ اور اس کی بندوق مع لیسنس میرے حوالہ کی اور ساتھ ہی ایک رقعہ "بھائی میں اب کبھی بندوق نہ چھوؤں گا، تم میرا لیسنس کینسل کرنے کی درخواست کلکٹر صاحب کے روبرو گذار دو اور بندوق داخل مال خانہ کردو۔" اور میں شوقین اسپورٹس مین کے خودسزکے اس پہلو کو سمجھ گیا، میں نے بندوق لیسنس اور درخواست کا دستخطی کاغذ رکھ لیا اور دو روز قیام کے بعد اتراج سنگھ چلا گیا اور جاڑوں کے سیزن بھر عمر میں پہلی مرتبہ ہمارا شکار بند رہا۔ ہرنوں کے شکار کے دو تین موقعے اور موسم یوں ہی نکل گئے اور تین مہینہ بعد اتراج سنگھ ہی پھر آیا، اور گلاب سنگھ کا رقعہ لایا۔ "بھائی اس لڑکے نے بھی میرے ساتھ شکار چھوڑ دیا اب تم آؤ ذرا اس کو سمجھاؤ اور کھیلو، میں تو کھیلنے نہ جاؤں شاید۔ اُس رات مہاجن نگری کی جوہر پر میں نے اس کی بندوق پکڑلی تھی اور تمہاری تجویز پر عمل نہ ہونے دیا تھا ورنہ تین عصمتیں برباد نہ ہوتیں، اور اس سزا میں میں نے تو عمر بھر بندوق نہ اٹھانے کا بردان دیا ہے۔

محمد احسن فاروقی

راکھ میں چنگاری

میں برتھ کی کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر آرام سے پیر ٹیک کر بیٹھ گیا تھا اور سگار سلگا کر پینے لگا تھا کہ اور مسافر آنا شروع ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک جوان مرد اور اس کے ساتھ دو عورتیں ایک جوان گود میں بچہ لئے اور دوسری ادھیڑ آکر میرے سامنے والی برتھ پر اس طرح بیٹھے کہ بالکل میرے سامنے کھڑکی کے پاس مرد تھا۔ اس کے پاس جوان عورت نے بچے کو لٹا دیا جو سو رہا تھا اور خود پاس بیٹھ گئی تھی۔ ادھیڑ عورت برتھ کے کنارے کی سیٹ پر سنبھل کر بڑے وقار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ نہ معلوم کیوں میں اس عورت کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ جیسے کبھی پہلے کہیں دیکھا تھا اور یاد کرنے لگا کہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔

اتنے میں دو اور مسافر آئے اور میری برتھ پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کو دیکھا۔ سگار کی طرف دھیان دیا۔ کھڑکی کے باہر دیکھا۔ میری نگاہ ایک مال گاڑی پر پڑی جو آہستہ آہستہ آرہی تھی۔ نگاہ پلٹ کر پھر اس عورت پر آئی۔ اس کا چہرہ کافی ڈھلا ہوا تھا۔ گالوں کی کھال ڈھیلی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے۔ مگر پھر بھی اس میں ایک دلکشی تھی جو یہ یاد دلاتی تھی کہ ایسے ہی ایک چہرہ کو کبھی میں نے پسند کیا تھا بلکہ اس کے لئے بیقرار رہا تھا۔

ریل چھوٹ گئی۔ شہر کے تمام آثار نکل گئے۔ اب کھڑکی سے میں دور تک پھیلے ہوئے کھلے میدان کو دیکھ رہا تھا جو بالکل بنجر تھا اور جس پر ادھر اُدھر ایک آدھ پہاڑی کھڑی نظر آرہی تھی۔ اس خشک منظر پر میرے سامنے وطن کی ہریالی لہلہاتے کھیت بڑے بڑے گھنے درختوں کی قطار حلقہ بنائے ہوئے آجایا کرتی تھی۔ آج بھی وہ سب یاد آیا مگر بار بار نگاہ اس عورت پر آتی اور اس کا سر سے پاؤں تک

جائزہ لیتی۔ اس کا پیٹ اور کولے کافی پھیلے ہوئے تھے اور میرا دل ہمیشہ نازک نازک ڈبلے ڈبلے جسموں
پر لگا تھا۔ کھڑکی کے باہر نظر کئے کئے مجھے وہ سب یاد آتی گئیں جن پر میں نے جوانی میں خاص دھیان
دیا تھا۔ پہلی نور اتھی جس کو بچپن ہی سے دیکھتا رہا تھا اور جوانی پر آکر ایسی دل کش ہو گئی تھی کہ
اس کے سوا کسی کو دیکھتا ہی نہ تھا مگر وہ میری نہ ہو سکی تھی اور شادی ہونے کے سال بھر بعد
بچہ ہونے میں مر گئی تھی۔ وہ میرے لئے حسن کا ماڈل رہی اور پھر جس کی طرف بھی دھیان گیا وہ کچھ
نہ کچھ تو ضرور اسی کی سی ہوتی۔ پانچ کی صورتیں تصور میں کھنچیں اور مجھے غالبؔ کا شعر یاد آیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

عرصے سے ان کے بابت سوچنا بھی ترک ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ سب اپنی اپنی مخصوص ادا کے ساتھ نورا
کی صورت کا بنیادی ڈھانچہ لئے ہوئے آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ میں نے پھر اس عورت کی طرف
دیکھا۔ اس میں اور ان میں کسی طرح کی مشابہت نہ تھی۔

ایک طرف میں نے طے کیا کہ اس کو دیکھوں ہی نہیں مگر دوسری طرف کوئی قوت مجھے مجبور کرتی
رہی کہ اسے ضرور دیکھوں اور یہ معلوم کروں کہ وہ ہے کون۔ اسی گو مگو کے عالم میں میں نے یہ بھی محسوس
کیا کہ وہ بھی کچھ کچھ دیر کے بعد میرا جائزہ لینے لگی تھی۔ میری صورت بھی جوانی کے زمانہ سے بہت بدل گئی
تھی۔ میں بہت زیادہ دبلا ہو چکا تھا گالوں میں گڈھے پڑ گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے جھریاں تھیں
ماتھے پر نشان نمایاں ہو چکے تھے اور سر کے بال کافی حد تک سفید تھے۔ جوانی کے دوست اگر کہیں مل
جاتے تو دیر ہی میں پہچان پاتے۔ اس لئے اسے بھی مجھے پہچاننے میں مشکل پڑ رہی تھی۔ مگر وہ نسائی طریقہ
پر اپنی میری طرف توجہ نمایاں ہونے سے روک روک کر مجھے پہچاننے کی کوشش ضرور کر رہی تھی۔

میں نے چاہا کہ اس کی آنکھوں سے آنکھیں لڑاؤں اور ممکن ہے کہ ہم دونوں کو کچھ یاد آجائے
مگر اس نے آنکھیں پھیر پھیر لیں اور کئی دفعہ تو رخ بھی بدل لیا۔ میں سوچنے لگا کہ جوانی میں اس کا رنگ
کھلتا ہوا ہو گا اور اب بہت دھیما ہو گیا اور میں یاد کرنے لگا کہ پانچ میں سے کس کا رنگ اس کے رنگ سے
قریب بتایا جا سکتا تھا۔ پھر ناک کی شکل اور ہونٹوں کے خط پر غور کیا تو یاد آیا کہ ان پانچ کے علاوہ جو
دل میں عرصہ تک بسی رہی تھیں ایک سلیمہ بھی تھی جس سے کچھ عرصے کے لئے کچھ لگاؤ ہوا تھا مگر وہ کچھ

زیادہ اچھی نہیں لگی تھی۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد وہ تن گئی تھی پھر نہ دکھائی دی تھی اور یہی اس مقام
سے جہاں وہ رہتی تھی ایسا الگ ہوا تھا کہ اس کے عزیزوں تک سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے
دو کوارٹر یاد آئے جن میں سے ایک میں میں اکیلا رہتا تھا اور دوسرے میں منظور صاحب ان کی بیوی
اور لڑکی سلیمہ رہتی تھی۔ منظور صاحب نے میرے کھانے کا ذمہ لے لیا تھا اور سلیمہ دروازے کی آڑ سے
ہاتھ بڑھا کر مجھے کھانے کی سینی دے دیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ کوئی خاص حسن نہیں رکھتے تھے بلکہ گھر داری
کا کام کرنے کی وجہ سے کچھ بد نما ہو گئے تھے۔ میرا کبھی جی نہیں چاہا تھا کہ اس کی جھلک دیکھوں۔

ان ہاتھوں کا نقشہ میرے سامنے آیا اور میں نے اس عورت کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جو
میرے سامنے تھی۔ اس کے ہاتھ بھی ایسے معلوم ہوئے جیسے میں نے کبھی پہلے ضرور دیکھے تھے مگر وہ بھی اب
اس قدر بدل گئے تھے کہ ان کو پہچاننا مشکل تھا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ منظور صاحب مجھے ساتھ کھانا کھانے کے لئے اپنے گھر کے اندر بلا لیا
کرتے تھے۔ ان کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھی رہا کرتی تھیں اور سلیمہ برقعہ اوڑھے ہوئے ہم لوگوں کو
پانی وانی دیا کرتی تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہونے کے بعد سلیمہ اکثر مجھے سینی دینے کے بجائے یہ کہہ کر "یہیں آ کر
کھا لیجئے" گھر کے اندر چلی جاتی۔ میں کمرے میں داخل ہو کر کھانا کھانے بیٹھ جاتا تو برقعہ میں لپٹی ہوئی
آتی، پانی دیتی۔ ایک مونڈھے پر بیٹھ جاتی۔ اٹھ کر پانی دیتی اور جب میں کھانا کھا چکتا تو سینی لے کر
چلی جاتی میں اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آ جاتا۔

پھر ایک دن اس نے برقعہ کی نقاب اُلٹتے ہوئے کہا تھا "آپ سے کیا پردہ۔ آپ گھر کے ہیں"
اور میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا جو مجھے کسی طرح نہ پسند آیا تھا۔ اس چہرہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے
آئی اور میں نے اس عورت کو دیکھا جو سامنے بیٹھی ہوئی اب مجھے زیادہ غور سے دیکھ رہی تھی، اور اس
کے چہرہ سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کچھ یاد کرنے کی شدید کوشش کر رہی تھی۔

اک دم سے وہ اٹھی اپنے ساتھ کے جوان کو متوجہ کرتی ہوئی بولی "شمو میرے ساتھ آؤ۔ لوٹا
کدھر رکھا ہے۔"

جوان نے کھڑے ہو کر اوپر کی برتھ پر رکھی ہوئی ایک ٹوکری سے لوٹا نکالا اور اس کے ساتھ
ساتھ باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ اس عورت کی چال باوجود تبدیلی کے سلیمہ کی چال سے بہت کچھ

مشابہ معلوم ہوئی۔ میں نے دل میں حساب لگایا تو منظور صاحب کے ساتھ رہنے والے زمانہ کو ستائیس برس ہو گئے تھے۔ سلیمہ کو میں نے زیادہ تر برقعہ اوڑھے ہوئے آتے جاتے دیکھا تھا اور اس کی مخصوص چال کی مجھے بڑی پہچان ہو گئی تھی۔ برقعہ کے خاص طور پر ملنے سے ہی میں اسے پہچان لیا کرتا تھا۔ اب جو عورت میرے سامنے چلتی ہوئی گئی تھی وہ برقعہ نہیں اوڑھے تھی اور اور شلوار اور لمبا کرتہ پہنے تھی مگر اس کے پیروں کی حرکت اور چلنے کی رفتار میں کچھ ایسی بات ضرور تھی جس کی بنا پر میرا دل کہنے لگا "ہو نا ہو۔ یہ سلیمہ ہی ہو سکتی ہے"۔

سلیمہ کی یاد کے ساتھ ایک بڑا اہم واقعہ وابستہ تھا جو مجھے اکثر یاد آجایا کرتا تھا اور اس وقت بڑی شدت کے ساتھ حافظہ سے ابھر کر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ایک رات کو مجھے نیند نہیں آرہی تھی میرے کواٹر والے کمرے کی چٹخنی کھلی ہوئی تھی اور اندر کا دروازہ جو میں سوتے وقت بند کر دیتا تھا یوں ہی بھڑا ہوا تھا کہ اک دم سے دروازہ کھلا اور سلیمہ دندناتی گھستی چلی آئی۔ میرے پلنگ کے پاس اس طرح کھڑی ہوئی کہ اس کے پیروں کے پلنگ کی پٹی سے لڑنے کی دھمک محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی طرف رخ کر کے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ عجیب قسم کی سرخی سے تمتمایا ہوا تھا اور وہ بڑی نڈری سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی اچھی معلوم ہوتی تھی کہ میں نجمہ کو جس کے خیال میں تڑپ رہا تھا بھول گیا اور میرا جی چاہا کہ اٹھ کر اسے پکڑ لوں اور اپنے پاس لٹا لوں مگر کسی پراسرار قوت نے مجھے روک لیا تھا اور میں بے حسی کے عالم میں اسے دیکھتا ہی رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میری اس بے حسی کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر اک دم سے پلٹ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی اور دروازے کے پٹ کو بڑی زور سے بند کر دیا تھا۔ اس آواز سے میں چونکا تھا اور میرے دل کا عجب عالم ہو گیا تھا۔ ایک طرف خیال آتا کہ وہ آپ سے آئی تھی اسے پکڑ لینا چاہئے تھا دوسری طرف خیال ہوتا کہ اگر پکڑ لیتا تو پھر زندگی بھر کے لئے پھنس جاتا اور پھر نجمہ کیا کہتی۔ میری بے وفائی پر کتنا روتی اور نہ معلوم کیا کیا کرتی۔ میں اٹھ کر دروازے پر آیا تھا اور اس کو کھول کر انگنائی میں نکل گیا تھا۔ سلیمہ کدھر سے آئی تھی؟ ضرور دیوار پھاند کر آئی تھی۔ اسے مجھ سے اس قدر شدید محبت ہو گئی تھی کہ وہ یہ سب کر گزری تھی۔

اس سارے واقعے کی تصویر اور اس سے وابستہ تمام خیالات میرے ذہن میں گزر رہے

کہ وہ عورت باتھ روم سے واپس آئی۔ اب میں نے اسے اور اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میرے دل نے کہا "یہ سکینہ ہی ہے ستائیس برس میں اس قدر بدل گئی۔"

وہ اکیلی ہی واپس آئی تھی اور اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے وہ آگے بڑھتی چلی آئی اور بالکل میرے سامنے کھڑکی کی طرف رخ کرکے بیٹھ گئی، پھر مڑ کر اس نے اپنے ساتھ کی جوان عورت سے کہا "میری ڈبیہ اور بٹوا کہاں ہے۔"

جوان عورت نے اٹھ کر اوپر کی برتھ پر رکھی ہوئی ٹوکری میں سے ڈبیہ اور بٹوا اسے نکال کر دیا۔ وہ پالتھی مارے بیٹھی ہوئی کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی اور ڈبیہ سے پان نکال کر اور بٹوے سے اس میں ڈلی اور تمباکو ڈال کر منہ میں رکھنے لگی۔ اس وقت میری اور اس کی آنکھیں چار ہوگئیں اور ایسی مسکراہٹ اس کے سارے چہرہ پر پھیلی کہ مجھے یقین ہوا کہ وہ مجھے پہچان گئی۔

میری ہمت ہوئی کہ میں بات کروں مگر اتنے میں وہ جوان آگیا اور اسے اپنی جگہ بیٹھا دیکھ کر بولا "اماں آپ ادھر بیٹھ گئیں۔ اچھا میں ادھر ہی بیٹھ جاؤں گا۔" اور بیٹھتے ہی بولا "اچھا آپ پان کھا رہی ہیں۔ ایک مجھے بھی دیجئے۔"

عورت نے ڈبیہ اور بٹوہ کھول کر پان بنایا اور جوان اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ پان منہ میں رکھ کر اس نے میری طرف رخ کیا اور اک دم سے میں نے اس سے پوچھا "میاں صاحبزادے آپ کون ہیں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے آپ لوگوں کو کبھی کہیں دیکھا تھا۔"

جوان کچھ چکرا گیا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عورت بول اٹھی "تم اس لڑکے کو کیا پہچان رہے ہوگے۔ اسے تم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہاں میں تمہیں پہچان گئی حالانکہ تم اب تک چکرا رہے ہو کہ میں کون ہوں۔"

جوان اب ہمارے درمیان سے ہٹ کر بیٹھ گیا اور میں اور وہ عورت آمنے سامنے ہوگئے۔ میں نے اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لئے کہا "میں نے تم کو پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا حالانکہ ستائیس برس میں تم بہت زیادہ بدل گئی ہو۔"

"باتیں بنا رہے ہو یا سچ مچ مجھے پہچان گئے ہو۔ بتاؤ میں کون ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"تم سکینہ ہو۔ منظور صاحب کی لڑکی۔ ہم تم پاس پاس کے کواٹروں میں رہتے

تھے۔"

"ہاں پہچان گئے" اس نے اس قدر خوش ہو کر کہا کہ اس کے چہرہ سے سارا ادھیڑپن غائب ہو گیا اور وہ مجھے بالکل ویسی معلوم ہوئی جیسی اس رات تھی جب وہ میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔

"میرے وہاں سے چلے آنے کے بعد ہم لوگوں کو ایک دوسرے کی کوئی بات معلوم ہی نہیں ہوئی۔ منظور صاحب کا کیا حال ہے۔"

"ان کا تو وہیں ہندوستان میں انتقال ہو گیا تھا۔ میری شادی کے کوئی پانچ برس بعد۔ یہ میرا سب سے بڑا لڑکا شمیم اس وقت چار برس کا تھا۔" اس نے شمیم کی طرف رخ کر کے کہا۔ "بیٹے شمیم۔ آپ کو سلام کرو۔ آپ معین صاحب ہیں۔ آپ ہمارے ابا جان مرحوم کے ساتھ کام کرتے تھے ہمارا اور ان کا کوارٹر ملا ہوا تھا۔ کھانا ہمارے یہاں کھاتے تھے۔"

شمیم نے مجھے سلام کیا۔ میں نے دعا دی۔ سلیمہ کہنے لگی "یہ میری بہو ہے۔ دو برس شادی کو ہوئے۔ یہ ایک بچی ہے ایک برس کی۔ میری تین لڑکے اور دو لڑکیاں اور ہیں۔ لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں لڑکے ابھی پڑھ رہے ہیں۔"

"تمہاری شادی کب اور کہاں ہوئی تھی مجھے پتہ ہی نہ چلا تھا۔"

"تم کو کیا معلوم ہوتا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ نجمہ کے ساتھ تمہاری شادی نہیں ہو سکی۔ پھر کہیں اور ہو گئی تھی۔ تمہارے جانے کے دو برس بعد والد نے میری شادی اس لڑکے کے باپ سے کر دی تھی جو اس کوارٹر میں آ کر رہے تھے جس میں تم رہتے تھے۔"

"تمہارے شوہر کون ہیں کہاں ہیں؟"

"اب انہیں مرے ہوئے چار برس ہو گئے۔ اس لڑکے کی شادی بھی نہیں دیکھی ہاں بڑی لڑکی کی جو اس کے بعد کی ہے شادی کر دی تھی اور چھوٹی لڑکی کی بھی جو بڑی کی پیٹھ پر کی ہے۔ دونوں اپنے اپنے اپنے گھروں میں سکھ چین سے ہیں۔ اب رہے لڑکے تو وہ ایک اسی سال پڑھائی ختم کر دے گا۔ دوسرے کو بھی دو برس لگیں گے سب سے چھوٹے کو کوئی چار چار پانچ پانچ سال لگ جائیں گے۔"

"سب اسی بڑے لڑکے شمیم ہی کے ساتھ رہتے ہیں؟"

"اور کہاں رہیں گے۔ باپ نے کراچی میں ایک مکان بنوایا تھا۔ اس کا چار سو روپیہ مہینہ
رایہ میرے ہاتھ میں آتا ہے۔ شبنم کی چھ سو تنخواہ ہے۔ اچھا خاصہ بنگلہ اپنے کو ملا ہوا ہے۔ شہر سے
چھ سات میل دور ہے۔ ہم اس میں رہ بیٹھے ہیں۔ لڑکے بس سے شہر پڑھنے جاتے ہیں۔ یہ بہو وہیں
کالونی میں ایک اسکول ہے اس میں پڑھاتی ہے میں اکیلی سب گھر دیکھتی ہوں۔ اب اس بچے کو بھی
بہلاتی رہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈبیہ کھولی پان نکالا بٹوہ کھول کر اس میں ڈلی ڈالی اور مجھ سے پوچھا "تم
تماکو کھاتے ہو؟"

"میں نے پان ہی کھانا چھوڑ دیا۔ بس سگار پیتا ہوں۔ مگر لاؤ اب تم نے بنایا ہے تو
کھا لوں گا۔"

"ارے ہاں۔ میں تمہارا حال تو پوچھنا بھول ہی گئی۔ تمہارے بھی بال بچے ہیں کہاں
ہیں؟"

"میرے تین بچے ہیں۔ دو لڑکے ایک لاہور میں ایک اسلام آباد میں دونوں سرکاری ملازم
ہیں۔ بیاہے ہوئے ہیں بچے ہیں مزے میں رہتے ہیں۔ ایک لڑکی ہے اس کا شوہر کراچی میں بینک
کا برانچ منیجر ہے۔ موٹر رکھتا ہے اپنا گھر بنوا لیا ہے۔ میں یہاں سرکاری ملازم ہوں حیدر آباد میں ون یونٹ
کالونی میں اکیلا رہتا ہوں۔ اب انچاس برس کا ہو گیا۔ چھ برس اور ملازمت ہے۔ پھر پنشن مل جائیگی۔
کراچی میں ایک مکان ہے۔ ایک منزل بنی ہے وہ تین سو مہینہ کرایہ پر اٹھی ہے۔ دوسری منزل رفتہ
رفتہ بنوا رہا ہوں۔ ہر ہفتہ کو کراچی آ جاتا ہوں۔ مکان کا کام دیکھتا ہوں۔ اتوار کی شام واپس
ہو جاتا ہوں۔"

"اور تم نے بیوی کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔"

"وہ چھ برس ہوئے مر چکی۔ ادھر سے فراغت ہے۔"

"حیدر آباد میں گھر کون دیکھتا ہے۔"

"کسی کی ضرورت نہیں۔ چائے وغیرہ خود بنا لیتا ہوں۔ دفتر سے نکل کر کسی ہوٹل میں کھانا
کھا لیتا ہوں۔ بس ایک وقت پیٹ بھر کر۔"

یہ سن کر وہ مجھے بڑی افسردگی کے ساتھ دیکھنے لگی۔ پھر اپنے لڑکے سے پوچھا "کیوں شمو جہاں یہ رہتے ہیں وہاں سے ہماری کالونی کتنی دور ہوگی؟"

"ہم ذیل پاک کالونی میں رہتے ہیں" لڑکے نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"وہ میرے یہاں سے آٹھ میل دور ہوگی" میں نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرہ پر کچھ ایسا اثر آیا جس سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر ترس کھا رہی تھی مگر کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ کیا اس کے دل میں میری محبت تھی؟ ع

کہ عشق از خانۂ عصمت برون آرد زلیخا را

ستائیس برس پیشتر اس کا رات کے وقت دیوار کود کر میرے پاس آجانا عشق کی حرکت تھی۔ میں نے اس کی قدر نہ کی۔ تجھ کو وہم میں رہا۔ وہم بالکل وہم۔ تجھ سے کوئی بات کوئی ملاقات کوئی وعدہ وعید تک نہ ہوا تھا۔ اس کے گھر والوں نے مجھے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اور پھر میرے والدین نے زبردستی میرے اوپر ایک بیوی عائد کردی۔ مجھے اپنی مری ہوئی بیوی یاد آئی جو کسی طرح میرے معیار حسن پر نہیں اترتی تھی۔ وہ گدبدی تھی اور موٹی بھی ہوگئی تھی۔ میں نے سلیمہ کو دیکھا۔ دل نے کہا "ہاں وہ بھی اسی طرح موٹی اور ڈھلی ہوئی ہوگئی تھی"۔ اور اب سلیمہ کا موٹاپا اور ڈھلاپن اچھا معلوم ہوتا گیا۔ دل میں اس کے لئے ایک پراسرار محبت جاگنے لگی۔

باتیں ہوتی گئیں۔ وقت گزرتا گیا۔ کوٹری کے اسٹیشن پر سلیمہ نے اپنا ناشتہ دان اتروایا۔ اور سب سے پہلے مجھے پوریاں کباب اور آلو دئے وہ سب بھی کھاتے پیتے رہے۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر اپنا سگار نکالا اور کہنے لگا۔ "سلیمہ یہ کھانا تمہارے ہاتھ کا پکایا ہوا ہے۔ آج ستائیس برس کے بعد تمہارے ہاتھ کا کھانا کھایا۔ محسوس ہوتا ہے کہ میں ستائیس برس پہلے پہونچ گیا"۔

میں سگار پیتا گیا۔ اس کی راکھ بڑھتی گئی۔ میں آدھا سگار پی چکا تھا جب گاڑی چھوٹی۔ سلیمہ اور اس کا لڑکا اور بہو اپنا سامان ٹھیک کرنے لگے۔ بچہ جو اب دیر کا اٹھ چکا تھا سلیمہ کی گود میں تھا اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے لینا چاہا تو سگار کی راکھ میرے کوٹ پر گری میں اسے جھاڑنے لگا تو وہ ٹوٹ گئی اور اس کے اندر سے ایک مہین سی چنگاری نکل کر ہوا میں غائب ہوگئی۔

حیدرآباد آنے لگا تو سلیمہ نے اپنے لڑکے سے کہا "انہیں اپنے گھر کا نمبر اور پتہ دیدو" اور

مجھ سے کہنے لگی "تم میرے گھر ضرور آنا"

حیدر آباد میں اسٹیشن کے باہر آکر جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے پھر کہا،

"دیکھو آنا ضرور میرے گھر۔ ضرور آنا"

ساڑھے دس بجے تھے جب میں نے اپنے گھر کا تالا کھولا۔ اندر داخل ہو کر میں نے حسبِ معمول اسٹوو کا سوئچ آن کیا اور اس پر کیتلی میں پانی رکھ دیا۔ کپڑے اتار کر آرام سے بستر میں بیٹھا۔ پھر اٹھ کر چائے بنائی۔ ڈبہ کا دودھ ایسے ہی وقت کام آتا تھا۔ اس کو چائے میں ڈال کر چائے پیتا رہا۔ پھر بستر میں لیٹ گیا، بجلی بجھا دی اور سگار جلا کر پینے لگا۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور خیالات کا عجیب ہیجان مجھے بیقرار کرنے لگا۔ سلیمہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے تھا اور زیادہ سے زیادہ حسین ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں ستائیس برس پیچھے پہونچ گیا۔ اور اب محسوس کر رہا تھا کہ سچ مچ مجھ میں ستائیس برس پہلے کی زندگی واپس آگئی تھی۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب سلیمہ میرے کوارٹر میں آکر میرے پلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا اس وقت کا چہرہ آنکھوں میں پھرا اور میں اس کا مقابلہ اس کے اس وقت کے چہرہ سے کرنے لگا۔ دونوں قریب آتے گئے اور یہ معلوم ہوا کہ دونوں ایک ہو گئے۔ مجھے یہ چہرہ نجمہ کی شادی ہو جانے پر بھی کافی دیر یاد آتا رہا تھا۔ اور جب وہ یاد آتا تو میں دل میں کہتا "ہائے میں نے اس کی محبت کی قدر نہ کی" مگر اپنی پسند کے اور چہرے دیکھے اور اسے بھول گیا۔ شادی ہو جانے پر بھی کوئی نہ کوئی نازک لڑکی دھیان میں رہی۔ بیوی سے چھپ چھپ کر اس سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ مجھے ایک خاص طرح ہی کی عورتیں پسند تھیں۔ اس طرح کی نہ بیوی تھی اور نہ سلیمہ۔ خیر بیوی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ بھی پسند کی چیز ہوتی گئی۔ طویل مدت تک لگاؤ نے اس میں بھی دلکشی پیدا کر دی۔ مگر سلیمہ کا چہرہ کبھی خاص طریقہ پر یاد نہیں آیا۔ وہ بالکل ذہن سے اتر گئی تھی۔ اسے بالکل ہی بھول گیا تھا۔ کبھی بھولے سے بھی شاید ہی یاد آئی ہو۔ کبھی اپنی محبوباؤں کا شمار کرتا تو اس کا خیال ہی نہ کرتا۔

مگر آج یہ کیا ہو گیا تھا۔ وہ کیوں دل میں سمائی جا رہی تھی۔ یقیناً اسے مجھ سے محبت تھی جس کا اس نے اپنی حد سے زیادہ بے باکی سے ایک رات اظہار کر دیا تھا۔ میں سنا کرتا تھا کہ عورت ایک ہی دفعہ اور ایک ہی سے محبت کرتی ہے اور آج مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ ستائیس برس کے عرصے نے زندگی میں

ہر قسم کی تبدیلی نے گھریلو زندگی اور بال بچوں میں ہر طرح دل بہل جانے نے سلیمہ کی محبت کو اب تک ختم نہیں کیا تھا۔ باتیں کرنے میں اس کا چہرہ کیسا روشن ہو گیا تھا۔ کیسا چمکتا رہا تھا۔ کس پیار سے اس نے مجھے کھانا دیا تھا اور آخر میں کس زور کے ساتھ بار بار کہتی رہی تھی "میرے گھر ضرور آنا"

یوں ہی سوچتے سوچتے مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اس پر عاشق ہو گیا۔ دس برس سے زیادہ عرصہ ہوئے ہوں گے جب سے میری عورتوں کی طرف توجہ ختم ہو چکی تھی۔ اپنے پسند والے پیشے کی عورتوں میں بھی کچھ نہ دکھائی دیتا۔ اکثر ایسیوں کو دیکھ کر ہنس دیتا اور دل میں کہتا "کیا حماقت تھی کہ میں ان پر مرنے لگا کرتا تھا۔ ان میں کچھ بھی تو نہیں ہے"۔ ہر روز مجھے اپنا شباب دور سے دور ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور میں یہ مصرع دوہرانے کا عادی ہو گیا تھا "گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا"۔ مگر آج تین گھنٹے سلیمہ کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کے بعد سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا سن ستائیس برس کم ہو گیا۔ یہ کیا تھا؟ جوانی واپس آگئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے سلیمہ کی صورت صاف صاف کھنچی ہوئی تھی۔ کوئی صورت کبھی اتنی صاف نہیں کھنچی تھی اور دل بیقرار ہو کر یہ چاہتا تھا کہ ابھی دوڑ کر اس کے پاس جاؤں اور کہوں "میں تجھ سے محبت کرتا ہوں جیسی کبھی کسی سے نہیں کی۔ ستائیس برس پہلے میں اپنی حماقت میں پھنسا تھا۔ پھر ہمارے ماں باپ بھی تھے جو ہمیں باندھنے کا حق رکھتے تھے مگر اب میں بھی آزاد ہوں اور تم بھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ رہ کر باقی زندگی نہایت خوشی سے گزار سکتے ہیں۔

اس قسم کے خیالات آتے رہے اور آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ دولہن بنی ہوئی ہے اور میں دولہا بنا ہوا ہوں۔ پھر ہم دونوں نہایت عمدہ سجے ہوئے کمرے میں پہونچے۔ میں نے اُسے ہاتھوں پر اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا اور اس کے پاس لیٹ گیا۔ یہ خواب ہر پھر کر گڑبڑ سڑبڑ ہو ہو کر صبح تک نہ معلوم کتنی دفعہ دکھائی دیا۔ فجر کی اذان کے وقت اٹھ کر اسٹوو پر پانی رکھا اور نماز پڑھنے لگا۔ نماز پڑھنے میں اس کی صورت آنکھوں کے سامنے رہی اور چائے پیتے میں محسوس کیا کہ وہ بری طرح سر پر سوار ہو گئی۔ پھر لیٹ کر سگار پیتا رہا مگر سگار کے بجائے اس کے تصور میں محو رہا۔

جب وہ آدمی آیا جو روز دودھ مکھن ڈبل روٹی اور انڈا وغیرہ دے جاتا تھا تو میں اٹھا۔ ناشتہ تیار کرتا رہا۔ میں اس وقت سیٹ ھر کر کھا لینے کا عادی تھا۔ اس کے بعد شیو کرتا اور دفتر

روانہ ہو جاتا۔ آج شیو کرتے میں میں نے اپنے چہرہ کو غور سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ میں ابھی ایسا بڈھا تو نہیں ہوا ہوں۔ یوں بیوی کے مرنے کے بعد سے یہ سوچا کرتا تھا کہ اب چل چلاؤ ہے اور کسی طرح زندگی کے دن کاٹ دینا ہے۔ مگر اب سلیمہ کے تصور نے جو آنکھوں کے سامنے کھیل رہا تھا دل میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا کر دی۔ وہ سلیمہ جس کو میں نے ستائیس برس پہلے ٹھکرا دیا تھا اب میرے سامنے اسی محبت کے ساتھ آئی تھی اور اب میں تمام غلط فہمیوں سے بالاتر ہو جانے کی وجہ سے اس کے پیروں پر گر پڑنے کے لئے تیار تھا۔ اس جذبہ کی وجہ سے میں نے آج زیادہ اچھی طرح مُنہ ہاتھ دھوئے اور زیادہ بہتر طریقہ پر سوٹ پہن کر زیادہ خوش خوش دفتر آیا۔ ساتھ ہی ساتھ دل میں ایک خواہش بے قراری کی حد تک ابھر رہی تھی کہ اس کے پاس جاؤں اور اس سے باتیں کرتا رہوں۔ میرے رویہ میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی تھی کہ لوگ مجھے روز سے کچھ بھی مختلف پاتے مگر اپنے اندر میں ضرور محسوس کر رہا تھا کہ میں پھر سے زندہ ہو گیا۔ یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ حالانکہ جوانی میں میں پانچ یا چھ دفعہ اس عالم میں آ چکا تھا جسے عشق کہا جا سکتا ہے مگر اب قریب پچاس برس کے سن میں حقیقت میں عاشق ہوا تھا۔ کبھی کسی کے تصور کا نقشہ اتنا صاف صاف سامنے نہیں آیا تھا جتنا اس وقت سلیمہ کا تھا اور پھر دل میں کبھی ایسا میٹھا میٹھا درد نہیں محسوس ہوا تھا جیسا اب محسوس ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر جی چاہتا رہا کہ اس نے پتہ بھی دے دیا ہے تاکید سے بلایا ہے تو پھر کیوں اُڑ کر اس کے پاس نہ پہنچ جاؤں۔

حسب دستور قریب تین بجے کام ختم کر کے دفتر سے اٹھا اور چلتا ہوا شہر کے اسی ہوٹل میں پہنچا جہاں کھانا کھایا کرتا تھا۔ یہاں کچھ جاننے والے مل گئے ان سے باتیں بھی ہوتی رہیں کھانا پینا بھی چلتا رہا مگر بار بار میں خاموش ہو جاتا اور میرا دھیان تصور کی اس تصویر پر جم جاتا جو زیادہ سے زیادہ خوبصورت ہوتی جا رہی تھی اور میں دل میں کہنے لگتا "ضرور چلوں۔ آج ہی چلوں۔ ابھی کھانے کے بعد چلوں۔ اب کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے اس سے صاف صاف کہدوں کہ میں تجھ پر بری طرح عاشق ہو گیا ہوں اور اب جو تمہاری مرضی ہو اس پر چلنے کے لئے تیار ہوں!" پھر دل میں کچھ جھجھک آتی اور سوچتا کہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ ایک آدھ دن گزر جانے دو پھر کسی دن چلنا۔

ہوٹل سے نکلنے کے بعد عموماً میں بازار کا چکر لگاتا۔ کسی دوست کے یہاں جا کر بیٹھ جاتا اور رات میں گھر آتا۔ آج ہوٹل سے نکل کر دس قدم گیا ہوں گا کہ ایک رکشا کھڑا نظر آیا اور رکشا والے نے پوچھا۔

"کہیں چلئے گا۔"

"ذیل پاک کالونی چلو گے؟" میرے منہ سے بے تحاشہ بالکل لاشعوری طور سے نکل گیا۔

رکشا تیزی سے چلی جا رہی تھی تو میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پر اسرار تذبذب کا عالم تھا مگر کالونی میں پہونچ کر مکان تلاش کر کے جب میں اس کے گھر کے اندر داخل ہوا تو اطمینان ہو گیا تھا۔ وہ اندر کے حصے میں برآمدے میں پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ ملازم جو مجھے اندر لے گیا تھا سامنے باورچی خانہ میں چلا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل گیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلی۔ سرخی گالوں پر دوڑ گئی۔ پلنگ کے پاس ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ میں اس پہ بیٹھ گیا۔ آنکھ بھر کر اسے دیکھا۔ اس کی صورت اتنی اچھی نہیں معلوم ہوئی جتنی میرے تصور کی تصویر میں نظر آتی رہی تھی۔ میرے جذبات پہ اوس سی پڑ گئی۔ وہ نہ معلوم کیا کیا باتیں کرتی رہی اور میں نہ معلوم کیا کیا کہتا رہا۔ اس نے مجھے چائے دی، پان دیا۔ کئی بار اٹھ اٹھ کر باورچی خانہ میں گئی اور پھر آ کر اپنی جگہ پہ بیٹھی اور باتیں کرتی رہی۔ میرے دل میں جو کچھ تھا اور جو میں کہہ دینا چاہتا تھا وہ منہ پر آتے آتے رہ رہ گیا۔ شاید میری آنکھوں نے دل کی بات اسے بتا دی۔

اس نے یہ بھی پوچھا تھا کہ "دفتر سے اٹھ کر کیا کیا کرتے ہو۔ گھر میں جا کر اکیلے پڑے رہتے ہو؟"

میں نے اپنا روز کا روٹین بتا دیا تھا۔ وہ کہنے لگی "تم یہاں آ کر کھانا کیوں نہ کھایا کرو۔ میں ویسے ہی انتظام کر دوں گی جیسے پہلے زمانہ میں کرتی تھی۔" پھر مُنہ میں پان رکھ کر اور ہنس کر بولی تھی "لڑکا اور بہو دن بھر کام پر رہتے ہیں۔ میں بچہ کو دیکھتی ہوں۔ پھر وہ لوگ سہ پہر کو بچہ بھی لے کر نکل جاتے ہیں۔ میں اکیلی رہ جاتی ہوں۔ دم گھبرا تا ہے۔ اگر تم یہاں کھانا کھایا کرو گے تو شام تک تم سے باتیں رہیں گی دل بہلے گا۔"

میں نہ معلوم کیا کیا کہنے کے منصوبے باندھتا رہا تھا مگر کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ اس نے ربط اور ملاقات کا بہترین ذریعہ نکال لیا تھا۔ باتوں باتوں میں مجھے جو رقم دینا تھی وہ بھی طے ہو گئی اور میں نے پیشگی ادا کر دی۔ اس کے لڑکے شمیم نے روز بس سے آنے جانے کی بڑی سستی ترکیب بھی بتا دی۔ وہ میری زندگی میں جس حد تک داخل ہو سکتی تھی داخل ہو گئی اور میری زندگی ایک بے مزا روزانہ روٹین کے بجائے بڑے انفرادی طور پہ رنگین ہو گئی۔ اگر کچھ اور آگے بڑھنے کی خواہش ہوتی تو غالب کا یہ شعر پڑھنے لگتا ؂

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو   نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

میرے جلے ہوئے دل کی راکھ میں سے جو چنگاری اٹھی تھی اس کی عجیب کیفیت تھی۔ ظاہر ہے یہ جوانی کے عشق کا شعلہ نہیں تھی جو سب کچھ جلا دیتا ہے مگر اس میں بھی گرمی تھی جلا دینے کی قوت تھی۔ جب میں سلیمہ سے دور ہوتا تو اس کی شکل دماغ کے کسی حصّہ میں چھپی ہوئی اندر والی آنکھوں کو دکھائی دیتی رہتی اور دل کو جلاتی رہتی۔ جب سڑک پہ اکیلا چلتا تو ادھر اُدھر دیکھتا کہ کہیں وہ آتو نہیں رہی ہے۔ رات میں پلنگ پر لیٹتا تو اس سے چمٹ جانے اس کو اپنانے اس کے ساتھ رہنے کے بڑے بڑے منصوبے باندھتا۔ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بڑے بڑے خواب دیکھتا۔ سوچتا کہ کل یہ کہوں گا اور یہ کروں گا۔ مگر اس کے سامنے پہونچتے ہی نہ کچھ کہا جاتا اور نہ کیا جاتا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا اس کے جسم کے ہر ہر حصّہ پر نگاہ جماتا۔ وہ پہلی نظر میں کچھ بھونڈی معلوم ہوتی مگر دیکھتے ہی دیکھتے اچھی لگنے لگتی۔ جب میں چلنے لگتا تو وہ میرے ساتھ ساتھ دروازے تک ضرور آتی۔ دروازے میں کھڑی مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہتی۔ میں اسے مڑ مڑ کر دیکھتا۔ اس کا چہرہ زیادہ سے زیادہ دل کش ہوتا جاتا اور اس دلکشی کا شدید تاثر لئے ہوئے میں گھر آتا اور رات بھر اس پر سر دھنتا رہتا اور اس کو اپنانے کے منصوبے باندھتا رہتا۔ دن ہفتے مہینے برس یوں ہی گزرتے گئے۔

کبھی کبھی وہ میرے ساتھ بازار جاتی اور مختلف قسم کی خریداریاں کرتی رہتی۔ میں اس کا خریدا ہوا سامان لئے ہوئے ساتھ ساتھ چلتا اور اس کی ہر ادا کو دیکھتا رہتا۔ میں ہر ہفتہ کراچی آتا تھا۔ اس کو بھی مہینہ میں ایک دفعہ کراچی آنا لازمی تھا۔ وہ اتوار کی صبح کو میرے ساتھ آتی۔ دن بھر میں اس کے ساتھ رکشا میں بیٹھا شہر بھر میں گھومتا پھرتا۔ کئی دفعہ اس نے میرا بنتا ہوا گھر بھی دیکھا اور اس کو بنانے کے سلسلے میں ہدایات اس طرح کرتی رہی جیسے وہ اس کا گھر تھا۔ ہم دونوں ہر بات میں اتفاق کرتے اور ایک دوسرے کو نہایت محبت اور خوشی سے دیکھتے۔ دو سال میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں اس کے گھر بار کا ایک ایسا حصّہ تھا جو اس سے الگ بھی تھا مگر ایسی طرح جوڑا ہوا تھا کہ اسے الگ کرنا ناممکن تھا۔ ہمارے تعلقات پر کبھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا کیونکہ کبھی کسی نے ان میں کوئی اعتراض کی بات نہیں دیکھی۔ انجان لوگ ہمیں پرانے میاں بیوی سمجھتے تھے اور جاننے والے یہ جانتے تھے کہ ہم میاں بیوی کے تعلق سے بالاتر جا چکے ہیں۔ کسی کو بھی کبھی میرے دل کی راکھ میں چھپی ہوئی اس چنگاری کا احساس نہ ہوا جو مجھے بیقرار کر دیا کرتی تھی اور میں سلیمہ کے ساتھ ہر ہر طرح رہنے کے خواب دیکھنے لگتا

تھا۔ کسی کسی وقت مجھے یہ محسوس ہوتا کہ میں یونانی دیومالا کے ٹنٹالس کی طرح ہوں۔ پانی کے درمیان پیاسا کھڑا ہوں۔ پانی پینے کے لئے مُنہ جھکاتا ہوں پانی دور ہٹ جاتا ہے۔ کبھی سوچتا کہ اس چکر کو ختم کیا جائے۔ اِدھر یا اُدھر مگر بہتر یہی ہے کہ اِدھر ہو۔ مگر اس کی زندگی کے مختلف بندھن اور ان میں اس کا مقام یہ ناممکن ہی کئے ہوئے تھا کہ وہ بالکل میری ہو جائے۔ میری بے قراری کے ساتھ ساتھ ایک امید بھی دل میں اُٹھتی کہ کبھی نہ کبھی میری سب حسرتیں ضرور پوری ہو جائیں گی۔ یہ امید ہی مجھے روز اس سے لگے رہنے کی ترغیب دیتی رہتی اور گزرتے ہوئے زمانہ کا خیال نہ آنے دیتی۔

چھ برس نہ معلوم کس طرح گزر گئے۔ اس دوران میں اس کے لڑکے پڑھائی ختم کرتے اور ملازم ہو کر اپنے اپنے گھر کے ہوتے رہے۔ ان کی شادیاں بھی ہوئیں۔ ان کے ہر کام میں میں ماں کے ساتھ اور ماں کے برابر شریک ہوتا رہا۔ میرے بچوں اور اس کے بچوں میں ملاقاتیں ہوئیں ربط قائم ہوئے۔ میرا کراچی والا گھر بالکل تیار ہو گیا اور میری پنشن کا وقت بھی آ گیا۔

میری آٹھ مہینے کی چھٹی ڈیو تھی۔ وہ میں نے لے لی۔ گھر جو سرکاری طرف سے ملا ہوا تھا خالی کر دیا۔ اسباب کراچی بھجوا دیا۔ ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے کراچی روانہ ہونے والا تھا اور دس بجے سلیمہ کے پاس رخصت ہونے کے لئے پہونچ گیا تھا۔ لڑکا اور بہو اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ ان کے دو بچے تھے جو اب اسکول جانے لگے تھے اور اسکول گئے ہوئے تھے۔ سلیمہ اپنے خاص انداز میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اپنی مخصوص آرام کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ دل کی راکھ میں چھپی ہوئی چنگاری خاص طریقہ پر تلملانے لگی۔ میں نے کہا "سلیمہ۔ ہم تم الگ ہی تھے۔ ادھر چھ برس سے جڑ گئے تھے۔ اب پھر بالکل الگ ہو جائیں گے۔ تم کو روز دیکھتا۔ تم سے باتیں کرتے رہنا ہی میری زندگی تھی۔ اب یہ زندگی ختم ہو رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میرا دل بھر آیا۔

اس کے چہرہ پر بھی افسردگی آئی۔ پھر آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

اس وقت میرے دل کے اندر چھپی ہوئی چنگاری کچھ اس طرح تلملائی کہ میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور مُنہ پر ایک کے بعد ایک پیار کیا۔

"تم چاہتے کیا ہو!" وہ سنبھل کر بولی اور پھر اپنی نگاہیں ترچھی کر کے مجھے دیکھتے ہوئے میں چپ رہ گیا۔ وہ مجھے عجب کرشمہ نظر آئی۔

"میں کیا بتاؤں کیا چاہتا ہوں اب تم ہی سمجھ لو اور جو کچھ کر سکتی ہو کرو ہمیشہ پہل تمہارے ہی ہاتھ میں رہی "

وہ کھلکھلا کھلکھلا کر ہنسی اور ہنسی خوشی مجھے رخصت کیا۔ دروازے تک پہونچانے آئی۔ مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ میں اس کا ہنستا ہوا چہرہ مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا چلا آیا۔

اس کے چہرہ کا یہ آخری تاثر رستے بھر اور کراچی میں گھر پہونچ کر بھی میرے سر پہ سوار رہا۔ بیگم کے مرنے کے بعد سے میں نے گھر کے رکھ رکھاؤ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ایک کمرے میں آکر پڑ رہتا تھا جس کو اکثر قبر سے تشبیہہ دیا کرتا تھا۔ مگر اب کراچی پہونچ کر میں نے گھر کے اوپر کے حصے کو مناسب طریقہ پر فرنیچر خرید کر سجانا شروع کیا اور اس طرح ایک ہفتہ گزرا۔ سلیمہ کو دیکھنے کی خواہش جب ستاتی تو ایسے ہی کسی کام میں مصروف ہو جاتا۔ مگر کام تھا ہی کیا اور جلدی ختم ہو گیا اور سلیمہ کو دیکھنے کی ہوک دل میں بڑھنے لگی۔ دل کہتا " چلو۔ ابھی چلو۔ حیدرآباد دور کہاں ہے۔ اسے دیکھ آؤ۔ اور اس نے میرے سوال کا جواب بھی تو نہیں دیا ہے۔ صرف ہنسنے لگی تھی اور ہنسنے لگی تھی اور ہنستی رہی تھی۔" مگر کراچی ایسے شہر میں گھر سے باہر آتا۔ اِدھر اُدھر پھرتا۔ دوستوں سے ملتا اور دن ختم ہو جاتا۔ دن یوں ہی ٹلتے رہے۔ راتوں کو باندھے ہوئے عزم دن کو یوں ہی ٹوٹتے رہے۔

ایک مہینہ گزر گیا ہو گا کہ دس بجے میرے زینے کے دروازے کو کھٹ کھٹانے کی آواز آئی۔ میں لپک کر آیا اور دروازہ کھولا تو کیا دیکھا کہ سلیمہ کھڑی ہے۔

"تم۔ سلیمہ" اک دم سے تعجب کے ساتھ میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ میں۔ میری بہو کے ساتھ اس کی بیوہ ماں آکر رہنے لگی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ یہی تم چاہتے ہو۔"

کیا بتاؤں میری خوشی کا کیا عالم ہوا۔ میں نے اچھل کر اسے چمٹا لیا۔ جو تنتیس برس پہلے کرنا تھا وہ اب ہو گیا۔

ممتاز مفتی

ہمارا سامان بندھا ہوا تھا۔ اور ہم دونوں ٹیکسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ آصفہ نوکری کے منہ پر رسی باندھ رہی تھی۔ میں اخبار کی سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ میں نے منہ سے اخبار ہٹائے بغیر پوچھا۔ "کیوں آصفہ تیاری مکمل ہو گئی۔؟

"جی ہاں"۔ اس کی مدھم آواز آئی

اس کے جی ہاں کے باوجود مجھے پتہ تھا کہ وہ شہر کو چھوڑ کر گاؤں جانا نہیں چاہتی۔ شہر کی رونق چھوڑ کر کس کا جی چاہتا ہے کہ گاؤں میں رہائش کرے۔ اگرچہ آصفہ کے لئے شہر کی رونق کبھی پیش منظر میں نہ آئی تھی چونکہ طبعاً وہ اکیلی تھی۔ پھر بھی پس منظر کی رونق تو تھی اور رونق چاہے پیش منظر میں ہو یا پس منظر میں بہر حال رونق ہوتی ہے۔

پھر ہمارا گاؤں بھی تو برائے نام گاؤں تھا۔ آپ جانتے ہیں پہاڑی علاقوں میں گاؤں نہیں ہوتے۔ گھر ہوتے ہیں وڈیرے ہوتے ہیں۔ دو یہاں ہیں، دو وہاں اس ٹیلے پر اور چار نیچے کھڈ میں۔ ان بکھرے ہوئے گھروں کو گاؤں نہیں کہا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہمارا گاؤں بہت دور پاکستان کے ایک دور افتادہ کونے میں واقع ہے۔ شہروں سے دور سڑکوں سے دور۔ ہنگاموں سے دور، جہاں امن ہی امن ہے اور لوگ امن سے اس قدر بیزار ہیں کہ رونق کے لئے انہوں نے باہمی اختلافات پال رکھے ہیں۔ ٹھہرے ہوئے پانیوں کو سڑاہند سے بچانے کے لئے لہریں پیدا کرنی ہی پڑتی ہیں۔

نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد میں روز سوچا کرتا تھا کہ اب شہر میں رہنے کا مقصد

کیا ہے ۔ اس سوچ میں ڈب ڈبکیاں کھاتے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے۔ کیا کروں میں طبعاً سوچنے والا آدمی ہوں ۔ کرنے والا نہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ سوچ میں ڈب ڈبکیاں کھانے کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے ۔ ایسا کہ فیصلہ کرنے کو جی نہیں چاہتا اور خود فریبی کے تحت فیصلہ کر بھی لو تو عمل میں لانے کی توفیق نہیں ہوتی ۔

پھر یہ ہوا کہ مالک مکان نے ہمیں نوٹس دیدیا کہ یا تو مکان خالی کر دو نہیں تو اگلے مہینے سے کرایہ دگنا ادا کرنا ہوگا۔

دگنا کرایہ دینے کی توفیق نہ تھی۔ سستا گھر تلاش کرنے کی ہمت نہ تھی۔ لہٰذا گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں ایک قابلِ رہایش مکان بھی تھا ساتھ تھوڑی سی زمین بھی تھی ۔

"مجھے پتہ ہے آصفہ" میں نے کہا "تو گاؤں جانا نہیں چاہتی۔"

چپ اس کی آواز آئی ۔

مجھے علم تھا کہ وہ میری بات کا جواب نہ دے گی ۔ اس نے کبھی مجھے نہیں جی نہ کہا تھا ۔ ایسے موقعہ پر وہ چپ ہو جایا کرتی تھی ۔ چپ اس کا واحد انکار تھا۔ ہتھیار تھا لیکن اس کے منہ سے باآواز چپ سن کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی ۔ میں نے اخبار ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی۔

" وہ " اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا

" وہ کیا " میں پوچھا۔

" جیدا " وہ بولی " وہ رو رہا ہے "

واقعی باہر سے جیدا کے رونے کی آواز آرہی تھی ۔ حسبِ معمول سسکیاں بھرتے ہوئے وہ چلا رہا تھا " میں نہیں کروں گا میں نہیں کروں گا "

جیدا بہت ہی پیارا بچہ ہے ۔ ساتھ ہی بہت خودسر ضدی، اس کی عمر تین سال کی ہوگی۔ ماں باپ ایک حادثے میں فوت ہو چکے ہیں ۔ دور کے ایک رشتے دار نے ازراہ ہمدردی اسے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے ۔ یہ ہمدردی دکھاوے کی زیادہ ہے جذبے کی کم کم ۔ ان کے اپنے تین بچے جو ہیں ۔

گھر والی جیدا کو گھر کے کام پر لگانا چاہتی ہے۔ لیکن جیدا اپنی مرضی کا مالک ہے۔ بڑا ہٹ دھرم ہے۔ صاف انکار کر دیتا ہے۔ نہیں کروں گا۔ مار کھاتا ہے مگر ضد نہیں چھوڑتا۔

وہ دن میں تین چار مرتبہ ہمارے گھر آیا کرتا ہے۔ سیدھا میرے پاس آتا ہے۔ نہ سلام نہ دعا، نہ جان نہ پہچان آتے ہی حکم چلاتا ہے۔ انکل آنٹی کو بولو مجھے سویٹ دے۔ آصفہ سے سویٹ لے کر وہ واپس چلا جاتا ہے۔ آصفہ نے کئی بار کوشش کی ہے کہ اسے پاس بٹھائے اس سے باتیں کرے۔ آصفہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ چلا کر اسے ڈانٹتا ہے۔ نہیں، بلکہ آصفہ نے اس کے لئے کھلونے بھی منگوا رکھے ہیں۔ لیکن اسے کھلونوں سے کھیلنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔

میں نے جیدا کی آواز سن کر کہا۔ "آصفہ باہر کی کنڈی لگا دو کہیں جیدا اندر نہ آجائے۔"

آصفہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دو ایک دن پہلے میں نے جیدا سے کہا تھا "جیدا ہم جا رہے ہیں۔"

"کہاں؟" وہ چونکا۔

"اپنے گاؤں" آصفہ نے کہا

"نہیں" وہ بولا۔ "تم نہیں جاؤ گے۔"

"ہم تو جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" اس نے چیخ کر کہا۔ پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ دھیمی آواز میں بولا "تم چلے گئے تو میں سویٹ کس سے لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ سویٹ لئے بغیر باہر نکل گیا۔

وہ چلا گیا تو کمرے پر دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پر نم خاموشی۔

جیدا کے رونے کی آواز ختم ہوئی تو میں نے پھر سے بات چھیڑی۔ میں نے کہا آصفہ اگر گاؤں میں تیرا جی نہ لگا تو ہم قصبے میں جا کر رہائش کر لیں گے۔ نالا پل کافی بڑا قصبہ ہے وہاں سو گھر ہوں گے۔ گاؤں سے صرف دس میل دور ہے۔ بڑی سڑک ہے۔ دریا پر پل ہے۔ غلے کی منڈی ہے۔ ٹرک آتے ہیں بسیں چلتی ہیں۔ بڑی چہل پہل رہتی ہے۔

"جی ہاں" آصفہ بولی

"جی ہاں جی ہاں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ صاحبو! میرا المیہ یہ ہے کہ میں نے ایک جی ہاں سے شادی کر رکھی ہے اس بدنصیبی کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر پڑتی ہے۔ تین سال جانے ان جانے میں میں دعائیں مانگتا رہا تھا کہ یا اللہ میں اپنی بیوی کے منہ سے کبھی جی ہاں بھی سنوں۔

لوگو! کبھی بن سوچے سمجھے دعا نہ مانگنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ اسے قبولیت بخش دے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جسے پھول سمجھتے ہیں وہ کانٹا ثابت ہو۔

آصفہ میری دوسری بیوی ہے۔ پہلی شہزادی تھی وہ واقعی میں شہزادی تھی۔ اس نے کبھی کسی بات پر مجھ سے اتفاق نہ کیا تھا۔ میں اسے کہا کرتا تھا: شہزادی کبھی تو میری بات مان لیا کر۔ لیکن میری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی اس کی زندگی نے وفا نہ کی شہزادی ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی آصفہ میرا چناؤ نہیں یہ احسان مجھ پر خالہ نے کیا تھا کہنے لگی سلیم میں نے تیرے لئے ایسی بیوی تلاش کی ہے جو تیرے گھر کو جنت بنا دے گی۔ خالہ سچ کہتی تھی۔ آصفہ کے آنے کے بعد واقعی ہمارا گھر جنت بن گیا۔ لیکن گھر نہ بنا۔

دوستو۔ میں جنت میں رہتا ہوں۔ مجھے گھر نصیب نہیں ہوا۔ اور میں ان جانے میں چوری چوری دعائیں مانگتا رہتا ہوں کہ کوئی سانپ آنکلے۔

مانا کہ نیک خاتون کی سبھی عزت کرتے ہیں۔ میں بھی کرتا ہوں لیکن نیک بیوی۔۔۔۔

اب میں نے جانا ہے کہ نیک بیوی ایک ریوڑی کے مصداق ہوتی ہے جس میں کڑاکا نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں میاں کڑاکے کا متمنی کیوں ہوتا ہے خالی مٹھاس کیوں اچھی نہیں لگتی۔ آصفہ کی مٹھاس اگر شوگر کوٹنگ جیسی ہوتی تو بھی بات بن جاتی۔ لیکن اس کی نیکی تو شہد کی طرح گاڑھی ہے۔

اللہ نہ کرے آپ کو کسی نیک آدمی کے ساتھ زندگی گزارنی پڑے۔ بائبل میں اللہ تعالےٰ کہتے ہیں BEWARE OF THE PRIDE OF PIETY خبردار نیکی کے تفاخر

سے بچنا۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہوتا ہے کہ نیک لوگ جانے یا ان جانے میں اپنی نیکی کو تمغہ بنا کر چھاتی پر ٹانک لیتے ہیں اور پھر لقہ کبوتر بن جاتے ہیں۔ آصفہ لقہ کبوتری نہ بنی تھی۔ اس نے اپنی نیکی پر کبھی مان نہیں کیا تھا۔ لیکن بڑے بوڑھے یہ بھی کہتے ہیں کہ اتنے اجلے نہ ہو کہ دوسرے میلے میلے نظر آئیں۔ ممکن ہے آصفہ کو میں کبھی میلا نظر نہیں آیا۔ لیکن اس کا کیا کروں کہ آصفہ کے اجلے پن کو محسوس کر کے میں خود، خود کو میلا سمجھنے لگا تھا۔ آصفہ کے ساتھ رہ کر میں گنہگار بن گیا تھا ــ خوا مخواہ حالانکہ یقین جانئے میں گنہگار نہیں ہوں۔ اچھا نہ سہی لیکن میں برا بھی تو نہیں ہوں۔ گنہگار بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انسان کے خمیر میں خیر کا عنصر اس قدر حاوی ہے کہ اس سے جان چھڑانا بڑی مشقت کا کام ہے۔

گھر میں ہم دو ہی رہتے ہیں آصفہ اور میں۔ میں ساٹھ کے لگ بھگ ہوں وہ پچاس کی ہوگی۔ لیکن اپنی نیکی کی وجہ سے یوں لگتی ہے جیسے مجھ سے پانچ سال بڑی ہو۔

پھر یہ بھی ہے کہ جب عورت کے اندر کا نسائی شعلہ بجھ جاتے تو وہ باسی گوشت کی گھٹڑی بن کر رہ جاتی ہے۔ جب وہ جوان تھی اس وقت بھی اس کے نسائی دیے کی لو اس قدر مدھم تھی کہ اس کی چمک کبھی مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس بات نے آصفہ کو بالکل ہی بجھا دیا تھا۔

کہتے ہیں بیویاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو میاں کے لئے جیتی ہیں۔ دوسری وہ جو اولاد کے لئے جیتی ہیں۔ آصفہ دونوں طرف سے محروم تھی۔ میاں کی نہ اسے طلب تھی نہ خواہش جب بھی میں اس کی بانہہ پکڑتا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے گناہ کر رہا ہوں۔ اولاد ہمارے نصیب میں نہ تھی۔ بڑے جتن کر دیکھے۔

شادی کے بعد شروع شروع میں۔ میں آصفہ سے لڑا کرتا تھا۔ محلے والے اپنے اپنے گھر میں بیٹھے ہماری لڑائی پر رننگ کمنٹری کیا کرتے تھے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسی لڑائی ہے جس میں صرف ایک پارٹی بولے جا رہی ہے۔ دوسری پارٹی جیسے موجود ہی نہیں۔ انہوں نے ہماری لڑائی کو ایک ہاتھ کی تالی کا نام دے رکھا تھا۔ دراصل میں لڑتا نہیں تھا بلکہ آصفہ کو سمجھانے کی

کوشش کیا کرتا تھا کہ بی بی کچھ کرو کچھ بولو لڑو جھگڑو۔ اس کھڑے پانی میں کوئی حرکت تو پیدا ہو۔
دوستو ہم مرد بھی کتنے احمق ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ دلیل دے کر ہم بیوی کو سمجھا سکتے ہیں لیکن
اب میں جان گیا ہوں اس لئے میں نے ایک ہاتھ کی تالی بجانا چھوڑ دیا ہے۔

آصفہ کے پاس بیٹھ کر وقت گزارنا بھی تو مشکل ہے۔ کوئی کب تک جی ہاں جی ہاں کی گردان
سنے۔ آصفہ باتیں کرنے والی عورت نہیں۔ پڑوسنوں کی غیبت کرنا اسے گوارہ نہیں۔ محلے کے
سکینڈل سے اسے دلچسپی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شک پڑتا تھا کہ وہ با عورت نہ ہو۔

باہر سے پام پام کی آواز آئی۔ ہیں اٹھ بیٹھا ٹیکسی آگئی۔ آصفہ میں نے کہا وہ جواب دیے
بغیر بادل ناخواستہ اٹھی عین اس وقت جید ابھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ بندھے سامان کی
طرف دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ کبھی سامان کی طرف دیکھتا کبھی آصفہ کی طرف۔ وہ اس قدر بوکھلا گیا
کہ اسے سویٹ مانگنا بھی یاد نہ رہا۔

"جیدے میں نے کہا ہم جا رہے ہیں۔ گاؤں"۔
"میں بھی جاؤں گا" وہ چیخ کر بولا۔
"پاگل ہو گئے ہو کیا" میں نے کہا۔
"آؤ میں تمہیں سویٹ دوں" آصفہ بولی
"جاؤں گا" وہ چلایا۔ اس نے سویٹ کی طرف توجہ نہ دی
"تیری آنٹی کیا کہے گی" آصفہ بولی۔
"کچھ نہیں کہے گی" وہ رونکا ہو کر بولا۔

دفعتاً میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ "آصفہ" میں چلایا "میں نے دیوانہ وار
آصفہ کی طرف دیکھا۔ پہلی مرتبہ آصفہ کی آنکھ میں چمک لہرائی۔ ایسی چمک جو صرف گنہگار کی آنکھ میں
لہرا سکتی ہے۔

"آصفہ" خوشی سے میری چیخ نکل گئی۔
آصفہ نے بڑھ کر جیدے کو کمبل میں لپیٹ لیا۔

انتظار حسین

پچھتاوا

مادھو پیدا ہو کر بہت پچھتایا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ پیدا تو وہ ہو چکا تھا۔ اصل میں وہ ماں کے بھرے میں آگیا۔ عجیب بات ہے کہ ماں ہی کی باتوں سے اس کے اندر یہ بات بیٹھ گئی کہ آدمی کو پیدا ہی نہیں ہونا چاہیئے اور ماں ہی کی باتوں میں آکر وہ پیدا ہونے پر رضامند ہو گیا۔ اسی پچھتاوے میں جب وہ اپنے سارے اگلے پچھلے کو کرید رہا تھا دھیرے دھیرے کر کے اس پر یہ بات کھلی کہ بس وہ سوال کر کے پھنس گیا۔ ساری خرابی اس سوال سے پیدا ہوئی۔ مگر سوال اس نے ایسا کونسا بھاری کیا تھا۔ اتنا ہی تو پوچھا تھا کہ ماں تو دن رات کڑھتی کیوں رہتی ہے۔ ماں نے دکھی ہو کر کہا کہ "میرے لال تو تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ ماں کے پیٹ میں نچنت بیٹھا ہے۔ جب خیر سے میں تجھے جنوں گی اور تو آنکھیں کھول کر اس دنیا کو دیکھے گا پھر تجھے پتہ چلے گا کہ یہاں پہ کتنے دکھڑے بکھیڑے ہیں۔"

"دکھڑے بکھیڑے جائیں بھاڑ میں۔ ماں، تو سکھی رہا کر۔"

"لال، مجھ دکھیا کے بھاگ میں تو دکھ لکھے ہیں۔"

"اور سکھ؟"

"سکھ۔" رکمنی نے ٹھنڈا سانس بھرا "سکھ یہاں کہاں ہے۔"

وہ یہ بات سن کر بہت بیکل ہوا۔ پوچھا "ماں، تو یہ کیا کہہ رہی ہے۔ سکھ کیا دنیا میں ناپید ہے۔ آخر کہیں تو ہوگا۔"

"میرے لال، سکھ ماں کی کوکھ تک ہے۔ آگے دکھ ہی دکھ ہے۔"

"ماں، پھر لوگ پیدا کیوں ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔

"مورکھ جو ہوتے۔ ہبڑ دبڑ پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی جان کو روتے ہیں"۔

"پھر پیدا ہونے اور جینے میں کیا فائدہ ہے"۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ گھاٹا ہی گھاٹا ہے"۔

مادھو ماں کی باتیں سُن کر دُبدا میں پڑ گیا۔ ایک سوال نے اسے آپکڑا کہ پیدا ہوا جائے یا نہ ہوا جائے۔ بہت ادھیڑبن کے بعد آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ سوچا کہ چلو اچھا ہوا، ماں کے پیٹ ہی میں اصلی بات کا پتہ چل گیا۔ ابھی تو تیر کمان میں ہے۔ میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ گھاٹے کا سودا میں کیوں کروں۔

رکمنی بھولی بھالی عورت تھی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کی کوکھ میں کیا گُل کھلا ہے اور ہونے والا کیا سوچ رہا ہے۔ آسوں مرادوں کے ساتھ اس نے نو مہینے پورے کئے اور بچہ جننے کے لیے تیار ہوئی۔ مگر بچہ نے تنت وقت پہ پیدا ہونے سے انکار کر دیا۔ رکمنی تو پیٹ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ یہ کیا ہوا۔ اس بات کا تو اسے سان گمان بھی نہیں تھا۔ ہوش ذرا ٹھکانے آئے تو بولی۔

"میرے لال، یہ تیرے جی میں کیا سمائی ہے۔ یہ تو انہونی بات ہے۔ جو بالک پیٹ میں آگیا، اسے پیدا بھی ہونا ہوتا ہے۔ ماں کی کوکھ تو بالک کو بس نو مہینے تک سنبھالتی ہے۔ میں نے نو مہینے پورے کر لیے۔ سو میرے للا جی اب تم باہر آؤ، آنکھیں کھولو اور دُنیا کو دیکھو"۔

"نہیں ماں، میں اس اندھیر نگری میں جہاں دکھ ہی دکھ ہے آنکھیں نہیں کھولوں گا چاہے میری ساری عمر تیری کوکھ میں پڑے پڑے بیت جائے"۔

رکمنی نے بہت سمجھایا بجھایا۔ مگر بالک اپنی ہٹ پہ آگیا تھا۔ کوکھ میں دھرنا دیکے بیٹھ گیا۔

جب بہت دن بیت گئے اور رکمنی اتنی بھاری ہو گئی کہ اٹھنا بیٹھنا اس کے لیے دوبھر

ہو گیا تو پھر اس نے پتی سے رو رو کے کہا۔

"بچے کا بوجھ مجھے لے بیٹھے گا۔"

گنپت پتنی کی تکلیف دیکھ کر بیکل ہو گیا۔ کہا کہ "وید جی سے جا کے کہتا ہوں کہ وہ کوئی دارو کریں گے۔"

"وید جی کی دارو کیا کام دے گی جب بالک ہی پیدا ہونے پر راضی نہیں ہے۔"

گنپت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ چکرا کر پتنی کو دیکھنے لگا۔

رکمنی نے کہا۔ "سوامی، اسے سمجھاؤ۔"

"کسے سمجھاؤں۔"

"اپنے بالک کو۔"

"بالک کو؟ ..... وہ تو پیٹ میں ہے۔"

"یہی تو اسے سمجھانا ہے کہ پیٹ میں بہت رہ لیا۔ اب باہر نکلے۔"

"اری کچھ تیری مت ماری گئی ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔"

"سوامی میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تمہارا بالک پیدا ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ نرالا بالک ہے۔ پیٹ میں دھرنا دے کے بیٹھ گیا ہے۔ پیدا ہونے سے انکار کرتا ہے۔"

گنپت بہت چکرایا۔ پہلے تو اس نے یہ بات ماننے ہی سے انکار کر دیا مگر جب رکمنی نے مادھو کی باتیں سنائیں تو سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے ویدوں پرانوں کو بہت چھانا تھا۔ دھیرے دھیرے کر کے بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ سوچ کر بولا "پہلے تو یہ انوکھی بات۔ پر سوچو تو اتنی انوکھی بھی نہیں۔ گاندنی نے بھی اسی پرکار پیدا ہونے سے انکار کر دیا تھا۔"

رکمنی نے چکرا کر پوچھا "گاندنی کون تھی؟"

"گاندنی ورشنی کے پتر شپھلک کی پتری تھی۔ ماں کے پیٹ میں اڑ کے بیٹھ گئی۔ جینے

چڑھے۔ پھر برس چڑھا۔ پھر دوسرا برس چڑھا۔ پھر تیسرا برس آن لگا۔ پتری تھی کہ پیٹ میں پڑی تھی، پیدا نہیں ہوتی تھی۔ کہتی تھی کہ مجھے پیدا ہونا ہی نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی۔"

"پیدا کیسے نہ ہوتی۔ پیدا تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ جو بچہ پیٹ میں آگیا وہ بھاگ کے کہاں جائے گا۔ پیدا ہووے ہی ہووے۔ پر اس نے ستایا بہت۔ پیدا ہونے کے لیے شرطیں رکھنی شروع کردیں۔"

"وہ کیا شرطیں تھیں۔"

"شرط بس ایک تھی۔ اسی پہ اڑی ہوئی تھی۔ پتا نے کہا پُتری زیادہ ہیر مت پھیلا۔ یہ تیری ماتا کی کوکھ ہے، وشنو جی کا وشال پیٹ نہیں ہے۔ میرا کہا مان اور پیدا ہو جا۔ وہ بولی، ایک شرط پہ جنموں گی۔ پوچھا وہ کیا شرط ہے۔ کہا، میں روز ایک گیا برہمنوں کو دان دیا کروں گی۔ یہ شرط پوری کرنے کا وچن دو تو پھر میں جنموں گی۔ پتا نے کہا چل تیرا کہا مان لیا۔ اب دیر مت کر۔ پیدا ہو جا۔ بس وہ ترنت ہی پیدا ہوگئی۔ اور پیدا ہوتے ہی گھر میں بندھی ہوئی گئیں دان دینی شروع کردیں۔"

رکمنی نے کہا۔ "اپنے مادھو سے بھی پوچھ لو کہ اس کی کیا شرط ہے۔ جو شرط رکھے مان لو۔ مجھ سے اب اسے سہارا نہیں جاتا۔"

گنپت نے بیٹے کو پکارا۔ "پُتر، یہ ماں کا پیٹ ہے۔ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے۔ بہت ہو چکی، اب پیدا ہو جاؤ۔ خود بھی جیو، ماں کو بھی جینے دو۔"

مادھو نے کوکھ میں لیٹے لیٹے پکار کے کہا۔ "پتا جی، پیدا ہو کے میں کیا لوں گا۔ پیدا ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ جیون میں تو دکھ ہی دکھ ہے۔"

گنپت بیٹے کے اس جواب پر اپنا سا منھ لے کے رہ گیا۔ رکمنی سے بولا۔ "اری بھاگوان بھری، تیرے پوت سے تو گوبر لال والے لچھن ہیں۔"

رکمنی نے پوچھا "سوامی گوبر لال کون تھا۔ اور اس کے کیا لچھن تھے۔"

"گوبر لال پراچین کال میں ایک ودھوان کا پُتر تھا۔ وہ ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ

باپ سے وِدّیا میں برابری کرنے لگا۔ باپ جو بات کہتا یہ اس سے جرح کرنے لگتا۔ ایک دن باپ کو تاؤ آگیا کہ میں اتنا بڑا ودھوان اور یہ ڈیڑھ بالشت کا چھوکرا کہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہے اور مجھ سے بحث کرتا ہے۔ اسی تاؤ میں پتنی کی کوکھ پہ لات ماری۔ لات سیدھی بالک کے سر پہ پڑی۔ چوٹ سے اس کے سر پہ گومڑ پڑ گیا۔ اسی سے وہ گومڑلال کہلانے لگا۔"

"پر وہ پیدا تو ہو گیا تھا نا؟"

"پیدا تو وہ اپنے سمے سے پہلے ہی ہو گیا اور ایسا پیدا ہوا کہ ویدوں کا ورنن کرتا پیٹ سے نکلا۔ باپ کہیں جیتا ہوتا تو اس کی وِدّیا کے سامنے پانی بھرتا۔ پر اس کا تو پہلے ہی دیہانت ہو چکا تھا۔ ہوا یوں کہ وہ راج دربار کے چاتر ودھوانوں کے چکّر میں آگیا اور ان سے مات کھا گیا۔ یہ ہار اسے کھا گئی۔ ندی میں جا کے ڈوب مرا۔ گومڑ جب سیانا ہوا تو ماں نے اسے بتایا کہ تیرے پتا کے ساتھ کیا ہوا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا راج دربار میں جا دھمکا۔ للکارا کہ میں ان چاتر ودھوانوں سے بحث کروں گا جو میرے پتا کی موت کا کارن بنے ہیں۔ راجہ نے کہا کہ بالک ہاتھیوں سے گنّے مت کھا۔ تو ابھی کچّی دھات ہے۔ یہ میرے دربار کے رتن اپنے ہنر میں منجھے ہوئے ہیں۔ پر گومڑلال ایک ایک پانی کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ ایک ایک پانی کر کے مانا۔ راج دربار کے ودھوانوں نے ناک رگڑی اور ہار مان لی۔"

رُکمنی یہ کہانی سُن کر بولی کہ پتا کا اس نے اپمان کیا۔ پر پیدا تو ہو گیا۔ تمہارا لاڈلا تو پیدا ہونے ہی کے لیے تیار نہیں۔ ارے اسے کسی پرکار پیدا ہونے پہ راضی کرو۔"

"بھاگوں بھری، میں اسے کیسے راضی کروں۔ اس نے ایسا سوال کر ڈالا ہے جس کا جواب میرے پاس تو ہے نہیں۔ پوچھتا ہے کہ پیدا ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ بھلا میں اس کا کیا جواب دوں۔ اس کا جواب تو رشیوں منیوں کے پاس بھی نہیں ہے۔"

"اچھا میں اس کرم جلے کی بات کا جواب دیتی ہوں۔" جل بھُن کر بولی اور پھر اپنی کوکھ والے سے مخاطب ہوئی "بالک بتا تو نے اپنے باپ سے کیا پوچھا تھا۔"

"ماں میں نے باپ سے یہ پوچھا تھا کہ پیدا ہونے کا آخر فائدہ کیا ہے۔"

"مورکھ میں تجھے بتاتی ہوں کہ پیدا ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ میرا

پنڈ تجھ سے چھوٹ جائے گا اور میرے پیٹ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

اس بات پہ مادھو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کچھ بن نہ پڑا کہ ماں کی بات کا کیا جواب دے۔ بس پیدا ہو گیا۔ مگر عجب ہوا" ادھر اس نے آنکھ کھولی ادھر ماں کی آنکھ بند ہو گئی۔ جیسے وہ اسے جننے ہی کے لیے جینے کا کشٹ کھینچ رہی تھی۔

گنپت کو رکمنی سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ دنیا سے سدھار گئی تو وہ بھی ڈھتیا چلا گیا۔ دنوں میں وہ بھی چٹ پٹ ہو گیا۔ مادھو دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا تو بالک پر سیانوں سے زیادہ سیانا تھا۔ ماں باپ کی موت پر اس نے جتنا شوک کیا اس سے زیادہ سوچ بچار کیا۔ سو رہ رہ کر سوچتا کہ اس کے جنم لینے کے ساتھ ہی ماتا پتا دونوں بیکھنٹ کو لد گئے۔ آخر کیوں۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ جانا کہ وہ دونوں اسی کے کارن دنیا سے سُدھارے۔ نہ وہ دنیا میں آتا نہ وہ دونوں دنیا سے جاتے۔ ایک جیو آیا اور دو جیو چلے گئے۔ اور جیو بھی کیسے۔ گنپت اور رکمنی جیسے کہ دونوں ہیرا تھے۔ اور میں؟ میں تو ان کے سامنے روڑا ہوں اور اب ان کے بنا تو بالکل ہی گلی کا روڑا بن جاؤں گا۔ ماں نے سچ ہی کہا تھا کہ اس جگ کا جیون گھاٹے کا سودا ہے۔ اور وہ پچھتایا کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا۔ اگر میں ماں کی بات کا اثر نہ لیتا اور پیدا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ پیدا نہ ہونے کا اچھا بھلا فیصلہ کر کے ماں کے بھرّے میں آگیا اور خواہ مخواہ پیدا ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ کیسا بھی گھاؤ ہو وقت اسے بھر دیتا ہے۔ مگر یہ کیسا گھاؤ تھا کہ جتنا وقت گذرتا جاتا تھا اتنا گہرا ہوتا جاتا تھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر کنبہ کے لوگ ایک دن اکٹھے ہو کر اس کے پاس آئے اور سمجھانے لگے کہ ماتا پتا کسی کے بھی سدا نہیں رہتے اور آنا جانا تو اس دنیا میں لگا ہی رہتا ہے۔ اب اس گھٹنا کو بہت دن بیت گئے ہیں اور تم سیانے ہو گئے ہو۔ گھر میں داتا کا دیا سب کچھ ہے۔ تمہارا پتا دھن دولت چھوڑ کے دنیا سے گیا ہے۔ بیاہ کرو اور گھر آباد کرو۔"

وہ بولا۔ "میں خود دکھی ہوں۔ گھر میں کسی دوسرے جیو کو لا کر کیوں دکھی کروں۔"

"ارے بھاگوان، تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ آنے والی آئے گی تو جی اور سا ہو گا اور

دکھ بٹ جائے گا۔"

اور کنبہ کے ایک بڑے نے یہ کہا کہ "لالہ، دکھ اس اسار سنسار میں اتنا ہے کہ کوئی اکیلی جان اسے سہار نہیں سکتی۔ اسی کارن پیدا کرنے والے نے جیو کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے۔ دوسرے کی سنگت میں دکھ بٹ جاتا ہے"۔

مادھو نے کنبہ والوں کی باتیں سنیں مگر ذرا جو ٹس سے مس ہوا ہو۔ آخر میں اس نے یہی کہا کہ "میں خود اپنے لیے بوجھ ہوں۔ میں اس بوجھ کو اتارنے کو پھر رہا ہوں۔ بیاہ کر کے ایک اور بوجھ سر لے لوں نہ بابا نہ۔"

کنبہ والوں کو یہ ٹکا سا جواب دے کر اس نے چلتا کیا۔ پھر سوچا کہ باپ کا چھوڑا ہوا روپیہ پیسہ، ڈھور ڈنگر، کھیت مکان یہ بھی تو سب بوجھ ہی ہے۔ یہ کھٹراگ آخر کس لیے۔ بس اس نے ترت پھرت سب کچھ برہمنوں کو دان دیدیا اگایوں کو پُن کر دیا۔ جیسے یہ سب کچھ خاک تھا کہ اس سے دامن جھاڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

باپ کی چھوڑی ہوئی ساری دھن دولت دان پن کرنے کے بعد مادھو نے سوچا کہ بس اب ایک جنم بھار رہ گیا ہے۔ اسے بھی اتار دوں تو بالکل ہلکا ہو جاؤں گا، مگر کیسے اتاروں۔ اس چکر میں وہ نگر سے نکل کھڑا ہوا۔ کتنے دنوں تک نگر نگر اور ڈگر ڈگر مارا مارا پھرتا رہا۔ پھرتا پھرتا ایک جنگل بیابان میں جا نکلا۔ دور دور تک آدمی نہ آدم زاد۔ پر تھوڑی دیر میں ایک ہرے بھرے پیڑ پہ نظریں جم گئیں۔ اس کی چھاؤں میں ایک ہری بھری ناری بیٹھی دھاروں دھار رو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر من میں کن من کن من ہونے لگی۔ پر فوراً ہی سنبھل گیا۔ سوچا کہ یہ تو میں ناری جال میں پھنسنے لگا ہوں۔ اس سے کنی کاٹی اور قدم مارتا آگے نکل گیا۔ بہت آگے نکل آیا تو پھر ٹھٹکا۔ اس بن میں جہاں دور دور تک آدمی کا پتہ نہیں ہے یہ ناری کیسے آئی اور کیوں رو رہی ہے۔ ضرور اس پہ کوئی بپتا پڑی ہے۔ اس سے مجھے پوچھ تو لینا چاہیے، کہ تجھ پہ کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہاں اکیلی بیٹھی ٹسر ٹسر رو رہی ہے۔ اگر میں اس کی کوئی مدد کر سکتا ہوں تو کرنی چاہیے۔ آخر آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ سو وہ جس تیزی سے کنی کاٹ کر آیا تھا اسی تیزی سے پلٹا۔ جا کر ناری سے پوچھا "اے ناری

تو کون ہے۔ آدمی کی بچی ہے یا کوئی اپسرا ہے۔ اس نرجن بن میں تو کیا کر رہی ہے اور کیوں یوں بلک بلک کر رو رہی ہے"۔

ناری نے سر اٹھا کر دیکھا۔ روتے روتے تھم گئی جیسے اسے دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھ گئی ہو۔ آنسو پونچھے اور بولی "تھی تو میں اپسرا ہی مگر اپنے کھوٹے بھاگوں سے اب ناری بن کر کشٹ کھینچ رہی ہوں"۔

"یہ کس کارن ہوا؟"

"ہوا یوں کہ اس بن میں ایک رشی تپ کر رہا تھا۔ اندر دیوتا اس کا تپ دیکھ کر وسوسے میں پڑ گئے۔ اپسراؤں کو بلا کر کہا کہ یہ رشی بہت بڑھ چلا ہے۔ تپ کے زور پہ دیوتا بننے کے جتن کر رہا ہے۔ کون اپسرا ہے جو اسے رجھا کر اس کے تپ میں بھنگ ڈالے۔ میں نے اپنے گھمنڈ میں کہا کہ میں جاتی ہوں۔ وہ بھاؤ بتاؤں گی کہ رشی جی ساری تپ بھول جائیں گے۔ سو میں سندر ناری بن کر اٹھلاتی بھاؤ بتاتی جو بن دکھاتی اس کے سامنے آئی۔ رشی نے میرے کھیل کو تاڑ لیا۔ لال پیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سراپ دیا کہ اب تو اسی روپ میں رہے گی اور اسی بن میں خاک پھانکتی پھرے گی۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ رشی کے چرنوں میں پڑ گئی۔ روئی گڑگڑائی کہ رشی جی چوک ہو گئی۔ شما کر دو۔ رشی مہاراج تھوڑے نرم پڑے اور بولے کہ اب تو میں سراپ دے چکا۔ واپس نہیں لے سکتا۔ ہاں یہ کر سکتا ہوں کہ سزا لمبی نہ کھنچے۔ سو سن کہ اس بن میں جب کوئی جوان آئے گا اور تو اس سے ملے گی تو پھر تیرا اپسرا والا روپ واپس آئے گا اور تو اس بن کی قید سے چھٹکارا پائے گی"۔

مادھو نے اس کی یہ بپتا سنی تو اس کا دل پسیج گیا۔ پھر حیران ہو کر پوچھا "ناری تجھے کتنے دن ہو گئے یہ سزا بھگتتے"۔

ٹھنڈا سانس بھر کر بولی "مت پوچھ کہ کتنے برسوں سے یہ کشٹ کھینچ رہی ہوں۔ لگتا ہے کہ شتابدی بیت گئی"۔

"اس دن سے ادھر کوئی جوان آیا ہی نہیں؟"

"جوان یہاں کہاں دکھائی دیتا ہے"۔ اس نے پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔ "سفید سن ایسی

جٹائیں بڑھائے بڈھے پھونس رشی یاں پہ آتے ہیں۔ سمادھی لگا کر آنکھیں موند کر ایسے بیٹھتے ہیں کہ پھر آنکھ ہی نہیں کھولتے۔ پر خیر اب تو آگیا ہے"۔ اور یہ کہتے کہتے اس کے من میں کا منا کمنائی اور من سے نکل کر آنکھوں میں جھلملائی۔ ایسی نظروں سے مادھو کو دیکھا کہ اس کا جی ڈول گیا۔

پر مادھو نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ "سندری، میں تو خود اپنے کئے کی سزا کاٹ رہا ہوں"۔

"تو نے کیا کیا تھا؟"

"میں نے بس اتنا کیا کہ پیدا ہو گیا۔ اور اب جینے کا دکھ سہہ رہا ہوں"۔

اس پر وہ ناری کھلکھلا کر ہنسی۔ بولی "مجھ سے مل سُکھی ہو جائے گا"۔

وہ ایک بار پھر ڈول گیا۔ مگر پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور جی کڑا کر کے کہا۔ "ایک چُوک کر چکا ہوں۔ دوسری چوک نہیں کروں گا"۔

"ارے مان بھی جا"۔ اس نے لجا کر کہا۔ "تیرے بھی دلدر دور ہو جائیں گے۔ میری بھی ناری جنم سے مکتی ہو جائے گی"۔

مادھو پھر پھسلنے لگا تھا۔ مگر جلدی ہی اپنے آپ کو تھام لیا۔ دل میں کہا کہ رشی جی تو بچ کر نکل گیا۔ پر میں یاں ٹکا رہا تو پھنس جاؤں گا۔ خیر اسی میں ہے کہ یاں سے بھاگ نکلو۔ دل میں یہ ٹھان کر اس نے ناری کی بات کا جواب یوں دیا کہ کان پکڑے۔ کہا کہ "نا بابا"۔ اور چل کھڑا ہوا۔

ناری کی آنکھوں میں جو آشا کی کرن جگمگائی تھی وہ تُرت کے ترت بجھ گئی۔ پاس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ بولی "تو کیسا مرد ہے۔ ایک ناری کو نراشا کے اندھکار میں چھوڑ کے جا رہا ہے"۔

مادھو بولا "جو خود اندھیرے میں بھٹک رہا ہو وہ کسی دوسرے کو اندھیرے سے کیا نکالے گا"۔ اور آگے بڑھ گیا۔

ناری پیچھے سے پُکاری "دیکھ پچھتائے گا"۔

مادھو نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ دور نکل کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ کس طرح ناری جنجال میں پھنسنے سے وہ بال بال بچا ہے۔

مادھو چلتا رہا، چلتا رہا۔ دھول مٹی میں کنکروں پتھروں پر چلتے چلتے اس کے تلوے چھل گئے۔ آخر ایک دن ایک سادھو کے درشن ہوئے۔ مادھو نے ڈنڈوت کیا اور اس کے چرنوں میں بیٹھ گیا۔ سادھو نے آنکھ بھر کر اسے دیکھا۔ پوچھا۔

"بچہ، تجھے کیا دکھ ہے؟"

"سادھو مہاراج، مجھ سے اک چوک ہوگئی"۔

"بچہ، کیا چوک ہوگئی تجھ سے"۔

"میں پیدا ہو گیا"۔

"پھر؟"

"اس کا اُپائے کیا ہے؟"

"اُپائے" سادھو ٹھنڈا سانس بھر کر بولا "بچہ، اسی چنتا میں تو میں بیاکل پھرتا ہوں کتنے تیرتھ کئے، کتنا ہوں میں مارا مارا پھرا، کتنا گیان دھیان کیا، پر پتہ نہ چلا کہ اس جیون روگ کا اپائے کیا ہے"۔

"مہاراج، میں تو اسی یاترا پہ نکلا ہوا ہوں اگر آپ نہیں بتاتے تو کسی ایسے کا پتہ بتایئے جو اس کھوج میں میری مدد کرے"۔

سادھو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "سومیرو پربت پہ ایک رشی باس کرتا ہے کتنی شتابدیوں سے اپنی سمادھی پہ آنکھیں موندے بیٹھا ہے۔ وہاں تک جانے کی ساہس ہو تو جا اور اس گیانی کے چرن چھو۔ وہی تجھے کچھ بتائے تو بتائے"۔

مادھو نے سومیرو پربت پہ جانے کا بیڑا اٹھایا اور چل پڑا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات جانا۔ جاڑا، گرمی، برسات، کسی رُت کو نہ گردانا۔ بس چلتا رہا۔ مرتا گرتا ٹھوکریں کھاتا آخر اس اونچے پربت پہ پہنچ ہی گیا۔

دیکھا کہ ایک گپھا میں ایک بوڑھا آنکھیں موندے بیٹھا ہے، بالکل پھونس کہ پھونک

مارے سے اڑ جائے۔ جٹائیں سفید برف سمان۔ وہ ہاتھ جوڑ کر سر نیوڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ دیر بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔ مادھو کو غور سے دیکھا "بچے تو کون ہے۔ یاں کیا لینے آیا ہے"۔

"دکھی ہوں۔ دارو کے کھوج میں آیا ہوں"۔

"کیا دکھ ہے تجھے؟"

"جیون دکھ"۔

"جیون تیرے لیے دکھ کس کارن بنا"۔

"اک چوک ہو گئی"۔

"کیا؟"

"سوچا تھا کہ پیدا نہیں ہوں گا۔ پر ماتا پتا کے کارن پیدا ہونا پڑ گیا"۔

"مورکھ پیدا تو ہونا پڑتا ہے"۔

"اور اس سے جو دکھ پیدا ہوتا ہے"۔

"وہ سہنا پڑتا ہے"۔

"پر رشی مہاراج اس کا کوئی اُپائے بھی تو ہوگا"۔

"مارا مارا مت پھر۔ بیٹھ جا"۔

وہ بیٹھ گیا اور بولا "رشی مہاراج میں بیٹھ گیا"۔

"آنکھیں بند کر لے"۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں اور بولا "رشی مہاراج، میں نے آنکھیں بند کرلیں"۔

"کان بند کر لے"۔

اس نے کان بند کر لیے اور کہا "رشی مہاراج، میں نے کان بند کر لیے"۔

"چُپ ہو جا"۔

وہ چُپ ہو گیا۔ بالکل چُپ۔ دن گذرتے گئے اور وہ چپ بیٹھا رہا۔ بالکل گم سُم۔ جانے کتنے دن کتنے برس اُسے لگا کہ صدیاں بیت گئیں۔ آخر آنکھ کھولی اور بولا "مہاراج اب

تو بہت سمے بیت گیا۔"

"سمے؟" رشی نے آنکھیں کھولیں اور حیرت سے مادھو کو دیکھا "مورکھ تو ابھی تک سمے کے چکر سے نہیں نکلا؟"

"نکلنے لگا تھا کہ اس نے ستانا شروع کر دیا۔"

"کس نے؟"

"ناری نے۔"

"کون تھی وہ؟"

اس نے وہ ساری کہانی سنائی اور کہا "جب اس نے آخری بار میری طرف دیکھا تھا تو اس کی نظروں میں کتنی نراشا تھی۔ ان نظروں کو میں نہیں بھول پا رہا۔"

رشی نے غصے سے اسے دیکھا "مورکھ جیون بھار کیا تھوڑا تھا کہ ایک اور بوجھ تو نے اپنے دم کے ساتھ لگا لیا۔ جا پہلے اس بوجھ کو اتار۔ اور پھر آ۔"

"بوجھ کو اتاروں۔ پر کیسے؟"

"اسی ناری کے پاس جا۔ ہلکا ہو کے آ۔"

وہ بہت پٹپٹایا "مہاراج سمے بہت بیت گیا ہے اور میں برف سے ڈھکے اس پربت پہ بیٹھے بیٹھے سیل چکا ہوں۔"

"پر چنگاری تو تیرے اندر اب تک سلگ رہی ہے۔"

وہ رو پڑا "یہی تو مشکل ہے۔ یہ کیسے بجھے۔"

"وہ ہی بجھا دے گی۔ جا یاں سے۔ بجھ جائے تو آ جائیو۔"

کتنی بے دلی سے اٹھا۔ مگر جب چلنے لگا تو پکے ارادے کے ساتھ بولا۔

"بس گیا اور آیا۔"

جس راستے آیا تھا اسی راستے واپس چلا۔ چلتے چلتے اسے اچھے برے خیالوں نے آ گھیرا۔ اگر یہی بات تھی تو میں نے اسے کیوں انکار کیا۔ اچھا ہوتا کہ اسی گھڑی اسے بھگتا دیتا۔ وہ بھی سکھی ہو جاتی۔ مجھے بھی کامنا سے مکتی مل جاتی۔ یہ کشٹ کہ اب کھینچ رہا ہوں کیوں کھینچنا پڑتا۔ ہاں

بالکل۔ اچھا ہی ہوتا۔ اس نے کتنا سمجھایا رجھایا پر میں ہی . . . . . اس کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا اسے یاد آئی اور بیکل کرتی چلی گئی۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ قدموں میں جیسے بجلی بھر گئی ہو۔ چل کیا رہا تھا، دوڑ رہا تھا۔

جب اس بن میں پہنچا تو دل بلّیوں اچھلنے لگا بھلا وہ کونسا برکش تھا جس کی چھاؤں میں وہ براجتی تھی۔ جس کی شاخیں ہری بھری اور چھاؤں گھنی دیکھی اسی پر گمان ہوا کہ یہاں تھی، وہ پر وہ تو اب یاں پہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک ایک پیڑ تلے دیکھا۔ کہیں نہیں تھی۔ ہے رام وہ کہاں الوپ ہو گئی۔ کیا مجھے دیکھ کے چھپ گئی ہے۔ اری سندری کیوں جوگی کو تڑپاتی ہے۔ کس بیکلی کے ساتھ ایک ایک کنج میں جھانکا۔ پورا بن چھان مارا۔ کہاں گئی۔ سندری۔ زمین کھا گئی یا آسمان چاٹ گیا۔ اور بن جو اُسے ہرا بھرا دکھائی دے رہا تھا اجاڑ لگنے لگا، جیسے ایک دم سے پت جھڑ لگ گئی ہو۔

بہت دوڑ دھوپ کے بعد ایک اجڑے پت جھڑ کے مارے پیڑ تلے ایک جوگی دکھائی دیا کہ انگ پہ بھبھوت ملے دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ چلو کوئی آدمی آدم زاد نظر تو آیا۔ سوچا کہ شاید اس سے کھوئے نگینہ کا کھوج ملے۔ جا کر اس کے پیر چھوئے۔ جوگی نے اس کا حال دیکھ کر ترس کھایا۔ کہا کہ "بچہ تو بہت چلا ہے۔ بیٹھ جا۔" وہ بیٹھ گیا۔

"اس اجاڑ بن میں کس کارن مارا مارا پھرتا ہے۔"

"جوگی جی، یاں پہ ایک ناری تھی۔ یہیں کہیں ایک پیڑ تلے براجی ہوئی تھی۔ اب آیا ہوں تو وہ مل نہیں رہی۔ کچھ اس کا پتہ ہو تو بتاؤ۔"

"وہ ناری کون تھی اور تو کون ہے۔"

جواب میں اس نے اپنی ساری رام کہانی سنا ڈالی۔ جوگی نے ساری کہانی سُنی۔ پھر افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"جس یاتری کے رستے میں ناری آنکلے اور آ کر نکل جائے پھر اسے بہت ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اور بہت پچھتانا پڑتا ہے۔"

"جوگی جی، پھر میں کیا کروں"۔

"اسے ڈھونڈ"۔

"بہت ڈھونڈھا"۔

"اور ڈھونڈ"۔

"کتنا تو ڈھونڈ لیا۔ کب تک ڈھونڈوں"۔

"مورکھ، ڈھونڈنے والے یہ نہیں پوچھا کرتے۔ بس ڈھونڈتے رہتے ہیں"۔

مادھو یہ سُن ترنت اٹھ کھڑا ہوا اور آگے چل پڑا۔ ایک ایک پیڑ تلے جھانکتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اسی میں کتنی دُور نکل گیا۔ سومیرو پربت اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں چھل گئے، سُوجھ گئے پر وہ چلتا چلا گیا۔ کبھی یوں لگتا کہ وہ صدیوں سے چل رہا ہے، بھٹکتا پھر رہا ہے۔ تب تھوڑا ٹھٹھکتا اور سوچتا کہ اس یاترا کا کوئی انت بھی ہے یا نہیں اور پھر چل پڑتا۔ مگر انت کہاں، رستہ تو الجھتا لمبا ہوتا ہی چلا جا رہا تھا اور رستہ جتنا الجھتا لمبا ہوتا گیا اتنا ہی اس کا پچھتاوا بڑھتا چلا گیا۔

صادق حسین

قانون اور کانٹے

سگنل کنٹرول میں اچانک فنی خرابی پیدا ہوئی تو اُسے عارضی طور پر معطل کر دیا گیا۔

کانسٹیبل شوکت، پیڑ کی چھاؤں سے نکل، چوراہے میں کھڑا ہو گیا۔

تمازتِ آفتاب سے تارکول کی سڑک کی سطح میں خفیف سی نرمی کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ چڑیوں نے پھر سے اُڑ کر درختوں کے جُھنڈ میں پناہ لی۔ پُھدکتی گلہریاں سبز تنوں میں چُھپ گئیں ٹِڈے سایہ دار درختوں کے تنوں سے چمٹ گئے۔

کانسٹیبل شوکت، چاق، چوبند، اپنے پیشہ ورانہ فرائض سرانجام دینے لگا۔ ہاتھوں کے منظم اشارے، چمکتے ہوئے سیاہ بوٹوں کی جچی تلی حرکت۔ پرندے، گلہریاں، ٹِڈے، سب کے سب اُس انسان کی طرف دیکھنے لگے جو کڑی دھوپ میں چوراہے کے بیچ تنِ تنہا کھڑا تھا۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوتیں اور پھر ایک صحت مند چہرے کا سفر کرتی اُس دھرتی پر جا گرتیں جس دھرتی پر امن و امان برقرار رکھنے کا اس نے حلف اُٹھایا تھا۔

شاہ لطیف بری کے دربار کا ملنگ، سبز چُغا پہنے، چمٹا بجاتا، فٹ پاتھ پر ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ ایک سفارت خانے کی ایئرکنڈیشنڈ موٹر کار میں بیٹھے خوش پوش افراد نے ملنگ کی طرف دیکھ کر ہمدردانہ لہجے میں تبادلۂ خیال کیا اور پھر سگریٹ سلگا لئے۔ اسکول کی بس چوراہے سے گزری تو طلبا کے شور نے فضا میں ہلچل مچا دی۔

اسلام آباد میں تانگہ، موٹر رکشا اور دوسری نچلے درجے کی سواریوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ کانسٹیبل شوکت کو اپنے گاؤں کی بیل گاڑی اکثر یاد آتی۔ یہاں مویشی رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ حُکم

امتناعی اُسے پسند نہ آیا۔ وہ سوچتا کہ تارو کے بغیر جینا بھی کوئی جینا ہے۔ اُس کی بیوہ ماں نے ایک بھینس پالی تھی جسے وہ پیار سے تارو کہہ کر پکارتی۔ نیلی راوی تارو تھی بھی اصیل اور دُدھیل۔ ماسی سفر جان دوہنی لے، تارو کے تنے ہوئے تھن مٹھیوں میں لیتی تو اُن کی آن میں دودھ کی نہر اُتر آتی۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے سب شوکت کی ماں کو ماسی سفر جان کہہ کر پکارتے۔ وہ مرحوم تھانیدار سمندر خان کی بہو تھی اور حوالدار فتح خان کی بیوہ۔ تھانیدار سمندر خان نے انگریزوں کے زمانے میں اپنی پگڑی اور اپنے اندر والے کا شملہ اونچا رکھا۔ حوالدار فتح خان نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر خاندان کی نام ونمود پر آنچ نہ آنے دی۔ اُس کے انتقال کے بعد اُس کے بھائیوں نے جدی اراضی ہتھیالی۔ ماسی سفر جان نے اُف نہ کی۔ پہلوٹھی کا بیٹا ندی میں ڈوب کر مر گیا۔ وہ زار وقطار روئی۔ اُدھر تارو چھوٹے مار کی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ جب تارو آخری سانس لے رہی تھی تو قصائی نے اُسے ذبح کر دیا۔ تارو کی کھال اُتار کر اُس کا سینہ چاک کیا گیا تو اُس کے دل میں ایک سوراخ پایا گیا۔ ماسی سفر جان کو معلوم تھا کہ تارو کے دل میں وہ سوراخ کیسے ہوا۔ تارو کی کٹی تو جوان ہو گئی تھی مگر چند سال پہلے اُس کا پہلوٹھی کا کٹڑا اچانک مر گیا تھا۔ اُس دن تارو نے ندی کے پانی میں اُترنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے دُودھ نہ اُتارا۔ کٹڑے کی سموچی کھال میں بھُس بھر کر اسے ناند کے پاس کھڑا کر دیا گیا، اس امید پر کہ تارو اُسے اپنا کٹڑا سمجھ کر بہل جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ تارو رات بھر آسمان کی طرف تھوتھنی کر کے بھیں بھیں کرتی رہی۔ فجر کی نماز پڑھ کر ماسی سفر جان نے کہا "تارو! میں تیرا دُکھ جانتی ہوں۔" ماسی سفر جان نے تارو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ تارو نے مڑ کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

ماسی سفر جان نے عورتوں سے کہا "میرا پہلوٹھی کا بیٹا مر گیا تھا جب میں مر جاؤں تو میرا سینہ چیر کر دیکھنا۔ میرے دل میں بھی ایک سوراخ پاؤ گی۔" لیکن اب تو وہ اپنے اکلوتے بیٹے شوکت کے لئے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ آنگن میں کُڑ کُڑ کرتی مرغی جب چیل دیکھ کر چوزے اپنے پروں تلے چھپا لیتی تو ماسی سفر جان سوچتی کہ شوکت کے پیچھے بھی چیلوں کی طرح سر پر منڈلا رہے ہیں مگر وہ شوکت کو اپنے پروں تلے چھپائے رکھے گی۔

تارو کی کٹڑی گابھن ہوئی تو اُس پر نیا جوبن آ گیا۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح ندی کے پانی میں

تیر کر باہر نکلتی تو اُس کی چمکتی ہوئی سیاہ جلد پر نگاہ نہ ٹھہرتی۔ ماسی سفر جان نے اُس کا نام بھی تارو رکھا۔ اِس تارو نے ایک کٹڑا دیا۔ کھیری بھاری ہو گئی۔ تھن تن گئے۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح اصیل اور دُودھیلن نکلی۔ ماسی سفر جان نے اُس کے دُودھ کی آمدنی سے شوکت کو پالا پوسا۔ اُسے مڈل تک پڑھایا۔ اب تو خیر سے وہ کانسٹیبل بن گیا تھا۔

ماسی سفر جان نے شوکت سے کہا " دیکھو بیٹا! کسی زمانے میں عورتیں بد دعا دیا کرتی تھیں " جا خدا تجھے تھانیدار بنائے "۔ اِس لئے کہ اُن دنوں یہ خیال عام تھا کہ تھانیداری میں من سُتھرا نہیں رہتا۔ مگر تیرے دادھیال کو گاؤں کے اُس پہنچے ہوئے بزرگ کی دُعا ہے جس نے کنویں کے مُنہ پر چادر بچھا، اُس پر نماز پڑھی تھی۔ تیرا دادا اور تیرا باپ دونوں سرخرو گئے۔ ہم نے پیسہ جمع نہیں کیا۔ اللہ نے عزت دی ہے۔ تجھے بھی اپنے باپ دادا کی طرح اس پُل صراط سے گزرنا ہوگا "

شوکت رخصت ہونے لگا تو ماسی سفر جان نے اُس کے گلے میں ایک تعویذ ڈالا۔ وہ تعویذ ورثہ میں چلا آرہا تھا۔ اُس تعویذ نے تھانیدار سمندر خان اور حوالدار فتح خان کے دلوں پر راج کیا تھا۔ اب وہ تعویذ اٹھارہ سالہ شوکت کے دل و دماغ کو سونپا جا رہا تھا۔

تین گھنٹے کی ڈیوٹی ختم ہوئی۔ دوسرا کانسٹیبل آگیا۔ شوکت واپس تھانے پہنچا۔ روزنامچے میں اپنی آمد درج کی۔ مُنہ ہاتھ دھوئے۔ چائے پینے میس میں چلا گیا۔ یہ میس ملازمین کے چندے سے چل رہا تھا۔ برتن، لکڑی کی میزیں اور بنچ، سرکار کا عطیہ تھے۔ باورچی کی تنخواہ تھانے کے بجٹ سے ادا کی جاتی۔

" صوفی جی! کیا حال ہے " ایک کانسٹیبل نے چائے کا گھونٹ پی کر شوکت سے کہا۔

" خدا کا شکر ہے " شوکت نے جواب دیا۔

شوکت نے ڈاڑھی نہیں رکھی ہوئی تھی۔ وہ نماز بھی باقاعدگی سے نہیں پڑھتا تھا۔ اُس کے ماتھے پر گٹا نہ تھا۔ اُسے مسئلے مسائل سے واقفیت نہ تھی۔ لیکن تھانے میں سب اُسے صوفی جی کہہ کر پکارتے۔

ایک دن، فرصت کے اوقات میں، شوکت، دوسری کوتوالی میں حوالدار الف دین سے ملنے چلا گیا۔ حوالدار الف دین کے بازو پر تین فیتے اور ایک تارا تھا۔ اُس نے اپنے جسم پر چربی کی وافر مقدار لاد رکھی تھی۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو پیٹی کا بکسوا کھول دیتا۔

"چاچا! یہ لوگ مجھے صوفی جی کیوں کہتے ہیں؟" شوکت نے پوچھا

"ابھی تمہیں پولیس میں بھرتی ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ تجربہ سب کچھ سکھا دیگا۔"

"چاچا! میرے کچھ ساتھی مجھے دیکھ کر کھسر پھسر کرتے ہیں۔"

"وقت گزرنے کے ساتھ تمہیں اس بات کا بھی پتا چل جائے گا۔"

"بزرگوار! شہد پنے کی حد ہو گئی ہے۔ ایک دن کانسٹیبل کالا خان نے مجھے دیکھ کر محرر کو آنکھ ماری اور پھر اُس نے حقارت سے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں کوئی چھڑا چھانٹ ہوں۔"

حوالدار الف دین ہنس پڑا۔

"چاچا! مجھے تو غصہ آگیا۔ دوسرے ساتھی بیچ بچاؤ نہ کرتے تو میں کانسٹیبل کالا خان کی بتیسی توڑ دیتا۔"

"تو ابھی نادان ہے۔ سرکاری ملازم تو غصہ پی کر جیتا ہے۔ میں نے اس ملازمت میں دو باتیں سیکھی ہیں۔ بس سر کرنا اور سلیوٹ مارنا۔ یہ دو گُر نوکری کی حفاظت کرتے ہیں۔"

"چاچا! آپ نے میری پہلی بات کا جواب نہیں دیا" شوکت، ایک معصوم بچے کی طرح حوالدار الف دین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

حوالدار الف دین نے شوکت کو اپنے گاؤں کی گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا تھا۔ اُسے چراگاہ میں بھینس چراتے، ٹیکے شہتوت اور بیر چُن چُن کھاتے دیکھا تھا۔ وہ حوالدار فتح خان اور ماسی سفر جان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کا دل پسیج اُٹھا۔

"دیکھو بیٹا!" حوالدار الف دین نے یہ کہتے ہوئے بات جاری رکھی "تیری شادی ہوگی۔ بال بچے ہوں گے۔"

"جی"

"بچوں کو اسکول میں پڑھانا ہوگا۔"

"جی"

"اسکول کی فیس دینا ہوگی۔"

"جی"

"کتابیں خریدنا ہوں گی۔"

"جی"

"گھر گرہستی چلانا ہوگی۔"

"جی"

"جب سے ہمارے گاؤں میں بجلی آئی ہے، بیبیاں ٹی وی مانگتی ہیں۔"

"جی"

"ہمارے گاؤں میں پہلا ریفریجیٹر دوبئی سے آیا تھا۔ جانتے ہو وہ کون لایا تھا۔"

"شیدے مراثی کا بیٹا۔"

"اُس ریفریجیٹر کو دیکھنے کے لیے شیدے مراثی کے گھر عورتوں، مردوں اور بچوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ اب تو ہمارے گاؤں میں ہر چوتھے گھر میں ریفریجیٹر ہے۔ مٹی کے کورے گھڑے کی مٹی پلید ہوگئی ہے۔ دنداسے کا رواج ختم ہوگیا ہے۔ عورتیں لپ اسٹک اور نیل پالش کی فرمائش کرتی ہیں۔"

"چاچا جی! آپ یہ باتیں مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔"

"یہ باتیں تیرے سوال کا جواب ہیں۔"

"چاچا جی! مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آیا۔"

"برخوردار! تیرے بزرگ صوفی تھے۔ فی الحال تو بھی صوفی ہے۔"

شوکت کو تربیتی کورس سے فارغ ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر چکے تھے۔ پہلے دن جب وہ اسلام آباد ٹریفک پولیس کی خصوصی یونی فارم پہن، تھانے سے باہر نکلا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر شخص اُس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ نیلی پتلون، سفید پیٹی، آسمانی رنگ کی قمیص، بائیں بازو پر کالی اور سفید دھاریوں والی پٹی، سفید دستانے، سیاہ جرابیں اور بوٹ، سر پر نیلے رنگ کی بیرٹ کیپ۔ اُس نے سوچا اس وقت اگر اس کی ماں وہاں موجود ہوتی تو اُسے دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔

"او منڈیا! یونی فارم تو ٹھیک سے پہنا کرو" ایک موٹی توند والے سنتری نے شوکت سے مخاطب ہو کر کہا۔

شوکت نے اپنی یونی فارم کا جائزہ لیا اور پھر ایک تذبذب کے عالم میں آگے بڑھ گیا۔

"جوان!" عقب سے ایک آواز آئی۔

شوکت رُک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

سامنے حوالدار شاہ جی کھڑے تھے۔ شرعی ڈاڑھی۔ ماتھے پر گٹا۔ وہ ہر روز صبح سویرے تھانے میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں چمک تھی۔ شوکت نے آج تک شاہ جی سے بات کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔

"اس شخص نے جو بات تم سے کہی، وہ میں نے سُن لی ہے" شاہ جی نے یہ کہتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "ہماری اس پولیس برادری میں ہر نئے آنے والے کو یہ شخص یہی بات کہتا ہے۔ یاد رکھو کہ شکست خوردہ لوگ، کامیاب افراد کو دیکھ کر جلتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے آپ کو توڑ پھوڑ کر فنا ہو جاتے ہیں۔"

شاہ جی چلے گئے۔

شوکت ہمت نہ کر سکا کہ وہ شاہ جی سے کہہ دے۔ "سر! مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔"

باتیں تو اور بھی تھیں جو اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ کل ہی کی بات تھی۔ اس کے تجربہ کار ساتھی کانسٹیبل نے اس سے چارج لے کر سیٹی بجائی۔ مسافروں سے بھری ویگن رُک گئی تو اُس

نے کہا "اللہ کرے بوہنی اچھی ہو" یہ بات شوکت سمجھ نہ سکا۔ وہ راستے میں سوچتا رہا۔ اُس کے گاؤں میں دُکان داروں کی آرزو ہوتی تھی کہ وہ کسی نیک آدمی کی بوہنی کریں۔ یہ راہے میں تو دُکان تھی نہ دُکان دار۔

والی بال کے کھلاڑی کانسٹیبل جہاں داد کی بات بھی اُس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

جہاں داد نے کہا۔ "سگی! یہ زندگی والی بال کا کھیل ہے۔ ایک کھلاڑی بوسٹ کرتا ہے اور دوسرا اسمیش لگاتا ہے۔ بال، اپنی کورٹ میں گرنے نہ دو۔ اِسے دوسرے کی کورٹ میں اِس زور سے پھینکو کہ مدمقابل سنبھلنے نہ پائے۔ تماشائیوں کی پروانہ کرو جس کھلاڑی کو آج وہ ہُوٹ کرتے ہیں، کل اُسی سے آٹوگراف مانگتے ہیں۔"

ایک دن، شوکت لکڑی کے بنچ پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ وہاں کانسٹیبل خلجی آگیا۔

کانسٹیبل خلجی نے کہا "یار تم سگریٹ پیتے ہو نہ سینما دیکھتے ہو۔ پیدا تم نہیں کرتے یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ آج کل تو مزدور بھی چالیس روپے روزانہ لیتا ہے۔"

"میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں۔ میں اپنے گاؤں میں ہوتا تو ہل چلاتا، فصل کاٹتا۔ بیل گاڑی میں چری ڈھوتا۔ یہاں تو مجھے یونی فارم ملی ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہوں۔ سونے کے لئے صاف ستھرا بستر اور مچھر دانی ہے۔ میں ہر ماہ اپنی ماں کو منی آرڈر بھیجتا ہوں۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔"

"دراصل، تمہاری جھجک دُور نہیں ہوئی" کانسٹیبل خلجی بولا "گُر میں بتادیتا ہوں، عمل کرنا تمہارا کام ہے۔ اسامی دیکھ کر چالان کی دھمکی دو اور اپنا کام کرو۔ حرکت میں برکت ہے۔ ایک آدھ بھرتی کا اصلی چالان کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔"

کانسٹیبل خلجی چلا گیا۔

شوکت نے دل میں سوچا۔ جب میں سیٹی بجاتا ہوں تو موٹر کاریں رُک جاتی ہیں۔ رات کو جب میں ریفلیکٹر جیکٹ پہنتا ہوں تو اس کے حروف موٹر کاروں کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں، اُن جگنوؤں کی طرح جن کو میں اپنے گاؤں کی گلیوں میں پکڑ لیتا اور انھیں اپنی قمیص پر سجا، ماں سے کہتا "ماں جی! یہ دیکھو تارے۔" اُس کی ماں اس کی بلائیں لے کر کہتی

"اللہ کرے تو بھی نارابن کر چکے۔"

عشا کی اذان بلند ہوئی۔

تھانے کے سامنے، سڑک کے اس پار، ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تھی، جہاں سے پانچ وقت کی اذان سنائی دیتی تو حوالات میں بند افراد کسی سوچ میں ڈوب جاتے۔ محرّر کا چلتا قلم رُک جاتا۔ تھانیدار کی پاٹ دار آواز وہیں کی وہیں ٹھٹک جاتی۔ اس تھانے کی مخلوق شاہ جی سے ڈرتی تھی۔ اذان کے دوران میں اگر کوئی شخص بولتا یا کام کرتے دیکھا جاتا تو شاہ جی اُسے ٹوکتے اور یہ ایسا معاملہ تھا جس میں کوئی چون وچرا نہ کر سکتا تھا۔

ایک دن شاہ جی نے شوکت کو اپنے پاس بٹھا کر کہا "برخوردار! جس سیدھی لکیر پر تم چل رہے ہو اُس سے بھٹک نہ جانا۔ اس وقت ہم دو نہیں بلکہ تین ہیں۔ ایک تم۔ دوسرا میں اور تیسرا ہمارا خدا۔"

شاہ جی کی باتیں شوکت کے کانوں میں دن بھر گونجتی رہیں۔

شام کے وقت 'والی بال کا کھلاڑی' کانسٹیبل جہاں داد شوکت کو ساتھ لے کر ٹہلنے نکل گیا۔ شوکت تھانے میں سب سے کم عمر تھا۔ کانسٹیبل جہاں داد تو میٹرک پاس تھا۔ اسی لئے تو بھرتی کے وقت ہی اُسے پانچ اضافے مل گئے تھے۔

"صوفی جی!" کانسٹیبل جہاں داد نے کہا "شروع شروع میں میں بھی تیری طرح تھا۔ جھجک کی ہتھکڑی سخت ہوتی ہے مگر ضرورت، یہ ہتھکڑی توڑ کر، ضرورت مند کو آزاد کر دیتی ہے۔"

"ضرورت کس چیز کی؟" شوکت نے پوچھا۔

"تو ابھی ناسمجھ ہے۔ یہ لو اپنی پتی" یہ کہتے ہوئے کانسٹیبل جہاں داد نے پچاس روپے کا ایک نوٹ شوکت کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"آج رات ہی سے دھندا شروع کر دو۔ یہ کاروبار ہے۔ ہم کسی سے بھیک نہیں مانگتے۔ یہ ہمارا حق ہے۔"

شوکت کی گرم مٹھی نے احتجاج نہ کیا۔ اس نے سوچا اس رقم سے اس کی ماں سردیوں میں گرم چادر خرید سکتی ہے۔ دوسرے لمحہ اس کے ہاتھ نے گلے کا تعویز چھوا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ماں

جی کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں "تجھے بھی اپنے باپ دادا کی طرح اس پُل صراط سے گزرنا ہوگا" شاہ جی کی آواز سنائی دینے لگی "جس سیدھی لکیر پر تم چل رہے ہو اُس سے بھٹک نہ جانا۔ اس وقت ہم دو نہیں بلکہ تین ہیں۔ ایک تم۔ دوسرا میں اور تیسرا ہمارا خدا"

پچاس روپے کا نوٹ انگارا بن گیا مٹھی جلنے لگی۔ اس نے اکڑا ہوا ٹھیکے دار کا غذ جہاں داد کو واپس دے کر کہا "میں یہ نہیں کرسکتا"

"تو السیٹیا ہے" کانسٹیبل جہاں داد غصّہ کے مارے تھرّا اُٹھا۔

"دیکھا جائے گا" کانسٹیبل جہاں داد نے مُنہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اندھیرے میں گم ہو گیا۔

چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دامنِ کوہ کی بلندی سے ریستوران کی روشنیاں ننھے ننھے ستاروں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔

شمال مشرق میں، نور پور گاؤں میں، بری امام کا مزار تھا۔ شوکت نے کل ہی تو اس دربار میں حاضری دی تھی۔ وہاں ملنگوں نے دھمال مچا رکھی تھی۔ اس نے سوچا وہاں تو ہر شخص ضرورت سے آزاد تھا۔ کانسٹیبل جہاں داد نے اُسے السیٹیا کہا تھا اور السیٹیا کا مطلب وہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ یہ لفظ اُس نے پہلی مرتبہ کمسنی کے عالم میں اپنے گاؤں میں سُنا تھا۔ گاؤں والوں نے فقیرا بھانڈ کو چھویوں اور لاٹھیوں سے مار ڈالا تھا۔ خون میں لت پت، فقیرا بھانڈ کی لاش کے پاس گاؤں کے جوانوں نے بھنگڑا ڈالا۔ فقیرا بھانڈ کا جرم یہ تھا کہ اس نے پڑوس کے حریف گاؤں کے لمبردار سے مال لے کر اپنے گاؤں کے لمبردار کے خلاف عدالت میں جھوٹی گواہی دی تھی۔ سامنے اینٹوں کی دیوار پر لکڑی کے کوئلے سے لکھا تھا "یہ السیٹیا ہے" شوکت اور اس کے ہم مکتب دوسرے لڑکوں نے وہ لفظ ہجے کر کے پڑھا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر شوکت تمام رات بخار میں مبتلا رہا۔ ماسی سفر جان کنویں کے ٹھنڈے پانی میں پٹی بھگو بھگو شوکت کی پیشانی پر رکھتی رہی تھی۔ آج کانسٹیبل جہاں داد نے اسے السیٹیا کہا تھا اُسے خوف آنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اُس شہر میں تنہا ہو۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاہ جی تو ہیں۔ یوں تو وہ تین چار جوانوں پر تنِ تنہا بھاری تھا۔ پچھلے ہفتے، تفریح کے اوقات میں چار جوانوں نے باری باری اُس سے پنجہ لڑایا تھا۔ کلائی کی۔ اس نے سب کو چت کر دیا۔ وہ اپنے گاؤں میں سب سے

اچھا کبڈی کھیلنے والا تھا۔ اس نے تارو کا خالص دودھ پیا تھا۔ اس کے گلے میں تعویذ تھا۔ وہ تھانیدار سمندر خان کا پوتا اور حوالدار فتح خان کا بیٹا تھا۔ مگر فقیرا بھانڈ کو دو چار آدمیوں نے نہیں سارے گاؤں نے مل کر مارا تھا۔ چند مہینوں کی ملازمت میں اُسے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ شہر میں لوگ چھویوں اور لاٹھیوں سے نہیں بلکہ سازش کی گھتّی مار دے کر کھنگاں دیتے ہیں۔ دفعتہً اُسے یاد آیا کہ تربیتی کورس کے خاتمے پر افسر انچارج نے جوانوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا "تم قانون کے محافظ ہو۔ تمہیں نہایت ایمانداری سے اپنے فرائض ادا کرنے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم قوم کی توقعات پر پورے اُترو گے۔" اس نے دل میں سوچا "یہ باتیں اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں مگر وہ اکیلا یہ جنگ نہیں لڑ سکتا۔ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میری ماں کیا کرے گی۔ نیت ڈانواں ڈول ہو گئی۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ کل صبح کانسٹیبل جہاں داد کے پاس جا کر کہہ دے گا "میں تیار ہوں۔ مجھے اپنے جیسا بنا لو۔"

دوسرے دن، تھانے میں، بات سرگوشیوں سے چل کر سرکاری اعلان تک جا پہنچی۔ کانسٹیبل جہاں داد کو لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔ اس کی پیٹی اتار لی گئی تھی۔ وہ رنگے ہاتھوں دھر لیا گیا تھا۔

اُس دن والی بال کا میدان سنسان پڑا تھا۔ زمین سے آٹھ فٹ اونچا جال کھول کر، بانس پر ڈال دیا گیا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کھلاڑیوں نے کھیل کا پرچم سرنگوں کر دیا ہو۔ کانسٹیبل جہاں داد تھا بھی بڑا لطیفے باز۔ اس کے بغیر یاروں کو چائے پینے کا مزا نہ آیا۔

شاہ جی نے دیوار پر کھریا سے ایک سیدھی لکیر کھینچ کر کہا "برخوردار شوکت! اس لکیر کو نہ بھولنا۔ لکیروں سے مل کر الفاظ بنتے ہیں۔ لکیروں سے زاویے اور موڑ جنم لیتے ہیں۔ لکیروں پر عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ سیدھی لکیر میں سُکھ ہے اور شانتی۔"

شوکت کو یوں محسوس ہوا جیسے کل رات اُس نے خودکشی کا ارادہ کیا تھا۔

سُرخ، سبز اور زرد رنگوں کی بتیاں، تین مجہولوں بہنوں کی طرح چوراہے کے بیچ کھڑی تھیں۔ چپ چاپ آنکھیں بند کئے۔ آج کا دن بیرونی کام کرنے کے لئے موزوں نہ تھا۔ سگنل کنٹرول پر کام کرنے والے افراد، موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔

مارگلہ کی پہاڑیوں پر چھائے بادل لمحہ بہ لمحہ تاریک ہوتے جا رہے تھے۔ سورج نے بادلوں کی اوٹ سے جھانک کر دھرتی کی طرف دیکھا اور پھر غائب ہوگیا۔ کوؤں کی ڈار کائیں کائیں کرتی، ہوا کے رُخ پر اُدھر سے اِدھر نکل گئی۔ سیدپور کے ٹیلوں بٹوں پر چیونٹیوں کے خانہ بدوش قافلے پناہ گاہوں کی تلاش میں مصروف ہوگئے چیلوں نے پَر جوڑ کر ہوا میں غوطے لگائے اور پھر وہ درختوں پر بیٹھ، موسم کے فیصلے کا انتظار کرنے لگیں۔

کانسٹیبل شوکت، موسم کا مزاج دیکھ کر، برساتی ساتھ لایا تھا۔ جانے والے کانسٹیبل سے ہاتھ مِلا، اللہ کا نام لے، وہ جم کر چوراہے میں کھڑا ہوگیا۔ وہ نہایت اعتماد سے ہاتھوں کے اشاروں سے ہدایات دینے میں مصروف ہوگیا۔ بوندا باندی ہوئی اور تھم گئی۔ ہوائیں سائیں سائیں کرتے لگیں اور پھر خاموش ہوگئیں۔

دفعتہً، وہ سامنے سے ایک سُرخ رنگ کی موٹر سائیکل نمودار ہوئی۔ وہ اتنی تیزی سے دوڑتی آرہی تھی کہ خدا کی پناہ۔ موٹر سائیکل پر دو نوجوان سوار تھے۔ ان کی شوخ سُرخ رنگ کی قمیصوں کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ سر کے لمبے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہارن کی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ دونوں سوار شور مچا رہے تھے۔ غُل غپاڑہ۔ ایک آندھی۔ ایک طوفان۔ سب کو جان کے لالے پڑ گئے۔ پاپیادہ افراد لپک کر درختوں کی آڑ میں چھپ گئے۔ سائیکل سوار ہینڈل گھما کر فُٹ پر چڑھ گئے۔ نجی موٹر کاریں، سرکاری گاڑیاں، مسافروں سے بھری بسیں، سب کی سب کنارے ہو گئیں۔ خواتین کے دل دہل گئے۔ ننھے مُنّے بچے سہم گئے۔ کانسٹیبل شوکت نے سیٹی بجا کر موٹر سائیکل کو رُک جانے کا اشارہ کیا۔ موٹر سائیکل فرّاٹے بھرتی برابر سے نکل گئی۔ کانسٹیبل شوکت وائرلیس پر پیغام دینے ہی لگا تھا کہ موٹر سائیکل اسی تیزی سے واپس آگئی۔

سوار کے پیچھے بیٹھے نوجوان نے دوڑتی موٹر سائیکل سے ہاتھ لپکا کر دس روپے کا نوٹ کانسٹیبل شوکت کی طرف ہوا میں اُڑا دیا اور پھر چلّا کر کہا "یہ لو، رشوت خور"۔

جوگندر پال

عجیب و غریب

میں یہاں شاہراہ کی پٹری پر سارا دن مُردہ پڑا رہا ہوں مگر کسی نے دھیان نہیں دیا ہے۔ ابھی ابھی میری آنکھ آپ ہی آپ کھُلی ہے اور حیرت سے میری جان پر بنی ہوئی ہے کہ میں تو مر چکا تھا، پھر جی کیسے پڑا ہوں۔

شام کافی گاڑھی ہو چکی ہے اور سڑکوں کی بتیوں سے روشنی کے فوارے چھوٹ رہے ہیں اور راہگیروں کے انبوہ مخالف سمتوں میں اندھا دھند آ جا رہے ہیں: ایک دوسرے سے بے خبر، بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ــــ وہ آدمی چلتے چلتے اُس درخت سے ٹکرا گیا ہے اور اپنا سر سہلاتے ہوئے جوں کا توں آگے ہو لیا ہے، مانو اُس کی بجائے کوئی اور ہی سر سہلا رہا ہو ــ میں نے اپنے آپ کو بتایا ہے (کیا پتہ، وہ بھی میرے مانند ذیابیطس کا مریض ہو اور اپنے بغیر ہی چل رہا ہو؟

میں اپنے وجود کو گھسیٹ کر قریب ہی پٹری کے کنارے پتھر کے بنچ پر آ بیٹھا ہوں اور حواس کو یکجا کرنے کے لئے ایک لمبی سانس لے رہا ہوں۔

آج صبح گھر سے نکلتے ہی مجھے کھٹکا سا ہوا تھا کہ وہ میرے پیچھے لگ گیا ہے ــــ نہیں، مجھے معلوم نہیں وہ کون اور کیا ہے۔ کئی دفعہ میرے خون میں شکر کی مقدار ایک دم گر جاتی ہے اور وہ ـــ ہاں، ہمیشہ وہی ـــ میرے آگے پیچھے یا دائیں بائیں سے مجھے آ لیتا ہے ــــ نہیں، میں اُسے کبھی دیکھ تو نہیں پایا مگر مجھے یقین ہے وہ وہی ہوتا ہے۔ جب وہ میرے سر پر آ پہنچتا ہے تو خوف کے مارے میں اپنے اندر ہی اندر کہیں غائب ہو جاتا ہوں اور اگر چل رہا ہوتا ہوں تو میری

بجائے دہی چلنے لگتا ہے ۔۔۔ کئی بار تم مجھے کوئی اور ہی لگتے ہو شرون' بڑے پیارے ۔ شبتو کے بارے میں مجھے سدا یہی خوف لاحق رہا ہے کہ وہ بوگی کی آس پر میری محبت کا دم بھرتی ہے' اتنی میٹھی ہے کہ اکثر اپنی نظر بچا کے اُسے مُنہ سے لگا لیتا ہوں اور پھر پیشاب کی بجائے شربت خارج کرنے کی نوبت آتی ہے تو کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں کہ آئندہ احتیاط سے کام لوں گا، مگر کیا کروں ؟ احتیاط برت برت کر بدن میں شکر کا نشان بھی نہ رہنے تو سنبھالے کے لئے پھوکا اور پھیکا میٹھا ہی ساتھ دے تو دے۔

کاما سے بچاؤ کے لئے ڈاکٹر نے مجھے ہدایت کر رکھی ہے کہ اس نوعیت کی ایمرجنسی میں مجھے خوف محسوس ہونے لگے تو میں اطمینان سے مسکرانا شروع کر دوں اور مسکراتے ہوئے منہ میں میٹھی گولیاں ڈال لوں ۔ میں ہمیشہ میٹھا اپنے پاس رکھتا ہوں اور اپنے بٹوے کے بالائی خانے میں مَیں نے ایک ٹائپ شدہ نوٹ رکھا ہوا ہے ۔ اس میں اپنے نام اور پورے پتے کے علاوہ میں نے یہ اطلاع فراہم کر رکھی ہے کہ میں ذیابیطس کا مریض ہوں اور کہ میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں کچی شکر کی گولیوں کا پیکٹ رکھا ہے ۔ اس میں سے چند گولیاں میرے منہ میں ڈال دی جائیں گی تو مجھے ہوش آجائے گا۔

گھر سے تھوڑے فاصلے پر آکر مجھے یہ احساس بے چین کرنے لگا تھا کہ وہ ۔۔۔ ہاں ' وہی' اور کون ؟ ۔۔۔ میرے تعاقب میں چلا آرہا ہے ۔ میں نے گھبرا کر ہونٹوں پر ایک بے لباس مسکراہٹ لٹالی اور اپنا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف لے گیا تاکہ میٹھی گولیاں نکال کر منہ میں رکھ لوں ، مگر پھر میں یہ سوچ کر رُک گیا کہ بس میں بیٹھ کر کھا لوں گا' اور بس اسٹاپ کی جانب تیز تیز قدم بڑھانے لگا ۔ ایسے موقعوں پر مَیں ٹھیک سے سوچنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہوں ۔ سارا فسا د میرے اندرون میں بپا ہوتا ہے مگر مَیں فرطِ خوف سے مسکرا مسکرا کر اپنے آس پاس گھور رہا ہوں ۔۔۔ میں بڑی تیزی سے چل رہا تھا اور بار بار اپنے پیچھے دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان خاتون سے ٹکرا گیا اور حالانکہ میں چاہتا تھا کہ اس کی گری ہوئی اشیاء کو اکٹھا کرنے میں اُس کی مدد کروں ، میں ویسے ہی آگے چلتا گیا۔

"ایڈیٹ!"

"اسے سن کر خدا جانے مجھے کیا سوجھی کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک اور خاتون سے اپنے کئے کی معافی مانگنے کے لئے اُسے جھک کر سلام کرنے لگا۔ نہ اُس بے چاری کی سمجھ میں کچھ آیا، نہ میری سمجھ میں، اور ذرا سی ٹھہر کے تندی سے اچک کر وہ اپنی راہ ہولی۔ دربیں منہ لٹکا کر اپنی۔

اس وقت بھی میں اگر دو چار میٹھی گولیاں منہ میں رکھ لیتا تو بات بگڑنے سے بچ رہتی، مگر اُڑے اُڑے سے ہوش میں مجھے اس کے سوا کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا کہ کسی طرح بہ حفاظت بس میں جا بیٹھوں۔ میں نے ایک بار پھر اپنے پیچھے گھور کر دیکھا اور۔ بدستور مسکرا مسکرا کر مزید خوفزدگی سے اپنی رفتار تیز کرلی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جس سے خوف زدہ ہوں، وہ میرے ذہن میں بھی آگھسا ہے۔ اب تو جو کچھ کرنا تھا اُسی چھلاوے کو کرنا تھا۔

میں پتھر کے بنچ پر بیٹھا تعجب کئے جا رہا ہوں کہ ایک بار موت واقع ہو جائے تو کوئی کیونکر جی سکتا ہے۔ میرے ارد گرد روشنی کا فوارہ چھوٹا ہوا ہے اور سینکڑوں لوگ اندھا دھند ادھر اُدھر آ جا رہے ہیں اور مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ ہر ایک کے ذہن پر کوئی چھلاوہ قابض ہے اور وہ بے خبری میں جدھر بھی جا رہا ہے اُسی چھلاوے کی مرضی سے ہی جا رہا ہے۔ اسی اثنا میں ایک بے بس اور بے نام پلّا مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اپنی ننھی منی دم ہلاتے ہوئے میرے قدموں میں آ بیٹھا ہے اور میرے جوتے چاٹنے لگا ہے۔

ہوا یہ کہ پٹری پر چلتے چلتے میں بس اسٹاپ سے بھی بہت آگے نکل آیا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کدھر اور کیوں جا رہا ہوں۔ میرا سر متواتر گھوم رہا تھا اور آنکھوں میں دھند سی چھا رہی تھی اور ذہن میں نیند کے پٹ کھل رہے تھے۔ میں نے پوری کوشش سے اپنے آپ کو اپنے جسم کے سارے حصوں میں سے ذہن میں اکٹھا کر لینا چاہا اور اپنے آپ یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ فوراً کوٹ کی اندرونی جیب سے میٹھی گولیاں نکال کر منہ میں رکھ لوں ——

ہائیں! یہ کیا؟ —— میرے ہاتھ جیب کی طرف نہیں اٹھ پا رہے تھے —— میں نے پٹری پر سیوں راہگیروں پر نظر دوڑائی اور ہر کسی کے عقب میں لڑکھڑاتے ہوئے اُسے مخاطب کرنا چاہا ——

ارے بھائی! —— بھائی! —— مگر کسی نے میری طرف سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میرے ہاتھ بیرجواب

دیتے رہے تھے اور ہر لمحہ میرے لئے نہایت اہم تھا۔ آخر میں ایک شخص کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔ پلیز میری جیب میں سے ––– اُس بھلے انسان نے ہڑبڑا کر مجھے ایک طرف جھٹک دیا اور سرعت سے آگے بڑھ گیا۔

میں اس قدر بدحواس ہو چکا تھا کہ ایک اور شخص کو روکنے کی بے تاب کوشش میں میں نے اپنے آپ کو اُس پر گرا دیا اور ––– اور جہاں مجھے وہ نظر آرہا تھا، وہاں دراصل کوئی تھا ہی نہیں۔ میں آنکھیں پھاڑے تا دیر وہاں دیکھتا رہا اور پھر ہول سا محسوس کر کے بے اختیار چلانے لگا ––– اے لوگو، خدا کے واسطے! ––– کوئی خدا کے واسطے میری جیب سے گولیاں نکال کر میرے منہ میں ڈال دو! ––– بچاؤ ––– ! ––– شاید میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں، ورنہ اتنی بھیڑ میں سے کوئی تو میری طرف متوجہ ہوتا ––– شاید وہاں کوئی موجود ہی نہ تھا۔ کیا پتہ، میرے منہ سے آواز ہی نہ نکل رہی ہو اور بدحواسی میں میں اپنے اندر ہی اندر چلائے جا رہا ہوں ––– یا کیا پتہ، کیا؟

پلا اچھل کر میری گود میں آبیٹھا ہے اور مجھے سونگھ سونگھ کر میرے وجود پر اس طرح منہ مار رہا ہے جیسے میں کوئی لذیذ شئے ہوں۔ میں نے پیار سے جھک کر اپنے گال اُس کے مُنہ کے ساتھ جوڑ لئے ہیں، مگر یہ خیال مجھے ابھی تک بے چین کئے ہوئے ہے کہ اگر میں واقعی مر گیا تھا تو پھر جی کیسے پڑا۔

اپنی دانست میں میں پٹری پر لڑکھڑاتے ہوئے بدستور چلائے جا رہا تھا ––– او بھائی لوگو! کوئی تو –––

ایک نوجوان کے اچانک رک جانے پر میری جان میں جان آئی۔ میں نے اپنے آپ کو اُس کی طرف کھینچ کر اپنی اندرونی جیب کی طرف اشارہ کیا۔

وہ نوجوان اپنا ہاتھ بڑی سرعت سے میری اندرونی جیب کی طرف لے گیا اور میرا بٹوا نکال کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ارے بھائی! ––– اے لوگو! –––

نامعلوم مجھ میں کہاں سے اتنا دم پیدا ہو گیا کہ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑنے لگا –––

نہیں، میں کہاں دوڑ سکتا تھا؟ یہ وہی تھا — وہی، اور کون؟ — جو میری اس حالت میں میری بجائے چل رہا ہوتا ہے۔ چند قدم پر ہی اُس نے میرے وجود کا بوجھ وہیں جھٹک دیا اور اُس نوجوان کے تعاقب میں غائب ہوگیا، اور میں ڈھیر کا ڈھیر نیچے آ گرا۔

پلّا میرے کندھوں پر چڑھ کر میرے منہ میں منہ ڈال رہا ہے اور مجھے بہت بھلا معلوم ہو رہا ہے۔

مجھے سوفی صد یقین ہے کہ پٹری پر گرتے ہی میرا دم نکل گیا تھا — موت؟ — موت کیا دوں؟ اتنی گہری نیند دم نکلنے کے سوا کب آتی ہے؟ — اور پھر میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے اُسے جو دیکھ لیا — وہ کون؟ — اور کون؟ — جمِ دُوت! — وہ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا اور اُٹھنے کو کہہ رہا تھا — چلو، چلیں! — میں کیوں کر اُٹھتا؟ سو اُس سے کہنے لگا، پہلے میری جیب سے چند میٹھی گولیاں میرے مُنہ میں ڈال دو۔ اُس نے مجھ پر جھک کر میری جیب سے گولیوں کا پیکٹ نکالا اور بڑے پیار سے ایک ایک کر کے دو چار میرے منہ میں ڈال دیں اور انتظار کرنے لگا کہ میں اُٹھ کر اُس کے ساتھ ہولوں، مگر گولیاں چوسنے چوسنے میں از سرِ نو سانس لینے لگا —!

پلّا میرے کندھے سے سر کی طرف جاتے ہوئے بار بار پھسل رہا ہے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا ہوں کہ اُسے اُٹھا کر سر پہ بٹھاؤں کہ ایک پولیس والا لاٹھی لئے میرے سر پہ کھڑا ہوا ہے۔

"تم ہی یہاں سارا دن نشے میں دُھت پڑے رہتے ہو؟"

میں گھبرا کر بنچ سے اُٹھ کھڑا ہوا ہوں اور پلّا بے چارہ نیچے آگرا ہے اور مجھے معلوم نہیں میں نے پولیس والے کو کیا جواب دینے کے لئے مُنہ کھولا ہے۔

"چلو، جو بیان دینا ہے تھانے میں چل کر دو۔"

"مگر —"

"نہیں، تھانے میں۔"

میں نے جھک کر چیختے ہوئے پلّے کو اُٹھا لینا چاہا ہے۔

"نہیں، اکیلے آؤ۔ چلو۔"

اس جمِ دُوت کے ساتھ ہوتے ہوئے مجھے خیال آیا ہے، نہیں، میں جی کہاں پڑا ہوں؟ میں موت کو ذرا بھولے ہوئے تھا۔

الطاف فاطمہ

بے قامت لوگ

جب دُتے نے مجھ سے ذکر کیا کہ پرے میدان کے ادھر سے جو بڑا نالہ ہے ناجی ... نالے کے ساتھ ساتھ سرکنڈوں کے جھنڈوں کی اوٹ میں ایک بابے نے جھگی ڈالی ہے جی ... وہ توقف کے بعد پھر گویا ہوا ”صاحب جی! کہتے ہیں پہونچا ہوا بابا ہے“۔

تو میں جو صحن میں کرسی ڈالے اخبار آنکھوں سے لگائے چھٹی والے دن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی بات سن کر کچھ بھڑک سا گیا۔ اخبار نیچا کر کے میں نے اُسے ڈانٹا۔

”دیکھ دُتے! تو ان بابوں شابوں کے چکر میں نہ پڑ جانا۔ بڑے وہ ہوتے ہیں۔ کوئی پہونچے وہونچے ہوئے نہیں ہوتے .... الٹا اگلے کو کہیں کا کہیں پہونچا دیتے ہیں“۔

دُلا ہمارا دودھ والا تھا تین پشتوں سے اس کے یہاں اس کا دودھ اس گھر میں لگا ہوا تھا۔

چھ فٹ تین انچ کا سیدھا تاڑ جیسا قد اکہرا جسم اور چوڑے شانے اس کی سانولی رنگت اور لمبی لمبی سیاہ آنکھوں سے بے فکری اور آسودگی پھوٹ پھوٹ کر دمکتی تھی۔

جستے سے بنی دودھ کی بڑی سی کین اٹھا کر چلنے لگا تو میں نے پھر ٹوکا....

”سن لیا ہے نا۔ خبردار .... ہاں میں نے کہہ دیا ہے پھر تجھے لینا دینا بھی کیا ہے۔ ان جیسوں سے، تیرے خدا نے تجھے کچھ کم دیا ہوا ہے۔ پھر بیاہ تیرا ہو گیا، منڈا تیرے ہو لیا .... مجال تیری ایک کے بعد ایک سوہتی رہتی ہیں“۔

جاتے جاتے وہ رکا اور اعتراف کیا۔

"ناں جی! مجھے کیا لینا دینا۔ رب نے بہت کچھ دے رکھا ہے جی بڑا فضل ہے اس کا۔"
میرے سامنے وہ رَجا پُجا کھڑا تھا۔ دودھ کی بالٹی اٹھائے وہ صحن سے نکل گیا۔ لیکن مجھے پتہ تھا۔ اس کے دل میں کیا ہے اور اس کیا ہے کی امیجری کچھ یوں بنتی تھی۔ اب اس نے ہماری چوڑی اور صاف ستھری گلی کے نکڑ پر کھڑی ریڑی پر پیتل کی دودھ کی خالی گاگریں اور جستی بالٹیاں لادی ہیں خود اچھل کر گھوڑے کی باگیں تھام کر بیٹھ گیا ہے۔ اس کا (عام ریڑی کھینچنے والے گھوڑوں سے مختلف) چاق چوبند اور خوبصورت گھوڑا۔ ٹاپ۔ ٹاپ۔ ٹاپ کرتا۔ اب سڑک پر آگیا ہے۔۔۔۔
اب وہ نالے والے میدان کی طرف مڑ گیا ہے۔ نالے کے ساتھ ساتھ چلتا چلتا اب سرکنڈوں کے جھنڈوں میں چھپتا جا رہا ہے اور "جھگی" سے کچھ فاصلے پر اس نے گھوڑا روک لیا ہے اور خود کود کر اترا ہے۔

لٹھے کی دودھ جیسی سفید چادر اور ململ سے "سرمئی" کہتے ہیں وہ سیدھا تاڑ سا قد لئے کھڑا ہوا ہے اس نے اپنے پیروں سے چمڑے کا تلّے والے کام کا جوتا اتارا ہے مودب اور عقیدت میں ڈوبا پیتل کی دودھ والی گاگر اس نے اتار لی ہے اور اب وہ "جھگی" میں داخل ہو گیا ہے۔ گاگر اس نے بابا کے قدموں میں رکھ دی ہے اور خود کچے فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا ہے۔
میں نے بے حد کوشش کی کہ اس امیجری میں باباجی کا واضح چہرہ مہرہ نہ سہی پیکر ہی نظر آئے۔۔۔ مگر مجھے وہاں کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔۔۔ باباجی کے مقام پر ایک خلا ہے البتہ وہ جیسے کسی کے حضور سر جھکائے سرنگوں بیٹھا کہتا ہے۔
"باباجی۔۔۔ دعا کریں۔۔۔ مجاں کو شہر میں لانے کی منا ہی ختم ہو جائے۔۔۔ "سانوں مجاں لانی دی اجازت مل جائے۔"
ہاں مجھے پتہ ہے یہی آرزو وہ لے کر گیا ہے۔ کئی برسوں سے رہ رہ کر وہ افواہ کے طور پر یہی خبر سناتا تھا۔
"صاحب جی کہتے ہیں مجاں شہر وچ واپس لانی دی اجازت ہو گئی ہے۔ وہ سرگوشی میں پوچھتا۔
کبھی وہ اپنا خواب سنانے لگتا، جو کچھ یوں ہوتا کہ مجاں شہر میں آچکی ہیں۔ آموں کے

باغ والے پچھواڑے میں کچے کوٹھے اور بھینسوں کے باڑے تیار ہو رہے ہیں۔ ہر شخص کی اپنی اپنی ایک آرزو ہوتی ہے۔

ڈُتے کے جی میں بھی تو آخر ایک نہ ایک تمنا کو گھر کرنا ہی تھا۔

ہاں بس وہ بھی ایک سوال لے کر گیا ہے مجھے یقین تھا۔

پھر دل کو تشویش سی ہو گئی ... وہ بابا کوئی چکر ہی نہ چلا دے۔ ہاتھ نہ کر جائے اس کے ساتھ یہ نہ ہو کہ کالا مرغ قبرستان میں اور کالا بکرا میدان میں چھوڑنے کی فرمائش کر دے جہاں اس کے بندے لگے ہوں مرغ اور بکرے کو گھیرنے کے لئے۔

پھر فرمائشوں کا تانتا ہی لگ جائے۔

اور .... اور .... پھر اور ....

ایک اور تشویش ہوئی جو اس سے بھی زیادہ وحشت ناک تھی کوئی منشیات وغیرہ کا چکر نہ چلا دے۔ اچھی اونچی اٹھان کا پاک صاف ستھری عادتوں والا جوان ہے۔

اور ... اور پھر اس کے گلے میں تو کالے ڈورے میں پلا ہوا سونے کا تعویذ بھی پڑا ہے۔

تشویش بڑھتی گئی۔

ڈُتے کی تین پشتوں نے ہمارے بڑوں کو دودھ پلایا تھا اس کی حفاظت میرا فرض ہے۔ بابا کا پتہ کرنا چاہیئے۔ اس کو پرکھنا ضرور ہے کچھ ایسی۔ ویسی ہو گئی تو .... تو .... سوچ کر ہی دل لرز گیا تھا۔

سو میں نے طے کر لیا کہ اگلے جمعہ کو باباجی پر ایک طرح کا چھاپہ مارنا ضرور ہے۔ آٹھ دن تو میرا ڈُتے سے سامنا ہی نہ ہوتا۔ البتہ جمعہ! پر جمعہ تک تو بابا کے سارے بخیئے ....

لیکن دل میں اندر سے عجیب سی ندامت بھری جا رہی تھی۔ ڈُتے کا تو محض بہانہ ہی ہے۔ تمہارے اپنے اندر بھی کوئی حاجت ہے... کوئی طلب... کوئی الجھن۔ ڈُتے کی آڑ لینے کے بجائے اپنے آپ کو اندر سے ٹٹولو۔

یا پا تو بعد کی بات ہے اپنے آپ پر چھاپہ ڈالو پہلے ۔ جو . . . جو دن سرک رہے تھے یہ ندامت یہ آواز اندر ہی اندر بڑھتی جاتی تھی ۔ جیسے اس نے مجھے آکاس بیل کی طرح اندر ہی اندر جکڑ لیا ہو۔

مجھے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا جیسے یہ آواز بابا کی ہے ۔ جیسے وہ اپنی جھگی میں بیٹھے بیٹھے ہپنوٹائز کر رہا ہے ! مجھے جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی ۔ کبھی اپنے آپ پہ کبھی بابا کی ذات پہ جسے میں نے ابھی دیکھا بھی نہ تھا۔

بالآخر وہ جمعہ بھی آ گیا۔

چپ چاپ میں نہایا دھویا ۔ سفید کرتا شلوار ریب تن کیا ۔ خس کا عطر گریبان میں لگایا ۔ دھیرے دھیرے چلتا میدان پار کر کے نالے کے ساتھ ساتھ گئے سرکنڈوں کے جھنڈ سے گزرتا ہوا ۔ اندر داخل ہوا ۔ جھگی کیا تھی ۔ پھوس اور ٹہنیوں سے بنائی تین دیواروں پر موٹا سا چھپر چھایا ہوا تھا . . . جس کا اسارا عین وسط میں گڑا ہوا تھا ۔ کچا فرش لپا ہوا . . . اور صاف ستھرا کھجور کی ایک صف پر بابا جی بیٹھے تھے ۔ سامنے کاٹھ کی رحل تھی جس پہ قرآن دھرا تھا ۔ اندر داخل ہونے سے پہلے پہلے میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تاڑ لیا تھا نہ کوئی مرغ نہ کالا بکرا ۔ نہ دھونی دینے کا سامان ۔ البتہ جھگی کے ایک گوشے میں کاٹھ کے چوکھٹے پہ ایک پانی کا گھڑا رکھا تھا ۔ دوسرے گوشے میں مٹی کا لپا پتا اجلا اجلا چولہا ، روشن تھا ۔ مٹی کی ہانڈی میں دال پک رہی تھی ۔ ایک لمحہ کو میں اس چولھے کو دیکھ کر سب کچھ بھول گیا ۔ ایسے چولھے اور اس میں جلتی لکڑی کی مہک اور چٹک کیسی خاموشی سے ہماری زندگیوں سے نکل گئی ۔ پوری جھگی چیڑ کی سلگتی لکڑی اور مسور کی پکتی دال کی خوشبو سے مہکتی تھی ۔

بس یہی کل کائنات تھی جو مجھے یہاں نظر آئی تھی اور ہاں ایک طوطا بھی تھا جو بے قید جھگی میں پھرتا تھا ۔ البتہ بولتا بالکل نہ تھا ۔

اور . . . اور یہ جو صف ہے نا . . . اصل راز تو اس کے تلے ہی سے نکلے گا ۔ میں نے خود کو دوبارہ شک میں مبتلا کرنا چاہا اور . . . اور . . . یہ جو . . . یہ جو قرآن سامنے دھرا ہے نا کیا پتہ محض دکھاوا ہو . . . اور پڑھنا ہی نہ آتا ہو . . . میں نے اپنے متزلزل ہوتے ہوئے

خیال کو مضبوط کرنا چاہا۔

شاید میرے قدموں کی چاپ سنی تھی۔

نظر اٹھا کر دیکھا۔

نگاہ میں اندر آنے کا اذن تھا۔

میں جھک کر جوتا اتارنے ہی کو تھا کہ اشارہ کر دیا۔

گویا فرماتے ہوں۔

"آجاؤ... اندر... جوتے کا تکلف کیا ضرور ہے!"

سو میں جوتا اتارے بنا ہی اندر چلا گیا۔

سن رکھا تھا... کہ باباؤں کی لمبی لمبی جٹائیں ہوتی ہیں۔ منہ سے کف اور رال ٹپکتی ہے بات کرتے میں تھوک اڑتا ہے۔ آنکھوں میں سختی اور سرخی عام رہتی ہے... انگلیوں میں رنگ برنگی نگینوں والی انگوٹھیاں، گلے میں مالائیں... آزو بازو سر مارتے حق... ہو... حق کرتے ہوئے بڑھے ہوئے گندے اور چیل کی چونچوں جیسے ناخون...

مگر... یہ کیسا بابا تھا۔ جس نے مُجھے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ صاف ستھرا لباس چھوٹی سی کتری ہوئی ڈاڑھی اور ٹھیک ٹھاک بال۔

مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر کلام پاک کو گردان دیا۔

آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نظر جھکالی۔

میں بھی نظریں جھکائے گردن ڈالے بیٹھا رہا۔

کافی دیر گزر گئی نہ وہ بولے نہ میں بولا۔

کوئی بیزاری، آوازاری بھی محسوس نہ ہوئی۔

پھر میں اٹھا۔ اجازت چاہی۔

وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے مصافحہ ہوا۔ مسالمہ ہوا۔

اور میں باہر نکل گیا۔

کوئی حاجت۔ کوئی طلب ہوتی تو بیان کرتا۔

پر اتنا اطمینان ہو گیا کہ وُلا محفوظ ہے . . . چاہے ہزار بار آئے قطعی اور ہر طرح محفوظ ہے۔

بات آئی گئی ہو جاتی۔ پر کیسے؟ کہ ہفتے کے دن اپنے معمول پر آگئے کو سر کے تو ہر سرکنے والے دن کے ساتھ رہ رہ کر ایک خیال سا پیدا ہونے لگا۔ دل میں تکرار سی ہوئی۔ اس جھگی میں کیسی سوندھی سوندھی سی خوشبو آتی تھی اتنی کہ اپنے گریبان میں بسی خس کی مہک ماند پڑ گئی۔ رہ رہ کر گمان گذرتا کہ جیسے کسی نے حمام کی مٹی مٹھی میں تھما دی ہو۔ اور رہ رہ کر جیسے کوئی تکرار کرتا ہو۔

مشکی یا عبیری کہ از خوشبوئے دل آویز تو مستم مستم مستم۔

خیر یہ تو میں خوب جانتا ہوں کہ آدمی جو کچھ بھی سوچنے لگے تو وہی خیال پک جاتا ہے۔ اور احساس بن جاتا ہے۔ لیکن شاید مٹی کی وہی سوندھی سوندھی مہک مجھے کھینچتی تھی۔ اس نے مجھے کھینچا اور پھر کھینچا۔

ہیں آنا جانا تھا۔ بات چیت بھی ہونے لگی تھی۔

بات بھی کیا ہوتی . . . اول تو بولتے ہی کب تھے من گھنے سے نظر آتے . . . بس ایک یوں ہی عام سی گفتگو کبھی موسم پر کبھی گرد و پیش پر کبھی کسی آسمان پر اُڑنے والے کسی پرندے پر۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک بات مُنہ سے نکل گئی۔

شاید میں نے استفسار کیا ہو کچھ یاد نہیں . . بس یہ یاد ہے کہ میں نے کہا۔

"حضرت ایک عجیب سا احساس ہے جو مجھے پیستا رہتا ہے۔ کچلے ڈالتا ہے۔ شرمسار رکھتا ہے۔"

پھر میں نے رک کر پوچھا تھا۔

"حضرت آپ متوجہ تو ہیں نا"

"بالکل . . . بالکل" جیسے مراقبے میں سے بولے ہوں۔

میں نے پھر عرض کیا۔

"ایک احساس ہے عجب سا . . . جیسے چار طرف کشیدہ قامت . . . بلند و بالا لوگ ہیں۔ جدھر کو دیکھتا ہوں کوہ پیکر اجسام اور ان سب کے درمیان میں ہوں اپنی بے قامتی کے

ساتھ کچھ نہ ہونے کا احساس۔۔۔" میری بات مکمل ہونے سے پہلے۔۔۔چونکے ایک نرم نرم نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"سبحان اللہ"۔۔کھڑے ہوئے۔

"سبحان اللہ" بیٹھ گئے۔

پھر کھڑے ہوئے۔۔۔"سبحان اللہ۔ بے قامتی۔۔۔اپنی بے قامتی کا احساس"۔ آواز جیسے کہیں دور سے آتی ہو۔

"حضرت مجھے خوف آتا ہے۔۔۔" "میں ہراساں ہوتا ہوں"۔

میں نے دوبارہ بات شروع کی جیسے میں ابوالہولوں۔۔۔اور اہراموں کے درمیان گھر گیا ہوں اور بے قامت ہو گیا ہوں۔۔ابوالہولوں۔۔۔اور اہراموں کے درمیان۔۔یعنی تراشیدہ، پتھرائے ہوئے پیکر۔ دوسروں کے ہاتھوں دی ہوئی قامتیں۔۔۔اور جو ان کے درمیان بھی اپنی بے قامتی کے احساس کے باوجود پھر بھی ڈٹا رہے۔۔۔پیر جمائے کھڑا رہے کتنی بڑی اور عظیم بات"۔

یہ پہلی بار تھی جو میں نے ان کو تیزی سے ٹہلتے اور بے ربط جملے ادا کرتے دیکھا اور سنا۔۔۔ میں سرنگوں بیٹھا رہا ان کی ٹوٹی ٹوٹی ڈوبی ڈوبی آواز کان میں پڑتی رہی۔

"اور۔۔۔اور ایک میں ہوں۔۔۔کہ اتنی ذرا سی بات کو بہت بڑا اسرار سمجھا۔۔۔ اور دربدر ہوا۔۔۔اور یہ سوال۔۔۔جب بھی۔۔۔جب بھی دھیان میں نہ آیا۔۔۔ایک بہتے کہ بستیوں آبادیوں اور دنیاداری کے ابوالہولوں کے درمیان۔۔۔کھڑے ہیں۔ آپ اپنے قدموں پر"۔

"لیکن حضرت یہ سوال اور اس کا انکشاف تو آپ کے روبرو ہو کر میرے اندر واضح ہوا انہیں نے ڈرتے ڈرتے آواز نکالی کہ اس وقت ان کا جلال اور شکوہ اپنے منتہا پر تھا۔

مگر وہ اپنے آپ میں بولا کئے۔ میں بھی بولتا رہا۔

حضرت میں آپ کے روبرو بیٹھا تو یہ احساس میرے سامنے یوں نمایاں ہوتا جیسے ٹیلیویژن کی اسکرین پہ بار بار لکھے ہوئے الفاظ میرے سامنے آتے ہوں"۔

"میں ... میں ... میرے روبرو؟ ..." وہ بیٹھے اور اٹھ کر پھر ٹہلنے لگے .....

"میں ... میں گناہ گار اتنی سی بات نہ کھوج پاتا تھا ... میرے روبرو! نہیں حضرت آپ خود اپنے روبرو ہوئے ... چلو خیر ... ایک بات تو ہوئی ... ہم ... یعنی ہم بے قامت لوگ ..." آواز اب بہت نحیف ہو گئی تھی اور بہت فاصلے سے آتی معلوم ہوتی .....

وہ بیٹھ گئے مراقبے کے عالم میں۔ وہ اور میں ایک دوسرے کے روبرو گردن نیہوڑائے بیٹھے رہے پھر میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ سوچتا تھا میں نے ناحق بے چین کیا حضرت کو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بڑے لمبے سفر سے واپسی ہوئی ہو۔ بہت گہرے نشیبوں سے چڑھائی کرتا کرتا کسی چوٹی کو سر کرنے کے بعد والی تکان سے دوچار ہوں۔ دو دن ہو گئے تھے دفتر ہی نہ جا سکا گھر ہی میں چادر لپیٹے دھوپ میں لیٹا رہا۔ کوئی دس بجے کے قریب دُلّا اپنی بالٹی لٹکائے گھر میں داخل ہوا ... میرے سرہانے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

"صاحب جی خیر تو ہے ... آج کیسے لیٹ گئے دفتر نہیں گئے۔"

"دُلّے! تھک گیا تھا۔ بہت ..."

میں نے دیکھا دُلّے کی آنکھ میں میرے لئے فکرمندی تھی۔

"اللہ رحم کرے جی!"

میں اُس کو حوصلہ دینے کی خاطر بیٹھ گیا اور اُس کو بہلانے کو بولا۔

"اور سنا ... دُلّے ... سب ٹھیک ٹھاک تو ہے۔"

"ناجی! کیا ٹھیک ٹھاک ..." ایک دم وہ افسردگی سے بولا۔ "صاحب جی میں نے ایک بار بولا تھا نہ کہ میرے میدان کے اور لے والے نالے کے ساتھ ساتھ والے سرکنڈوں میں ایک باباجی نے جھگی ڈالی ہے ... (دُلّا سمجھ رہا تھا کہ میں نے تو کبھی اس جھگی تک جانا تو ایک طرف اس کا خیال بھی نہ کیا ہوگا) صاحب جی! وہ باباجی جھگی چھوڑ گئے ..." یہ کہتا کہتا وہ ڈر گیا تھا اس خیال سے کہ میں اس کو ڈانٹوں گا کہ پھر تو باباؤں شاباؤں کے چکر میں پڑا۔

لیکن جب میں نے چونک کر سوال کیا۔

"اچھا! کب!"

تو وہ حوصلہ پا گیا کچھ اور آگے سرک آیا اور بالکل میرے مُنہ کے قریب مُنہ لا کر بولا۔

"صاحب جی۔ رب دی سوں جدوں کا میں ریڑھی ادھر سے لے جا کر سلام کرنے لگ پیا تھا۔ وڈی برکت ہون لگی سی... سوں رب دی میں کدی چلو دودھ بھی موڑ کے نہیں لے گیا... سارا کا سارا یوں (چٹکی بجا کر) وِک جاندا سی"۔

اور اب اس کی آنکھوں میں بڑا گہرا ملال تھا...

"ہو سکتا ہے نہ ہی گیا ہو... تیرا وہم ہی ہو..." میں نے بڑی آس سے کہا۔

"نہیں جی چھڈ گیا جھگی میں کل سلام کرن واسطے گیا تو پتہ چلا۔ بابا جی تھاں چھڈ گیا"۔

بڑے اشتیاق اور سرگوشی میں کہتا گیا۔

" صاحب جی... صف ویسی کی ویسی پھیلی ہوئی۔ گھڑا... مٹی کا بدھنا... دال کی ہانڈی چولھے پر دھری ہوئی۔ صف پر رحل رکھی ہوئی..."

وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے کہا۔

" ڈُنے وہیں کہیں ہو گا پھر تو... ہو سکتا ہے رفع حاجت"۔

"ناجی نا... اس نے بات کاٹی۔ رحل پر قرآن نہیں تھا ناجی بس اوہی چک کے لے گیا"۔ اس نے ایک گہری سانس لی "عجب خشبو والا بابا سی... صاحب جی جھگی بس ایسی سوندھی سوندھی مہک پھیلتی تھی۔ اور پھر سرگوشی میں بولا۔ "کسم ہے اللہ دی کدی کچھ پیش کرنے کی ہمّت ہی نہ ہوئی، حوصلہ ہی نہ پڑا کتنا میرا جی کرتا تھا۔ ایک پیالہ دودھ تو پیش کر دوں مگر ہمّت ہی جواب دے جاتی.. "

" پھر جاتا کیوں تھا؟" .. میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"بس صاحب میں کب جاتا تھا کوئی چیز تھی مجھے کھینچتی تھی بس میں اندر وڑ جاندا۔ سلام کردا ہور اُلٹے قدموں لوٹ اندا سی"۔

"کیوں۔ ٹھیرتا کیوں نہ تھا" میری بھی آواز جیسے فاصلے سے آتی تھی۔

"بس صاحب اپنا آپ اتنا چھوٹا... خاک کے ذرے ورگا لگتا ہور... ہور"

میں اٹھ کھڑا ہوا... ٹہلا... تو.... دُتے تو نے بھی ایسا سوچا.. دُتے تجھے بھی اپنی بے قامتی کا احساس... جی صاحب جی! میں شاید زور سے بولا تھا۔ اسی لئے اس نے دبک کر کہا۔

"صاحب جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے۔؟"

"ہاں دُتے! ہم... وہ ہم کو بتانے آیا تھا۔"

وہ ہونق ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں لرزتا چارپائی پر گر گیا۔

"صاحب جی! کیا بات ہے؟" وہ مجھ پر تشویش سے جھکا۔

"دُتے بیگم سے لحاف مانگ مجھ پر ڈال دے مجھے جوڑی چڑھ رہی ہے۔"

اس نے مجھے لحاف میں دبکاتے دبکاتے سوال کیا۔

"صاحب جی! وہ ہمیں کیا بتانے آیا تھا؟"

"یہی کہ ہم بے قامت لوگ ہیں... لیکن اس احساس کے باوجود ہمیں اپنی جگہ پر قدم جمائے رہنا ہے۔"

یہ کہتے کہتے مجھ پر غفلت سی طاری ہو گئی۔

اختر جمال

کاجل

آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں، اونچے درخت، ہر رنگ، نسل، مذہب اور قوم کے لوگوں کا ایک سمندر جو تینوں طرف سے ایک بڑے سمندر میں گھرا ہوا ہے جس کا نام بحرِ ہند ہے۔

ایک طرف جب نظر جاتی ہے تو لگتا ہے کہ حسن، امارت، نفاست، سلیقہ اور تہذیب کا نام بمبئی ہے اور دوسری طرف جب نظر جاتی ہے تو یہ لگتا ہے کہ بدصورتی، غربت، گندگی اور گھناؤنے پن کا نام بمبئی ہے۔ یہ شہر تضادوں کا مجموعہ ہے ایک طرف کروڑپتی اور لکھ پتی ہیں دوسری طرف بے کار اور بے روزگار، فاقہ کش اور بے گھر لوگوں کی قطاریں۔

بارش میں بس ایک چھتری آدمی کے پاس ہونی چاہیئے۔ اگر چھتری ہے تو اسے کسی فٹ پاتھ پر لگا کر اس کے نیچے وہ رات گزار سکتا ہے۔ دن میں اپنی سائیکل کے اوپر فٹ کر کے وہ اس چھتری کے نیچے چھوٹی سی باطلی کی دوکان لگا لیتا ہے کنگھے، ہیئر پن، بٹن اور مٹھائی کی گولیاں ـــ اس شہر میں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ گھر کسے کہتے ہیں۔ بس جہاں بیٹھ گئے وہی جگہ گھر ہے، جس عورت کے ساتھ سو لیئے وہی بیوی، جس بچے کو پیار سے گود میں اٹھا لیا وہی اپنا بچہ ـــ یہ دوڑتی، بھاگتی چیختی، چلاتی بمبئی: لوکل ٹرین میں ہزاروں رنگ برنگے چہرے لٹکتے نظر آتے ہیں۔ ٹرینیں ہی ٹرینیں۔ بسیں ہی بسیں، قطاریں ہی قطاریں، لوگ ہی لوگ۔

برسہا برس پہاڑوں کی تنہائی میں گزار کر میں آدمیوں کے سمندر میں بوکھلاسی گئی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی یا چھوٹی بہن کے ساتھ جب بس میں سوار ہوتی تو ایسا لگتا جیسے ایک ننھی سی بچی اپنے کسی بزرگ کی حفاظت میں سفر کر رہی ہے جسے یہ نہیں معلوم کہاں اترنا ہے۔ کہاں چڑھنا ہے، کونسی بس پہنی ہے اور کونسی لوکل ٹرین ــــ بس جہاں وہ اتریں وہیں اتر جانا چاہیئے جہاں وہ لے چلیں وہیں جانا چاہیئے۔ آنکھیں کھول کر بھی آنکھیں بند کر کے سفر کر رہی تھی۔ دماغ کو تالا ڈال کر روح کو جسم کے ہینڈ بیگ میں حفاظت سے پکڑے چل رہی تھی۔

میری نظر دوڑتی بھاگتی عمارتوں پر جاتی، کبھی دوسری سمت سمندر کی موجوں کو سر اٹھا اٹھا کر ساحل سے فریاد کرتے اور چپکے سے لوٹ جاتے دیکھتی۔ بادلوں کے ٹکڑے کبھی برس پڑتے اور کبھی ذرا سی دیر کو ٹھٹک کر چپ چاپ دم سادھ لیتے۔ اکثر سب کے ساتھ گھومتے پھرتے میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتی کہ ہم نے اتنی دور دور زندگی گزاری ــــ زندگی جو یوں بھی اتنی مختصر سی چیز ہے ــــ پانی کا بلبلا! ہم سگے بہن بھائی ہو کر بھی ایک دوسرے کے سکھ دکھ، رنج، خوشی کسی میں شریک ہونا تو الگ۔ رہا خط و کتابت تک سالہا سال نہ کر سکے۔ ایک آنگن میں اٹھارہ برس اکٹھے گزار کر پھر تقدیر نے ہمیں اتنا دور دور اور الگ کر دیا جیسے ہم کبھی ایک گھر اور ایک آنگن میں اکٹھے ہی نہ ہوئے تھے۔ جیسے وہ بچپن بس ایک خواب ہی تھا۔ اور اب سالہا سال بعد وہ چہرے مجھے یقین دلا رہے ہیں کہ نہیں، وہ بچپن خواب نہیں، ایک حقیقت تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ ان چند سالوں میں کیسے کیسے خاندان اور کنبے ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے ہیں۔ ماں بنگلہ دیش میں ہے، باپ کھٹمنڈو میں، بھائی پاکستان میں اور بیٹی لاپتہ ہے۔ ان گنت دکھ بھری کہانیاں ــــ میرے چاروں طرف کرب سے بے چین دھواں دھواں سے وجود ہیں۔ پھر آخر میں اپنی ذات کا کیوں سوچ رہی ہوں۔ ہم جیتے جی بچھڑ گئے تو کیا ہوا؟ انسانوں کے اس سمندر میں چند لمحوں نے ہمیں یکجا تو کر دیا ہے اور میں ان خوبصورت لمحوں کے لئے خدا کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

ہم سب زندہ ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے خوب صورت بچوں کو میں سینے سے لگا سکتی ہوں۔ پیار کر سکتی ہوں اور یہ جیتے جاگتے لمحے خواب نہیں، بالکل زندہ حقیقت ہیں۔ ہمارے ارد گرد اتنا غم ہے کہ اس میں ہمیں اپنے غم کے متعلق سوچنے کا بھی حق نہیں۔ مجھے ان لمحوں کی بخشی ہوئی خوشی کی قدر کرنی چاہیئے۔

ایک بس سے دوسری بس، دوسری سے تیسری بس، پھر لوکل ٹرین۔ سفر ہی سفر — ایک شہر میں فاصلوں کا اتنا جال — مگر یہ ایک شہر کہاں — یہ تو شہروں کا مجموعہ ہے۔

میں ایک دن اسی طرح لوکل ٹرین میں جب اسٹیل کے ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑے ہچکولے کھا رہی تھی تو میری نظر کاجل پر پڑی۔ جب ہماری نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو کاجل لوگوں کی بھیڑ کو تقریباً پھلانگتی ہوئی میری جانب بڑھی اور گلے لگ کر رونے لگی — میں دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بولی "کاجل، کیسی ہو؟" — آنسو ہی آنسو، کوئی بات اس کے منہ سے نہ نکلی — "ارے بھئی، بات تو کرو۔" میں اس کے رونے سے پریشان ہو گئی۔ میں نے اسے بھائی کا پتہ سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم آنا، مجھ سے ضرور ملنا۔ آخر تم کہاں —؟" وہ اس طرح رو رہی تھی جیسے سننے سے بھی معذور ہے۔ میرے بھائی نے جلدی سے کاغذ پر پتہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "کاجل، خدا کے لئے بات تو کرو۔"

چند لمحے گزرنے کے بعد لوکل ٹرین ٹھہرتے ہی کاجل تیزی سے نیچے اتر گئی —

"مجھے بائیکلا اترنا ہے۔" وہ جاتے ہوئے چلا کر بولی۔ پھر اس نے ہاتھ ہلا کر کہا "میں ضرور آؤں گی۔"

اس کے آنسوؤں نے مجھے انتہائی پریشان کر دیا تھا۔

میرے بھائی نے ساری صورتِ حال سے پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہ لڑکی کون تھی؟"

کچھ لوگوں کے اترنے سے سیٹیں خالی ہو گئی تھیں۔ ہم بیٹھ گئے تو میں نے اس کی

ت کا جواب دیا۔

"بس یہی سمجھ لو کہ میری بیٹی تھی۔" پھر میں اسے کاجل کے متعلق بتانے لگی۔" کاجل کا
لق مشرقی پاکستان کے ایک گھرانے سے ہے اس کا کنبہ دس سال سے اسلام آباد میں
قیم تھا۔ وہ لوگ میرے قریبی پڑوسی تھے۔ اس کے ابا باقاعدگی سے محلے کی مسجد میں نماز
ڑھنے جایا کرتے تھے۔ سیدھے سادھے دین دار اور اچھے لوگ۔ اماں سودے سلف
سے لے کر گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں۔ باپ سرکاری ملازم تھے۔ مگر کنبہ بڑا ہو اور
ایمانداری سے کام کیا جائے تو ملازم پیشہ کھانا پینا طبقہ بھی مشکل سے سفید پوشی کا بھرم
رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہی حال کاجل کے گھرانے کا تھا۔ وہ سات آٹھ بہن بھائی
تھے۔ سب ہی پڑھ رہے تھے۔ کاجل کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ گانا بھی بہت اچھا گاتی تھی اور
چھٹی کے دن جب وہ ریاض کرتی تو ہارمونیم کے ساتھ اس کی خوب صورت آواز سنائی
دیتی۔۔ اس کا گھر چھوٹا سا مشرقی پاکستان معلوم ہوتا تھا۔ بید کی کرسیاں اور سوتی جوٹ کا قالین
ناریل اور گھاس کے تنکوں کی آرائشی چیزیں، مشرقی پاکستان کی چند تصاویر۔۔ کاجل کی ماں
بہت خلیق تھیں اور محلے پڑوس میں ان کا سب سے ملنا جلنا تھا۔ آتے جاتے راستے ہی
میں اکثر ملاقات ہو جاتی تو ہم اپنی اپنی مولی گاجروں، شلجم اور ٹماٹروں کی باتیں کرتے۔
ایک دوسرے کی سبزیاں دیکھتے۔ جب ہم کوئی اچھی چیز پکاتے تو ایک دوسرے کو بھیجتے۔
غرض جس طرح اچھے پڑوسی ملتے جلتے ہیں اسی طرح ہم بھی دس سال سے ساتھ رہ رہے تھے۔
پھر بنگلہ دیش سے بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں کے قتل کی لرزہ خیز خبریں آنے لگیں اور
دوسری جانب فوج کے مظالم کی داستانیں سنی جا رہی تھیں۔ ان دنوں سارے بنگالی گھرانے
خاموش اور فکر مند رہنے لگے تھے۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ ان خبروں کے ردِ عمل میں نہ ہوا
تھا مگر اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا تھا کہ پہلے جیسی بات بھی نہیں رہی ہے۔ ایک کرب
انگیز خاموشی فضا پر مسلط تھی۔ اکثر تہوار یا تقریب میں چند پڑوسی یکجا ہوتے تو خونی ڈرامے
پر اظہارِ رائے کرتے اور اس لمحے کاجل کی ماں بالکل خاموش ہو جاتیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے
گھر والوں کے لئے اتنی فکر مند ہوتیں کہ بے اختیار رونے لگتیں۔ دونوں حصوں میں خط و کتابت

بند ہو چکی تھی۔ بیرون ملک سے ہوتا ہوا کوئی خط آتا تو وہ کچھ ڈھارس محسوس کرتیں، مگر ان کی شدید ذہنی اذیت بڑھتی جا رہی تھی ــــ وہ مشرقی پاکستان میں اپنے عزیزوں کے لیے اور یہاں اپنے مستقبل کے لئے ہر وقت فکرمند رہا کرتی تھیں۔

جس دن ڈھاکہ سے بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان ہوا اور جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالے اس شام وہ لوگ ہمارے گھر آئے۔ وہ سب بہت ہی اداس تھے اور انتہائی غیر مطمئن۔

"ہم ہندستان کے غلام بن گئے، یہ آزادی نہیں ہے" کاجل کے والد نے کہا تھا۔

اس روز فضا بڑی بوجھل اور اداس تھی۔ لفظ ساتھ چھوڑ گئے تھے ـــ سچائی اتنی بے رحم نظر آ رہی تھی کہ اُسے ماننے کو جی نہ چاہتا تھا، مگر مانے بغیر چارہ بھی نہ تھا ــــ میں نے انہیں ڈھارس دینے کی کوشش کی۔

"آخری جیت بہرحال بنگال کے عوام کی ہوگی۔ شاید ایک لمبے عرصے تک آپ کو پریشانیاں اُٹھانی پڑیں مگر انجام کار . . ."

"خدا جانے کیا ہوگا کل؟ ــــ کل کی کسی کو خبر نہیں" کاجل کی ماں نے بے یقینی سے کہا ــــ پھر بولیں ــ "جی نہیں چاہتا یہاں سے جائیں ــ مگر جانا بھی ہے"۔

پھر دفاتر سے ان سب لوگوں کو چھٹی دے دی گئی جو بنگلہ دیش جانا چاہتے تھے۔ وہ سب اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے بنگلہ دیش کی خبریں سنتے اور وہاں جانے کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو ماہانہ الاؤنس مل رہا تھا جس میں وہ گزر بسر کی کوشش کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ بنگالی اپنا سامان بیچکر پر اسرار راستوں سے جانے لگے۔ پٹھان کپڑے اور جنس کی اسمگلنگ چھوڑ کر انسانوں کی اسمگلنگ کر رہے تھے، جو بہت زیادہ منافع بخش تھی۔ بیس سے لے کر تیس ہزار تک فی خاندان لیتے تھے۔ رات کے سناٹے میں خفیہ ویگن سروس چلتی تھی اور زیادہ تر لوگ قبائلی راستے افغانستان جا کر وہاں سے بنگلہ دیش

جانے کا طریقہ کار اختیار کر رہے تھے۔ کاجل کی ماں اکثر ان مسائل پر تبادلۂ خیال کرتیں اور پھر کہتیں "ہم اس طرح نہیں جائیں گے، ہم تو راستے کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں"۔ دراصل کاجل کے والد کسی ناجائز بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے وہ صاف ستھرا راستہ پسند کرتے تھے اور بیوی بچوں سے یہی کہتے کہ جب آنا جانا شروع ہوگا ہم تب ہی جائیں گے۔ مگر حالات اتنے پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے کہ راستے کھلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ آخر بے کار بیٹھے بیٹھے تھک کر کاجل کے والد نے بھی وہی طریقہ کار اختیار کیا اور خاموشی سے جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

عید سے دو دن پہلے وہ لوگ بازار میں جوتوں کی دکان پر ملے۔ مجھے دیکھ کر وہ سب اتنی گرم جوشی اور محبّت سے ملے کہ میں نے سوچا شاید ہم سب کی یہ آخری ملاقات ہے۔ اس لئے کہ قریبی ہمسائے عام طور پہ بازار میں اس طرح نہیں ملا کرتے۔ ان کا انداز تو ایسا تھا جیسے ہم لوگوں کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں — عید کے دن جب ہم لوگ ان کے گھر گئے تو دروازے پر تالا تھا۔ وہ اتنی خاموشی اور رازداری سے گئے کہ پڑوس میں کسی کو بھی ان کے جانے کی اطلاع نہ ہوئی۔

اور اب پورے تین سال بعد کاجل مجھے بمبئی کی لوکل ٹرین میں نظر آئی اور وہ سارے وقت روتی رہی اس نے تک نہ کی — خدا جانے وہ کن حالات میں ہے۔ ماں باپ زندہ ہیں یا نہیں؟ یہاں کیسے آئی ہے؟ بہت سے سوال رہ رہ کر ذہن میں اٹھتے اور گڈمڈ ہو جاتے۔

کاجل کے ملنے اور رونے کا پُر اسرار واقعہ سُن کر سب نے اپنی اپنی رائے دی اور کاجل کے متعلق چند روز تک اتنی بہت سی پُر اسرار کہانیاں سوچی گئیں کہ اگر وہ لکھی جاتیں تو چند جاسوسی فلمیں بن سکتی تھیں۔ بھیانک — باتیں سوچ سوچ کر میں پریشان ہو جاتی پھر میرا دل گواہی دیتا کہ وہ اچھی ہے اور محفوظ ہے۔ اس لئے کہ آسمان کے فرشتے انسانوں کے روپ میں جگہ جگہ ملتے ہیں اور یہ تو انسانوں کا سمندر ہے اور وہ انجان غیبی ہاتھ جو ہمیشہ اور ہر جگہ ہمارے سر پر رہتا ہے ضرور کاجل کے سر پر بھی ہوگا۔

میں بار بار پچھتاتی کہ اس روز بائیکلا پر ہی کیوں نہ اتر گئی۔ آخر معلوم تو ہوتا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ مگر وہ ایک لمحے میں بغیر بتائے اتر گئی اور اس سے پہلے کہ مجھے کچھ سوچنے کی مہلت ملتی ٹرین چل پڑتی۔ میں ہر روز اس کا انتظار کرتی۔ پتہ تو اسے دے دیا تھا شاید وہ آجائے اس لیے کہ اترتے ہوئے اس نے کہا تھا "میں ضرور آؤں گی"۔

ایک صبح اچانک کاجل آگئی۔ وہ گہرے سبز رنگ کی خوب صورت ساڑھی باندھے تھی اور بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور ہونٹ ہنس رہے تھے۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ یقین دلا رہا تھا کہ وہ سب پر اسرار کہانیاں جو ہم کئی دن سے اس کے متعلق سوچ رہے تھے، غلط تھیں۔

کاجل نے اطمینان سے بنگلہ دیش پہنچنے کا قصہ سنایا اس کے والد نے پٹھانوں کو تیس ہزار روپیہ دیا تھا۔ پہاڑی راستے سے جاتے ہوئے انہیں ایک ہفتہ سے زیادہ لگا۔ وہ سب گدھوں پر اور کبھی پیدل سفر کرتے رہے۔ دو دن تو بالکل بھوکے پیاسے رہے۔ بڑی مشکل سے افغانستان پہنچے۔ وہاں جا کر ہندستان کی ایمبیسی سے تعلق پیدا کیا اور پھر ہندستان ہوتے ہوئے بنگلہ دیش پہنچے۔

"سب اچھی طرح ہیں، خوش ہیں؟"

"ابا پر پہلے تو پاکستان سے وفاداری کا الزام تھا مگر پھر انہیں ملازمت میں واپس لے لیا گیا۔ بنگلہ دیش جا کر بھی ہم نے بہت پریشانیاں اٹھائیں"۔ پھر وہ بنگلہ دیش کی مہنگائی کی حال بیان کرنے لگی۔ اور بولی "ہندستان نے تو بنگلہ دیش کو اس طرح لوٹا ہے کہ پچھلے دو سو سال میں انگریزوں نے بھی ہندوستان کو اتنا نہ لوٹا ہوگا"۔ پھر وہ کچھ سوچ کر چپ ہو گئی۔

"اچھا، تم بمبئی میں اکیلی کیسے ہو"۔

"مجھے فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ ماموں یہاں آرہے تھے ان کے ساتھ میں بھی آگئی۔ میرے ماموں پہلے سے کلکتے میں رہتے تھے۔ آج کل بمبئی میں بھی ان کا کاروبار ہے"۔

"فلموں میں کام ملنے کی امید ہے۔"

"کوشش تو کر رہی ہوں۔ دیکھیے۔"

"ایک طرف تو ہندستان کو اتنا برا بھلا کہہ رہی ہیں پھر یہاں کی فلموں میں کام بھی نا چاہتی ہیں۔" میرے بھائی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"آپ میری بات کا برا مان گئے؟" کاجل نے سادگی سے پوچھا۔

"ہندستان نے بنگلہ دیش کے لیے لاکھوں آدمیوں کو کٹوا دیا، پھر بھی برائی اور رسوائی ہی ہاتھ آئی" وہ جل کر بولا۔

میں نے ہنس کر کہا "وہ جو بڑی بوڑھیاں کہا کرتی ہیں کہ پرائے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑایا کرتے اُلٹے خود ہی گر پڑتے ہیں۔"

کاجل نے کہا۔ "بنگلہ دیش اور پاکستان آپس میں لڑ جھگڑ کر پھر ایک ہو جاتے۔ آخر سگے بہن بھائی لڑتے بھی ہیں۔"

"ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بھی تو سگے بہن بھائی ہیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ ہم بہن بھائی ہیں مگر بنگلہ دیش تو ہمارے وجود کا ہی ایک حصّہ تھا۔ ہم آپ اپنے دشمن بن گئے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو تباہ کیا۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔"

"اچھا، سیاسی باتیں ختم کیجیے۔ کچھ اور باتیں کیجیے۔" میری بھاوج نے فریاد کی۔

"ہاں کاجل بہت اچھا گاتی ہے۔ ہمیشہ گانے میں پہلا انعام لیا کرتی تھی اور مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کی وجہ سے مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ہمارا وہ حصّہ جو زیادہ خوب صورت تھا ہم سے الگ ہو گیا۔ رقص، موسیقی، نرمی اور لطافت۔ ہماری روح کا حسن شاید اسی خطے میں منہ سے بولتا تھا۔"

کاجل نے کہا "وہاں بھی بہت اچھے گانے والے ہیں۔ بہت خوب صورت آوازیں ہیں۔ وہاں طاقت، مضبوطی اور پہاڑوں کا عزم تھا۔ وہ حصّہ زیادہ خوب صورت تھا۔"

"ہمارے گانے والوں کے متعلق کیا خیال ہے؟" بھائی مسکرا کر بولیں۔

میں نے ہنس کر کہا "بھئی تمہارے ہی ایک اخبار نے لکھا تھا کہ ہمارے ریڈیو اسٹیشنوں پر دو عورتوں کا قبضہ ہے، ایک اندرا دوسری لتا"

"اچھا کاجل، اب تم گانا سناؤ"

"بغیر ساز کے؟"

"یونہی ہلکا پھلکا گانا، غزل یا گیت"

"جیسا آپ کا حکم"

برسوں بعد کاجل کی میٹھی اور سریلی آواز سنی۔ اس کی آواز کا سحر ماحول پر اتنا چھا گیا کہ گانا ختم ہونے کے بعد سب خاموش ہو گئے۔

میرے بھائی نے کہا "آپ فلموں میں گانا ہی کیوں نہیں گاتیں؟ آپ کو تو بس گانا ہی چاہیے۔ اگر آپ نے اداکاری کی تو آپ بحیثیت فنکار اپنے ساتھ انصاف نہ کر سکیں گی"

"ہاں، یہ بات میں خود بھی سوچتی ہوں"

میں نے چند نام لے کر اپنے بھائی سے کہا "ان لوگوں سے کہو کہ اپنے گیت کاجل سے گوائیں اور اسے کام دلائیں"

"ہاں ضرور، میں پوری کوشش کروں گا"

جب وہ جانے لگی تو میں نے کہا "ہاں بھئی ایک بات تو تم سے پوچھنی ہی رہ گئی —— اور اس کی وجہ سے ہم سب کئی دنوں تک پریشان رہے۔ تم اس روز ٹرین میں آخر اس قدر کیوں روئی تھیں؟"

"آپ سے مل کر مجھے بے اختیار پاکستان یاد آگیا تھا —— اپنا گھر —— سہیلیاں —— مجھے —— مجھے اسلام آباد بہت یاد آتا ہے" اس کی آنکھوں میں یکایک پھر آنسو چھلک آئے اور پھر وہ آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی۔

وہ آنسو جن کی بابت ہم نے اتنی بہت سی پُر اسرار کہانیاں سوچی تھیں محبت کے آنسو تھے۔

رضیہ فصیح احمد

بے اماں

(۱)

سلیم کے کان اب تک بصیرہ کی آواز سے گونج رہے تھے۔ "آپ کو معلوم ہے سمن نے ڈیو ۔۔۔ ایک امریکن لڑکے سے شادی کر لی ہے۔" بصیرہ کیا یہی جملہ کہہ کر گئی تھی یا اس کے کانوں نے غلط سُنا تھا؟ ۔۔۔ اور جب یہ جملہ اس کے کانوں میں پڑا تھا تو نیاگرا آبشار کا ڈھائی ہزار فیٹ چوڑا نعل یکایک جھول گیا تھا۔ پُر اسرار اور بے رنگ کی روشنی کے اس لمبے چوڑے آبشار کو اپنی جگہ واپس آنے میں چند ثانیے ضرور لگے تھے۔ ایک جگہ ٹھہرنے کے بعد اس گرتے آبشار کی دھائیں دھائیں جیسے اس کے کانوں نے پہلی مرتبہ سُنی تھی۔ بصیرہ نے یہ بات اس سے کیوں کہی تھی ۔۔۔ کیا اسے ان کے تعلقات کا علم تھا؟ ۔ کیسے تعلقات!۔ اس کے اور سمن کے آپس کے تعلقات کی نوعیت تو خود اسے آج تک پتہ نہ چلی تھی ۔۔۔ وہ تو اس کے دوست امان کی منگیتر تھی ۔۔۔ کم از کم امان بچپن سے یہی کہتا آ رہا تھا۔ اس وقت سے جب سمن ساتویں یا آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھی ۔۔۔ وہ اکثر اسے بھی اپنے ساتھ سمن کی امی کے ہاں لے جاتا تھا جو اس کی رشتے کی خالہ تھیں۔ وہ امان کی خوب خاطریں کرتی تھیں اور امان کی وجہ سے اُس کی بھی۔

"لڑکو اب کھانا کھا کر جانا ۔۔۔" کھانے کا وقت ہوتا تو اس کی امی باورچی خانے سے پکار کر کہتیں۔

"نہیں خالہ ۔۔۔ اب چلیں گے ۔۔۔" وہ کہتا اور بیٹھا رہتا ۔۔۔ پھر وہ کھانا کھاتے، اس کی امی کے ہاتھ کا انڈے کا حلوہ بے حد لذیذ ہوتا تھا خوب پستے اور بادام پڑا اور چاندی کے ورق سے سجا۔ پھر امان نے ہاتھ پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑا ۔۔۔ گھر میں کوئی اور نہیں تھا، وہ تنہائی میں اس سے اُلٹی

سیدھی باتیں کرتا یہاں تک کہ وہ سہیلیوں کی بہنوں کی شادی اور مہندی کا بہانہ کر کے اس کے ساتھ پکنکوں پر باہر جانے لگی۔ سلیم اماں کو سمجھاتا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ کبھی جی چاہتا سمن سے کہے، ہوش میں آؤ، یہ تمہارا کزن یا منگیتر جو کوئی بھی ہے تمہیں تباہ کر دے گا مگر وہ یہ بات کبھی بھی اس سے نہ کہہ سکا ــــ سمندر کے کنارے گزری وہ رات وہ کبھی نہ بھول سکے گا جب اس لڑکی کی خاطر اس نے سچ مچ جاں سے گزرنا چاہا تھا ــــ وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔ اوس کے قطروں سے ہٹ کا برآمدہ اس طرح تر تھا جیسے رات بھر بارش ہوئی ہو یا ہٹ کی نچلی منڈیر پار کر سمندر کی لہریں وہاں تک گزر کر آئی ہوں ــــ ہٹ کے نیچے لکڑی کے ٹیڑھے ترچھے ستون اپنے سایوں کے ساتھ مل کر کسی ڈراؤنے خواب کا سا نہ سمجھ میں آنے والا نمونہ بنا رہے تھے۔ سیلی زمین پر بے شکل چکنے جانور بے آواز یا ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ اس وقت وہ سچ مچ نیلا گاؤن پہنے، نیلے مخملیں چپلوں میں پاؤں ڈالے بال جھٹکتی باہر آ جائے تو اسے گیلی زمین میں یوں پیر پھیلائے بیٹھے دیکھ کر کیا کہے گی اور وہ اس سے کیا کہے گا؟ ــــ سمن کو جیسے وہ اس وقت بھی نیلے گاؤن اور نیلے چپلوں میں دیکھ رہا تھا ــــ کیوں؟ ــــ اس لئے کہ اماں نے جب یہ نائٹی گاؤن اور چپل خریدے تھے تو وہ ساتھ تھا۔

سمن اماں کے ساتھ ہٹ میں تھی۔ اماں نے شام کو کہا تھا کہ کھڑکی کے ٹوٹے شیشے سے سمندر کی بے پناہ آواز اندر آ کر رات کو اسے بے آرام کرے گی ــــ اسی ٹوٹے شیشے کی جگہ سے ان دونوں کی باتوں اور ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز باہر آ کر اسے بے آرام کر رہی تھی ــــ بے آرام ہی نہیں بے کل بھی ــــ یہ آوازیں جو کبھی سمندر کی طرف سے ابھرتی بپھرتی لہروں کی آوازوں میں ڈوب جاتی تھیں، کبھی شہر کی طرف سے نصف دائرے کی رنگین جگمگ کرتی، ٹوٹی چوڑیوں کی کرچیوں کی طرح اس کے دل میں چبھ جاتی اور کبھی سڑک پر پڑنے والی کسی گاڑی کی تیز دھار دار روشنی کی مانند اس کے سینے میں پیوست ہو جاتی تھیں۔ اسے کسی بات پر شدید غم اور غصہ تھا ــــ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کسی قسم کا کوئی انتہائی قدم کیا وہ اسی وقت جائے اور سمن کو اماں کے چنگل سے نکال کر کہے ــــ "بے وقوف لڑکی اسے تجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے جنہیں محبت ہوتی ہے وہ اپنی محبوباؤں کے بدن کے ناپ اور راتوں کی حکایتوں کے مزے لے لے کر دوستوں کو نہیں سناتے ــــ کم از کم وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کے خلوت کا ایک ثانیہ گزارتا تو کسی اور کو سمجھنے، قدمے، لمحہ بھر کو اس میں شریک کرتا ــــ اور جب یہ

کے ذہن میں آئی تو اس نے سر سے پیر تک جھرجھری لی جیسے کسی دشمن نے یہ بات اس کے کان میں کہی ہو۔

وہ نیچی منڈیر کے سائے میں ٹھنڈی گیلی ریت پر اسی طرح بیٹھا رہا یہاں تک کہ چاند جو سرِ شام کسی اچانک خوش خبری کی طرح سیدھا آسمان سے ان کی ہٹ کی کھڑکی میں جھانکا تھا اب سر پر جھک کر ڈھل چکا تھا اور بادلوں کی غلاف در غلاف تہوں میں چھپ گیا تھا۔ ملگجی چاندنی نے سارا منظر ریتیلا کر دیا تھا ــــ پاس کی ہٹ سے ایک خوفناک کتا منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر اسے شبہے سے دیکھ رہا تھا۔ تب اسے اپنے آپ پر انتہائی غصہ آیا تھا کہ اس نے کچھ بھی نہ کیا تھا، ساری رات وہیں بیٹھے بیٹھے گزار دی تھی ــــ اس ایک پاگل لمحے میں اس نے اپنے آپ کو ہٹ کی چھت کے کالے گیلے چوبی شہتیروں میں ایک آگے نکلے شہتیر پر سمن کے دوپٹے کے پھندے سے لٹکے دیکھا۔ اس کا جسم دہرا ہو کر جھول رہا تھا، اس کی دھاری دار قمیص کی پٹیاں پیٹھ پر صبح کی ہوا میں ہلکے ہلکے ہل رہی تھیں۔ پھندے سے لٹکی گردن کے اوپر اس کا سر بھی آہستہ آہستہ جھول رہا تھا ــــ آسمانی رنگ کا گاؤن پہنے، اسی رنگ کے مخملیں چپل میں پاؤں ڈالے اپنے بال جھٹکتی سمن بیڈ روم سے باہر نکلی ــــ اس کی جھولتی نعش کو دیکھ کر اس نے چیخ ماری اور واپس اندر کی طرف بھاگی۔

وہ واقعی باہر نکل آئی تھی۔ وہ واقعی نیلا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ گاؤن کے لمبے V گریبان کے نیچے سی تھرو نائٹی کی سفید بیل جھانک رہی تھی اور اس کی پتلی ریشمی کمر وہ جیسے گاؤن کے پار بھی دیکھ سکتا تھا ــــ یکایک وہ اٹھا اور سمندر کے نیم گرم پانی کو اپنے بدن پر محسوس کرتا چلا گیا ــــ پانی اس کی کمر اور پھر سینے تک آ پہنچا ــــ اس نے سمن کی آواز سنی جو چلا رہی تھی۔ "امان! تمہارا دوست پانی میں بہت دور چلا گیا ہے، تم تو کہہ رہے تھے اسے تیرنا نہیں آتا!"

سلیم نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس کی نظروں میں سمندر کی لہروں کے اوپر اڑتے سفید جھاگ قطار در قطار تھے، سفید جھاگ جیسے دور پہاڑوں پر پڑی برف۔ چند قدم اور۔

بس چند قدم اور ــــ

اتنے میں کوئی بھاگتا ہوا آیا اور پیچھے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹتا ہوا پیچھے لے گیا ــــ

"پاگل ہو گئے ہو، مرنے کا ارادہ ہے کیا؟ ــــ آؤ چل کر وہاں بیٹھتے ہیں۔ پانی کے

کنارے چلتے ہوئے وہ ہٹ سے ذرا دور چٹان کے کنارے جا پہنچے۔ پانی کے تیز بہاؤ کی شدت کو کم کرنے کے لئے وہاں سیمنٹ کے بڑے بڑے بلاک پڑے تھے۔ وہ دونوں ان مکعب ستونوں پر جا بیٹھے۔ بائیں طرف صبح سویرے آنے والوں کی ایک پوری ٹولی چہل بازی میں مصروف تھی۔
سلیم اس طرف دیکھتا رہا۔ امان سمجھا وہ ان لوگوں کو دیکھ رہا ہے جب کہ وہ امان کی طرف اور اُسی ہٹ کی سمت دیکھنا نہیں چاہتا جہاں اس کی نیلم پری موجود تھی ــــ وہ رات کا قصہ سناتا رہا ــــ وہ سی تھرو نائٹی اس کے جسم پر دستانے کی طرح چُست بیٹھی تھی۔ اس کی کمر امان کے دونوں ہاتھوں کے حلقے میں آگئی تھی اور وہ بھولی چڑیا اس کے جال میں بڑی آسانی سے پھنس گئی تھی۔
اس نے صرف یہ کہا تھا کہ ان کی شادی طے ہے، ان کے درمیان جلد یا بدیر کوئی پردہ نہ رہے گا تو ابھی کیوں نہ سہی اور سب یہی تو کرتے ہیں کوئی بُری بات نہیں ہے تمہارے ابا امّی ــــ بڑے بڑے قابل لوگ ــــ پیغمبر ..... سب کو معلوم ہے ہماری شادی ہو جائے گی۔ سب کو معلوم ہے محبّت میں یوں ہوا کرتا ہے۔ لوگ جانتے بھی ہوں تو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ سلیم نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ امان نے اصرار بھی نہیں کیا ورنہ وہ دیکھ لیتا کہ سلیم کا چہرہ سمندر کے پانی سے نہیں اس کے اپنے نمکین آنسوؤں سے تر بتر ہے۔
جس دن وہ کٹورے میں برف لینے نکلا تھا اور وہاں تک نہیں پہنچ پایا تھا اس دن بھی امّی کی گود میں پڑا روتا رہا تھا۔ امّی سمجھی تھیں وہ تھکن، پریشانی اور خوف سے رو رہا تھا۔
امان اُٹھ کر چلا گیا۔ سلیم وہیں بیٹھا اپنے بچپنے کے پاگل پن کو زندہ کرتا رہا ــــ اس کی عمر نو دس سال سے زیادہ نہ ہوگی ــــ رات ہی کو والد کے تبادلے پر اُس نئی جگہ پہنچے تھے۔
صبح اُٹھ کر کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھا ــــ ایک عجیب خواب کا سا عالم ــــ جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کھڑکی کے سامنے ایک اونچا سفید برف کا پہاڑ کھڑا دکھائی دیا۔ برف کبھی خوابوں میں دیکھی اور کہانیوں میں پڑھی تھی۔ اب برف کا پہاڑ سامنے تھا۔ ہاتھ میں چاندی کا کٹورا اٹھایا اور سوچا لاؤ تھوڑی سی برف ہی بھر لائیں ــــ صبح جب امّی ابا اور بہن بھائی سو کر اٹھیں گے تو ان کو دکھا کر حیران کریں گے۔

حیران کرنے کا ایسا اندھا دھند شوق پہلے کبھی نہ ہوا تھا، یہ شاید یہاں کی ہوا میں تھا ــــ نئی جگہ کی تنک آمیز ہوا نے، لالے کے ان پھولوں نے جو صرف تصویروں میں دیکھے تھے اور کوہ قاف جیسے پہاڑ نے جہاں پریوں کا بسیرا تھا ایسا دندمچایا ــــ گماں بھی نہ تھا کہ پہاڑ زیادہ دور ہوگا۔ یہ بس سامنے ہی تو تھا۔ چلتے چلتے ــــ دوپہر ہوگئی۔ بس یوں ہی لگتا رہا دو قدم اور دو قدم اور . . . . بھوکا پیاسا چلتا رہا، پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ قدم نہ ڈگمگا جائیں ــــ آگے ہی آگے چلتا رہا، پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ قدم نہ ڈگمگا جائیں ــــ آگے ہی آگے چلتا رہا ــــ اکا دکا کھیت اکا دکا راہ گیر ملے جن سے کنی کترا کر نکل گیا یا درخت کے پیچھے چھپ گیا ــــ ایک درخت کے نیچے پڑے زرد آلو کھاروں میں سے دو چار کرتے کے دامن سے پونچھ کر کھائے اور پھر چلنے لگا ــــ پھر لگا جیسے دھوپ بھی ڈھل رہی ہو جیسے شام ہو رہی ہو ــــ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کتنی دور چلا آیا تھا کون سا دشت تھا۔ اب نہ کھیت تھے، نہ گاؤں نہ راہ گیر ــــ پہاڑ اب بھی سامنے تھا مگر اب بھی اتنی ہی دور ــــ لگتا تھا جیسے بس دو قدم ــــ کیا یہ جادو کا پہاڑ تھا، کوئی سراب تھا ــــ نہیں پہاڑ تو اصلی تھا ــــ ننھی سمجھ نے کام نہ دیا کہ برف بغیر لوٹا جائے یا برف لے کر ــــ بھوک پیاس سے نڈھال پیروں کی طرف دیکھا تو خون کی پھواریں قطرہ قطرہ نکل کر کہیں کہیں جم گئی تھیں ــــ سورج ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ کیا واپس جائے؟ خالی کٹورہ ہاتھ میں ہے اور برف کا پہاڑ بس دو قدم ــــ وہ وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا ــــ پہلی مرتبہ پلٹ کر دیکھا ــــ دشتِ تنہائی کا پہلا احساس ــــ گھر سے دور شام پڑ رہی تھی۔ برف کا پہاڑ سامنے تھا ــــ گھر کا آرام آتش دان میں چٹخنی لکڑیوں کی آگ سب سپنا تھی۔ صرف دشتِ تنہائی میں بڑھتی رات کی نیم تاریکی اور قطرہ قطرہ ٹھنڈک جو خوف کے چبھتے ریزوں کی طرح دھیرے دھیرے جسم میں اتر رہی تھی۔

کسی مسافر نے تیز تیز اپنے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اسے دیکھا اور نزدیک آیا۔

"بچے کہاں سے آیا ہے؟"

ڈرتے ڈرتے نام بتایا۔ وہ شخص حیران ہو کر اس کی صورت تکنے لگا۔

"سچ بتاؤ کس وقت چلے تھے؟"

"صبح۔"

"صبح !۔۔۔ ناشتہ کیا تھا ؟"

"نہیں ۔"

"بچّہ ۔۔۔۔۔ تجھے نہیں معلوم تو کتنی دُور آگیا ہے ۔کہاں جانا ہے تجھے ؟"

"پہاڑ پر ۔"

مسافر نے اُس کے ہاتھ میں خالی کٹورہ دیکھا اور کہا "بچّہ واپس جا ، ابھی واپس جا ۔ ساری رات چلے گا تب بھی پہاڑ تک نہیں پہنچے گا ، تجھے نہیں معلوم یہ پہاڑ ابھی یہاں سے بھی بہت دور ہے ۔۔ پگلا ہے کیا ؟ " پھر اُس نے اپنی چادر میں بندھے چند سیب اور مکئی کی روٹی اسے دی ، اپنی چھاگل سے پانی پلایا ۔ آدھے راستے اس کے ساتھ آیا اور کہا " میرا گھر اس پہاڑی کے پیچھے ہے ۔ میرا بچہ بیمار ہے اس کے لیے دوا لے کر جا رہا ہوں تیرے ساتھ گھر تک نہیں جا سکتا مگر تو سیدھا اسی راستے پر چلا جا ، پہنچ جائے گا ۔ راستے میں کوئی ملے اور پوچھے تو کہہ دینا قادر خاں کے گھر سے آ رہا ہوں ۔"

جس وقت وہ گھر پہنچا ہے اسے نہیں معلوم کہ وہ گھر کی چوکھٹ پر گرا ، یا صحن میں یا امّی کی گود میں ۔۔۔ پولیس کو اطلاع کی جا چکی تھی ۔۔۔ چھوٹی سی بستی کے تقریباً سارے مرد اس کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے ۔۔۔۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پہلے ہی دن بچے کو کون اٹھا لے گیا ۔ ایسا بھی نہ تھا کہ باپ سے کسی کی دشمنی رہی ہو ۔۔ کسی کے خیال میں بھی نہ آیا کہ وہ کٹورا اٹھا کر برف لینے چل دیا ہوگا ۔۔۔ دنوں اس کی مہم کے چرچے رہے ۔

دوسرے دن قادر خاں بھی اس کی خیریت پوچھنے آیا تھا ۔ سب حیران اور پریشان تھے مگر سلیم کو غم تھا کہ اس کا کٹورہ خالی رہ گیا تھا ۔۔۔ خالی کٹورا دیکھ کر برسوں اس کا دل کیسا کیسا دکھا تھا ۔ کیا معلوم ذرا سی اور ہمت کر لیتا تو وہاں تک پہنچ ہی جاتا ۔۔۔ اب ایسا بھی کیا تھا ۔ سامنے ہی تو تھا ۔۔۔ وہ امّی کی گود میں پڑا روتا رہا تھا اور وہ تسلی دیتی رہی تھیں کہ اب وہ گھر آگیا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ وہ اپنی کسی اندرونی ، پکڑ میں نہ آسکنے والی مایوسی میں رو رہا تھا ، شاید اس لیے کہ رونے سے نامعلوم غموں کے بوجھ بھی ہلکے ہو جاتے

اب ۔۔۔۔

اسے محسوس ہوا جیسے آبشار کی پھوار کے چند قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپکے اور گالوں پر
تے اس کی گردن پر گرے ـــــ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتا وہ بصیرہ کی تلاش میں پیچھے آیا۔
سکھ خواتین اپنے گھر والوں کے ساتھ ابھی ابھی اُٹھ کر گئی تھیں۔ سلیم بصیرہ کے پاس پہنچ کر بیٹھ
یا۔

"کیا آپ کبھی ڈیو سے ملی تھیں؟" اس نے یکایک پوچھا۔

"جی ہاں!" بصیرہ نے کہا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا، جیسے بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہو مگر فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ پہلے
پوچھے۔ بالآخر اس نے کہا۔

"وہ کیا کرتا ہے؟"

وہ امریکن کاؤنسلٹ میں تھا۔ بہت اچھی اُردو بولتا ہے۔ سُنا ہے جاپان میں رہا ہے اور اسے
پانی بھی آتی ہے۔ کراچی کی امریکن کاؤنسلٹ سے اس نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا تھا۔ وہ کہتا
تھا اپنے ملک میں ہم انسانی برابری بنیادی انسانی حقوق اور انفرادی آزادی کی باتیں کرتے ہیں
ر یہاں وہی رویّہ رکھتے ہیں جو انگریز بیوروکریٹس کا تھا۔ ہمارے سفارت خانے قلعے بن جاتے
ہیں، عوام سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ ہم شیشوں کے پیچھے سے فون پر ان سے گفتگو کرتے ہیں
جیسے وہ بھیک کے کشکول لئے ہمارے سامنے کھڑے ہوں۔ سفارت خانے کے مقامی ملازم لوگوں
سے ان کے پاسپورٹ کے رنگوں کے مطابق بات کرتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں سے شریفانہ گفتگو
بھی عار سمجھتے ہیں اور ہم یہ خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں ـــ اس کے کہنے سننے سے کوئی فرق نہ پڑا۔
ؤنسلٹ کا قلعہ اور بلند ہو گیا، اس کے جنگلے سنگین بن گئے، چوبیس گھنٹے ہتھیار بند فوج کا پہرہ
ہنے لگا۔ لائبریری جانے والے لڑکوں کو تین تین بار سیکورٹی کے دروازے سے گزرنے کے لئے
جانے لگا ـــ چھوٹی سی چھوٹی بات پوچھنے کے لئے لوگوں کو ویزا آفس کے باہر طویل قطاروں
ں کھڑا رہنا پڑا تو اس نے احتجاجاً وہ نوکری چھوڑ دی اور امریکن اسکول میں پڑھانے لگا۔ اس
اُردو اتنی اچھی تھی کہ چاہتا تو وہاں کے پاکستانی بچوں کو اُردو پڑھا سکتا تھا مگر اس اسکول
ں اردو کا معیار یہ ہے کہ حروف کے نام اور آوازیں انگریزی میں لکھائی جاتی ہیں ـــ ڈیو کا تو

شین قاف بھی اتنا درست ہے کہ منہ کے آگے رکھے مائک میں شیخ قدرت اللہ یا مسز قامت اللہ کہہ کر پکارتا تو کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ ان کا نام کسی امریکن کی زبان سے نکلا ہے۔ جب سفید کونچی سی چٹیا والی بڑی بی غرارہ لہراتی، ہانپتی کانپتی آن کر کھڑکی کے آگے کھڑی ہوتیں اور وہ کہتا ٹیلی فون اٹھا لیجئے پھر سلام علیکم اور مزاج پرسی کے بعد سوالات شروع کرتا تو ان کی سفید دیدہ پھٹی آنکھیں بالکل ہی باؤلی سی ہو جاتیں۔

"آپ امریکہ کیوں جا رہی ہیں؟" وہ بڑی اپنائیت سے پوچھتا اور ان میں سے اکثر لمبی لمبی داستانیں لے بیٹھتیں۔ "اللہ تیرا بھلا کرے بیٹا، بات یہ ہے کہ میرے چھ بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں — بیٹے ایک ایک کر کے سارے امریکہ سدھار گئے اب میں جا رہی ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا جائیے۔ خدا مبارک کرے۔" وہ کہتا۔

"بیٹا تو جیئے، تیرے بیٹے پوتے جئیں — کیسی صاف اردو بولتا ہے — امریکن ہے — سچ مچ —؟"

"ہاں بڑی بی امریکن ہوں۔"

"اے ہے مجھے بڑی بی تو نہ کہہ — اماں کہہ لے، خالہ کہہ لے۔" بصیرہ ہنسی۔ پھر سلیم کے چہرے کی طرف دیکھا — وہ اس کے ان ڈرامائی مکالموں سے ذرا بھی محظوظ نہ ہوا تھا — جل کر وہ خاموش ہو گئی۔

گانے والوں کا گروپ پھر کہیں سے گھومتا گھامتا آیا اور عین ان کے سامنے جنگلے کے نزدیک کھڑے ہو کر گانے لگا — گٹار بجانے والا دل و جان سے گٹار بجانے اور بلی دیرا کا گانا گانے میں مصروف تھا۔

تم میرے سامنے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لئے کھڑی ہو۔
تم سوچ رہی ہو میں تمہیں برا بھلا کہوں گا، کوئی ایسی بات جس سے تمہیں تکلیف ہو۔
پھر تم مجھے نہیں جانتیں —
میں اور تمہیں تکلیف دوں!
میں تو اس زمین کو بوسہ دیتا ہوں جس پر تم چلی ہو —

کاش میں تمہیں دوبارہ اپنے بازوؤں میں لے سکتا۔

دوبارہ اپنے بازوؤں میں لے سکتا ـــ

گانا کسی زبان کا ہو، اچھا ہو، تو اچھا لگتا ہے ـــ بعض اوقات اس کے الفاظ مار دیتے ہیں، بعض اوقات ایک خاص وقت، ایک خاص فضا اور کسی خاص موڈ میں اس کی موسیقی یا الفاظ کی ادائیگی گھائل کر دیتی ہے ـــ اب یہ گیت اس خاص فضا، اس خاص موڈ میں کیسا بھلا لگ رہا ہے ـــ کیسے دل کو دھیرے دھیرے پگھلا رہا ہے۔ بصیرہ نے سوچا ـــ سلیم کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ کسی لمحے رونے والا ہو ـــ یکایک چاند نکل آیا، بادلوں کے نقاب سے نکلے چاند نے اپنی سفید روشنی آبشار پر ڈالی۔ گٹار بجاتا اور گاتا شخص یکایک اچک کر جنگلے کے ستون پر چڑھ گیا اور پھر ـــ اس نے کسی پرند کی طرح اپنے بازو ہوا میں بلند کیے اور گٹار سمیت آبشار کی گود میں کود گیا۔

تالیاں بجاتے ہاتھ رک گئے۔ ہاہو کرتے لوگوں کے منھ سے عجیب چیخیں سی نکلیں ـ بھیڑ میں ہلچل سی مچی ـــ ایک ریلا سا جنگلے کی طرف لپکا ـــ کیا ہوا؟ ـــ کیا ہوا ـــ کا شور مچا ـــ سلیم نے بصیرہ کا ہاتھ تھاما اور اسے انسانوں کے ریلے کے درمیان سے نکالتا سڑک کے دوسری طرف کے چمن زار تک لایا اور ایک بنچ پر بٹھا دیا ـــ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سلیم اس کے نزدیک بیٹھا تھا۔ ایک سسکی کی آواز ابھری۔ سلیم نے آہستہ سے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا، وہ آنسوؤں سے تر تھا ـ سلیم نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــ اس شخص کے غم میں جس کو وہ جانتی نہیں تھی، پہچانتی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ لمحے کے اس سحر کو برداشت نہ کر سکا ـ شاید اسے یہ احساس ہوا کہ اتنا خوب صورت لمحہ دوبارہ اس کی زندگی میں نہ آئے گا اور وہ اسے امر کرنے کے لئے چاندنی سے بھرے آبشار میں کود گیا۔

کیا لمحے کے اس سحر کو بصیرہ نے بھی اسی شدت سے محسوس کیا تھا؟ ـــ روتے روتے یکایک اس کی گردن ڈھلک گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

(زیرِ تحریر ناول کا ایک باب)

خالد حسین

قرض

وہ ایک معزز شہری تھا۔

اس کے علاوہ اس نے کچھ بننے کی خواہش بھی نہ کی تھی۔ اس کے کچھ موروثی اثرات بھی تھے۔ شروع ہی سے اس کے خاندان میں بس صاحبِ اعتبار ہونا ہی انسانی منتہا تھی، چنانچہ اس نے اپنے باپ کو ہمیشہ اس حالت میں پایا کہ اس کا لباس پاک اور بے داغ اور اس کا حساب ہمیشہ بے باق رہا۔ گو اس کے باوجود وہ بے باک کبھی نظر نہ آیا بلکہ جس قدر اس کا حساب بے باق ہوتا چلا جاتا اسی قدر وہ خوف زدہ اور پژمردہ نظر آتا گیا۔ مگر یہ افسردگی تو ان کے ہاں پچاس ساٹھ کے پیٹے میں پہنچنے والے مردوں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ اسی نقاہت سے وہ صاحبِ اعتبار بھی ہوتے چلے جاتے۔

چنانچہ ساٹھواں برس لگتے ہی اس کو سب سے زیادہ ایک معزز شہری بننے اور صاحبِ اعتبار ہونے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ صاحبِ اعتبار کیوں کر ہوا جاتا ہے، اس کی اخلاقی فہرست تو اس نے بے شمار کتابوں اور دینی رسالوں میں پڑھ رکھی تھی اور جمعہ کے جمعہ مولانا کے وعظ اور ٹی وی کے ناگہانی خطبات اس کو بہت کچھ تفصیلات اور باریکیاں مہیا کرتے رہتے مگر وہ بھی اپنے حلیے کا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ سب سے زیادہ اس نے اپنے آپ کو بس ایک ضرب المثل میں ڈھالنے کی کوشش کی، پاک رہو، بے باک رہو، پاک رہنے کے لئے وہ جسم اور لباس اور اطراف کی صفائی کے بارے میں نہایت محتاط بلکہ چوکنا رہتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح اس کا لباس بھی بے داغ، استری شدہ، تلوار کی دھار ایسی کریز اور کوٹ کی جیب

میں سفید چمکتے دمکتے رومال سے مزین ہوتا۔ جوتے کی ٹو بقول شخصے اس کے لئے آئینہ کا کام دیتی تھی۔ چلتے پھرتے جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔

اور حساب تو وہ اپنے باپ سے بڑھ کر بے باق رکھتا تھا۔ سب سے زیادہ ہیبت ناک شے اس کے تصور میں قرض تھی۔ اور یہ خوف اس کے دل میں اس کی ماں نے بٹھایا تھا۔ جو ہر دم اٹھتے بیٹھتے قرض سے بچنے کی دعائیں پڑھتی رہتی تھی۔ اور ایک اس دعا کا وظیفہ بھی کرتی تھی کہ جس سے آدمی پر خواہ پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو تو ادا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی ماں پر کسی قسم کا کوئی قرض نہ تھا مگر پھر بھی وہ اس سے ہر دم خوف زدہ رہتی۔ چنانچہ مرتے ہوئے یہ خوف اس کو لطور ترکہ دے گئی۔ سیوں کہ وہ نہایت تفعیل کے ساتھ اپنے تمام کام نمٹا کے اس دنیا سے رخصت ہوئی تھی اور جاتے جاتے کہہ گئی تھی کہ مجھ پر کسی کا کوئی قرض نہیں، تم لوگ مطمئن رہنا۔

چنانچہ ذکی احمد نے بھی ایک معزز شہری اور صاحب اعتبار وں میں شامل ہونے کا جو معیار بنایا تھا وہ محض اسی قدر تھا کہ قرض، بات کا نہ پیسہ کا۔ ساٹھ برسوں میں ہزاروں ہی تو ایسے مصائب آئے ہوں گے کہ یہاں کچھ دوستوں یا محکموں کی مدد سے کام نکل سکتا تھا مگر اس کے دل میں بیٹھی ہیبت نے گو اس کے ہاتھ اور زبان دونوں کو جکڑ رکھا تھا۔ چنانچہ وہ ساٹھ کی دھائی سے بخیر و خوبی گذر رہا تھا۔ پاک تو وہ تھا ہی۔ اپنے حسابوں، مگر بے باک رہنا اپنے باپ کی طرح اس کی بھی فطرت میں نہ تھا۔ اسی لئے اس کا دل سینے میں کسی تو گرفتار تہہ دام، پرندے کی طرح پھڑکتا رہتا۔ نہ جانے سے عجب سے بلبلے بھی اٹھنے لگے تھے۔ ملازمت کے تیس سال پورے کر کے ہی اس نے ریٹائرمنٹ بھی اسی سلسلے میں لی کہ سینے میں گھٹن کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں ترمرے سے آنے لگے تھے۔ اور ڈرائیونگ میں بھی خاصی دقت ہونے لگی تھی کہ اکثر سڑک سیدھی جانے کی بجائے اوپر آسمان پر چڑھتی نظر آنے لگتی اور پل اور ان پر چلتی بتیاں عجب انجانے راستوں، ان دیکھی بستیوں کی طرف لے جاتے، مگر جب وہ بہ خرابی بسیار وہاں سے لوٹتا تو کوئی بھی یقین نہ کرتا خصوصاً اس کے بچوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اس کے دماغ کا وہ حصہ متاثر ہو چکا ہے جس میں یادداشت کے خلیے ہوتے ہیں۔ اور ان خلیوں سے نمٹنا وہ خوب جانتا تھا مگر اکثر وہ بحث کے موڈ میں

یادور
ہوتا تھا۔ یادداشت کے خلیوں کا یہ عالم تھا کہ گھومتے گھامتے، سب کے سب، نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع ہو کر ایک جگہ آن بسے تھے۔ اور اگلی پچھلی کوئی ایک بات بھی ایسی نہ تھی کہ اس کے ذہن بلکہ آنکھوں میں آئینہ نہ ہوتی۔ خیر، جب بچے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرکے اس کے روز روز کے نئے نئے راستوں کے قصے سنتے رہے تو وہ بھی ان کا دل رکھنے کو خاموش رہتا۔

مگر ایسے میں اس کو اپنا باپ بے حد یاد آتا۔ اُسے افسوس ہونے لگتا کہ جب اس کا باپ عمر کے اس حصے میں تھا جس میں کہ اب وہ خود ہے تو اس سے یہ ضرور پوچھنا چاہیئے تھا کہ دور کی چیزیں نزدیک اور نزدیک کی دور کیوں کر ہو جاتی ہیں۔ اور پھر آنکھوں کا بھی یہی عالم ہے کہ اس عمر میں قریب کی شے نہیں دیکھتیں، دور دراز کی چیزوں کو کیا خوب واضح دیکھتی، جانتی اور پرکھتی ہیں۔ مگر جب اس کا باپ اس عمر کا تھا تو وہ تو خود اپنے بچوں کے برابر تھا اور یہ کیا نہیں ہو سکتا کہ کبھی باپ اور بیٹے ہم عمر ہو جائیں۔ یہ کوئی ایسی ان ہونی بات بھی نہیں تھی۔ مگر اب اس نے ایک معزز شہری اور صاحب اعتباروں میں شامل رہنے کی خاطر یہ کہنا اور پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بالکل سیدھی سی بات تھی کہ چونکہ وہ آج کل اکثر اپنے ماں باپ کو یاد کرتا تھا اور اس کے ماں باپ خود اسی کی عمر کے تھے جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اب کہیں جو آپس میں مل پاتے تو ہم عمر ہی ہوں گے، بلکہ حساب سے تو ماں اس سے کم سے کم سات برس چھوٹی اور باپ بیس دن کم بنتا۔ اور یوں بھی جب وہ آئینہ دیکھتا تو محسوس کرتا کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ معمّر دکھائی دیتا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ معزز اور صاحب اعتبار تھا۔ اپنا اندر باہر صاف ستھرا رکھنے کے لئے اس نے برسوں پہلے سے وزن کم کرنے کے تمام حربے اختیار کر رکھے تھے۔ چنانچہ اس کے چہرے پر وہ نرمی اور گولائی نہیں تھی جو اس عمر میں اس کے باپ کے چہرے پر تھی اور وہ نقلی ڈاڑھی لگانے والا بچہ نظر آیا کرتا تھا۔

مگر یہ سب کچھ ثانوی تھا۔ اصل مسئلہ تو بالکل صاف تھا۔ وہ اپنے مقاصد میں انتہائی کامیاب و کامران شخص ثابت ہوا تھا۔ لوگ یقیناً اس پر رشک کرتے ہوں گے، کیوں کہ وہ ایک معزز شہری اور صاحب اعتبار شخص تھا، لوگ باگ آتے جاتے اس کو سلام کرتے، رشتہ دار دوست

احباب ہفتہ کے ہفتہ اپنے گھر یا خود اس کے ڈرائنگ روم میں محفلیں لگاتے۔ نوجوان اساتذہ کے کلام کے علاوہ تاریخ، ریاضی اور فلسفے کے نکات بھی سمجھنے چلے آتے اور بہت مودب ہو کر بیٹھتے، مطمئن ہو کر اُٹھتے۔ اس کی بیوی ابھی تک خوش شکلوں میں شمار ہوتی تھی اور اسی کی طرح اپنے اندر باہر کی صفائی کی نہایت کڑی نگرانی کرتی تھی۔ اور ابھی تک نہایت آسانی کے ساتھ بالکل صحیح ڈرائیونگ کرتی چلی جا رہی تھی۔ اور اس کے دوستوں کی ہفتہ وار دعوتوں کا اہتمام نہایت سلیقے اور سعادت مندی سے کرتی تھی۔ ایسی ہی ایک محفل کی بساط لپیٹ رہی تھی کہ جاتے جاتے کفیل احمد نے کہا۔

"ہاں یار ذکی! وہ تم نے مجھ سے قلم لیا تھا اس روز کچھ پتہ و تہ لکھنے کے لئے۔ لوٹایا نہیں۔ خیر کسی وقت دیکھ کر دے دینا۔ چیز تو کچھ نہیں — دراصل یار وہ میری مرحوم بیوی کی نشانی ہے۔ بس یہی کچھ جذباتی وابستگی ہے۔"

"قلم؟" وہ حیران رہ گیا۔ "یار کون سا قلم؟ کب؟ کس کا پتہ — بھئی اوّل تو میرے پاس ہر وقت قلم موجود رہتا ہے۔ دوسرے میں کسی دوسرے کے قلم سے لکھنے کا قائل نہیں۔ میرے باپ نے کہا تھا کہ — مگر کب؟ کہاں؟"

"ارے چلو چھوڑو — بھول گئے ہو گے — مٹی ڈالو یار — ہاں اگلی دفعہ پھر اس کتاب پر بات ہو گی — لو بھئی چلے۔"

سب چلے گئے۔ وہ دیر تک کرسی میں ایک ہی رُخ، ایک ہی پوزیشن میں دھنسا پتھر سا رہ گیا۔ دماغ کے خلیے ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے۔ تو کیا واقعی میں نے قلم لیا اور بھول گیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کی بیوی نے بھی تصدیق کی کہ اس نے کبھی کسی سے آج تک قلم لے کر نہیں لکھا۔ اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ کفیل احمد بھول رہا ہے۔ کسی اور نے قلم لیا ہو گا۔ پھر بھی بہت دنوں تک وہ اپنی الماریوں، دراز، کپڑوں کی جیبیں الٹ پلٹ کرتا رہا۔ حالانکہ اُسے پختہ یقین تھا کہ اس نے قلم نہیں لیا۔

ذکی احمد کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ بات بہت مشکل سے بھولتا تھا۔ اس قلم والے قصے سے گھر کے تمام لوگ، دوست، احباب تنگ آ گئے۔ کفیل احمد نے بھی ہاتھ جوڑ لئے۔

ڈنڈوت کی کہ اے بھائی خطا ہوئی، بس بھول جا۔ لیا بھی تو کیا ہوا؟
بس یہ بات اس کے دل میں تیر سی لگتی۔ یار نہ کوئی گواہ نہ عینی شاہد کس کے سامنے لیا؟
بیٹوں نے پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کیے۔
اب بھی ہاتھ میں چھڑی پکڑے، وہ جب صبح کی سیر کو نکلتا تو کبھی خیال اس پر اسرار قلم کی طرف جا نکلتا۔ کیسا ہوگا؟ کس رنگ کس شکل کا؟ مگر رفتہ رفتہ یہ خیال دھندلانے لگا۔ اس روز مدتوں بعد صبح کی سیر میں اچانک ہی منور سے ملاقات ہوگئی۔
"ارے پیر فرتوت!"
"ارے میاں آزاد، لکھنؤ کے بانکے۔ یار تو ذرا بھی جو بدلا ہو۔" اس نے رشک سے منور احمد کی طرف دیکھا۔
"کمال کرتے ہو یار، پندرہ بیس دن میں کون سے جگ بیت گئے کہ میرا حلیہ ہی بدل جاتا۔ تم سناؤ، خوب کسرتیں ہو رہی ہیں یارا۔"
"پندرہ بیس دن!" وہ سناٹے میں آگیا۔ "یار میں تو تجھ سے برسوں بعد ملا ہوں۔"
"کیا سٹھیا گئے ہو واللہ!"
"چلئے سبحان اللہ، میاں، سرنیچا ٹانگیں اوپر کرنے کی ورزش کیا کرو۔ دوران خون دماغ کی طرف ہوگا تو افاقہ محسوس کرو گے۔ ہاں بھئی یہ بھابھی ابھی تک کیا غضب کی کڑھائی کرتی ہیں۔ نکی مین! کیا نفیس مٹی رومال لگا رکھا ہے جیب میں!"
مگر اب ہر بات دور سے آرہی تھی۔ کچھ بھنبھناتی ہوئی۔ ذکی احمد ایک معزز شہری اور صاحب اعتبار زیادہ کنفیوز نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے تمام باتیں سنی ان سنی کر کے جانے کی ٹھانی۔
"اچھا بھئی۔ او کے۔ کبھی آؤنا۔ میرا چکر وہاں، اس درخت سے لے کر فوارے تک کا ہے۔" وہ آگے بڑھنے لگا۔
"او کے۔ ہاں بھئی وہ دستانوں کا کام نکل گیا ہو تو کسی وقت دے دینا۔ اس روز تو سخت سردی تھی۔"
"دستانے؟" وہ رک گیا۔ "کیسے دستانے؟" اسے اپنا آپ پتھر میں ڈھلتا محسوس ہوا۔

"واہ بھئی وہی دستانے ۔ اس رات ملاقات ہوئی تو تمہارے ہاتھ برف ایسے یخ تھے میں نے ان کے پہنا دئیے تھے کہ کل لے لوں گا ۔ بس پھر موقعہ ہی نہیں ملا۔ وہ دراصل میرے بیٹے کے ہیں۔ کنیڈا سے لایا تھا۔ بہت گرم ہیں۔" منور احمد برابر اچھلنے کی ورزش کئے جا رہا تھا۔

"دستانے؟ کیسے تھے؟ کس رنگ کے۔ کس رات کو۔ کب؟ میں تم سے برسوں بعد ملا ہوں۔ منور احمد ہوش میں تو ہو۔" ذکی احمد نے اس کی آنکھوں میں گھور کے کہا۔

"اُفوہ ۔ اولڈ بوائے غصے کی کیا بات ہے یار ۔ کوئی ایسی چیز نہ تھی۔ چلو دفع کرو۔ مٹی پاؤ ۔ چالیس، اکتالیس۔"

"نہیں مٹی نہیں پڑ سکتی ۔ میں ایک معزز شہری ہوں ۔ اور میں نے اور میرے باپ نے اور اس کے باپ کے باپ نے کبھی کسی سے کوئی شے ادھار، عاریتاً، قرض نہیں لی اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی کی چیز ہماری نسل میں سے کسی کے پاس رہ گئی ہو۔ اور میری ماں نے مرتے وقت۔" وہ غصے سے کانپنے لگا۔

"اُفوہ بھئی مجھے احساس نہ تھا ۔ چلو اپنا چکر لگاؤ۔ فورگٹ اٹ یار ۔ اب ایسی بھی کیا بات ہے۔ دستانے، بس!"

اور ایکسے منور احمد جوگنگ کرتا ہوا دور نکل گیا۔ ذکی احمد کی آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے نمونوں کے جالی دار ترمرے لہرا رہے تھے ۔ قرض! ایک ہی لفظ اس کی کنپٹیوں پر ہتھوڑے ٹھونک رہا تھا۔ جس نے آج تک کسی سے ایک سوئی تک قرض گوارا نہ کیا۔ جو بے باق ہے اور بے باک ہے، جس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا بچ کر رہنا۔ مجھ پر کسی کا کوئی قرض نہیں۔ مگر یہ سب کیوں کر ہوا ۔ وہ قلم، یہ دستانے، اتنی معمولی چیزیں ۔ مگر معمولی کہاں؟ قلم تو برگد کا جٹا دھاری پیڑ بن کے اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ دستانے کا پنجہ تمام آسمان پر محیط تھا۔ اُسے اپنے سفید، شفاف لباس پر چھینٹے نظر آنے لگے۔

گھر پہنچتے ہی اس نے فرحت سے نئے کپڑے لانے کو کہا اور یہ جوڑا دھوبی کے بھجوا دیا۔ سردی کے مارے اس کو کپکپاہٹ محسوس ہو رہی تھی ۔ فرحت نے اس کو اچھی طرح سے لحاف اوڑھا دیا۔

"کیا بات ہے؟ آصف کو بلاؤں آپ کا بلڈ پریشر"

"نہیں" اس نے فرحت کی جانب کروٹ لی " فرحت کبھی میں کوئی کسی کے دستانے لے کر آیا تھا۔ کہیں سے ۔۔ ایک آدھ ماہ پہلے۔ یا اس سے پہلے کبھی۔ کبھی کسی کے۔ تم نے کبھی کوئی اجنبی دستانے میرے ہاتھ پر دیکھے ہیں جو میں نے خود نہ خریدے ہوں؟"

"دستانے؟" فرحت نے حیرت سے کہا۔ "نہیں تو۔ کبھی بھی نہیں۔ دستانے تو میں خود ہر سال اپنے ہاتھ سے آپ کے لئے بنتی ہوں۔"

"تو پھر منور احمد کیوں کہتا ہے؟"

"لوگ چیز دیتے کسی کو ہیں۔ نام کسی کا لیتے ہیں۔ وہ تو اسے مل بھی گئے ہوں گے۔ آپ خواہ مخواہ فکر نہ کریں۔ بس سو جائیں۔"

مگر خواب میں اس کی ماں اپنی جوانی کی حالت میں آئی اور وہ خود ضعیف و ناتواں اس کے سامنے تھا اور اس نے اپنے آپ کو اپنی ماں سے زیادہ معمر پایا، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، اور ماں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔ "میں تو نچنت ہوں مجھ پر کسی کا قرض نہیں۔"

"اور میں؟" وہ ایک جھٹکے سے بیدار ہو گیا۔ " اور میں؟" اسے اپنا آپ زرد بھربھری مٹی کے کچے وجود کی طرح ادھڑتا محسوس ہوا ۔ "مجھ پر یہ کیسے کیسے عجیب و غریب قرض ہیں۔"

اور اسے یاد آیا کہ ماں ایک وظیفہ کرتی تھی جس سے پہاڑ برابر قرض بھی ادا ہو جاتے ہیں۔ اس نے فرحت سے پرانی کتابوں میں وہ وظیفوں کی کتاب ڈھونڈنے کو کہا۔

"مگر آپ پر کونسا قرض ہے؟ کوئی قرض نہیں۔"

"تو پھر لوگ کیوں کہتے ہیں ۔۔؟"

"بس آپ کا وہم ہے۔ وہ لوگ بھولتے ہیں۔"

"مگر مجھی سے کیوں کہتے ہیں؟" اس پر آصف نے اس کی دوا بدل دی۔ جس سے اس کی آنکھوں کے سامنے ترمرے نئی نئی شکلوں میں تنے لگے۔ مگر ہر شے دور سے دور تر

ہوتی چلی گئی۔ اکثر سے لگتا کہ کسی شریر بچے نے وڈیو فلم کے فارورڈ کا بٹن مسلسل دبائے رکھا ہے۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھا۔ دوستوں کی محفلیں لگتیں۔ کفیل احمد سعودی عرب جا چکا تھا۔ اور منور احمد کی چھٹی بھی ختم ہو گئی تھی۔

آصف نے ڈاکٹر احمد دیداد کے تمام وڈیو کسیٹ لاکر اس کے کمرے میں رکھ دیئے تھے۔ جنہیں وہ اکثر دیکھتا رہتا۔ اس روز دھوبی کا دن تھا۔ دُھلائی کے کپڑوں کا بڑا سا گٹھر باندھ کر اس نے کمر پر لادا اور جاتے جاتے اس کے کمرے سے ٹی وی کی آواز سُن کر دروازے میں رک گیا۔

"بڑے صاب جی یہ کون ملوانا ہیں ؟"

"آؤ رمضان — بیٹھو، دیکھو — یہ مولانا نہیں — یہ عالم ہیں — ہمیں ایسے ہی علماء کی ضرورت ہے جو ہماری بات ساری دنیا کو سمجھا سکیں۔ آؤ میں تمہیں ترجمہ کر کے بتاتا جاتا ہوں۔ دیکھو یہ تمام مناظرہ جو ہے نا وہ ولایت میں ہوا ہے۔"

"اچھا!" رمضان حیران ہو کر بیٹھ رہا۔ اور بہت دیر بیٹھا رہا۔ ذکی احمد وقفوں وقفوں سے فقروں کا ترجمہ سناتا رہا۔

"واہ جی واہ — اَلّذِینَ — کیسے کیسے علمان ہیں جی — اچھا اب بھٹی کا وقت ہو رہا ہے۔" وہ اُٹھ کر چل دیا۔ اور جاتے جاتے دروازے میں رک کر پلٹا۔

"ہاں صاحب جی۔ وہ میری ٹوپی — اس روز مسجد میں آپ نے نماز پڑھنے کو لی تھی — اور بھی ہیں میرے پاس — مگر وہ میرے بیٹے نے کویت سے بھیجی تھی — یہیں کہیں ہو گی۔ جی چلو — پھر لے لوں گا۔ اگلی دفعہ۔"

"ٹوپی — ؟" اس کا تمام جسم لرز اٹھا۔ کب — کونسی ؟ رمضان! کس مسجد میں؟ میں تو ایک مدت سے محلے کی مسجد میں نہیں گیا — میں تو جامع مسجد میں جاتا ہوں کیسی تھی ٹوپی ؟"

"چھوڑو جی — صاحب جی — کچھ بھی نہیں — اور آ جائے گی — ایسی بھی کیا بات ہے جی — ہم غریبوں کا تو فخر ہی سہی اچھا جی۔"

"نہیں رکو ـــ رمضان!" وہ ننگے پاؤں اس کے پیچھے بھاگا ـ مگر رمضان گیٹ سے باہر جاچکا تھا ـ

فرحت اور آصف نے اُسے دونوں سے سہارا دیا ـ "کیا ہوا؟ ـ لوگ تو باولے ہو گئے ہیں ـ کون سی ٹوپی ـــ کل ہی میں بیس ٹوپیاں لے کر دوں گی خبیث کو!"

" مگر میں نے ٹوپی نہیں لی ـ نہیں مانگی ـــ" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا ـ "میں نے ٹوپی نہیں لی :"

" ٹھیک ہے ابا جی ـــ یہ سب خبیث ایک سے ہوتے ہیں ـــ خواہ مخواہ چیزیں بٹورنے کا بہانہ ہے ـــ آپ آرام کریں ـ" آصف نے نہایت آہستگی سے اُسے بستر پہ لٹا دیا ـ

مگر اس وقت وہ لیٹنا نہیں چاہتا تھا ـ "مجھے باہر کھلی ہوا میں جانے دو ـ" وہ اپنے ہرے بھرے لان میں بیٹھ گیا ـ چاروں سمت سویٹ پیز کی مہک اڑ رہی تھی ـ اور منی پلانٹ اور بوگن بیلا اور پیلی چنبیلی کی گھنی بیلیں دیواروں پر چڑھی تھیں ـ سبزے کی فصیلیں چاروں سمت اٹھی تھیں ـ دنیا کس قدر مقدرو والی، کتنی دولت مند، کیسی صاحب ثروت ہے ـ اس نے کھلے آسمان کی طرف دیکھا ـ جس کا کوئی شروع کوئی اخیر نہ تھا اور اس نے زمین کی سختی کو اپنے پاؤں تلے محسوس کیا اور اس زمین اور آسمان کے درمیان کا فاصلہ ماپنا چاہا ـ مگر اس زمین اور آسمان کے درمیان تو بس تنگیٔ چشم حسود کا سا فاصلہ تھا جس میں صرف ایک ذکی احمد مقروض تھا ـ جس کی جیب میں قرضے کا قلم ـــ ہاتھ میں مانگے کے دستانے سر پر غصب شدہ ٹوپی تھی ـــ ان بے بضاعت چیزوں نے اس سے اس کا موروثی لقب چھین لیا تھا ـ وہ معزز شہری تھا نہ صاحب اعتبار! یہ سب کیوں کر ہو گیا ـ وہ حیران ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ـ اسے چاروں سمت سے ہر شے اپنی چیز طلب کرتی نظر آتی ـ گویا ابھی یہ درخت، پھول، زمین، مکان، فرش، جانور، انسان، سب اس سے اپنی اپنی چیزیں مانگنے لگیں گے ـ چیزیں جو اس نے نہیں لی تھیں مگر اس کی برأت کا کوئی عینی گواہ کوئی شاہد نہ تھا ـ وہ قرض خواہوں میں گھرا تھا اور آج تک خبر نہ رکھتا تھا ـ ماں پہاڑ ایسے قرض سے نجات

کے وظیفے کیوں کرتی تھی؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھا۔ مگر فرحت اس کو سہارا دینے کے لئے آگئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور سہم گیا۔ اس کی شکل بھی فرغن خوابوں ایسی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ترس کے گہرے بھر گئے۔

"سنیئے! وہ مجھے ضرورت تو نہیں تھی ـــ مگر وہ میں نے ایک پیکٹ رکھوایا تھا آپ کے پاس ـــ وہ ـــ مجھے اچانک ہی ضرورت ـــ"

"پیکٹ؟ کونسا؟" الفاظ ذکی احمد کی زبان پر جم گئے ـــ فرحت کی صورت بدل چکی تھی۔ وہ پلٹ کر گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ موسم صبح سے خنک تھا۔ رہ رہ کے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے جن میں درختوں کے پتے سرسراتے اور دور دور کی باتیں ان میں لپٹی چلی آتیں۔ اس وقت آسمان پر ستارے نظر آنے شروع ہو گئے تھے ـ کتنے، کس قدر، کہاں سے کہاں تک ـ کب سے کب تک؟ اس نے ان سب کو دیکھنا چاہا۔ اور ان سب کو بھی جو اس کے سامنے نہ تھے۔

تاریکی رفتہ رفتہ گہری ہو رہی تھی ـ تاریکی کی بھی اپنی چمک ہوتی ہے جب وہ بے حد گہری ہو جائے اور اس میں ستاروں کے نقطے ٹمٹمانے لگیں ـــ اور باقی گھُپ اندھیرا اور ہواؤں کی سرسراہٹ اور قدیم درختوں سے لپٹے واقعات اور لمحے اور باتیں جو گذر کے نہ گذریں اور ہر شے گذرنے سے پہلے اور گزرنے کے بعد کی کیفیت میں گرفتار ـــ اس نے سر گھما کے چاروں اور دیکھا اور ایک ہی آواز پھلجھڑی کی قوس ایسی آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے تک ٹھہری تھی ـــ "ہماری شے ہمیں لوٹا دو ذکی احمد ـــ ہماری شے ہمیں لوٹا دو ـ"

منشا یاد

چیزیں اپنے تعلّق سے پہچانی جاتی ہیں

بڑی نہر کے پُل پر پہنچ کر اس کے میکے کے گاؤں کا گھوڑ سوار واپس چلا گیا۔ اس کا سسرالی گاؤں اب ڈیڑھ دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کی مسجد کے مینار، چودھریوں کے چوبارے اور آم کے پیڑ صاف نظر آنے لگے تھے۔

نہر سے ایک چھوٹا سا راج بہا سیدھا گاؤں جاتا تھا۔ اس نے پانی سے لبالب نہر کو دیکھا۔ اُسے لگا وہ خود بھی اسی کی طرح خوشی سے لبالب ہے۔ اپنی اب تک کی زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا جب اس نے خوشی محسوس کی تھی اور اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ پہلا موقع وہ تھا جب وہ پہلی بار ماں بنی تھی اور اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ پدری نظام کے معاشرے میں ہر عورت کو بیٹے کی پیدائش احساس تحفظ عطا کرتی ہے اُسے بھی ایسا لگا تھا جیسے ترازو کا وہ پلڑا جسے اس کی ساس اپنے بیٹے سمیت اُٹھنے نہیں دیتی تھی ایک دم برابر ہو گیا ہو۔ مگر اب اسے ایک دوسری طرح کی خوشی اور فخر کا احساس ہو رہا تھا، جیسے وہ گدھی یا گائے کی جُون سے نکل کر آدمی کی جون میں آگئی ہو۔

راج بہا کے دونوں جانب ہری بھری فصلیں اور پھلوں سے لدے اشجار تھے جو سہ پہر کی دھوپ میں بہت خوب صورت لگ رہے تھے یا شاید آج اسے ہر چیز خوبصورت لگ رہی تھی۔ اُسے وہ دن یاد آنے لگا جب کئی سال پہلے وہ بیاہ کر پہلی بار اس گاؤں میں آئی تھی۔ ایسی ہی رُت تھی ہاں بارش ہو جانے کی وجہ سے اس روز اتنا گرد و غبار

نہیں اٹھاتا تھا اُس کو یاد اس روز نہر بھی سوکھی پڑی تھی۔ البتہ آنسوؤں کی ایک نہر اس کے اندر ضرور بہہ رہی تھی جو آنکھوں موکھوں سے رِس نہیں پا رہی تھی، اُسے ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس دن کی ہر بات اس کے دل پر نقش تھی۔ لاری سے اُتر کر انہوں نے تانگہ کرائے پر لیا تھا۔ دولہا، دلہن اور جہیز سمیت پوری برات ایک ہی تانگے میں سما گئی تھی۔ اس کا خیال تھا اگر میکے کے گاؤں میں اس کی رخصتی دھوم دھام سے نہیں ہوئی تھی تو سسرالی گاؤں میں اس کا استقبال ضرور اچھے طریقے سے ہوگا مگر جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ محض ایک کٹیا سے دوسری میں منتقل ہوئی تھی۔ ویسا ہی چھوٹا سا کچّے پکّے مکانوں پر مشتمل ایک گاؤں۔ ویسا ہی بڑا سا تالاب جس نے آدھے سے زیادہ گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اسی طرح کا گاؤں سے ہٹ کر ایک جھونپڑی نما مکان جس کی دیواریں مفلسی کی اینٹوں اور محرومی کے گارے سے چُنی گئی تھیں۔ اور جس کی چھت عُسرت کی کڑیوں پر کھڑی تھی۔

تانگہ گاؤں سے باہر ہی رُک گیا تھا کہ گلیوں میں بارش کا پانی، گوبر اور کیچڑ تھا۔ براتیوں نے اُس کے جہیز کا مختصر سا سامان اٹھا لیا تھا۔ کپڑوں کی گٹھڑی اس نے خود سر پر اُٹھالی اور چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کی پوٹلی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ کیچڑ سے لت پت گلیوں میں وہ سنبھل سنبھل کر چلتی بڑی مشکل سے اس گھر تک پہنچی تھی جو اب اس کا اپنا گھر تھا۔ گلیوں میں لوگ آجا رہے تھے مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی البتہ چند ایک راہگیروں نے اس کے لیے راستہ ضرور چھوڑ اٹھایا پھر موچیوں کی دکان کے سامنے اکڑوں بیٹھے کن کٹے کُتّے نے اس پر غرّانے کے لیے مُنہ کھولا تھا۔ مگر پھر اس کے شناسا ہمراہیوں کو دیکھ کر وہ اپنی غرّاہٹ پی گیا تھا۔

اُسے یاد آ رہا تھا کہ اس کی ساس نے اس کا استقبال اس طرح کیا تھا جیسے اس کا بیٹا نئی گائے یا گدھی خرید لایا ہو اس کی پہلی بیوی دو لڑکیاں چھوڑ کر مر گئی تھی یا شاید شوہر نے اسے پیٹ پیٹ کر یا ساس نے طعنے دے دے کر مار ڈالا تھا ساس نے البتہ اس کے سر سے گٹھڑی اتار کر ایک طرف رکھ دی تھی حالانکہ وہ جانتی ہوگی کہ اس میں کوئی قیمتی چیز نہیں تھی پھر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی تک لے گئی تھی جس پر کالی چیٹ ڈبیوں والا

کھیس بچھا ہوا تھا۔ اسے اس کھیس اور اپنے جیون میں بڑی مشابہت نظر آئی تھی وہ اس
ے بعد بھی اُسے سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی کہیں اس کا کالا رنگ اتر کر سفیدی کو سیاہی مائل
کردے۔ ساس اُسے چارپائی پر بٹھا کر بیٹے اور براتیوں کی آؤ بھگت میں اُسے بھول گئی تھی۔
سے پانی بھی مانگ کر پینا پڑا تھا۔

مکلاوے کے بعد وہ صرف دو بار شوہر کے ہمراہ میکے گئی تھی۔ ایک بار جب اس کا بوڑھا
پ فوت ہوگیا تھا اور دوسری بار جب اس کے سوتیلے بھائی کا بیاہ ہوا تھا۔ اس کے بعد
سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں نے کبھی اس کی خبر لی نہ ہی اسے کسی خوشی غمی کے موقع پر یاد کیا۔ وہ بھی
بھی پلٹ کر وہاں نہیں گئی۔ کس کے پاس جاتی ــــ؟ سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کو اس سے ملنے
کوئی ارمان نہیں تھا۔ وہ تو اس کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کے موقع پر بھی ملنے یا مبارک باد دینے
ہیں آئے تھے۔ ان کے اس سلوک کی وجہ سے اس کا دل دکھی رہتا تھا مگر اس نے تہیّہ کیا ہوا
تھا کہ جب تک میکے کے گھر سے کوئی اسے ملنے نہیں آتا یا اُسے خوشی غمی کی کسی تقریب میں شرکت
کے لیے سندیسہ نہیں بھیجا جاتا وہ بھی ان سے ملنے نہیں جائیگی۔

اس کا شوہر اس کے باپ کی طرح غریب اور معمولی شخص تھا۔ نمبر دار کے ہاں ملازم تھا
اُن کی چلمیں بھرتا، مویشیوں کو چارہ ڈالتا اور ان کے گھوڑوں کی خدمت کرتا۔ وہ بڑی مشکل
کی زندگی گزار رہی تھی مگر مفلسی تو اس کی جڑواں بہن تھی وہ ایسی زندگی کی عادی تھی۔ اس لیے
اسے کوئی شکایت تھی۔ خدا نے اُسے صحت مند اولاد دی تھی اور وہ خوش اور مطمئن تھی۔ البتہ
بوڑھی ساس جب اسے میکے گھر کے طعنے دیتی کہ اس کا آگا پیچھا نہیں ہے اور کبھی کسی نے بھول کر
بھی اس کی خبر نہیں لی تو اسے بہت برا لگتا اور وہ اندر ہی اندر آدی پر چڑھی رہتی۔ اس کا شوہر
اب تک ماں سے ڈرتا تھا اور جب بھی گھر میں جھگڑا ہو جاتا تھا وہ اسے ہی پیٹ ڈالتا تھا خواہ
اس کا ذرا سا قصور بھی نہ ہو۔

پھر میکہ گھر ہی نہیں میکہ گاؤں بھی اس کے لیے گالی بن گیا اور بڑھیا اُسے ستانے کا
کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔

اس کا میکہ گاؤں کچھ اچھی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ زمینداروں کے دو گروہ

پشت ہا پشت سے آپس میں موت کی ہولی کھیلتے آئے تھے۔ اس نے بچپن میں بھی انتقام در انتقام کے سلسلوں کی کئی لڑائیاں دیکھی اور سنی تھیں۔ مگر اب اس گاؤں کے لوگ باہمی لڑائیوں کے علاوہ چوریوں اور ڈاکوں میں بھی ملوث ہو گئے تھے۔ کئی ایک اشتہاری ملزموں کی پولیس کو تلاش رہتی تھی اور وہ اکثر چھاپے مارتی رہتی تھی۔

اس کے سسرال کی گاؤں کی ایک عورت اس علاقے میں بیاہی ہوئی تھی وہ سال چھ مہینے میں جب بھی آتی اس سے نئی نئی خونریزیوں، مقدموں اور حادثوں کے قصے سننے میں آتے۔ اور اب تو کچھ عرصے سے اس کے میکے گاؤں کے چوروں، ڈاکوؤں اور قتل کے مقدموں میں ماخوذ اشتہاری ملزموں کے پولیس مقابلوں کی خبریں ہر گاؤں میں پہنچنے لگی تھیں۔ جب بھی ایسی کوئی خبر آتی اس کی ساس اُسے جلانے کے لیے بار بار اس کے میکے گاؤں کا ذکر اس طرح کرتی جیسے ان سب باتوں کی ذمہ دار وہی ہو۔

بڑھیا جب زیادہ تنگ کرتی تو اس سے نہ رہا جاتا وہ جواب دیتی۔

"اگر وہ گاؤں برا ہے اور وہاں کے لوگ ایسے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"ہاں تمہارا تو کچھ قصور نہیں اس گاؤں کی مٹی ہی ایسی ہے وہاں کوئی اچھا انسان پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں پیدا نہیں ہو سکتا" وہ جل بھن کر جواب دیتی۔ پھر اسے اپنے گاؤں کے نیک، اچھے اور معصوم لوگ یاد آتے۔ اپنا باپ یاد آتا جس نے زندگی بھر لوگوں کی خدمت کی تھی اور جو ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر بے چین ہو جاتا تھا۔ اور "سب کا بھلا" جس کا تکیۂ کلام بن گیا تھا۔

کئی بار وہ خود کو سمجھاتی کہ اس کے شوہر کا گاؤں ہی اب اس کا اپنا گاؤں تھا اور اسے میکے گاؤں کے طعنوں مہنوں سے چڑنا نہیں چاہیئے بلکہ اسے بھول جانا چاہیئے مگر میکہ گاؤں اس کے دل و دماغ سے نہ نکلتا تھا وہ جیسا بھی تھا اسے بے حد عزیز تھا وہ وہاں نہیں جاتی تھی مگر وہ اس کے اندر آباد رہتا تھا وہ اس کے سپنے دیکھتی، اس کی گلیوں میں گھومتی، اس کے خراس اور رہٹ چلنے کی آوازیں سنتی۔ بچپن کی ہم جولیوں کے ساتھ اس کے باغوں میں لکن میٹی

پھیلتی۔ اس کے پرندے اس کے خیالوں میں پھڑپھڑاتے۔ اس کے کھیت اور فصلیں اس کی یادوں کے افق پر لہلہاتیں اس کا نام لیتے ہی اس کے منہ میں مٹھاس سی گھل جاتی۔

ایک بار قریبی قصبے کے میلہ مویشیاں میں اس کے گاؤں کی ایک بھینس بکنے آئی جسے اس کے سسرالی گاؤں کا ایک جاٹ خرید کر لے آیا اُسے پتہ چلا تو وہ یوں بیتاب ہو کر اس بھینس کو دیکھنے گئی جیسے وہ اس کی کوئی بچھڑی سہیلی ہو۔ اس کے بعد بھی وہ کئی بار اسے دیکھنے گئی اور اس کے حال احوال سے باخبر رہتی۔

پھر ایک دفعہ جب گاؤں کے ایک زمیندار کی بیٹی کی شادی ہوئی تو وہ گاؤں کی عورتوں کے ہمراہ بارات کے استقبال کے لیے سٹھری سٹھنیاں گا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک اونچے شملے والے معمّر براتی پر پڑی جو بادامی رنگ کی گھوڑی پر سوار تھا۔ سٹھنی کے بول اس کے حلق میں اٹک گئے وہ اس کے میکے گاؤں کا ملک نواز تھا۔ ملک نواز کو اس نے لڑکپن میں دیکھا تھا مگر فاصلے سے ــــ پھر بھی اس نے اسے پہچان لیا اس کا جی چاہا آگے بڑھ کر اس کی لگام تھام لے اور بتائے کہ وہ اس کے گاؤں کی ہے اور اسے یہاں دیکھ کر اسے بہت اچھا لگا ہے مگر وہ ایسا نہ کر سکی وہ جانتی تھی کہ اس کے اور ملک نواز کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ وہی فاصلہ جو ہاتھی اور چیونٹی میں ہوتا ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں چھتوں کی منڈیروں سے براتیوں پر کنکریاں پھینک رہی تھیں اس خیال سے کہ کوئی کنکری ملک نواز یا اس کے گاؤں کی گھوڑی کو نہ لگ جائے وہ انہیں منع کرنے لگی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس پر پھولوں کی پتیوں کی بارش کرتی۔ اس نے آس پاس کھڑی عورتوں کو خوشی اور فخر سے بتایا۔

" وہ سفید شملے والا ــــ بادامی گھوڑی پر سوار براتی میرے گاؤں کا ہے اس کا نام ملک نواز ہے۔ صدقے جاؤں ساری برات میں سب سے زیادہ باوقار لگ رہا ہے۔"

برات کھانا کھانے لگی تو وہ دوسری عورتوں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی اور واپس اپنے گھر آ گئی۔ گاؤں بھر میں زردے پلاؤ اور قورمے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر بھی خدمت گاروں میں شامل تھا اور اُسے بھی کھانا ملنا تھا مگر کامیوں اور خدمت گاروں کی باری سب سے آخر میں آتی تھی۔ بچّوں کو بھوک لگی تھی، اس نے سوچا چاول ابال لے ــــ

شادی کے گھر سے پتہ نہیں کس وقت کھانا آئے۔

اسی سمے گاؤں کے میراثی نے باہر سے آواز دی وہ باہر آئی تو وہ ہاتھ میں سالن کی دیگچی اور چاولوں کی طشتری لیے کھڑا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اس کے شوہر نے اتنی جلدی کھانا کیسے حاصل کر لیا اور پھر کسی کے ہاتھ بھجوا بھی دیا۔ میراثی نے کہا۔

"یہ تمہاری روٹی ہے بہن — جلدی سے برتن خالی کر دو"۔

"میری روٹی — ؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس نے بھیجی ہے ؟"

"یہ جاٹ لوگ ہیں نا بیٹی — ان کی قدیمی روایت ہے کسی دوسرے گاؤں میں شادی بیاہ پر جائیں تو اپنے گاؤں کی بیٹیوں کو روٹی ضرور بھجواتے ہیں اسے سنبھال کہتے ہیں۔ برات میں تمہارے گاؤں کا ملک نواز بھی ہے۔ اس نے تمہیں یہ روٹی بھیجی ہے"۔

"تو کیا وہ مجھے جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ"

"اس نے تاجا نائی کو بلا کر پوچھا تھا اسی سے پتہ چلا کہ اس کے گاؤں کی ایک لڑکی یہاں بیاہی ہوئی ہے۔ یہ روپے بھی ساتھ ہیں"۔ میراثی نے پانچ روپے کا نوٹ اور کھانا اسے تھماتے ہوئے بتایا۔

خوشی سے اس کا دل کھل اٹھا۔ فخر کے احساس سے اسے اپنا قد بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اس کھانے کو طشتریوں میں سجا کر گھر کے باہر رکھ دے اور آنے جانے والوں کو دکھا دکھا کر کہے دیکھو یہ کھانا میرے میکے گاؤں کے براتی نے مجھے بھیجا ہے۔

ڈولی نکلی اور برات واپس جانے لگی تو وہ ہمت کر کے ملک نواز کے پاس پہنچ گئی اور اسے سلام کیا۔

"میرا نام بی بی ہے میں آپ کے گاؤں کی ہوں فیکے مصلی کی بیٹی"۔

"جیتی رہو"

"آپ نے مجھے یاد رکھا آپ کی بڑی مہربانی"۔

"وہ تو میرا فرض تھا اللہ تمہیں خوش رکھے"۔

ملک نواز نے اس کے گھر، شوہر اور بچوں کے بارے میں بھی پوچھا اور اُسے دُعا دے کر چلا گیا اسے لگا جیسے وہ کچھ عرصہ پہلے مرگئی تھی اور اب دوبارہ جی اٹھی ہے۔

میکے گاؤں کی خوشگوار یادوں نے اسے کئی روز تک بے چین کیے رکھا وہ اپنے گاؤں جانا اور اپنے مرحوم ماں باپ کی نشانی اپنا آبائی مکان دیکھنا چاہتی تھی مگر شوہر اور ساس نے اُسے جانے کی اجازت نہ دی۔

اُسے یاد آرہا تھا کہ چند روز پہلے جب وہ ایک مدّت کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے کے ہمراہ اپنے میکے گاؤں کے لیے روانہ ہوئی تھی تو اس کی ساس نے بہت باتیں بنائی تھیں۔ اگرچہ وہ اپنے سوتیلے بھائی کے اکلوتے بچّے کی تعزیت کے لیے جارہی تھی مگر بڑھیا اسے ابھی سے خالی ہاتھ لوٹنے کے طعنے دے رہی تھی۔ اس کا شوہر عام طور پر لین دین کی ایسی باتوں کو اہمیت نہ دیتا تھا مگر جب سے نمبردار کی گھوڑی جس کے چارے پانی پہ وہ مامور تھا چوری ہوگئی تھی اور اسے نوکری سے جواب مل گیا تھا وہ بے کار رہ کر ضدّی اور چڑچڑا ہوگیا تھا۔ اس نے بھی طعنوں مہنوں میں ماں کا ساتھ دیا اور اُسے ریل گاڑی یا بس کا کرایہ تک نہ دیا تھا۔ ماں بیٹا بیس میل کا سفر پیدل طے کرکے پہنچے تھے۔

سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں نے اس کی آمد پر کسی خاص خوشی یا تشکّر کا اظہار نہیں کیا تھا مگر اتنے عرصے کے بعد اس کا ایسے موقع پر آنا انہیں بُرا بھی نہیں لگا تھا اس کے جی میں لالچ بالکل نہیں تھا اور پھر وہ افسوس کے لیے آئی تھی مگر وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی تھی کہ اسے اور اس کے لڑکے کو میکے گھر سے کم از کم ایک ایک جوڑا کپڑوں کا ضرور مل جائے ورنہ وہ ساس اور شوہر کے طعنے سن سن کر دکھی ہوتی رہے گی۔ اس نے سوچا تک نہ تھا کہ میکے گاؤں جانا اتنا مبارک اور خوشگوار ثابت ہوگا۔

ایک شام وہ اپنی سوتیلی بہن کے ہمراہ گلی سے گزر رہی تھی کہ چاچا دتو لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا قریب سے گزرا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔ چاچا دتو کھاتا پیتا جاٹ تھا۔ کئی مربعے زمین اس کی ملکیت تھی مگر وہ زندگی بھر چوریوں اور ڈاکوں میں ملوث رہا تھا۔ کئی بار جیل گیا تھا۔ اب کمزور اور بوڑھا ہوگیا تھا۔ مگر اس کے بیٹے اور بھائی بھتیجے پوری طرح

اس کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے چوریاں اور ڈاکے ان کی ضرورت اور مجبوری نہیں مشغلہ تھے۔ رہزنی، رسہ گیری اور ڈکیتی میں ان کی دور دور تک مار تھی۔ چاچا دتو نے اُسے نہیں پہچانا اس کی بہن نے اس کا تعارف کرایا تو اسے یاد آگیا۔ اس کا مرحوم باپ کچھ عرصہ تک ان کے مویشی چراتا رہا تھا وہ بھی کبھی کبھی گندم صاف کرنے ماں کے ساتھ ان کی حویلی میں جایا کرتی تھی۔ چاچا دتو نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی پھر بولا۔

"کہاں بیاہی ہوئی ہو؟"

اس نے اپنے سُسرالی گاؤں کا نام بتایا تو چاچا دتو چونک سا گیا۔ کچھ دیر پریشان سا کھڑا لاٹھی کے سرے پر پیتل کی شام کو مسلتا رہا پھر بولا۔

"کب سے وہاں ہو؟"

"میرے بیاہ کو تو دس بارہ سال ہوگئے ہیں چاچا۔"

چاچا دتو نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگا۔

"بیٹی سُسرال واپس جانے سے پہلے ہمارے ہاں ضرور آنا ایک ضروری کام ہے۔"

اس نے اگلے روز آنے کا وعدہ کر لیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چاچا دتو کو اس سے کیا ضروری کام ہو سکتا تھا اور وہ اس کے سُسرالی گاؤں کا نام سن کر چونک سا کیوں گیا تھا۔

اگلے روز وہ ماں اور بھائی کے ساتھ چاچا دتو کی حویلی پہنچی۔ انہیں ڈیوڑھی میں بٹھا دیا گیا اور لسی پانی سے تواضع کی گئی۔ گھر کے اندر کنبے کے بہت سے افراد جمع تھے اور اندر سے کسی مسئلے پر بحث کی آوازیں آرہی تھیں تھوڑی دیر بعد چاچا دتو کی چھوٹی بہو کپڑوں کا جوڑا، چاولوں کا تھال اور پانچ روپے کا نوٹ لے کر آئی اور سب کچھ اس کی جھولی میں ڈال کر چلی گئی وہ اُٹھ کر واپس آنے لگے تو ایک نوکرانی نے آکر کہا۔

"ابھی تم لوگ بیٹھو اور چودھری صاحب کا انتظار کرو۔"

گھر کے اندر آوازوں کا شور اب اونچا ہوگیا تھا ایسے لگتا تھا جیسے کوئی نہایت نزاعی معاملہ زیرِ بحث ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا مگر بار بار کسی گھوڑی کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ چونکی

لیکن وہ نمبردار کی اُسی گھوڑی کا ذکر تو نہیں تھا جس کے چوری ہو جانے پر اس کے شوہر کو نوکری سے جواب مل گیا تھا اور جس کی بازیابی کے لیے اس کے سسرالی گاؤں کے نمبردار نے بھاری رقم کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔

یہ تین چار ماہ پہلے کی بات تھی جب گرمیوں کی ایک رات کو چند مسلح گھوڑ سوار ڈاکو اس کے سسرالی گاؤں میں داخل ہوئے تھے۔ نمبردار کی گھوڑی جسے رانی کے نام سے پکارا جاتا تھا اور جو اس کی اکلوتی بیٹی بانو کو بہت عزیز تھی، چوری کر کے لے گئے تھے۔ رانی کی خوبصورتی اور خوبیوں کا دُور دُور تک شہرہ تھا اور اعلیٰ نسل کی گھوڑیوں اور گھوڑوں کے شوقین زمیندار اُسے خریدنے کے لیے بھاری رقموں کی پیش کش کر چکے تھے۔ مگر نمبردار اسے کسی قیمت پر بیچنے پر رضامند نہیں ہوا تھا اس سے بانو ہی کی طرح محبت کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی خیریت دریافت کرنے اور دعا دینے کے لیے بانو اور رانی کا نام ایک ساتھ لیتے تھے۔ رانی کی علاقے میں اس قدر دھوم تھی کہ بانو کہا کرتی اُسے رانی نے بانو رانی بنا دیا ہے ورنہ وہ محض بانو تھی جب ڈاکوؤں نے رانی کے پاؤں کا سنگل کھولا بانو قریبی چھت پر سو رہی تھی۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی تھی جب حویلی سے نکلتے ہوئے رانی زور زور سے ہنہنائی تھی اور اس سے پیشتر کہ بانو کا شور سُن کر جاگے اور بوکھلاتے ہوئے لوگ ڈاکوؤں کے گرد گھیرا ڈال لیتے یا ان کا تعاقب کرتے وہ ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں تیز رفتار گھوڑوں پر سوار غائب ہو چکے تھے۔ کھوجیوں نے پکی سڑک تک کھُرا نکالا مگر پھر اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا اگر بارش نہ ہو جاتی تو شاید اس کا کچھ سُراغ مل جاتا مگر اب سارے نشانات مٹ چکے تھے۔

اتنی خوبصورت عزیز اور قیمتی گھوڑی چوری ہو جانے پر نمبردار اور اس کی بیٹی ہی نہیں پورا گاؤں اداس تھا۔ دُور دُور سے لوگ افسوس کرنے آئے۔ بانو نے کئی روز تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ پولیس میں رپورٹ کرائی گئی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور اب نمبردار نے ہر طرف سے مایوس ہو کر مخبری یا نشاندہی کرنے والے کے لیے بھاری رقم کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔

اس کا اندازہ درست نکلا یہ اُسی گھوڑی کا ذکر ہو رہا تھا۔

چاچا ولّو اس کے پاس آیا اور بولا۔

"بیٹی ۔۔ لڑکے تمہارے سسرالی گاؤں کی گھوڑی کی شہرت سن کر اسے بھگا لائے تھے۔ واقعی بہت خوبصورت اور قیمتی جانور ہے۔ لیکن اگر انہیں معلوم ہوتا کہ وہاں اپنے گاؤں کی لڑکی بیاہی ہوئی ہے تو وہ کبھی اس طرف کا رُخ نہ کرتے۔ یہ سب لاعلمی میں ہوا۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم گھوڑی واپس کر دیں گے۔"

چاچا وتو کا منجھلا بیٹا جس کی بڑی بڑی خوفناک مونچھیں تھیں قریب آیا اور بولا۔ "اگر تم چاہو تو یہ گھوڑی تم خود واپس لے جا سکتی ہو۔"

"میں ۔۔؟"

"ہاں" چاچا وتو نے کہا "کوئی آدمی تمہیں وہاں تک چھوڑ آئے گا۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔" اس کی سوتیلی ماں نے کہا "نمبردار اور اس کی بیٹی بہت خوش ہوں گے۔ اس کی زندگی سنور جائے گی۔"

"میں ان سے کہوں گی۔" وہ بولی "پولیس رپورٹ واپس لے لیں وہ ضرور مان جائیں گے۔"

"پولیس سے ہم نپٹ لیں گے۔" چاچا وتو کے بیٹے نے کہا۔

"ہاں اس کی تم فکر نہ کرو۔" چاچا وتو بولا "ہم تو تم سے شرمندہ ہیں بیٹی۔"

وہ چونکی

ایک تیز رفتار موٹر سائیکل گرد اڑاتی شور مچاتی قریب آ رہی تھی۔ وہ لگام کھینچ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ موٹر سائیکل سوار قریب آ کر رُک گیا وہ ماسٹر گلزار تھا کہنے لگا۔

"مجھے تو یہ نمبردار کی گھوڑی رانی معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں وہی ہے۔" اس نے چہک کر کہا۔

"کہاں سے ملی؟"

"میرے میکے گاؤں کے ڈاکو لے گئے تھے۔" اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے ڈاکو ہونا بڑے فخر کی بات ہو۔

"پھر واپس کیسے کر دی؟"

"جب انہیں پتہ چلا اس گاؤں میں میں بیاہی ہوئی ہوں ان کے گاؤں کی بیٹی۔ تو

انہوں نے واپس کر دی۔"

"کمال ہے۔" ماسٹر گلزار نے حیرت اور خوشی سے کہا۔ "ان چوروں ڈاکوؤں کے بھی نرالے اصول ہوتے ہیں اچھا میں گاؤں جاکر اطلاع کرتا ہوں۔"

وہ چاہتی تو ماسٹر گلزار کے پیچھے پیچھے فوراً ہی گاؤں پہنچ سکتی تھی اس کا بیٹا بھی رفتار بڑھانے کے لیے اصرار کر رہا تھا خود رانی اپنے گاؤں کے قریب آکر بے قرار ہو رہی تھی اور اڑ کر پہنچ جانا چاہتی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر رفتار کم کر دی۔ وہ جانتی تھی کہ گاؤں میں رانی کی بازیابی کی خبر پہنچتے ہی سارا گاؤں اسے دیکھنے اور اس کا استقبال کرنے کے لیے جمع ہو جائے گا وہ خوشی کی ان ساعتوں کو طول دینا چاہتی تھی۔

گاؤں کے باہر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اسے لگا وہ خود رانی ہے اور ہاتھی پر سوار ہودج میں بیٹھی اپنی راجدھانی میں لوٹ رہی ہے۔ لیکن اسی سمے جب خوشی کی نہر کناروں سے چھلک رہی تھی وہ پہلا دن اسے پھر یاد آیا جب وہ نئی نویلی دلہن کے روپ میں تانگے سے اتر کر اس گاؤں میں داخل ہوئی تھی اور اگرچہ اسے اطمینان تھا کہ میکے گاؤں نے اس کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے مگر وہ یہ سوچ کر اداس ہو گئی کہ یہ سب رانی کی وجہ سے ہو رہا تھا اور ایک گھوڑی اس سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ورنہ وہ تو آج بھی وہی تھی۔ چیزیں اپنے تعلق سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس نے دکھ سے سوچا کوئی ان کی اپنی شناخت نہیں کرتا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے لگا جیسے کہیں دور کسی ہیڈ ورکس پر آہنی دروازے گرا کر نہر کو بند کر دیا گیا ہو اور اس میں ہر لحظہ پانی کی سطح کم ہوتی جا رہی ہو۔

جب بانو نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا تو پانی کا آخری ریلا موگھوں سے گذر چکا تھا اور دور دور تک سپاٹ ملی ریت ہی ریت تھی۔

حمید سہروردی

بات کچھ بھی تو نہیں تھی۔ بس یونہی، وہ سو گیا۔ رات سونے کے لئے ہی ہوتی ہے۔ دن بھر کی ساری تھکن بستر میں جذب ہوتی چلی جاتی ہے اور صبح ہشاش بشاش چہرہ، کھلا کھلا جسم ایک نئی توانائی اور نئے اور انوکھے جذبوں کے ساتھ مختلف النوع منصوبے بنا لئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایسا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ بغیر منصوبوں کے ہی معمول کی زندگی کے ہاتھوں، اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔

ہر شام کی طرح، آج شام بھی، نڈھال نڈھال، مضمحل مضمحل اپنے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر، اطراف کے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے، جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اور بند کمرے کے قفل میں ایک چابی گھمائی۔ قفل کھل گیا۔ چابی قفل کے اندر ہی رہ گئی، جیسے ہی دروازہ کھلا۔ ہمیشہ کی طرح بلی اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اُس نے معمول کے مطابق بلی کو گود میں اٹھا لیا۔ بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی، اپنے سامنے کے پیروں کو اس کے چہرے پر رگڑنے لگی۔ وہ بلی کو وہیں چھوڑ دیتا۔ پھر اندر کمرے میں جانب مشرق دیوار سے لگے ہوئے آئینہ میں دن بھر کی کیفیت کو پڑھ لیتا اور بلی کو لے کر ایزی چیئر میں گھس جاتا۔ پھر آہستہ آہستہ ایزی چیئر پر ہی بیٹھا ہوا، بشرٹ کے بٹن کھولتا۔ اپنے پیر لمبے کرتا۔ تاکہ تھکن دُور ہو جائے۔ بلی کو گود سے الگ کر کے، حمام میں چلا جاتا۔ نل کھول کر بالٹی سے صبح کا پانی پھینک کر تازہ پانی بھر لیتا۔ منہ ہاتھ دھوتا۔ حمام خانے سے ڈرائنگ روم میں چلا آتا۔ اور میز پر پڑے ہوئے مختلف النوع رسائل کی ورق گردانی کرتا۔ تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتا۔ تاکہ دنیا میں ہونے والے واقعات اور حادثات سے بے خبر نہ رہے۔ اسی دوران اُس کو خیال آتا کہ بلی صبح سے بھوکی ہے تو فوراً اس نے دودھ کا

برتن بلّی کے سامنے رکھ دیا۔ بلّی کی بھوک کے خیال کے ساتھ ہی اس کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگتیں۔ اُس نے پھر سے ویسے ہی کمرے کو بند کر کے ہوٹل کی راہ لیتا۔ ایک آدھ گھنٹہ کے بعد واپس چلا آتا۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں یا رسائل پڑھ لیتا۔ یا پھر آفس سے ساتھ لائی ہوئی فائلوں میں خود کو مصروف رکھتا۔ تاکہ موجودہ بوریڈم کا احساس پرے ہو جائے ــــ بلّی وقت سے پہلے ہی اونگھنے لگتی۔

اِدھر چند دنوں سے وہ خود کو اداس اداس سا محسوس کر رہا تھا یا پھر اپنے آپ میں ایک نئی تبدیلی کو پا رہا تھا۔ مانوسیت اور نامانوسیت کے درمیان خود کو پگھلتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ نیند کبھی جلد چلی آتی اور بعض اوقات رات رات بھر کروٹیں بدل بدل کر نیند کی گود میں جانے کی کوشش کرتا تھا۔

تبدیلی کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ وہ بجائے شام کے رات کے کھانے کے بعد کمرے پر آنے لگا تھا۔ بلّی میاؤں میاؤں کرتے نڈھال ہو جاتی تھی۔ البتہ اب وہ آتے ہی بلّی کے سامنے دودھ کا برتن رکھ دیا کرتا ــــ شامیں منجمد ہونے کی بجائے پھیلتی جا رہی تھیں ــــ وہ شہر سے باہر تفریح کے لئے نکل جاتا۔ فطرت سے قریب ہونے کا ایک جذبہ بھی مچلتا تھا ــــ وہ لمحہ لمحہ گزرتا رہا۔

تعجب تو اس پر تھا کہ دونوں ایک ہی آفس میں رہتے ہوئے، ایک دوسرے کے نام سے واقف نہیں تھے۔ بات بہت معمولی سی تھی۔ دونوں ذرا سی زحمت گوارا کر لیتے تو آفس کے رجسٹر پر ہی غائبانہ متعارف ہو گئے ہوتے۔ لیکن دونوں نے کبھی ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

اچانک ایک دوپہر کو جب سورج خفگی اور ناراضگی کے کینوس پر تھک کر کہیں آسمانوں میں چھپا ہوا تھا اور ابر خوش و خرم ساری کائنات پر چھایا ہوا تھا۔ آفس کے احاطہ میں ہی ایک ریستوران میں پہلی مرتبہ اشاروں، کنایوں یا انجانے پن سے پرے راست گفتگو پر اتر آئے، دوران چائے نوشی آفس کی باتوں کی بجائے تازہ ترین ملکی اور غیر ملکی حالات پر بغیر کسی تکلف کے تبصرے کئے جا رہے تھے۔ ریستوران میں بیٹھے ہوئے گاہکوں نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ دو،

باتوں پر بھی ہیں یا پھر آفیشل رشتہ داری ہے۔ ویسے اوروں کو ان دونوں سے کیا لینا دینا تھا ــــ مقررہ وقفہ کے ختم ہونے سے چند منٹ پہلے، دونوں وہاں سے اُٹھے۔ چھوٹے کا بل دونوں نے اپنی اپنی جیبوں سے ادا کیا۔ نہ رومانیہ نے بل ادا کرنے میں پیش قدمی کی نہ ہی فیروز نے پہل کی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، جو دو اجنبیوں کے درمیان ہوتا ہے ــــ دونوں لمحہ لمحہ بسر ہوتے رہے۔

اس بات سے قطع نظر دونوں ایک دوسرے کو کیا سمجھتے ہیں۔ ایک شام دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نیلگوں آسمان میں اپنی نظریں گاڑے ہوئے تھے اور باوجود اس کے کہ ایک دوسرے سے خفا خفا اور ناراض تھے۔ ساتھ ساتھ قدم اٹھا رہے تھے۔ اُن دونوں میں کوئی بھی بات مشترک نہیں تھی لیکن دونوں ایک ساتھ ہی رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں نے ایک جان کر، صدق دل سے عہد و پیمان کیے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہیں۔ حادثے تو اتفاقات کے چہرے پر پاؤڈر اسٹک کا کام کرتے ہیں بس ایک سپید و سیاہ کے درمیانی رنگ کی شام ہمیشہ کی طرح دونوں طے شدہ پروگرام کے مطابق منتخب جگہ پر موجود تھے اور مصروف گفتگو بھی۔ باتوں باتوں میں رومانیہ نے کہا۔

"میں وہ نہیں ہوں، جو تم دیکھ رہے ہو اور نہ وہ ہوں جسے تم جیسے مرد بار بار سوچ سوچ کر اپنی نیت پر کالا رنگ چڑھا لیتے ہیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں میں نے بارہا سوچا ہے کہ میں ایسا کیوں سوچتی ہوں تم اور تمہارے جیسے سیکڑوں مرد خواہ مخواہ میرے بارے میں سوچتے ہوں گے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہوگا وہ میرے بارے میں یہی کچھ سوچتے ہوں۔ صرف ایک نظر دیکھتے ہوں گے اور آگے بڑھ جاتے ہوں گے۔ نجانے کیوں سب کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ میں کیوں خود کو کھویا کھویا سا محسوس کرتی ہوں اور یہ سب کچھ عاتی ہوتا ہے۔ لیکن ہر روز ایک نہ ایک بار ایسا ہی احساس مجھ پر طاری ہوتا ہے اور ہر وقت میں تم جیسے مردوں کو بُرا بھلا کہہ کر خود کو گناہگار بنا لیتی ہوں۔"

فیروز نے اُس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ رومانیہ کی باتوں کو سُن ہی نہیں رہا ہے۔ لیکن اُس کی آنکھیں، رومانیہ کی آنکھوں میں پھنسی ہوئی تھیں اور جذبہ رومانیہ کے شریر کے اندر ہی اندر بسر ہو رہا تھا۔ فیروز نے سوچا ــــ میں اور مجھ جیسے مرد کیا سوچتے ہوں گے کچھ بھی تو نہیں! کچھ تو کیسے نہیں ــــ اس کے خدوخال میں میری دلچسپی کیا معنی رکھتی ہے اور مرد تو ایسا ہی سوچتے ہوں گے۔ رومانیہ کے کہنے کے مطابق میں کیا دیکھ رہا ہوں اور کیا سمجھ رہا ہوں۔

شاید اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں اور اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں تو کیا ایسی سہانی اور سلونی شاموں سے مسرت اندوز ہوا جا سکتا ہے؟ نہیں، نہیں، مجھے کچھ سوچنا ہی چاہیئے۔ اس کے بارے میں، اس کی کہی ہوئی باتوں کے بارے میں۔ یہ کیا سوچ سکتا ہوں ــــ

اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ــــ لیکن کب تک ــــ اب وہ کافی کھلے کھلے سے لگ رہے تھے۔ دونوں چپ کی سیماؤں میں بیٹھے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

"چلو، فیروز آج بہت وقت ہو گیا ہے"۔

نجانے فیروز کہاں گم تھا، رومانیہ بھی، وہاں سے اٹھی نہیں۔ اس کی ساڑی کا آنچل بنجر زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس نے سمیٹا ہی نہیں۔

"ہاں چلو رومانیہ چلیں"۔ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔

فیروز کمرے پر آیا۔ ہر روز کی طرح، بلی نے آج بھی اس کا استقبال کیا۔ اس نے بلی کو زور زور سے دبوچا ــــ بلی نے بھوکی شیرنی کی طرح آنکھیں نکال کر زور زور سے چیختے ہوئے اُسے دیکھا ــــ ایک پنجہ بھی اُس نے، اس کے ہاتھ پر مارا۔ جیسے ہی بلی کا پنجہ، اس کے دائیں ہاتھ پر پڑا۔ اس نے بلی کو زمین پر چھوڑ دیا اور فوراً باورچی خانے میں چلا گیا اور دودھ کا برتن اٹھا لایا۔ بہت دیر تک بلی، اُس کے قریب نہیں آئی۔ فیروز اس کو پیار سے بار بار بلاتا رہا۔ بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے غصہ کو تھوک کر، اپنی بھوک کو محسوس کر کے، دودھ کے برتن کے قریب چلی آئی۔ فیروز نے پھر سے بلی کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا۔ بلی ایک دم چونک گئی اور قریب چلی آئی۔

آج فیروز نے اپنا چہرہ آئینے میں نہیں دیکھا اور نہ ہی کتابوں اور فائلوں کو جھاڑا۔ چونکہ بہت دیر باہر رہا تھا۔ بستر میں گھس گیا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں ــــ وہ سو گیا ــــ

"نہیں، وہ میں نہیں ہوں جو تم دیکھ رہے ہو، یا تم جیسے مرد سمجھتے ہیں"۔ ہاں اُس شام رومانیہ کا بھائی کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا ــــ یہ رومانیہ سے پوچھنے پر معلوم ہوا تھا۔ وہ یونہی اس کے گھر چلا گیا

رومانیہ نے دروازہ کھولا ـــــ وہ مکان میں داخل ہوا ـــــ رومانیہ ایسا لگ رہا ہے۔ کیسا ؟ ابھی ابھی خواب سے جاگ اٹھی ہو۔ چہرہ سوجا ہوا اور آنکھیں نیم وا ، بال اس کی پیٹھ پر اِدھر اُدھر بکھیں رہے تھے۔ ساڑی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں ۔ یقیناً وہ سو کر اٹھی تھی ـــــ اور اس نے خلافِ توقع اندر کمرے میں لے جاکر بٹھا دیا۔ اپنی خواب گاہ میں ۔ پلنگ پر مچھر دانی پوری طرح سے گری ہوئی تھی ٹیبل پر بہت سی کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ رومانیہ حمام خانے میں جا چکی تھی۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا رہا ۔ اس کی چال میں غضب کی لچک ہے۔ جسم بھرا بھرا گدر از گداز ہے ۔ کچھ دیر بعد رومانیہ چائے کی ٹرے لے کر واپس آئی ۔ دونوں نے چائے پی لی ۔

" میں وہ نہیں ہوں جو تم دیکھ رہے ہو اور سمجھتے ہو ـــــ "

فیروز کی نظریں اس کے سر کے اوپر لٹکی ہوئی اس کی ہی تصویر پر گڑی ہوئی تھیں کتنی حسین ہے یہ کمبخت ـــــ

رومانیہ نے کہا ـــــ " کیا دیکھ رہے ہو ؟ "

" تمہاری تصویر ـــــ "

" پسند آئی ـــــ "

" پسند ـــــ بہت زیادہ ـــــ "

رومانیہ نے ساڑی کا پلو ٹھیک کیا ،

" کاش "

باہر سے کسی کے قدموں کی آواز آئی ۔

" ارے آپ ـــــ ! "

رومانیہ کا بھائی کرکٹ کھیل کر واپس آگیا تھا۔ کرکٹ کے متعلق فیروز کیا خاک بات کر سکتا تھا ـــــ

" کباب میں ہڈی سالا ـــــ تم کیسے ہو ؟ "

" اچھا ہوں ـــــ " اتنا ہی کہہ کر وہ کمرے کے باہر چلا گیا ۔

رومانیہ خاموش تھی۔ شاید سوچ رہی ہو گی کہ فیروز 'کاش' کے ساتھ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

بعد
لیکن اس نے 'کاش' زور سے تو نہیں کہا تھا۔ اس نے سُنا بھی نہیں ہوگا۔ پھر کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے
انکھیوں سے اُس کو دیکھا۔ بے حد حسین ہے کم بخت۔

کاش ___

رومانیہ نے کہا ــــ "کیا تم کل بمبئی جا رہے ہو؟"

"کاش میں جا سکتا ــــ"

"کیوں ــ؟"

"میں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا ہے ـــ وہاں کیا دھرا ہے۔ ایک دم خالی
خالی پن ہی تو ہوگا۔"

"کیوں ــ؟"

"بس یونہی ــ" کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔

پھر فیروز نے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

رومانیہ کا بھائی مُنہ ہاتھ دھو کر واپس کمرے میں آگیا اور آتے ہی فلم کی باتیں کرنے
لگا۔ اس کی باتیں بڑی پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھیں۔ فیروز نے اس سلسلے کو منقطع کر دیا اور
وہاں سے چلا آیا۔

ہاں۔ اسے اچھی طرح یاد ہے۔ رومانیہ اس شام کیسے پیر پھیلا کر بیٹھی تھی۔ توبہ ـــ
اور اس کے بعد لیٹ گئی تھی، زمین پر ہی اور اس کی ناف چمک رہی تھی۔ وہ ناف چومنے کے
لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ اُس نے کروٹ بدل لی۔ اور اس کے خوب صورت پیر، جنہیں روزانہ
آفس میں، ٹیبل کے نیچے سے آنکھیں چُرا چُرا کر دیکھتا ہوں، ہائے کم بخت کے پیر بھی کتنے حسین
اور دل کش لگتے ہیں اور وہ جب چلتی ہے تو اس کے کولھے ایسے اتھل پتھل کرتے ہیں جیسے
کائنات انگڑائی لے رہی ہو۔ اور اس کے بال جو گھٹنوں تک بڑھے ہوئے ہیں۔ چلتی ہے
تو ایسے اُچھلنے لگتے ہیں جیسے سانپ مدھر موسیقی سُن کر سرشاری سے اُچھل رہا ہے۔ کاش ـــ

اور اس کی تصویر کا ایک رُخ جو مسکراتا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مونا لیزا کے بعد
اس کی مسکراہٹ ہی سب کچھ ہے . . . اس کی مخروطی انگلیوں میں قلم یوں محسوس کرتا ہوگا کہ وہ

تاقیامت انھیں تراشی ہوئی انگلیوں میں پھنسا رہے۔ کپڑے بھی روزانہ یہی سوچتے ہوں گے کہ اُس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم پر لپٹے رہیں۔ کیسی مورتی ہے ـــ مورتی ـــ وہ کروٹ بدلتا ہے۔ پھر سیدھا ہوتا ہے۔

اے رومانیہ ـــ رومانیہ ـــ جلدی آؤ ـــ ہاں، ہاں میرے سامنے بیٹھو ـــ ہم دونوں ہوا کے گھوڑے پر سوار آسمانوں کی سیر کریں گے۔ ہم دونوں اوپر ہی اوپر جا رہے ہیں۔ کیوں رومانیہ ـــ اس نے گھوڑے کی لگام اُس کے ہاتھ میں تھما دی اور اس کے پیٹ کو دبا کر پکڑ لیا ہے۔ اس کی پشت اس کی گود میں ہے۔ رومانیہ کچھ بھی تو نہیں کہہ رہی ہے۔ کیا رومانیہ بھی یہی چاہتی تھی۔ کتنے دن، میں نے ضائع کیے ـــ کاش ـــ

رومانیہ اپنے جسم پر سے ایک ایک کپڑا اتار رہی ہے ـــ! بس رومانیہ بس۔ وہ اور رومانیہ آسمان سے زمین کی طرف آ رہے ہیں ـــ کھٹ ـــ کھٹ ـــ کھٹ ـــ کھٹ ـــ سائیکل کی آواز۔

"کون ہے؟"

"میں دودھ والا صاب"

فیروز کی آنکھیں کھل گئیں۔

ہر روز بستر پر سونے والی بلّی اس کے بستر پر نہیں تھی ـــ

نیا دور
تقی حسین خسرو

بے طلب بے جستجو

شیلفوں پر سجی وہ کتابیں جہانگیر کو گول مٹول بچوں سے مشابہ لگیں۔ ان کتابوں کو وہ اس سے پہلے کئی دفعہ دیکھ چکا تھا۔ مگر آج ــــ چنانچہ اُس نے ایک عمدہ سی جلد میں بندھی کتاب شیلف سے ایسے اُٹھائی جیسے کسی نووارد کو گود میں لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور پھر جس احساس سے دو چار ہوا وہ ــــ وہی میل کچیل سے پاک ایک ناقابل بیان تازگی کا احساس تھا! وہی غیر آلودہ بے تعلق لمس! وہی حیرت و استعجاب!

جہانگیر نے سوچا نہیں، یہ محض اُس کے اپنے تخیل کی رنگ آمیزی ہے۔ ورنہ کتابیں اور بچے! بچے تو اُسے زندگی میں بے طلب بے جستجو ملے تھے۔ البتہ کتابوں سے شغف شائد ورثے میں ملا تھا۔ شائد اس لئے کہ اُس نے گھر میں الف لیلیٰ کے سوا کوئی کتاب نہ دیکھی تھی۔ ہاں سُنا ضرور تھا کہ کوئی نہ کوئی سنجیدہ کتاب اُس کے باپ کے زیرِ مطالعہ رہتی۔ ورثے میں اور چیزوں کے علاوہ اُس کے باپ نے کچھ کتابیں بھی چھوڑی تھیں۔ مگر بڑے بھائی نے اُن کتابوں کو شائد حفاظت کی خاطر کسی بنی خانے میں جمع کروا دیا تھا۔ وہ بنی خانہ شہر میں کہاں تھا اور وہ کتابیں کیا تھیں اس کا علم جہانگیر کو کبھی نہ ہو سکا تھا۔ البتہ گھر میں ایک کہانیوں کی کتاب موجود تھی۔ کہانیوں کی چلتی پھرتی کتاب! اُس کی ماں کو بے شمار کہانیاں یاد تھیں کہنے کا انداز بھی ماں کا تھا۔ بی بی سگھڑ کی کہانی تو وہ ہر جمعرات کو پابندی سے سنایا کرتی۔ کہانی کے اختتام پر ملنے والی موتیا سی سفید سفید ریوڑھیاں مقدس کہانی کے تاثر کو کچھ اور زیادہ کر دیتیں۔ تیسری کی چاند کی کہانی، کوہ قاف کی پریوں کی کہانی، جنوں، بادشاہوں، شہزادوں، وزیروں، ذ

زادوں، لکڑ ہاروں اور درویشوں کی کہانیاں جو ایک بار شروع ہوئیں تو ختم ہونے میں نہ آتیں جہانگیر کہانی کے دوران میں سو جاتا۔ اُس کی ماں وہ کہانیوں کی پہلی کتاب تھی جو جہانگیر نے کچھ پڑھی تھی اور کچھ نہیں پڑھی تھی۔ مگر کہانی کی کتاب کا چسکا بس اُسی وقت سے پڑ گیا تھا اُسے!

جہانگیر اب تو کتابوں کی جہانگیری کا قائل تھا۔ مگر آج اپنے چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ لگے بک شیلفوں کے درمیان کھڑا جن پر از فرش تا سقف گول مٹول بچوں جیسی کتابیں سجی تھیں ایک عجیب حیرت سی محسوس کر رہا تھا۔ کتابیں پڑھنا، کتابیں دیکھنا اور کتابیں جمع کرنا۔ تو جہانگیر کے لیے ایک آئیڈیل رہا ہی تھا اور اس آئیڈیل کے حصول کی ایک دفعہ شکل بھی بنی تھی کہ اس نے کچھ ریڈرز ڈائجسٹ جمع کر لئے تھے۔ اُس زمانے میں ایک روپیہ چھتر پیسے کا ڈائجسٹ آتا تھا اور اُس کی ضخامت بھی زیادہ تھی۔ جمع شدہ اس ذخیرے کو دیکھ کر وہ خوش ہوا کرتا۔ کالج سے فارغ ہو کر نئی نئی ملازمت کی تھی۔ ریڈرز ڈائجسٹ کے مستقل عنوانات "لائف اِز لائیک ڈیٹ" "مائی موسٹ اَن فارگٹ ایبل کیرکٹر" "ڈراما اِن رئیل لائف" اور بھی بہت سے اُسے بہت پسند تھے۔ پھر اس کا گٹ اَپ" اس کے اشتہار، اُس کا پرنٹ یہ سب کچھ کس قدر حیرت انگیز تھا! مگر پھر اُس کی بہن کے بچوں نے شب خون مارنے شروع کر دیئے تھے۔ بہن دو چار دنوں کے لئے گھر آتی اور انہی دو چار دنوں میں اُس کے بچے جہانگیر نے جمع شدہ ذخیرے کے لئے وہ ٹڈی دل ثابت ہوتے جو آن کی آن میں لہلہاتے کھیت بھوسی کر دیتا ہے۔ پھر وقت نے بھی تو جہانگیر کو آگے کی جانب ایک غیر محسوس دھکا دیا تھا۔ اب ـــ جب جہانگیر نے مڑ کر دیکھا ـــ تو چھوٹے چھوٹے ریڈرز ڈائجسٹ اور بھی عنوانات اُسے کچھ پھیکے پھیکے سے لگے اور پھر ریڈرز ڈائجسٹ کی قیمت میں بھی تو اضافہ ہو گیا تھا اور ضخامت میں حیرت انگیز کمی!

جہانگیر نے ایک دفعہ اور اپنے چاروں طرف بک شیلفوں پر سجی اُن گول مٹول بچوں جیسی کتابوں کو حیرت سے دیکھا۔ اُسے لگا وہ کتابیں ـــ وہ گول مٹول بچے ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے بے تعلقی سے ہی سہی اپنی تازہ تازہ آنکھوں سے اُسے ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ کلکاریاں مار رہے تھے بعض نے جیسے رونے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ جہانگیر نے یک بارگی محسوس کیا جیسے وہ اُن سب تک ایک وقت میں پہنچنا چاہتا تھا۔

(۲)

شفقت ملک سے ملاقات جہانگیر کے لئے زندگی میں ایک عرصے بعد تازگی کا باعث بنی تھی۔
ہنستی آنکھیں جہانگیر نے اس سے پہلے شاید ہی دیکھی تھیں۔ آنکھیں جو ہنستی نہ تھکتی تھیں! جیسے
رض کے کونے کونے میں پھیلے گوتم کے بظاہر بے جان مگر جاندار مجسّمے صدیوں سے مسکراتے
ہے تھے۔ شفقت ملک اس شہر دلنواز کے اُن لوگوں میں سے تھے جنھیں مقدس صحیفوں میں
کے نمک سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی وجہ اُن کی کتابیں تھیں جو اُن کے گھر کے پانچ بٹا سات
پر ایسے پھیلی ہوئی تھیں جیسے سمندر کرۂ ارض پر! شفقت ملک جوانی اور ادھیڑ عمری کی
پر کسی ستون کی طرح یوں ایستادہ تھے کہ ہر دو کو اُن کے بارے میں علاقائی دعویٰ ہو سکتا تھا۔ مگر
اس کی پروا نہ معلوم ہوتی تھی کہ اُن کا رنگ سُرخ و سفید تھا۔ قد معمول سے اونچا۔ جسم مائل بہ فربہی۔
اُبھرا ہوا۔ گال بھرے بھرے آنکھیں دھیمی دھیمی۔ سر کے بال گھنے نہ تھے مگر انھیں گنجا کوئی نہ
ملتا تھا۔ یہ سب کچھ ایک عجیب نرمی بلکہ اُداسی کو ظاہر کرتا۔ مگر ذرا سنبھل کر دیکھیں تو لگتا پہلا تاثر
تھا کہ یہی دھیمی دھیمی آنکھیں ہنستی نہ تھکتی تھیں۔ آنکھوں کی یہی دائمی ہنسی اُن کے چہرے کے تاثر میں
۔ ناختم ہونے والا کھلنڈرا پن سا گھول دیتی۔

جہانگیر ایک رہنما کے ساتھ زینہ زینہ چڑھ کر پہنچا تھا۔ شفقت ملک نے اس سے پہلے کہ وہ آخری
ینے پر قدم رکھتا دروازے میں آکر کہا "بھئی بالکل اپنی تصویر جیسے ہیں!" جہانگیر کو لگا جیسے تصویر
، ساتھ اُس کی اپنی شخصیت بھی وقت کی گرد سے اُبھر آئی ہو۔ شفقت ملک نے سگریٹ رول کر کے
یا اور صوفے پر بیٹھنے کے بعد جب دوبارہ اُس کی طرف دیکھا تو لگا وہ تمام کتابیں جو اُن کے دائیں
ئیں، اوپر نیچے، آگے پیچھے اور نہیں معلوم کہاں کہاں رکھی تھیں جیسے اُن آنکھوں سے جھانک رہی تھیں
ر وہ اُسے اُن کتابوں کی روشنی میں اُس کے آر پار دیکھ رہے تھے۔ گردوپیش اور شخصیت میں ایسی
یرت انگیز مطابقت جہانگیر نے اس سے پہلے صرف ایک بار دیکھی تھی۔

برسوں پہلے۔ اُس وقت اسے اِس کا پوری طرح شعور بھی نہ تھا۔ مگر اُس واقعے نے غیر محسوس
طور پر اُسے اسٹی مولیٹ (STIMULATE) کیا تھا۔ پھر اُس کی زندگی میں تبدیلی آئی تھی۔ ایک

بہت بڑی تبدیلی جس نے اُس کی ایک ایک نکتے پر رُکی ہوئی، زنگ زدہ، جمود کا شکار زندگی کو حرکت آشنا میل کچیل سے پاک بہتے دریا کی طرح رواں دواں کر دیا تھا۔ وہ تمام آئیڈیلز جو محض ماضی کا حصہ تھے اور کتابوں میں محفوظ یکبارگی دوبارہ زندہ ہو گئے تھے۔ پھر اُس کے لئے اُفق ہی تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ۔۔۔ کاٹیج اینڈ انڈسٹری کا خوبصورت ڈسپلے سینٹر! جہانگیر بڑی احتیاط سے کُھدائی کر رہا ہے۔ کسی پُرانی یاد کی بازیافت اُس کے اندر پوشیدہ آرکیالوجسٹ کو برآمد کرتی ہے۔ کبھی وہ اپنے سالخوردہ سے بائیسکل پر اُس نے یہ بائیسکل جمعرات بازار سے بہت سستا لیا تھا، بڑی آسانی سے یہ چڑھائی چڑھ جاتا۔ عابد روڈ، جی پی او، گرامر اسکول، جان کمپنی، آج یہاں تک پہنچتے پہنچتے اُس کا سانس پھول گیا تھا۔ گن فاونڈری! ہاں اِس جگہ کو گن فاونڈری کہتے ہیں۔ اُس کے ساتھ اُس کا ایک معمر ساتھی ہے۔ اُنھیں ڈسپلے سینٹر سے ایک تحفہ خریدنا ہے۔ تحفے کی خریداری کے لئے اس سے بہتر جگہ نہیں ہو سکتی کہ ملکی مصنوعات یہاں بہت واجبی داموں دستیاب ہیں۔ اتنے ہی واجبی کہ خریداری کے بعد جیب کی تنگی میں اضافہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر یہی جیب کی تنگی خریداری سے پہلے خریداری کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی ہے۔ سجا سجایا ڈسپلے سینٹر اندر سے کچھ اور خوبصورت ہے کہ حال ہی میں اس میں توسیع و ترمیم کی گئی ہے۔ تازہ تازہ پالش سے چمکتے لکڑی کے شوکیسوں میں قرینے سے دھری اشیاء۔ دیواروں کے ساتھ سلیقے سے رکھی خوبصورت لکڑی کی مصنوعات، قالین، بید کی مصنوعات، سلائی کڑھائی کے شاہکار اور بھی نہیں معلوم کیا کیا۔ بائیں طرف شوکیسوں کے ساتھ اندر کی جانب دو قبول صورت لڑکیاں بے حس و حرکت کسی مٹی کی صنعت ہی کی طرح ایستادہ ہیں۔ جہانگیر اپنے معمر ساتھی سے سرگوشی والے لہجے میں پوچھتا ہے "ملکی مصنوعات؟" ٹھیک اُسی وقت اُن دونوں ہی لڑکیوں نے حرکت کی ہے۔ "مگر تحفے میں پیش نہیں کی جا سکتیں۔" جہانگیر مُسکرا دیتا ہے۔ وہ شوکیسوں میں جھانک جھانک کر دیکھتے ہیں اور جب بالآخر ایک مناسب سا تحفہ خرید چکتے ہیں تو ایک ریلیف سا محسوس کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ڈسپلے سینٹر سے نکل پڑیں کہ اُنھیں دُور جانا ہے۔ مگر وہ ایک شخص!

وہ انتہائی دائیں جانب دھرے شوکیسوں کے سرے پر کھڑا ایک شخص! جہانگیر نے تمام وقت اُن نظروں کو جسم پر رینگتا محسوس کیا ہے۔ اُس شخص نے اشارہ کیا ہے، مگر بڑی شائستگی سے اُس اشارے

میں۔ جہانگیر بے ارادہ کھنچ کر پہنچا ہے۔ وہ شفاف کمانی دار سنہری عینک سے جھانکتی آنکھیں کتنی بے پناہ روشنی ہے ان آنکھوں میں! جہانگیر نے بس ایک نظر میں دیکھا ہے کہ وہ چہرہ کتابی ہے! رنگ گورا، مسکراتے پتلے ہونٹوں پر ہلکی سی پان کی سُرخی! سیاہ بالوں میں جو بہت احتیاط سے پیچھے کی جانب کنگھی کئے ہوئے ہیں چمکتے چاندی کے نفیس تاروں جیسے سفید بال! جسم پر بے داغ سفید بُشرٹ! نچلا جسم نظر نہ آسکا کہ آگے شو کیس دھرا ہے۔ اُن آنکھوں سے جہانگیر نے یکبارگی محسوس کیا ہے' ڈسپلے سینٹر میں رکھی تمام مصنوعات اُسے اُس کے آرپار دیکھ رہی ہیں۔ مصنوعات جو صدیوں پر پھیلے انسانی ارتقا کا حاصل ہیں! جہانگیر سب کچھ بھول گیا ہے۔ یا یوں ہے کہ اُسے سب کچھ یاد آگیا ہے۔ وہ کہاں سے چلا تھا؟ تاریخ کہہ رہی ہے۔ چپّو تھامنے کے لئے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورج کا طلوع و غروب کسی بڑے واقعے کو جنم نہیں دے سکتا کہ یہ حادثہ تو صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ طلوع و غروب کے درمیان مہلت کم ہے کہ انسانی وجود نیند کا خوگر ہے۔ ایک بظاہر حقیر مگر مبہم کاوش حرکت کا پتہ دیتی ہے۔ دریا ہی دنیا کی بڑی تہذیبوں کے خلّاق ہیں۔ گھر کی چار دیواری اور ملک کی سرحد، مگر ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست! اونچے ماتھے کشادہ پیشانیاں، روشن جبینیں، بلند حوصلے، ناقابلِ شکست عزم، اقبالمندی! حجر و شجر بھی اثبات کے لئے خاص موسمی حالات کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اور وہ 'وہ خضر بے برگ وساماں وہ سفر بے سنگ و میل' والا آئیڈیل!

..... یہ اور نہیں معلوم کیا کیا بہت تھوڑی دیر میں اُس کے ذہن سے گزر چکا ہے۔ وہ ایک مکالمہ تھا۔ خاموش مکالمہ جس میں الفاظ کم تھے اور معنی زیادہ! جہانگیر سے اُس کا نام تک نہ پوچھا ہے اُس شخص نے۔ وہ جیسے سب کچھ جانتا ہے۔ غیب کا علم صرف اور صرف خدا کو ہے! "گھر آنا میں تمہیں انگوٹھی دوں گا" اُس شخص کسی قدر سوچ کر کہا ہے۔ جہانگیر کو گھر کا پتہ دیا ہے۔ پھر نظریں پھیری ہیں اُس نے۔ جہانگیر کو لگا ہے ڈسپلے سینٹر میں رکھی تمام مصنوعات جو ایک ثانیے پہلے اُسے ان آنکھوں سے اُس کے آرپار دیکھ رہی تھیں، دوبارہ بے تعلق نظر آنے لگی ہیں۔ جہانگیر کا معمر ساتھی کہ مردم شناس ہے بہت کوشش کی ہے اُس شخص کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی مگر ناکام!

جہانگیر کے لئے تجربہ شدید تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ توازن کھو بیٹھا تھا۔ ماں کی بات اور تھی' دُنیا والوں میں پہلی بار کسی نے اس توجہ سے ..... پھر اس توجہ کا سیاق و سباق ہی مختلف تھا۔ مگر شاید وہ ابھی اس کا اہل نہ تھا۔ اپنے اس تجربے کی صحیح تشریح نہ کر سکا تھا۔ وہ اس کے لئے گویا ایک

ہالوسی نیشن (HALUCINATION) تھا۔ ایک لہر تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے قدم اکھڑ گئے تھے۔ مگر پھر وہ بہت جلد دوبارہ زمین پر کھڑا تھا۔ انگوٹھی کیا حاصل کرتا کہ دو چار دنوں میں یہ ہی بھول گیا تھا۔ اس کے باوجود ایک غیر محسوس سی تبدیلی اس واقعے کے بعد زندگی میں در آئی تھی۔ اب نجمہ کی بات اُس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

نجمہ کی بات وہ اب تک ٹالتا آیا تھا۔ اس کی وجہ وہ ایک عمر تھی جو وہ گزار چکا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دہائی پر محیط وہ ملازمت تھی جو وہ کر چکا تھا۔ اور بھی بہت سی بلکہ بے شمار باتیں تھیں جن کا شمار ممکن نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کب سے اس شہر میں رہتا آیا تھا۔ اسی شہر میں اُس نے اپنے پردادا کی قبر دیکھی تھی۔ اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے۔ پائیں میں موجود اُس وقت کے نواب کی قبر۔ چاروں طرف پھیلتا قبرستان فیض جاریہ کا مُنہ بولتا ثبوت تھا۔ چنانچہ یہ شہر اُس کے بازار، اس کی گلیاں، اس کی پُرشکوہ عمارتیں، اس کی مساجد، اس کے شوالے، اس کے املی بن اس کے سیتا پھل اس کے بے نشان اور نہیں معلوم کیا کیا، یہ سب اُسے اگلے وقتوں سے جانتے تھے۔ اُس نے تعلیم یہیں حاصل کی تھی اور ارڈیل ٹٹو بھی یہیں ثابت ہوا تھا۔ یہیں مکلّف رہا تھا اور آوارگی بھی یہیں کی تھی۔ اسی دیار میں اُس نے رہنے اور بسنے کی کوشش بھی کی تھیں اور اب ـــ جب کہ وہ بڑی حد تک SETTLED تھا زندگی میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کا خیال اُس کے لئے ناقابلِ قبول تھا۔ پھر نجمہ کی بات اُسے اضافی بھی لگتی کہ اُس کے قریبی عزیزوں کی محبت اُسے کھینچتی تھی۔ چنانچہ جب بھی وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتی اور کبھی بچوں کے مستقبل کا حوالہ دیتی تو وہ ٹال جاتا کہ اُس کے خیال میں بچے اگر ہونہار اور محنتی نہ ہوں تو دُنیا کے کسی بھی حصّہ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔ مگر اب وہ سوچنے لگا تھا۔ اب وہ زندگی میں ایک کمی سی محسوس کرتا۔ زندگی محض خورد خواب کا نام نہیں ہو سکتا۔ سوچ نے بالآخر عمل کی صورت اختیار کی تو وہ سب کچھ جو اُسے عزیز تھا، بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

گرد و پیش سے حیرت انگیز مطابقت! وہ آنکھوں سے جھانکتی مصنوعات ـــ یہ کتابیں بر سوں پر پھیلا سفر!

(۳)

"لوگ بہت کم کسی کی کنٹری بیوشن کا اعتراف کرتے ہیں" شفقت ملک نے دو چار مثالیں دیں "کتاب کا انتساب کسی اور کی نہیں صاحب کتاب کی بڑائی ظاہر کرتا ہے"! ایک بار پھر وہی ڈسپلے سنس والی فضا نے ظہور کیا ہے کسی نے اشارہ کیا ہے اُسے! مگر بڑی شائستگی ہے اُس اشارے میں! شفقت ملک سے ملاقات، شاید یہی وجہ تھی جہانگیر کے لئے ایک عرصہ بعد زندگی کا باعث بنی تھی۔

ورنہ، زندگی، ایک بار پھر ایک نکتے پر رک سی گئی تھی۔ وہی زمین و آسمان زندگی میں در آئے تھے۔ آئیڈیل کے حصول نے شادمان کیا تھا مگر ساتھ ہی منہ میں کڑواہٹ بھی پیدا کی تھی۔ کڑواہٹ بڑھتی ہی گئی تھی۔ حرکت باعث برکت مگر کہاں پہ، تمنا کا دوسرا قدم یارب! ایثار، قربانی اور بے غرضی! آسمان پر چمکتے تاروں کی طرح خوبصورت! انسانی کوشش کا لازمی انجام پستی اور انحطاط! جہانگیر نے اس دوران میں اقوام عالم کی تاریخ کا، تاریخ کے ایام اللہ کا دوبارہ مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعے نے بڑی حد تک سہارا دیا تھا۔ ورنہ تنہائیاں ہر لحظہ گہرے ہوتے دھندلی شام کے ملگجے پن کی طرح بڑھتی ہی گئی تھیں۔ کبھی تاریک آسمان پر ٹھہرے ہوئے بھاری بادلوں کے درمیان بھولے سے چمکتی بجلی کی طرح ایک بہت غیر واضح سی روشنی کی لکیر ذہن میں در آتی جس کا حاصل ایک تشنہ انجام، کھردری، دروں بینی کے بوجھ تلے کراہتی تحریر ہوتی۔ بس یہی ایک تعلق سا تعلق تھا دنیا سے۔ نوکری وہ کرتا تھا۔ مگر نوکری وہاں کی طرح یہاں بھی ایک مجبوری تھی!

اور اب میز پر ایک ناقابل انکار ٹھوس حقیقت کی طرح دھرے ٹیلی فون کی گھنٹی ہمیشہ کی طرح بجتی اور وہ بھی غیر ارادی طور پر ریسیور اٹھا کر "ہلو" کہتا۔ پھر چونک اُٹھتا "بھئی کچھ پتہ ہے آپ کو، وائی، ایم، سی، اے میں کتابوں کی نمائش لگی ہے"۔ آواز دوست! "جی ہاں پتہ ہے۔ اخبار میں خبر دیکھی تھی"۔ "پھر کیا ارادہ ہے جناب کا؟" "وہی جو آپ کا ہے"۔ "آج شام چلتے ہیں۔ آپ ساڑھے چھ بجے تک پہنچ جائیں۔ میں تیار ملوں گا۔ نمائش چلتے ہیں پھر وہاں سے کہیں چل کر بیٹھتے ہیں"۔ اور کبھی "بھئی فلاں صاحب آئے ہوئے ہیں۔ انھیں غریب خانے پر بلایا ہے۔ آپ بھی تشریف لائیں۔ محفل کی رونق میں اضافہ ہوگا۔ ہاں سنئے آپ۔

کے راستے میں فلاں صاحب کا گھر ہے۔ انہیں اور اُن کی بیگم کو بھی بٹھا لیجئے۔ بے چاروں کے ہاں گاڑی نہیں ہے۔" کبھی سی ویو اپارٹمنٹ سے سمندر میں ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنے کی دعوت! کبھی سمندر کے کنارے دھرتی ماتا کے اتھاہ سینے میں اُتر کر صدیوں پرانے مندر میں بھگوان کی مورتی کے درشن اور پجاری کو نذر! جہانگیر کو لگا تھا وہ اب تک کراچی سے واقف ہی نہ تھا۔ اب کراچی بند کتاب کی صورت ورق ورق کھلتا گیا تھا۔ یوں بھی اصل چیز تو کتابیں تھیں۔ باقی سب کچھ ثانوی تھا۔ شفقت ملک کتابیں پڑھتے، کتابیں لکھتے، کتابیں چھاپتے، کتابیں بولتے اور کتابیں سوچتے تھے۔ بڑھے ہوئے ذوق کے اشتراک نے شفقت ملک کے ساتھ دوستی کو قابلِ احترام بنا دیا تھا۔ مگر سوچ کا کیا کیجئے کہ آدمی کا اس پر زور نہیں چلتا۔ زندگی اپنا ایک بائیولاجیکل اثبات بھی تو چاہتی ہے اُسے تو بچے بے مطلب بے جستجو ملے تھے —— وہ ایک بے نام سا بوجھل احساس تھا جس کی کوئی تہہ نہ تھی۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا کہ موجودہ دور میں اس کی ایسی اہمیت بھی نہ رہی تھی۔ پھر شفقت ملک کی زندگی میں جو قابلِ رشک یکسوئی اور ایک بے مثال لگن تھی اُس کے بعد پھر کسی بات کی گنجائش کہاں نکلتی تھی۔ مگر . . . . چنانچہ اُس دن بھی وہ از فرش تا سقف شیلفوں پر سجی کتابوں کے درمیان کھڑا بظاہر کتابیں دیکھ رہا تھا کہ —— اپنے اس تجربے سے دوچار ہوا تھا۔ مگر بات اس حد تک رہتی تو وہ یہ سوچ کر ٹال جاتا کہ یہ محض اُس کے اپنے تخیل کی رنگ آمیزی ہے۔ لیکن نہیں کتابیں تو اُس سے انتقام لے رہی تھیں۔ اُس کی سوچ کا انتقام!

(۴)

اب جہانگیر دیوانہ وار شہر کی دکانیں جھانکتا پھرتا۔ مگر شیلفوں پر کتابیں نہیں گول مٹول بچے رکھے نظر آتے۔ بچے جو اُسے زندگی میں بے طلب بے جستجو ملے تھے۔

رخسانہ بشیر

اَن دیکھا

چرچ کے سامنے جُولی نے بس رکوائی۔ بہت دنوں کے بعد وہ اس راستے سے گذری تھی ہفتوں مہینوں اور سالوں کا حساب اِسے یاد نہیں۔ مگر ملگجی شام میں بوجھل سی کھڑی گہرے سُرخ رنگ کی عمارت نے جیسے اداس ہو کر اسے دیکھا تھا اور کھلی ہوئی کھڑکیوں کی خالی آنکھیں بس کے شیشے میں گذر کر اُس کے چہرے پر جھک آئی تھیں۔

"جولی تم بھول گئیں کیا.....؟"

اور وہ بھولی نہیں تھی۔ اس لئے بے اختیار ہو کر چرچ کے بڑے دروازے پر اُتر گئی۔ دروازہ بند تھا۔ بس آگے نکل گئی۔ جولی دونوں ہاتھ سینے کے خلاء پر رکھے۔ جہاں کبھی اس کی سانسوں کے عین اوپر ایک صلیب ہمیشہ رکھی رہتی تھی، اور بند دروازے کے باہر سر نیچا کئے وہ سوچتی رہی... یسوع.... !" تو آج بھی بند دروازے کے دوسری طرف ہے۔ جہاں میں تجھ کو چھوڑ کر گئی تھی۔ ٹھیک وہیں پر...." یسوع۔ یسوع۔

ایک سسکی صلیب کی طرح جولی کے لبوں میں کھُب گئی۔

"تو میرا خدا نہیں.... اگر تو ہوتا، ہاں اگر تو واقعی ہوتا"

اور بند دروازے پر دستک دیئے بغیر وہ مڑ کر واپس جانے لگی "خدا کو بُلانے کے لئے کسی بند دروازے پر دستک کی ضرورت نہیں.." جولی چلتی جاتی تھی۔ اور خالی سڑک لمبی ہوتی جاتی تھی۔ آسمان پر اندھیرے کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں جن کے سروں پر شفق سلگتے سلگتے ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔ تیز ہوا کے ایک جھونکے کو جولی نے سینے کی چھلنی میں چھن کر گذرنے دیا۔ اور اسے

سالوں پہلے کی ایک رات یاد آئی۔ سانس لینے سے جب کبھی اس کا بدن دُکھتا تھا۔ جولی کے جسم کو وہ بھولی بسری رات یاد آجاتی تھی۔

"سڑک پر اس کے آگے تیرہ چودہ سال کی لڑکی چلنے لگی جس کی سفید ٹخنوں تک نیچی ڈھیلی فراک کئی جگہوں سے پھٹی ہوئی تھی۔ ننگے پیر زخمی تھے۔ اور خون کی ایک پتلی لکیر ان کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ لڑکی کی چمکیلی ... گلابی جلد پر جگہ جگہ سُرخ بوندیں اُگی ہوئی ... !

بڑی ..... معصوم آنکھیں۔ سمندر جتنے آنسوؤں سے بھری ..... ! کاندھوں پر پھٹی ہوئی فراک کے چیتھڑوں کے ساتھ اس کے ملائم سُنہری بال جھول رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ تھک کر گر پڑی۔ جولی نے دوڑ کر اُسے اُٹھایا۔ لڑکی کا پیارا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دیکھا۔ اور گرم ہونٹوں سے اُس کی گیلی پلکیں چوم کر بہت سارے آنسو پی لیے ..... " جولی۔ ہائی ڈیئر جولی .....

وہ اس کے بازوؤں میں چھپ کر سسکنے لگی ..... " اور یہ چھوٹی لڑکی ..... جولی کے سینے میں چہرہ رکھے کب سے سسک رہی تھی ..... !

جولی .....

مشنری کے لاوارث بچیوں کے ادارے میں پلنے والی لٹل گرل (LITTLE GIRL) بہت حیران تھی ..... میمنے جیسی سیدھی۔ بڑی پیاری بچی تھی، اس کی یاد کا پہلا دن ہاسٹل کے لمبے ہال سے شروع ہوتا تھا جس کی دیواریں سیلن زدہ اور اکتائی ہوئی سی اُداس کھڑی رہتی تھیں۔ چھت اوپر بہت دور تھی۔ میں دونوں طرف بستروں کی دو لمبی قطاریں تھیں۔ جتنی لڑکیاں تھیں اتنے بستر اور دیوار پر اتنی ہی کھونٹیاں رات کو سونے سے پہلے وہ سب اپنی ڈھیلی فراک اُتار کر اُس پر لٹکا دیتی تھیں۔ ہاسٹل کے اندر زندگی سوتیلی ماں جیسی نامہربان تھی۔ گھٹی گھٹی ــــ ہمیشہ ڈراتی، دھمکاتی ہوئی سی۔ ایک لگے بندھے معمول کے مطابق بہت سویرے جگا کر اُن سب کو بائبل پڑھائی جاتی تھی جس کے بعد وہ ناشتہ لینے کے لئے قطار بنالیتیں۔ سہتے ہوئے بے رونق چہروں والی ہراساں لڑکیاں۔ اِن کی آنکھوں کی چمک میں کچی عمر کے خوابوں کی جگہ بھوک بھٹکتی ہوئی۔ کھانے میں اپنا حصّہ زیادہ لینے کے لئے وہ بُری طرح ایک دوسرے کو نوچتی کھسوٹتی تھیں۔ اور کبھی اس جھگڑے میں وارڈن سے پٹائی بھی کروالیتی تھیں۔

ہاسٹل میں کمرے بہت تھے اور بے حساب لوگ اِن کمروں میں رہتے تھے۔ چرچ کے ملازم۔ نوعمر راہبائیں۔

دنیا نیا گر صلیب کی ہو جانے والی ۔ان کو پڑھانے کے لئے پکی عمر کی راہبائیں۔ ایک الگ تھلگ حصے میں لاوارث لڑکوں کا ہال تھا۔ اور ان کے نگرانوں کے کمرے تھے ۔ جُولی کے ذمے جس ایک کمرے کی صفائی تھی، اُس میں سفید بالوں اور بجھی ہوئی آنکھوں والا ایک پادری دن رات عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھ کی دوسری لڑکیاں کمروں کی صفائی اور کیاریوں کے جھاڑ جھنکار چُننے کے بعد جتنا وقت بچ رہتا۔ اس میں حمدیہ گیت سیکھتی تھیں اور سسٹر مریم انہیں کرائسٹ کا قصہ سُنایا کرتی تھی .... یسوع ....

لوگوں کے گناہوں کی صلیب اُٹھا لینے والا دردمند ..... جولی نے اس کی ایک بہت خوبصورت تصویر سسٹر مریم کے کمرے میں لگی دیکھی تھی ۔اور دن میں جتنی بار وہ اپنے گلے میں پڑے کراس کو چھوتی تھی ۔ وہ آدمی اس کے اندر سانس لے کر جی اٹھتا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے ہال کی بتیاں بُجھا دی جاتی تھیں ۔مگر کبھی اس اندھیرے میں بھی کوئی لڑکی یسوع کا قصہ چھیڑ دیتی تھی تو اس کی نرم آواز اور جولی کے آنسو دونوں ایک دوسرے میں شامل ہوتے رہتے .... !

یسوع ... تاریکی میں وہ دردمند آدمی اس کے سرہانے آکر بیٹھ جاتا تھا ۔جولی کے ملائم بالوں میں اُنگلیاں پھیرتا رہتا اور اُس کے چہرے پر بہتے آنسوؤں سے باتیں کرتا رہتا۔

تو میری ماں ہے ..... وہ کہتی ! میں نے اپنے باپ کی شکل تجھ میں دیکھی ہے اور تو .... کہیں بھی میرا ساتھ نہ چھوڑنا ۔

صلیب جولی کی سہیلی تھی ۔ اس کی ہم راز تھی ۔ وہ لڑکیاں بہت ہی کم ایک دوسرے سے بات کرتی تھیں اور اکثر سہمی سہمی .... اپنے ہی جیسے دوسرے لوگوں سے ڈری ہوئی ، اپنے کام میں جُٹی رہتیں اُن کی آنکھوں نے پھول اور تتلیاں اور ستارے اور آسمان، اُفقوں کے بیچ ٹھہرے چاندنی کے سمندر کبھی دیکھے ہی نہیں تھے ۔اس لئے سوتے ہوئے بھی ان کے خوابوں میں سفید لبادے اوڑھے مُردے ٹہلتے رہتے اور میلی دیواروں پر دھوئیں کی کالی لکیریں لمبی ہوتی جاتی تھیں ۔

جولی کے کمرے کا پادری جسے وہ ہر روز کھانا پہونچانے اور اُس کے بستر پر جمی ہوئی گرد جھاڑنے جاتی تھی ایک دن چپ چاپ مرگیا ۔شام کو اُسے ایک سیاہ تابوت میں بند کر کے چرچ سے ملحقہ احاطے میں دفنا دیا گیا .....

تقریب میں جولی بھی شامل تھی اور لڑکیوں کی قطار کے آخر میں کھڑی تھی۔ اس دن ان سب کو پہننے کے لئے سیاہ اسکارف دیئے گئے۔ ہوا تیز چل رہی تھی اور بڑے بڑے بوجھل بادل چرچ کی چھت پر جھکے ہوئے تھے۔ جولی اپنی دعا کے لفظ دوہرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں تابوت پر بکھرے سفید پھولوں کے ڈھیر کو اداس ہوکر دیکھ رہی تھیں۔ پھول چھوٹے بہت کم کھلے ہوئے ہوا کا ذرا تیز جھونکا آتا تو ان میں کئی اڑ کر کیچڑ میں دھنس جاتے ... تابوت کو تازہ کھودی ہوئی قبر میں اٹھا کر رکھا جانے لگا تو یک دم سسکیوں کا بادل برسا اور آندھی کا شدید جھکڑ آیا۔ جولی کے سر پہ بندھا اسکارف غبار میں اڑتا ہوا دور جانے لگا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑی تو مٹی کا ایک بگولا زمین کی تہہ سے اٹھا اور ہر چیز اس کی زد میں آگئی۔ سیاہ تابوت — سفید پھول۔ ادھر ادھر قبروں کے ماتھے سے لگی صلیبیں .... بری طرح چیختی ہوئی عورتیں اور گھبرائے کھڑے آدمی .... جولی اندازے سے اپنے اسکارف کے پیچھے دوڑ رہی تھی، ور ٹخنوں تک مٹی کے گرداب میں دھنس گئی تھی — جب کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک بڑے درخت کی اوٹ میں روک دیا اور خود اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ نوکیلی بوندوں کی بوچھاڑ سنسناتی ہوا میں بھٹکتی ہوئی ان کے ارد گرد برسنے لگی۔ جولی بری طرح ٹھٹھرتی ہوئی درخت سے چپکی کھڑی رہی۔ پھر اس نے دیکھنا شروع کیا تو اسے قریب کھڑا وہ لڑکا نظر آیا جو اسی کی عمر کا شاید لاوارث لڑکوں کے ہاسٹل کا کوئی لڑکا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر گھبراہٹ تھی اور موہوم سی شوق کی لپک تھی ...

"مائیکل!" .. اس نے بتایا "میں یہیں رہتا ہوں"۔

جولی چپ رہی۔ اس کے گلابی چہرے سے بھیگی بالوں کی جھالر میں بوندیں جمع ہونے لگی تھیں۔ ہونٹ نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ مائیکل نے اس کی عمر کی کوئی لڑکی پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ ڈرے ہاتھ سے اسے چھو کر جگہ جگہ سے دیکھتا رہا۔ لیکن پھر اکتا گیا اور منہ پھیر کر طوفانی بارش کی طرف دیکھنے لگا۔ جس بڑے درخت کے نیچے وہ دونوں کھڑے تھے۔ اس کی ٹہنیاں ایک قبر پر جھکی ہوئی تھیں۔ بوچھاڑ تیز ہوئی تو جولی نے کپکپاتے ہاتھوں سے اسے پرے دھکیلا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ جولی کے منہ پر مارا اور اس کے گرد اپنے پتلے بازو لپیٹ دیئے .... بارش رکی اور دونوں وہاں سے اٹھے تو دوست بن چکے تھے!

"میں کبھی کبھی یہاں آیا کروں گا دوپہر کے وقت ....!" مائیکل نے پھٹی پرانی قمیض سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

جُولی نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ فراک کا دامن اُلٹ کر اپنا چہرہ صاف کیا اور مڑ کر دیکھے بغیر ہاسٹل کی طرف دوڑنے لگی۔

یسوع ...." وہ سب میں زیادہ مہربان تمہاری حفاظت کرے۔ تمہیں کسی نے یہاں آتے ہوئے دیکھا تو نہیں .... سنسان دوپہروں میں وہ اُس قبر کے سرہانے لگی صلیب کے پاس جس میں پادری کو دفنایا گیا تھا۔ بیٹھتے تھے اور سمجھ میں نہ آنے والی نظروں سے ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہتے تھے!

جولی .....!

چھوٹی بے وقوف گھبرائی ہوئی لڑکی۔

مائیکل کا چہرہ دیکھتے۔ اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے۔ اور اس کی گرم سانسوں کو اپنے سوکھے لبوں سے اُلجھتے محسوس کر کے حیران رہ جاتی تھی۔" میرے دل کو کیا ہوتا ہے مائیک ....! وہ پوچھنے لگتی .....!" جیسے تم اپنی انگلی کی نوک سے میرے دل کے کناروں پر لکیریں کھینچ رہے ہو۔"

" مائیک ... سنو تم کیا یسوع ہو ....!

"نہیں —!"

" پھر مجھے سارا دن تمہارا خیال کیوں رہتا ہے۔ میں اپنے کراس کو دیکھتی ہوں تب بھی تم یاد آتے ہو۔ اب رات کو کبھی یوں ہوتا تھا کہ جولی بستر میں لیٹ کر آنکھیں بند کرتی تھی۔ وہ اُس کے سرہانے آکر بیٹھ جاتا تھا۔ یسوع اپنی جگہ پر۔ مائیکل اُس نے بالکل ساتھ بیٹھ کر مسکراتا ہوا صلیب وہ مٹھی میں بھینچ کر اپنی بند پلکوں پر رکھ لیتی تھی۔ چرچ میں لگی کرائسٹ کی تصویر کو دیکھ کر اُس کے اندر آنسوؤں کی بارش ہونے لگتی تھی اور گردن جھک جاتی تھی۔

تو ... عظیم مہربان خدا ... میرے دل کی بات تو سمجھتا ہے ناں۔ میں اب مائیکل سے دُور نہیں ہونا چاہتی۔

انہیں ملتے بہت دن ہو گئے۔ مائیکل دو ایک بار اُس کے لئے چھوٹی چیزیں لے کر آیا۔ نیلے

رنگ کا ایک رومال۔ اپنے حصے میں سے بچائی ہوئی چوکلیٹ۔ جسے اُن دونوں نے بانٹ کر کھا لیا تھا۔ مگر رومال وارڈن کے ڈر سے جولی نے زمین کھود کر درخت کی جڑ میں دفن کر دیا تھا۔ وارڈن کی مار وہ ہنسی خوشی سہہ لیتی تھی۔ اور لمبے لمبے زنجیروں میں بندھے ہوئے دن اب اسے اُداس نہیں کرتے تھے۔ بائبل پڑھنے سے بھی زیادہ جولی کو مائیکل کا چہرہ دیکھ کر سُکھ ملتا تھا۔ اور حمدیہ گیت سیکھتے ہوئے اُس کی آواز میں اتنا خلوص ہوتا کہ اس کے ارد گرد کی تمام چیزیں بھیگ جایا کرتی تھیں۔ بہت لڑکیوں میں بیٹھے ہوئے وہ اکیلی ہو جاتی۔ یسوع اُس کے سامنے آن کھڑا ہوتا۔ اس کے سائے میں کھڑا ہوا مائیکل۔

جولی کے اندر کی دیوار پر دو تصویریں ساتھ ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ اور مائیکل جب کبھی پوچھتا "ہم دونوں میں زیادہ اچھا کون ہے . . ."

تو بغیر سوچے وہ اپنی صلیب کو چوم لیتی تھی۔

میرا کرائسٹ۔ میرا خدا . . . . وہ میرے ساتھ اس وقت سے ہے جب تم بھی میرے ساتھ نہیں تھے۔

ایک دن وہ دونوں دیکھ لئے گئے۔ ویسی ہی سرد شام تھی جب وہ پہلی دفعہ درخت کی اوٹ میں کھڑے ہوئے تھے۔ دوپہر کو برف گرتی رہی تھی۔ اب آسمان چُپ تھا۔ مگر رگوں کو سُن کر دینے والی تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اور جولی کے سارے جسم پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں۔ اُسے کپکپاتے دیکھ کر مائیکل نے اپنا پُرانا کوٹ اُس پر ڈال دیا۔ مگر کوٹ سے زیادہ گرم۔ سُلگتا ہوا خود مائیکل . . . . جولی اکثر اُسے پہن لیا کرتی تھی۔ وہ اُسے پہنے کھڑی تھی۔ جب وارڈن چرچ کا دروازہ بند کرنے آئی اور اچانک اس کی نظر قبروں کے احاطے کی طرف اٹھ گئی . . . . !

سیاہ سڑک چل رہی تھی . . . . . !

سورج ڈوبا پھر چاند نکلا۔ اور آسمان چھوٹے چھوٹے ستاروں سے بھر گیا۔ "یہ جتنے ستارے ہیں ناں" اس نے سر اٹھا کے سونا برساتی ہوئی رات سے کہا۔ "اتنے زخم لگے ہیں میرے جسم کو! اور میری روح . . . . !

"اس کی چھلنی میں تو سات سمندروں کا پانی اور ان کے ساحلوں کی ریت چھن سکتی

ہے۔ بھولا بسرا درد کراہ بن کر اس کے گلے تک آیا۔ اور جولی کے زخم دل کی تمام سانسیں گھر چا ہوا
ناسور بن گئیں۔ وارڈن کی پوچھ گچھ اُسے اب تک یاد تھا۔ یہ پوچھ گچھ ساری رات جاری رہی تھی۔
اور اگلی صبح اُسے ایک تاریک کوٹھری میں ڈال دیا گیا تھا۔ جولی بھوکی پیاسی وہاں پڑی تھی۔ ننگے
فرش کی ٹھنڈ موت جیسی بے حس تھی۔ اور کمرے کی دیواروں میں ایک بھی کھڑکی نہیں تھی۔ باری
باری لوگ اس کے پاس آتے! ہیولوں کی طرح کے!

وارڈن۔

سسٹر مریم!

ایک اور سخت گیر آدمی شاید لڑکوں کے ہاسٹل کا نگراں!

"میں تمہیں نن بنانا چاہتی تھی۔ مگر تم.... !" وارڈن کے ہاتھ پتھر تھے۔ اُس کا ملائم بدن....!
پھول کی جن پنیوں کو مائیکل کے معصوم ہونٹوں نے چوما تھا۔ جگہ جگہ سے نچ گئیں....!

"جولی.... تم گناہ گار" سسٹر مریم کچھ کہتی نہیں تھی۔ مگر اس کی آنکھوں کے الاؤ....!" تم
دونوں نے چرچ کا بھی خیال نہیں کیا۔" وہ سخت گیر آدمی اپنے ہاتھ میں چابک لے کر آتا تھا۔ اور چمکیلی
گلابی جلد والے بُت کو ادھیڑتا رہتا تھا۔ جولی حیران وحشت زدہ آنکھوں سے ان سب کو دیکھتی حیرت
کے مارے اس سے رویا نہیں جاتا تھا۔ مگر اس کے چھوٹے دل کی ساری فریادیں کرائسٹ کے نام تھیں

——! یسوع......!

اس قبر کے پاس میرے سینے میں پڑی صلیب اٹھائے ہوئے اور وہاں مائیکل کے ساتھ تو بھی نہیں
تیرے ساتھ تھا اور مائیکل سے ملنا اگر گناہ تھا تو نے مجھے روکا کیوں نہیں.... تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں!
"یسوع۔ یسوع...!" ان سب کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی اندر لگی تصویر کا منہ نوچنے لگتی تھی۔ "کیا
خدا ہے تو.... ! ان لوگوں کو روکتا بھی نہیں....! انہیں میری بات کا یقین نہیں۔ مائیکل کو تو نے
بھیجا تھا...!" تیسرے دن جولی کو بند کمرے سے نکال کر چرچ کے دروازے کے باہر چھوڑ دیا گیا۔
وہ ان لڑکیوں میں جنہیں آگے چل کر راہبائیں بننا تھا رہنے کے قابل نہیں...!" سسٹر مریم نے اس
کے گلے میں پڑی صلیب اُتار لی تھی۔ اور چرچ کی دیوار پر لگے کرائسٹ کو جولی نے باہر نکلنے سے پہلے جیسے
بالکل خالی ہو کر دیکھا تھا۔ تو بول نہیں سکتا...! اور۔

میرے دل کی بات تو نے ان سب کو نہیں بتائی۔

"تو میرا خدا نہیں ہو سکتا۔ خدا بھی کبھی گونگا ہوا ہے۔" وہ خالی ہاتھ باہر آئی تھی اور کرائسٹ چرچ کے اندر رہ گیا تھا۔

برفانی تودے جیسی یخ رات ... آسمانوں اور زمین کے درمیان ہر طرف پھیلی ہوئی ... !

جولی کی عمر تیرہ سال تھی .... اس کے جسم پر پھٹی ہوئی سفید فراک تھی اور اس کے شہر کے سب لوگ مر چکے تھے۔ خدا کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ مگر اس کا رستہ جولی کو معلوم نہیں۔ رات بھر وہ جدھر اس کا دل چاہا ... چلتی رہی۔ تھک جاتی تو گر پڑتی مگر برف ہونے سے پہلے اٹھ کر چل دیتی تھی۔ رات ختم ہو گئی۔ زخموں میں ہوتی دُکھن بھی ہار کر سو گئی ... ! جولی کے پپوٹوں میں نیند بھرتی جارہی تھی ۔!

صبح اس نے ایک جگہ سے کوفی کا ایک مگ مانگ کر پیا ... ریسٹورنٹ میں ابھی دن نکلا تھا کاؤنٹر پر کھڑے حیرت زدہ آدمی نے اس میلی کچیلی زخمی لڑکی کو گرم کوفی پلائی۔ برگر کھانے کو دیئے .... ! جولی کھاتے کھاتے اونگھ گئی تو اس کو بازوؤں میں اٹھا کر ریسٹورنٹ سے ملحقہ اپنے کمرے میں لے آیا۔ کمرہ گرم تھا۔ اور اس کی گرمی زندگی سے بھری ہوئی تھی۔ مگر یہاں دھوپ نہیں آتی تھی۔ دیواروں پر ایک اکیلے آدمی کی تنہائی لکھی تھی۔

جولی کو اس نے احتیاط سے بستر میں لٹا دیا۔ پھر اس پر ایک ایک کر کے کمبل ڈالنے لگا۔ گہری نیند میں ڈوبنے سے پہلے جولی نے اپنے چہرے پر سلگتی سانسوں کو پہچاننے کی یونہی سی ذرا ایک کوشش کی۔

"تم مائیکل ...!"

اس کے ہاتھ خلا میں بھٹکتے رہے اور بے سدھ ہو کر تکیے کے سہرے پر آن گرے !

"نہیں .... موہن !"

بہت دور دنیا کے آخری سرے سے سرگوشی ابھری۔ جولی نے آنکھیں بند کریں .... موہن نے دیکھا وہ گہری نیند سو رہی تھی ..... !

موہن ایک بھگوان کو پوجتا تھا ..... !

سویرے اُٹھ کر ریسٹورنٹ کے دھندے نمٹانے چلا جاتا۔ شام ڈھلے واپس آتا۔ سارا دن جولی بستر میں گم صم پڑی اُس بھگوان کو دیکھتی رہتی جس کا بُت سرہانے کی میز پر رکھا تھا۔ اُس کے زخم اچھے ہوتے جا رہے تھے۔ مگر بہت سے جُڑے ہوئے زخموں کے ٹانکے رات کو موہن ادھیڑ دیتا تھا۔ اُس کے اندر مسلسل کہیں ذرا ذرا سا لہو رستا اور ہڈیوں کے گودے میں چنگاریاں سلگتی رہتیں۔ جولی بستر سے اُٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تو موہن اسے اکیلا چھوڑ کر جاتے ہوئے ڈرنے لگا۔ ریسٹورنٹ سے اس کا کمرہ بہت قریب تھا۔ مگر باہر جاتے ہوئے وہ دروازے میں تالا ڈال دیتا تھا۔

جولی کو خالی کمرے میں اس کھڑا بھگوان بُلاتا رہتا۔ "آؤ میں تمہارا خدا بن جاؤں جیسے میں موہن کا خدا ہوں"۔

"اونہہ تم ..... موہن کو اتنا ذرا سا بھی اعتبار نہیں تمہارا۔ تمہاری موجودگی میں وہ میری حفاظت کے لئے دروازے کے باہر تالا ڈالتا ہے ..... کیسے بھگوان ہو تم اس کے .....؟ ہاتھ تک تو ہلتے نہیں تمہارے!"

موہن کو نشے کی بُری عادت تھی۔ کسی کسی رات وہ دوستوں میں بیٹھ کر گاڑھا دھواں اُگلتے ہوئے سگار پیتا اور کمرے میں آ کر بُری طرح چیختے ہوئے کئی چیزیں توڑ دیتا تھا۔ بھگوان کی مورتی کو ایک دفعہ اس نے اُٹھا کر دور پٹخ دیا تھا۔ وہ کئی حصوں میں ٹوٹ گئی تھی۔ ٹوٹی ہوئی مورتی کے ٹکڑے صبح تک فرش پر پڑے رہے۔ مگر اگلے دن پُرانی میز پر ایک نیا بُت رکھ دیا گیا۔

موہن کے ساتھ وہ بہت دنوں تک رہی اور اس کے بھگوان کے ساتھ ایک پل بھی نہیں، جولی سے اُس کا دل اچھی طرح بھر گیا تو وہ اُسے اپنے ایک دوست کے گھر چھوڑ آیا۔ وہاں سے ایک اور آدمی کے گھر۔

پھر کہیں اور .....

اور اس کے بعد کسی دوسری جگہ .....

بہت سے گھروں کی دیواروں پر تنہائیاں لکھی تھیں۔ ان گھروں میں آدمی رہتے تھے اور ان کے کرائسٹ ان کے بھگوان۔ ان کے خدا ..... "خدا کے ہوتے ہوئے یہ اکیلے ہیں!" جولی کو خیال آتا۔ اور ان کے ہوتے ہوئے ان کا خدا اکیلا پڑا ..... ! وہ رشتہ جو ماں کے پیٹ سے یہ

لوگ اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اس سے ان کی جان پہچان نہیں تو آدمیوں سے ان کی جان پہچان کیسے ہو جاتی ہے۔

ایک بودھ لڑکے کے کمرے میں بہت سال پہلے اُس نے گوتم دیکھا تھا۔ اس ذرا سے مجسمے کے آگے وہ بودھ لڑکا رات کو سونے سے پہلے جھکتا تھا۔ اور بڑے پیار سے اس پر جمی ہوئی گرد پونچھتا تھا۔

"یہ گوتم ہے . . . میرا خدا" اس نے جولی کو بتایا۔

"کیسا خدا ہے یہ ـ ہمیں گناہ کرتے دیکھتا ہے اور چپ رہتا ہے۔ یہ دیکھو میں یہاں اس کے سامنے کپڑے اتار کر کھڑی ہو جاؤں تب بھی یہ کچھ نہیں کہے گا۔ اس میں تو اتنا لحاظ نہیں کہ اپنا منہ دیوار کی طرف ہی کر لے . . . . .

میں اسے توڑ نہ ڈالوں . . . . !"

جولی نے کرائسٹ کی تصویر پھاڑی تھی ۔

بھگوان کو توڑا تھا۔

گوتم ٹکڑے ٹکڑے کئے تھے . . . مگر اس کے اندر کوئی چیز اب تک زندہ تھی اور کلبلاتے ہوئے کیڑے کی طرح سرسراتی رہتی تھی۔ "کوئی ایک وہم . . . .

کسی کے ہونے کا یقین . . . کسی سے ملنے کی آس!

کہیں چھپا ہوا خدا ۔

مدتوں وہ نروان کی کھوج میں چلنے والے ہپیوں کے ٹولے میں شامل ہو کر نروان کو ڈھونڈھتی رہی۔ نروان کہیں تھا۔ ہاں شاید . . . اس وقت وہ سب لڑکے اور لڑکیاں ملکوں ملکوں گھومتے تھے۔ بھرے بازار میں مجمع لگا کر گٹار بجاتے اور بھیک مانگتے تھے۔ رات کو چرس ملی تمباکو کے سگار پی کر خواب بُنتے۔ جولی نے خود اپنی آنکھوں سے دن کے دھندوں کی ستائی ہوئی گرد آلود دنیا کو چاندنی اور پھولوں کا جزیرہ بنتے ہوئے دیکھا تھا۔ گاڑھے کسیلے دھوئیں کی لکیر اس کے حلق میں گہری اترتی اور اس لکیر کے ارد گرد ستارے کھل اُٹھتے تھے!

بدن کے اندر کہکشاں . . . . . !

بدن کے باہر سُرخ پھولوں اور سات رنگ کے آسمانوں کی دنیا اس کے ساتھیوں کے ہیولے سنہری پروں والے پرندے بن جاتے تھے۔ اور رات بھر وہ نقرئی پانیوں کی آبشاروں کے جھاگ میں تیرتے۔ ڈوبتے۔ اُبھرتے۔ چاندنی کا گھونٹ بھر کے اُفق کی طرف اڑتے رہتے تھے۔ اس وقت نسروان دلوں کے گٹار پر پیار کی انگلیوں سے گیت چھیڑ دیتا۔

جولی کے سونے معبد میں مقدس آگ کے الاؤ روشن ہوتے!

مگر اگلی صبح دنیا جل کر راکھ ہو جاتی تھی۔ "دن کی دھوپ میں آنکھیں کھولنا..... جولی کی پتلیوں میں وہ چھوٹی چھوٹی کرچیاں کب سے کھُبی ہوئی تھیں۔ صبح خیموں کے باہر بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر کے پاس لڑکیاں اور لڑکے بے سُدھ پڑے ہوتے۔ میل میں اٹے ہوئے نُچے کھسوٹے اُن کے جسم... چہروں پر لمبی خراشیں.... جیسے گیلی زمین پر سُرخ لکیریں کھنچی ہوں۔ رات کا نسروان صبح پیوند لگی جیکٹ اور میلی جینز پہن کر گٹار اُٹھائے سڑکوں پر بھیک مانگتا تھا۔

خدا.... میں تجھ سے تیرے ہونے کا یقین۔ اس ایک یقین کی بھیک مانگتی ہوں۔ میری روح کی چادر پھٹ گئی ہے تیری تلاش میں چلتے ہوئے..... ورمیرے جسم پر زخموں کے سوا کچھ نہیں بچا.... تو کرائسٹ ہے۔

تو بھگوان ہے۔

تو گوتم ہے

تو نسروان ہے.....

مگر تو ہے کہاں.... اِن سب میں کس کے اندر تو اَن دیکھا۔ میں تجھے دیکھنا چاہتی ہوں، جولی کو چرچ سے نکلے ہوئے عمریں گذر گئیں۔ اُس نے کئی جنم لئے تھے اور بھول کر کبھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تھی تو اسے پکی عمر کی ایک سُتی ہوئی عورت کا چہرہ دکھائی دیتا۔

یہ عورت جو صرف عورت تھی۔

بہت دفعہ بِکھی گئی تھی۔

اور ان گنت ہاتھوں سے اتنی بار لکھی گئی تھی کہ اس کے سادہ ورق پر سیاہی کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔ گلابی چہرے۔ سنہری چمکیلے بالوں والی جولی....! ایک بے ساختہ سی مہک اب تک اُس

کے بدن سے پھوٹتی تھی۔ اور جولی کے پاس آنے والا ہر آدمی کچھ دیر کے لئے پاگل تو ضرور ہو جاتا تھا۔ "کسی کو کیا معلوم بھلا .... وہ اپنا خدا "گم" کر چکی ہے ..."

"میرے سادہ صفحے پر تو نے PROSTITUTE کا جسم لکھا" جولی کے دل میں کسی آن دیکھے کے لئے بہت دُکھ تھا۔" حالاں کہ یہ صفحہ اتنا معصوم تھا کہ میں نے اس پر HOLY BOOK لکھنا چاہا تھا تو جب کبھی ملا میں تیرے ساتھ لگ کر اس ناانصافی پر رووں گی ضرور ...."

جولی کی آنکھیں بنجر ہوگئی تھیں اور ان میں آنسو نہیں آتے تھے۔ جس نے کبھی خدا کی شکل نہ دیکھی ہو۔ وہ رو کیسے سکتا ہے۔ اس کے اندر بادل ٹھہرے ہوئے تھے ب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔

لیکن آخر وہ برسے کس کی چھت پر!

احسن کے ساتھ ان دنوں وہ جس کمرے میں رہتی تھی۔ اُس کی چھت میں کئی چھید تھے اور کڑیاں دیمک چاٹ گئی تھی۔ تیز دھوپ ان سوراخوں میں چھن کر سارا دن فرش پر انگارے دہکاتی رات کو اندھیرے کی مٹی بھر بھر اکر گرتی تھی اور جولی اپنے سینے کی تاریک سرنگوں میں احسن کو ساتھ لے کر کسی روشن سرے کی امید میں چل نکلتی۔ احسن — خاموش بھیگے ہوئے کاغذ جیسا حساس آدمی! جولی اُسے فلیٹ کی سیڑھیوں پر پڑی ملی تھی۔ پھٹی ہوئی ساڑھی پہنے وہ بھک منگوں جیسی عورت جو ماں بننے والی تھی اور اُس کے بدن پر لمبی نیلی لکیریں سرسرا رہی تھیں۔ احسن ان دیکھے بغیر گذر جاتا، مگر جُولی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے پیر جکڑ لئے۔

"یہ میرا گھر ہے ....!" اگلی صبح جانے سے پہلے وہ اُسے گھر کی چابی دیتے ہوئے بتا کر گیا۔

"یہ میرا گھر ہے۔ یہاں تم سے پہلے کوئی عورت نہیں آئی ...."

"پھر تم مجھے کیوں لائے!" جولی احسن کے کوٹ میں لپٹی ہوئی ادھورا کمبل اوڑھے آتش دان کے سامنے پڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں کسی ان کہی کی گھمبیرتا سُلگ رہی تھی۔

"تم ماں ہو.... یہاں جب تک تمہارا دل چاہے رہو......!" چابی جولی کی ہتھیلی پر لرزتی رہی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

کمرے میں بستر ایک ہی تھا جس پر وہ گم صم پڑی رہتی تھی۔ احسن رات گئے واپس لوٹتا اپنے

ہاتھ سے اسے کھانا کھلاتا۔ آتش دان میں ٹھنڈی راکھ کے اوپر نئی لکڑیاں رکھ دیتا اور جولی اونگھنے لگتی تھی وہ کچھ بولے بغیر دیوار سے لگ کر سو جاتا تھا۔ جولی... رات بھر کروٹیں بدلتی رہتی۔

"یہ آدمی اسے بولنا نہیں آتا کیا...؟"

ایک رات وہ جھنا گئی اور سوتے ہوئے احسن کو اس نے بُری طرح جھنجھوڑ کر جگایا۔ "تم ہر رات اسی طرح سوتے رہو گے کیا...؟"

احسن ہراساں ہو کر اسے دیکھنے لگا...! "یہ پورے چاند میں جوار بھاٹا ہو جانے والی سمندری لہروں جیسی عورت تھی۔ سطح سے اوپر... اور اتنی ہی سطح کے نیچے...!" اس کے گریبان میں پسینے کی بوندیں تھیں... اور سوکھے لبوں پر فریادیں۔

"میں جُولی ہوں... میں جُولی ہوں۔"

احسن کے مضبوط ہاتھ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ دوسرا ہاتھ اس نے جولی کے بالوں پر رکھا اور نرم انگلیوں سے اس کی پشت پر اپنے اندر کا سارا خلوص لکھنے لگا جس میں زمین و آسمانوں کے درمیان پھیلی ہوئی محبت بھی شامل تھی۔ جیسے کوئی شے رگوں میں دوڑتے احسن کے لہو سے پھوٹ کر جولی کے خلیوں میں شامل ہو رہی ہو۔ اس کی سانسیں دھیمی ہونے لگیں۔ ریت آنکھوں نے زخم ہو کر احسن کو دیکھا...!

"تم بھیڑیے نہیں ہو کیا...؟ میں تمہارے بھٹ میں پڑی بے بس بھیڑ... میری کھال ادھیڑ ڈالو...!"

"تم ماں ہو..." وہ اسے تھپکنے لگا۔ "یہ بچہ کیسے ہی اندھیروں سے آیا ہے۔ اسے روشنی پہونچنے دو۔" کانپتے ہوئے جسم کو کمبل میں لپیٹ کر اس نے اتنے احترام سے جیسے مقدس کتاب اٹھاتے ہیں۔ جولی کو اٹھا کر بستر میں رکھ دیا۔

"یہ بستر...!"

جولی نے اپنے اوپر جھکی ہوئی شکروں کی آنکھیں اور بھیڑیوں کی تھوتھنیاں دیکھی تھیں۔ کے تصور سے اسے درندوں کی کمین گاہیں یاد آتی تھیں۔ اندھیرے غار۔ ان میں رچی ہوئی کی بُو... مگر اب... احسن کو دیکھ کر بہت بھولا ہوا سا ایک احساس اس بستر میں اس

سرہانے آکر بیٹھ جاتا تھا۔ "یسوع"

نہیں اُسے تو وہ پیچھے کہیں دور چھوڑ آئی ہے۔ اور اب مبہم سے نقوش بھی اُس چہرے کے جولی کے ذہن میں نہیں . . .

ایک رات زور کی بارش ہونے لگی چھت میں جولی کے سر کے عین اوپر سوراخ تھا۔ احسن اس سوراخ کے نیچے! جولی کے اوپر جھکا بیٹھا رہا۔ بارش جانے کب رُکی ہو صبح جولی کی آنکھ کھلی تو حسن اُسے ڈھانپے ہوئے سو رہا تھا اور کپڑوں سمیت اس کا سارا جسم۔ پلکوں کے سرے تک بھیگے ہوئے تھے ــــ

کبھی وہ چپ چاپ اس کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ اور غور سے دیکھتا رہتا۔ جولی کی ہڈیوں میں شدید رو گذرنے لگتی۔ "تم . . . کیا دیکھتے ہو . . . . ؟"

"تمہارے اندر کہیں روشنی کا منبع ہے جولی۔"

"روشنی . . . !"

جُولی کو اب اس خیال سے ہنسی آتی تھی۔ وہ روئیں روئیں میں بسی پاپی عورت۔ گناہ اُس کے گُودے میں اُترے ہوئے۔ اس کے اندر تہہ در تہہ کوٹھڑیاں تھیں اور کالی آندھیوں کے جھکڑ سیاہ ریت کے صحراؤں میں طوفان بنتے رہتے تھے۔

جولی چلنے پھرنے . . . . بات کرنے کے قابل نہ رہی تو وہ باہر کے سارے کام چھوڑ کر اپنے کمرے کا ہو گیا۔

وہ کبھی کبھی آنکھیں کھولتی تھی۔ بے خیالی میں احسن کو اپنے لئے کھانا بناتے . . . ادھورے کمبل میں نئے ٹکڑے جوڑتے۔ آتش دان سُلگاتے ہوئے دیکھتی تھی۔ گرم چائے کا کپ اس کے مُنہ سے لگا ہوتا۔ احسن کا بازو کندھے پر . . . . !

رات کے خواب اس سے زیادہ خوبصورت ہوا کرتے . . . . !

"وہ اس کے قریب ہی کہیں اداس بیٹھا ہوا۔ اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اسے آواز دیتا ہوا جُولی۔ جُولی۔ تم سن رہی ہو ناں میری آواز . . . "!

اور یہ آواز۔ یہ آواز . . . . . جُولی ازل کے دن سے سن رہی تھی، اس میں شکار پر جھپٹنے

درندے کی غرّاہٹ نہیں تھی۔ غار میں اکیلے بیٹھ کر خدا کو پکارتے آدمی کا دُکھ تھا۔ وہ بول نہیں سکتی تھی۔ مسکراہٹ اس کے چہرے کی زردی میں لو بن جگاتی رہتی ...... !

وہ سو رہی تھی۔

شاید مر رہی تھی ....

بہت دن گذر گئے۔

جولی کی دنیا میں احسن کے چہرے کا ایک جھروکا کھُلا تھا۔ جس میں وہ سارے زندہ لوگوں بھرے پُرے بازاروں، ستاروں، آسمانوں کو جب ہوش میں آتی دیکھ لیتی تھی۔

"جُولی ...!" ایک دن وہی آواز ایک بار پھر اُسے اُفقوں کے پار سے آتی سنائی دی۔ "تم ابھی مرنا نہیں جُولی .... !"

اُس نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں۔ احسن کے آنسو اُس کی پتلیوں پر گرے۔ برف کی سِلیں اور تیز گرم شعلے۔

اس نے ہاتھ سے ٹٹول کر احسن کا ہاتھ پکڑا ..... !

"مجھے تمہاری ضرورت ہے جُولی تم ابھی مرنا نہیں ....!"

جُولی نے اُس سے پوچھا نہیں کہ یہ کیسی ضرورت ہے ... ! اُسے معلوم تھا۔ ماں کی کوکھ میں پڑے بچے کو ماں کے جسم سے رابطے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے ..... !

وہ احسن سے کیسا پیار کرتی ہے ـــ ! جولی سمندروں کے اندر کی بہت گہری تہوں کی جانب تیر رہی تھی جب اُسے خیال آیا ....

"جیسا پیار کوئی ماں اپنے اندر پڑے بچے کے ساتھ کر سکتی ہے۔ اُسے زندگی سکھاتا اُسے روشنی پہونچاتا ہوا پیار .... !"

اور اس کے بدلے میں احسن کی محبت .... !

احسن کی محبتوں میں کئی محبتیں شامل ہو گئی تھیں

کرائسٹ .... صلیب اُٹھائے ہوئے

بھگوان۔

گوتم۔

نروان.....

احسن کی محبت کتنی ہوگی.... بھلا.....

ہاں جتنی محبت اُس ان دیکھے نے بندوں کے دل میں اپنے لئے رکھی ہوگی ان کی تخلیق کے وقت۔

یہ کیسا رشتہ ہے.... یہ پہلے کیوں نہیں تھا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں احسن تو کہیں نہیں وہ ان دیکھا مجھ سے آن ملے شاید....!

درد کی شدت کو سہنے کے لئے وہ اپنے خیال کے روشن نقطے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پھر اُس کی آنکھ کھُل گئی اور اُس نے احسن کو زمین پر اُترتے ہوئے دیکھا۔

"تم کہاں تھیں جُولی۔ میں آوازیں دیتے.... دیتے تھک گیا۔"

"میں سُن رہی تھی....!" وہ بستر میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ بہت دن کے بعد جُولی میں دیکھنے سُننے اور بولنے کی ہمت واپس آئی تھی۔ احسن اس نے دیکھا پھٹی پرانی قمیص پہنے ہوئے تھا اور اس کے سارے گرم کپڑے جولی کے جسم پر تھے۔

"تم احسن... تم کیوں بُلا رہے تھے مجھے۔"؟!

وہ چُپ رہا۔ اور ایک کتاب اُٹھا لایا۔ کتاب اُس نے جُولی کے سامنے رکھ دی۔

سبز مقدس کتاب۔

یہ میری کتاب ہے.... وہ بتانے لگا۔

میں اِسے پڑھ نہیں سکتا.....!

مجھے کسی نے سکھایا ہی نہیں.... !

"مگر میرا دل کہتا ہے میں اسے پڑھ لوں گا۔ تو مجھے اپنے خدا تک پہونچنے کا راستہ مل جائیگا۔"

ایک آنسو کا پردہ سرکا کے احسن نے بمشکل اس کی طرف دیکھا۔

"تم مجھے پڑھا سکتی ہو۔

"مجھے پتہ ہے۔ تم اس کتاب میں لکھے ایک ایک لفظ کا مطلب جانتی ہو۔"!

"تم نے کہیں وہ ان دیکھا .... خدا دیکھا ہے ...!"

"تم نے تو ضرور دیکھا ہوگا!"

جولی کے ہاتھ جس پر اب ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں بچا تھا.... اٹھا کر مقدس کتاب کے اوپر رکھ دیا۔

پانچ انگلیاں۔

پانچ شمعیں لو دے اٹھیں۔

اندھیروں کے خطوط جل کر راکھ ہونے لگے اور آنسو دونوں ایک ساتھ جھڑتے رہے۔

"ہاں!"

"میں اُس اَن دیکھے کو جانتی ہوں احسن ....!"

جولی نے بہت دیر کے بعد کہا ــــ!

مرزا حامد بیگ

عالم شاہ خاں
ایک تعارف

ڈاکٹر عالم شاہ خان اُودے پور یونیورسٹی، راجستھان (بھارت) میں ہندی زبان و ادب کے اُستاد ہیں۔ خان صاحب نے اپنے پی ایچ۔ ڈی۔ کے تحقیقی مقالہ میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کے اہم موضوع پر تخصیصی نوعیت کا کام کیا۔ اسی موضوع پر اُن کی ایک کتاب عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے۔

ہندی کہانی کاروں میں عالم شاہ خان کا نام بہت نمایاں ہے۔ اُن کے افسانوں خصوصاً "ایک اور سیتا" (سارِیکا۔ جولائی ۱۹۷۰ء) "مرا دن بھر ادن" (سارِیکا۔ عالمی طوائف نمبر جنوری ۱۹۷۴ء) "ندا کی رتھی" (سارِیکا۔ ستمبر ۱۹۷۶ء) اور "کرائے کی کوکھ" (سارِیکا۔ جون ۱۹۷۷ء) کو ہندی کے نئے افسانوی ادب میں اہم کارناموں کا تسلسل کہنا چاہیئے۔ افسانہ "ایک اور سیتا" کے منظرِ عام پر آنے کے بعد عالم شاہ خاں کا شمار ہندی کے متنازعہ کہانی کار کے طور پر ہونے لگا تھا۔ افسانہ "کرائے کی کوکھ" کی اشاعت کے بعد "ہندو تہذیب" کے خدائی فوجداروں نے انھیں ہندوستانی معاشرے کا کھلا باغی قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر عالم شاہ خاں کا خصوصی موضوع راجستھان میں اُودے پور، بیکانیر، جے پور، الور اور جودھپور کی گری پڑی آبادیاں اور وہ "کچلی ہوئی آوازیں" ہیں، جو راجستھان کے لق و دق صحراؤں میں سارے ہوئے جھونپڑوں سے اُٹھتی تو ہیں لیکن قبولیت کا شرف حاصل نہ کر پانے والی دعاؤں کی طرح کہیں راہ میں ہی دم توڑ جاتی ہیں۔

عالم شاہ خاں کی کہانیوں میں رانا پرتاب اور اکبرِ اعظم کے فیصلہ کن معرکہ (ہلدی گھاٹ کی جنگ) کے بعد "راجپوت خانہ بدوش خصائص" اہمیت کے حامل ہیں، جبکہ اُن کے مخصوص ہندی اسلوب میں ویدک سنسکرت، مختلف النوع بھاشاؤں اور پراکرتوں کے بعد اپبھرنش، کھڑی بولی اور ہندی ناگری کی باہمی آویزش خصوصی توجہ کی طالب ہے۔

عالم شاہ خان
ترجمہ: مرزا حامد بیگ

کرائے کی کوکھ

سگنوُے ــــ بوئے جا بیج پہ بیج ، اگائی جا لونڈے ، سمیٹ فصل بیٹوں کی ، دونوں ہاتھ ۔"

"جلتا کیوں ہے ، آگوان ــــ یہ گھگھرا گلے پڑ گیا ، گھبرا گیا میں تو ــــ سالی لگائی ہے کہ تُو ؟ لگی ، اور لے گئی بیج ۔ سال کے سال لونڈا لے لو ۔ صحن بھر دیا ، ہر جا چھوکرے ہی چھوکرے ۔"

"شکر کر شُکر ــــ یہاں تو ترس گئے لڑکے کی صُورت کو ۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں ــ اترانے کے دن ختم ہو گئے ، کتنے ڈھیلے پڑ گئے ، بیٹے کی آس میں آنکھیں پتھرا گئیں ــــ پر نصیب اپنے اپنے ۔"

"ارے ــ مرا کیوں جاتا ہے ، کر لے بدل بیٹے سے بیٹی کا ۔ میں تو بیٹوں کے بہاؤ میں ڈوب مرا ــــ بیٹے ، کم نصیب ــــ"

"دیکھ مکر نہ جانا ــــ دے گا بیٹی کے بدلے بیٹا ؟"

"چل ، ابھی لے ۔ جو نہ بدلے اپنے باپ کا نہیں ۔"

"جانے بھی دے ۔ بیٹے بیٹی کا ناتا ۔ یوں نہیں بنتا ۔ رشتہ وہ جو خون کا ۔ تبھی تو ممتا گرلاتی ہے ، دل نہیں ٹھہرتا ــــ لیکن یار ، عجب ہے ۔ کبوتری ، پرایا انڈا اگر ماکر بچہ جنے ۔ کاش ، بندے بنی آدموں میں ایسا ہوتا ، تو میں تجھ سے ــــ تیری جورو سے بھیک مانگتا ۔"

"وہ کیا بھلا ؟"

" سدا کے ذات بھائی ہو۔ میرے انڈے سے تم بچہ نکال دو ـــ پر آدمی کا انڈا ہو،
تب نا ـــ کچھ کہوں بھی تو کیسے ؟"

"آدمی کا انڈا ؟ باؤلا ہو گیا ہے کیا ؟ پھر بھی کہہ، جو ہوگا کروں گا۔"

"تو سن ـــ ہوتی آئی کہوں۔ پرکھوں کی ریت بھی ہے ـــ چھوڑ کیوں نہیں دیتا،
تو اپنی جورو کو میرے ساتھ۔ دو ایک برس، میرے ساتھ رہ لے گی۔ بس بیٹا بھر لے تو، اس
کی کوکھ سے ـــ پھر جھگڑا عوضانہ جو بنے لے لے۔"

"یوں کہو ـــ چار پیسے جُڑ گئے تو اپنے لنگوٹیا یار کی لُگائی کو تاکنے لگا۔"

"آنکھیں جوڑنے، دل ڈالنے کی بات نہیں۔ بس چاہتا ہوں کہ گھر کا جالا جُڑ جائے۔
سا نجھے کے کھیت، ہم نہیں جوتتے کیا ؟ بٹائی، بٹوارا بھی تو ہوتا ہی ہے نا۔ پھر اپنی ذات برادری
میں تو ایسا ہوتا ہی آیا ہے ـــ"

"لے سُلگا"، کہتے ہوئے آگوان نے بیڑی آگے بڑھا دی اور "ٹھک"، کر کے دارو کی
بوتل کنوئیں کی مینڈھ پر رکھ دی۔

ہتھیلیوں میں بل دے کر رسّی کے سرے کو سنبھالتے اور بیڑی کو دانتوں تلے دبا کر
سلگتی دیا سلائی کو ہاتھوں کی اوٹ میں کر کے، سگنوا اپنے ہونٹوں تک لے آیا تو چہرے پر بے ترتیب
داڑھی کے بالوں تلے، باہم اُلجھی اور بکھری ہوئی جھرّیوں کا جال اُبھر آیا۔ اس نے زور کا دم لگایا
اور بولا:

"لے آگوان یار ـــ تو بات پر بات خوب مارے ـــ وہ تیری گھر والی ؟"

"چل اسے تو گھر میں ڈال لے۔ تیرا کیا جائے، کر لے بدلہ میری "دوسری" سے اپنی کا۔ کہو،
کچھ اوپر بھی دُوں ؟"

آگوان نے مُنہ تک آئی بوتل سے ایک گھونٹ لے کر کہا، اور بوتل سگنوا کی ٹھہری
ہوئی ہتھیلی پر ٹیک دی۔ اب ان دونوں کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے جھلکنے لگے تھے۔

برگد کے گھنے پتوں کی چھتنار سے چھنتا ہوا چاند، چاروں اور پھیلی تاریکی کو دھکیل کر،
ان دونوں کے قریب دو جوار میں پھیلے گدلے پانی میں جھانک رہا تھا۔ ایسے میں آگوان نے کھنکار کر

تھوکا تو پانی میں ایک پھوڑا سا تیرنے لگا۔

"بول منظور ہے؟ ارے سوچ، جورُو کے بدلے جورو اور اوپر سے لوٹ۔ اسے کہیں جُوتی کے بدلے جُوتی، اوپر سے چاندی کی میخ ـــــ دُو جی کی گانٹھ بھی ڈھیلی نہیں، پر بیٹا نہیں ہے اُس کے مُقدر میں ـــــ میں لایا ہی اُسے بیٹے کے واسطے تھا۔ چھوڑ یہ سب اور بیٹور تو اب۔"

"لیکن میری گھروالی ـــــ اُس سے بھی تو ـــــ"

"اب بات کی نان توڑ بھی کہیں پر ـــــ وہ عورت ذات ـــــ بیر کا سائیں جو کرے، وہ اس کا دین دھرم۔"

"ذرا سوچ بچار کر لوں۔" سگنوا نے داڑھ میں تربوزوں کو کُرتے کے تنے سے پونچھتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"گھاٹے کا سودا ہو تو سوچ بھی ـــــ بولتا نہیں؟ جی کرے تو برس دو بعد پھیر لینا۔ یہی جان کہ میرا بیج رکھنے کو، پھوٹنے تک تو نے اپنا برتن مجھے سونپا اور میں نے تجھے۔"

"تُو جان ـــــ ساری برادری تجھے "سرپنچ" کہے، اور تُو گھروالی کو برتن بولے۔ وہ بیچاری خود کو کچھ نہ جانے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ بیوی، ڈھور ڈنگر ہے؟ اِس کھونٹے سے اُس کھونٹے باندھ دو؟"

"جیسے باپو گاندھی فرفر بولے، ویسے بولتا ہے۔ ارے نادان، کل تیری میری پاک دامن، پگڑی میں دُھول جھونک کر اپنے سُسر کی دو کھنڈی حویلی الانگھ جاوے۔ تُو ہی بتا ـــــ کیا ہم دونوں اُس کے لہنگے کا لڑ پکڑ لیویں گے؟ کیا ہوتا نہیں ایسا؟ اپنی ذات برادری میں جھگڑا نپٹایا اور بات آئی گئی ہو گئی۔"

"ارے مجھے سب پتا ہے، لیکن ـــــ یہ بچے کچے ـــــ ہیں تو سب بچے۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں ـــــ اُس کنبے اور بچوں کی پال پوس کے لیے اور لے لے ـــــ مجھے بیٹا چاہیئے، اور میں جانتا ہوں کہ تیری کے جو ہو گا، بیٹا ہی ہو گا ـــــ آج تک اُس مرد صفت نے بیٹی جنی بھی تو نہیں۔ کتنے ہوئے اس کے؟"

" مجھ سے تو تین ہیں۔ پہلے دو آدھ ہیں، اگلے آدمی سے "

" ساتھ نہیں اٹھا لایا۔ پہلوں کو — "

" پر ایا موت گھر لا ڈالوں؟ اُن کا بکھیڑا الگ "

" چل — دو جالوں پر سو اور لے مجھ سے اور چھوڑ گھر والی کو "

" سو الگ بھرے تھے، میں نے اُن چھو کر دں کے، پورے سو "

" سگنوئے! بھاگ دوڑ میں بھی حساب کتاب سے نہیں چوکا — پر تب اُس کی کاٹھی بھی تو ٹھی ہوئی تھی۔ جو بن تو سب چاٹ چکا اُس کا — چل، نبیڑ تین سو پر "

" ذرا اپنی گھر والی سے بھی تو کہہ سن لوں۔ تو بھی اپنی ست پھیری سے ماتھا جوڑے "

" اپن، جورو سے ماتھا نہیں جوڑنے کے۔ جورو کیا ہوئی، پاؤں کی جوتی، جوتی، جب جی چاہا اتار دی، پھینک دی، بدل لی۔ بھولے بادشاہ — بیمار سیتا کو جب رام جی نے بن باس دیا، تو اُس سے پوچھا تھا، اُس نے — تو بڑا اوتار بنا پھرتا ہے "

" یہ بات نہیں آگوان — بات یہ — "

" بات وات، تو نبیڑنا — کیا رہن رکھے گا سب کو، اس ساہوکار سانپ کے؟ گردی بیٹھا، وہاں سب کے سب — " آگوان جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

(۲)

" کھا لے، مکئی کا ٹکڑ " کئی چنگیر اُس کے سامنے دھکیلتے ہوئے بولی۔

لیکن سگنوا، گم متھان بیٹھا تھا۔

" آج گم سم کیوں ہو؟ بولو نا۔ کچھ اونچ نیچ ہو گئی کیا؟ "

مربل سے پیاز پر مکئہ تلتے ہوئے سگنوا کی گھر والی نے پوچھا۔

" جی اچھا نہیں ہے؟ کچھ کھا پی لو، نیند آجائے گی "

" تجھے کھانے اڑانے کے علاوہ کچھ سوجھتا بھی ہے؟ وہ تیرے باپ، ساہوکار کے ظالم بیٹے نے چکر میں ڈال دیا آج — کرنے لگا حجت پہ حجت۔ بولا پائی پائی کا حساب کرنا ہے تو بیٹھ جاؤ گردی — " سگنوا زخم کھا کر اکھڑا۔

"گروی؟" گنی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"موقع دیکھ کر مجھے بھی ہاڑ لادے تو ـــــ جانتی نہیں جیسے ـــــ تجھے اور مجھے اب ساہو کے گروی بیٹھنا پڑے گا ـــــ زندگی بھر کے لیے ـــ جان ہار کر بیجنا اس کے کھیت، پورنا کھلیان اور بھرنا اُس کا قرض ـــــ نہ حاصل نہ وصول۔"

"اور یہ بچے کچے؟"

"یہ بھی ساتھ گروی ـــــ کھائیں گے ساہوکار کے ڈھور ڈنگروں کے ساتھ۔ پر تجھے کیا؟ تو تو جنتی جا ـــــ باز نہ آنا، برس کے برس۔"

"میں اکیلی نے جنے ہیں یہ سُوَر؟"

"نہیں ـــ میں کہتا ہوں ـــــ آئے تیری ہوتی سوتی ماں بھی بچے جننے میرے گھر۔"

"اپنی ماں کو گھر ڈال لیتا، رہ جنتی تیرے ـــ ہوش کر ہوش۔"

"ہوش ہوتا تو دھرتا تیرے مرد کے ہاتھ تھیلی، اور لیتا یہ قرض اپنے سر۔"

"میں نے کہا تھا تجھے قرض لینے کو؟ ـــــ اتنی سکت تھی تجھ میں؟"

"اوے، بھول گئی، ٹھمکے لگا لگا کر سامنے نہیں آتی تھی میرے ـــــ پھولوں بُوا سے جتایا نہیں تھا کہ ـــ مجھ مرے ہوئے کو کیوں مارے ہے؟"

"میں نے نہیں کہا تھا کسی کو کچھ ـــــ اب سمجھے ہو کہ زور ظلم تھا۔ اپنے نکاح سے تھے، اپنے جنے سینے سے جڑے تھے ـــــ پر تیرے گھر بیٹھ کر، کون سا راج کرتی ہوں؟ ایک وقت کھاتی ہوں تو دو وقت بھوکی مرتی ہوں۔"

"اے ہے، بڑی دُکھیاری ہے بچاری۔ تو چھوڑ کیوں نہیں دیتی میرا پنڈا؟ جا بیٹھ کسی اور کے۔ تیرے نصیبوں سے دھن برستا ہے نا!"

"ارے ـــــ اچھے وقت سے ہی دشمنی رہی۔ مجھے یقین ہوتا کہ اولاد کے ناتے اچھے دنوں کی کلائی ٹوٹ جائے گی تو منہ جھلس لیتی اپنا ـــــ غارت گر مرد، گھر میں ڈال بھی چھل گیا۔ ابھی آگے کی کس نے دیکھی؟"

"آگا پیچھا، خوب سوچے سمجھے ہے، عورت!"

"ہوش جو بھلا بیٹھی ہوں۔ پیٹ کی بھوک اور کوکھ کے کوڑھ نے پاگل کر کے رکھ دیا ــ تو تو جانتا ہی ہے ــ"

"میں جو کچھ جانتا ہوں، تجھے بتا دیا ــ گروی بیٹھنا ہے، ساہوکار کے، تجھ مجھ کو ــ لڑکے بالے سب" اب سگنوا کے لفظ تھک کر ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"تیرا ساتھ ہے تو گروی بھی رہ لیں گی ــ سر پہ چھپر، اور روکھا سوکھا، جوار باجرہ کچھ تو دے گا، ادھ مرا سا ہو ــ قحط کٹ جائے گا۔ کل بیٹے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔"

کنی نے بھیگی ہوئی پلکیں جھپکاتے ہوئے، بے بسی سے سگنوا کے گھٹنوں پر بندھے ہاتھوں پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔

اِدھر اُدھر لڑھکے ہوئے سر جو، چندو ایک دوسرے کی گردن، پیٹ اور سر ناپتے، نیند میں جھومتے اِدھر اُدھر لڑھکے پڑے تھے۔ یوں جیسے اندھیارے کی گٹھڑیاں اور پوٹلیاں اُوپر تلے دھری ہوں۔ جاڑے کے مارے "چاؤں، چاؤں" کرتے سکتے چھپر کے درمیانی بانس سے اپنے وجود کو رگڑ رگڑ کر گرمانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کنی نے ٹھٹھری ہوئی زمین سے چندو کو کھینچ کر چٹائی پر کر لیا، اور اپنے چھلنی دوپٹے سے سب کو ڈھانپ دیا۔ اب اُس کے بدن پر صرف ایک بوسیدہ سینہ بند رہ گیا تھا، جو ساہوکار کی بہو نے اُس کی گدرائی ہوئی رنگت پر ریجھ کر دیا تھا، اور نیچے پھٹی ہوئی ساڑھی کا آدھا پلّو لپٹا ہوا تھا۔

چھپر کی ایک درز سے چھن چھن کر ظاہر ہوتے ہوئے اُجالے کی مدھم روشنی میں نمایاں کنی کی قربت محسوس کر کے سگنوا کھد بدایا۔ تبھی کنی نے اونگھتے ہوئے اس کی متلاشی انگلیوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور بڑبڑائی:

"کوئی حیلہ کرو نا!"

"تو حیلے کی کہتی ہے ــ نیک بخت، ابھی شہر میں پڑھا گوتسنکر کا بڑے والا بیٹا کہتا تھا ــ اب سرکار زور ظلم کی مزدوری نہیں رہنے دے گی۔ ساہوکار لوگوں کی پکڑ دھکڑ زوروں پر ہے۔ دیکھنا سگنوا، ڈرنا نہیں۔"

پھر ایک لمبی چُپ کی چادر، دونوں میاں بیوی کے درمیان تنتی چلی گئی۔ دونوں ابھی بولتے جھجکتے کہ باہر گرجدار آواز سے کسی نے پکارا۔

"سگنوا ہو!"

چارسُو پھیلے ہوئے سناٹے کو چیرتے ہوئے، وہ جواب میں پکارا: "آیا ہو"

"اتنی رات گئے ساہوکار، آوار دھُوا ـــ رام جی رکھے" یہ کہتا ہوا سگنوا، چھپّر سے نکلا۔

"ساہو ـــ پالنہار! آپ اور اس جاڑے میں، اتنی رات گئے ـــ مجھے بُلوا لیا ہوتا۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے ـــ میں کہوں آج چھیترے تیرے، ایسا ویسا بولا تھا، چوپال میں۔"

"نہیں تو ـــ چھوٹے ساہو، ملے تھے۔ قرض کی بات یاد دلائی تھی۔"

"نہیں ـــ وہ، گروی رکھنے کی بات کرتا تھا۔ میں سب سمجھوں، پر بھائی ـــ مجھے کسی کو گروی نہیں رکھنا، زور ظلم نہیں کرنا ـــ اب تُو ایسا کر، کل ہی میرے چھپّر کو چھوڑ دے، کہیں اور ڈیرا ڈال۔ جب تیرے پاس ہُوا میرا دیا مجھے لوٹا دینا ـــ پر اب دُور ہو جا۔ تیرا ساتھ، مجھے لے ڈوبے گا۔"

"پر، مالک میں جاؤں کہاں؟ میرا دوسرا ٹھکانہ کوئی نہیں ـــ جہاں جا پہنچوں ان لڑکوں بالوں کو۔"

"اب تُو جو بھی کر، چاہے کہیں جا کر رہ ـــ یہ "زنانی سرکار" تو ہمارا گلا ناپ رہی ہے ـــ نئے قانون پر قانون بن رہے ہیں۔ وہ شنکر کے بیٹے کی سُنی تُو نے، لیڈر بن رہا ہے۔"

"پر سرکار ـــ جو بولے اُسے بکنے دو۔ میں آپ کا دیا، سب لوٹا دوں گا۔ اب تو سر جو بھی بڑا ہو گیا ہے۔ چار کی جگہ چھ ہاتھ لگیں گے تو ـــ"

"زبانی جمع خرچ چھوڑ۔ تب تک میرا جنازہ نکل جائے گا۔ بس کہہ جو دیا، تُو کل ہی اپنا ٹھکانہ الگ کر لے۔" اتنا کہہ کر ڈولتا، ڈھیتا ساہوکار واپس ہو لیا۔ سگنوا، کاٹھ کا بنا، کچھ دیر تو وہیں کھڑا رہا، پھر چھپّر میں ہو لیا۔

اُسے یوں بھونچکا سا دیکھ کر بیوی نے ٹہوکا دیا:

"پھر؟"

"پھر نہیں — مُقدر کی مار کہہ۔"

"اب کہاں — کس جگہ ڈالو گے چھپّر، کچھ سوچا بھی؟"

"میری سوچ بچار سے کچھ ہُوا ہے آج تک۔ ہُگُنی را — وہ گیوان آیا تھا۔ مینڈھ پر بیٹھے بہت کچھ کہتا تھا —"

"آگیوان — وہ، میرے ہوتے سوتے گاؤں کا؟"

"ہاں، وہی — کہتا تھا، سگنوا ایک ثواب کما، اور پاپ کاٹ ڈال ساہوکار کا۔"

"کیسا ثواب؟ تیرا لنگوٹیا ہے، اُس کے دل میں رحم پیدا ہو گیا، تیرے لیے؟"

"مجھ پر تو نہیں، البتہ تجھ پر ضرور آمڈ آیا ہے، اس کے من میں کچھ —"

"صاف صاف کہو، چاہتا کیا تھا وہ؟"

"کہوں گا، تو میری نیت پر شک کرے گی۔"

"بول بھی۔ پاپ تو میں جان گئی، پر ثواب والی کیا بات ہے؟"

"اری مُورکھ، کہتا تھا، ذات بھائی کے ناتے سے ہی سہی — اپنی عورت کو لا بیٹھا میرے ہاں۔ بس اُس کی کوکھ سے میرا بیٹا پڑ جائے تو —"، بیٹے ہی بیٹے جو ہوتے آئے ہیں تیرے اور اُس کے بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں۔"

"یُوں کہو، میں اُس کا بیٹا جنوں۔ رہے ہم بیویاں ڈھور ڈنگر دِکھیں ہیں تم کو — جو رُو اور زمین، ایک سمجھو ہو تم مرد لوگ —"

"کہا نہیں تھا — آخر بھڑک اُٹھی نا۔"

"رہنے دو اُسے۔ آنے والے کل کی سوچ — چھپّر کہاں نسرے گا۔"

(۳)

اس سے پہلے کہ جھٹپٹا ہوتا اور دُھوپ نکلتی، ساہوکار گاؤں کے پنچوں کو ساتھ لیے سامنے تھا۔ سگنوا، دونوں ہاتھ جوڑے جیسے پٹ کر کھڑا تھا، اور اس کے وُجود کی اوٹ میں کھڑی، ہُگُنی کانپ رہی تھی۔

اپنے بھاری مُنہ سے بھاپ کا بگولا چھوڑتے ہوئے ساہوکار بولا:

"سگنوا! پانچ پنچوں کے سامنے تیرا میرا فیصلہ ہے۔ لو دیکھو پنچو —— یہ لکھت پڑھت ہے بیاج کی۔ جسے میں سب کے سامنے پھاڑ رہا ہوں۔ اب اس کی ادائیگی کا بوجھ ہے سگنوا کے سر —— اور سگنوا مجھ سے جڑا ناتا توڑے ہے۔"

اتنا کہہ کر ساہو نے سچ مچ اُن کاغذات کو پھاڑ پھینکا، جو مُدّت سے سگنوا کو اپنے ہی شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔

کاغذات کے پُرزے اِدھر اُدھر اڑ کر بکھرنے لگے، تو اُسے یوں لگا جیسے اس کے سینے پر بیٹھے ہوئے ناگ کا پھن کرچی کرچی ہو کر جھڑ گیا ہو۔ اُس نے ایک اُجلا اور گہرا سانس لیا۔ تب ساہوکار آگے بڑھا اور اس کی گھرداری کا سارا سامان سمیٹ کر چھپّر سے باہر ڈالنے لگا۔ گُنی نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دیے، پر ساہو نہ رکا۔ سگنوا، کھڑا انصاف چاہنے کے لئے منمناتا رہا۔ بچے ہڑبڑا کر نیند سے جاگ اُٹھے اور چھپّر کے باہر کھڑے ہو کر بلکنے لگے۔ ایسے میں قریب آدھا گاؤں ساہوکار کے کھلیان میں یکجا ہو گیا تھا۔

سب کچھ منتشر ہوتا اور مٹتا ہوا دیکھ کر سگنوا نے گاؤں والوں کا رُخ کیا تو سُود سے آزاد کر دینے کی بات کر کے ساہو نے سب کو ہمنوا بنا لیا۔ اب سگنوا کے سَر، ساہو کا کوئی ڈنک ڈنڈا نہیں تھا جو فریاد کر کے وہ گاؤں کی ہمدردیاں حاصل کرتا۔ سب بکھر بیت گیا۔ اُس کے سر پر آسمان کی چھت کے سوا کچھ نہ تھا، اور ساتھ تھا بسورتی ہوئی عورت اور بلکتے ہوئے بچوں کا۔

آنسو اُمڈے تو کب سُوکھے، سسکنا کب تھما ہے اور رستے کہاں جا کر دم ہوئے ہیں، کون جانے۔ ہنگامہ تھما تو یہ اُجڑا ہوا کُنبہ گاؤں کے ایک سرے پر کھڑے برگد تلے بکھرا پڑا تھا۔ دن ڈھلا تو ملگجا اندھیرا چھایا، پھر یہ ملگجا اندھیرا اوڑھے رات اُتری اور سائیں سائیں کرتی رات بھوکوں کو کھا، اَدھ موا کر کے پھر دن میں ڈھل گئی۔ ایسے میں سگنوا اور اُس کی جورُو کی ادھ کھلی آنکھوں میں آگوان کا چہرہ سما گیا۔ سگنوا کی آنکھ میں گُنی نے آگوان کی شبیہہ دیکھی اور سگنوا نے بیوی کی پُتلیوں میں عیال داری کی بے بسی صاف پڑھ لی۔ سو، دو دن کی بھوک، سگنوا کو آگوان کی دہلیز تک ہانک کر لے گئی۔

(۴)

بتاسہ بھر زمین پر کھڑے چلنی چھپر تلے اپنے لڑکوں کو سنورا سمٹا دیکھنے کی خواہش دوسرے دن ہی گنی کو خیالوں ہی خیالوں میں آگوان کے بکھرے پڑے آنگن اور چوبارے دکھا گئی۔ اس کے پاؤں کی پازیب بے چین ہو اٹھی، اُجلی ہتھیلی پر مہندی رچ گئی، اور اس کا کندن جسم ریشم میں جا بسا۔

یہ خیالوں کے محل جب نسرے ہیں تو کھُردرے اور تُرش تھے۔ سہاگ رات کو، کھیر کے تنکے اس کے گلے میں کانٹے بن گئے۔ لپی پُتی ہوئی، چلنی، چمکدار اور رنگین گارے کی دیواریں، گنی کے گرد اگرد سمٹتی چلی گئیں، وہ پل ہی تو گئی ۔۔۔ آگوان سے اُٹھتی تکتی باس کے جھکوں اور کپکپاتی ہوئی ڈھیلی بانہوں کے بیچ۔

مٹیالے اندھیرے میں وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی سمٹی۔ تو اس نے اپنے چاروں اطراف میں گناہ اور ثواب کے بچے، باہم اُلجھے ہوئے دیکھے۔ انہیں پلکوں کی اوٹ چھپا کر، چوبارے کے باہر قدم دھرا تو ایک طنز میں بھیگی کھلکھلاہٹ نے اُسے چونکا دیا:

"تو، تُو ہے دُوسری کے بدلے میں آئی ہوئی تیسری۔ میں ہوں آگیو ان کی اصل ست پھیری، تو بھی جیسے بیٹا جنے گی، اس لیے گھر لاڈ الا ہے تجھے ۔۔۔ دھوکا قطعاً نہ کرنا، ہاں!"

اُس ادھیڑ عمر کی گئی گزری، چوڑی چکلی عورت نے اپنی نئی سوت کو طعنوں کے ترکش کے ساتھ آگھیرا۔

"بیٹا جننے کو جیتے ہے تُو ۔۔۔ سمجھی، پر بیٹا ہی جننا تیرے اختیار میں بھی ہے؟ پر گیہان نے تو یہی کہا تھا۔ تُو نے اپنی کوکھ کے بل نہیں دیکھے کبھی؟"

طنز کا نشتر، دل میں اُتر تو گیا، پر وہ بولی نہیں ۔ بس بوجھل پلکیں اُٹھا کر اُسے ایک نظر دیکھ لیا۔

"ایسی شرمیلی، جیسے آج ہی بنتی ہو بہنی پہلے پہل۔ تیجا مرد تو میرا ہی ہے۔ دیکھتی جا آگے کا حساب بھی ہو گا ہی۔"

[illegible]

" میرا حساب تو صاف ہے ۔ اوروں کا بھی سمجھ میں آہی جاوے گا " سوتن کی دھونس کا جواب چاروناچار دینا ہی پڑا ۔

" حساب کتاب کی ایک ہی کہی تو نے ـــــ یہ جو سہاگن کا سوانگ رچائے ہوئے ہے ۔ آگے جو چڑے گی ، بھرے گی ، یہ سب میرا اور میرے باپ ہی کا ہے ، سمجھی ؟ اُس کا نہیں ، جو تجھے لایا ہے یہاں "

پہلی بات چیت میں ہی نویلی سوت نے جگر خراش بول داغ دیا تو بڑی پھٹ پڑی :

" پتا لگ ہی جانے گا تجھے ، ـــــ آگوان میرے ہی سہارے پر کھڑا ہے ، بنا ہے ـــــ اور تو بھی یہاں تبھی تک ہے ، جبھی تک میں چاہوں ـــــ بیٹے ڈھالنے کی ٹکسال جو لگا رکھی ہے ـــــ اِس باپ کی عمر کے بڈھے کھوسٹ پنڈے سے ـــــ "

اُس نے اتنا کہا اور پاؤں پٹختی اپنی پرچھتی کی اوٹ میں چلی گئی ۔

جو ہوا ، اور آنے والے دلوں میں جو کچھ ہوگا ، وہ اُس سے بے خبر تو نہیں تھی ، جو بدکتی یا کرلاتی ۔ اس نے پاؤں گاڑ کر کھڑے رہنے کی ٹھانی اور وہاں سے جھنکتی ہوئی چلی آئی ۔

آگے جو کچھ ہونا تھا ، وہ تو اُسے جھیلنا ہی تھا ، اور اب تک اس نے جو سب سے کڑوی اور کسیلی بات سُنی تھی وہ آگوان کی شہ پر سگنوا اور آگیوان کی دوسری جورو کے ملاپ سے متعلق تھی ۔ گنگی نے اِس آس پر آگوان کے گھر بیٹھنا قبول کیا تھا کہ سگنوا ، جیسے تیسے دو ایک برس اس کی راہ تکے گا ، اور لڑکوں بالوں کو سنبھالے گا ـــــ اور اُس کے بدلے میں ملے ہوئے روپوں سے ساہوکار سے لیا ہوا قرض چکا دے گا ۔

شروع چاند کے پہلے پندھواڑے ہی میں اُس نے سُنا کہ سگنوا نے " دوسری " گھر میں لا ڈالی ہے اور اپنے جگر گوشوں کو مار پیٹ کرتا ہے ۔ اس کا جی بیقرار ہو اٹھا ، اور اس نے سوچا کہ لوٹ جائے ، لیکن آگیوان کی چہار دیواری الانگھنا ناممکن تھا ۔ دن میں " بڑی " اس کی نگرانی کرتی رہتی اور رات کو آگوان آگھیرتا ۔ ذات برادری ، سب آگوان کے کہے سُنے میں تھی ، عورت ذات کی کون سُنتا ۔

بڑی کے طعنے سنتی اور آگوان کا بوجھ ڈھوتی ہوئی عورت اب نئے ماحول میں رچ بس

گئی تھی۔ من کو مار کر گھر کے ڈھور ڈنگروں کے چارہ پانی میں لگی رہتی۔ دو وقت کی کھا کر، سوتے جاگتے گھر کی نگہداشت میں جُٹی رہتی۔ پر "بڑی" کے طعنے مہنے ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ بڑی نے کانٹا نکالنے کو سُوئی سنبھالی تھی، سینے جوڑنے کے لیے نہیں۔ آج جب وہ غسل خانے سے نکل کر بال جھٹک رہی تھی تو اُس نے "بڑی" کو اپنی کوٹھڑی کی اوٹ پر کنکر ہاتھ میں لئے لکیر کھینچتے دیکھا۔ اس سے پہلے بھی وہ جب جب نہا دھو کر نکلی تھی اُسے اسی انداز میں لکیریں اُسارتے دیکھتی آئی تھی۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنے بال سکھا کر وہ "بڑی" کی بیٹی جھمکو کے بال سنوارنے بیٹھ گئی۔

"دیکھ ری گئی موئی — نہا دھو کر کنواری لڑکیوں کے ساتھ مت بیٹھا کر۔ ان کی چھوا چھوت بڑی خراب ہووے ہے۔ تیری کوکھ کے بیج نے جو ذات بدل لی تو؟"

بڑی نے طنز کیا۔

"بڑی! آخر ہے تو تُو بھی عورت ذات ہی۔ میرے اندر بھی کبھی جھانک کر دیکھ — پھر جھمکو، چھپا کے مجھے کیا بیر؟" اُس نے جھمکو کو اپنی باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"میرے بگڑے نصیبوں کو بھی کبھی سوچا ہے تُو نے، جو میں آؤں تیری اور سانپ بن کے آ بیٹھی ہے میری چھاتی پر — سُنا، کب بھر رہی ہے کر لے کی کوکھ، بیٹے سے؟"

"یہ طرارہ ہے تو خود کیوں نہیں جن لیتی بیٹا — ہے کمر میں زور؟" اتنا کہہ کر کُنّی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے چھپر میں گم ہو گئی۔

(۵)

آسمان بادلوں سے اٹا ہوا تھا، اور بدلیوں میں مینہ ڈنک رہا تھا۔ اُسے اپنی کوکھ میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایسے میں، اُس کی یادوں کے البم میں پیچھے رہ گئے ننھے برجو، مرجو یا شاید چندو کی ابھرتی ہوئی صورت آسمائی۔

"برجُو تو سمجھدار ہے پر چندو تو ابھی —" اُس نے کتنا چاہا تھا کہ چندو کو ساتھ لے لیتی، پر آگیوان یہ کہہ کر اڑ گیا تھا کہ جب تک وہ گود میں ہوگا، اس کی گود جلد ہری ہونے کی نہیں اور یوں سارے کیے کرے پہ پانی پھر جائے گا۔ آج اس نے سوچا، کہ یہ سب کیسے ادر ہوں کر

ہوا۔ ایک نہیں، دو بار وہ دھوکہ کھا گئی۔ کبھی رواج اور ذات برادری کے نام پر اور کبھی اولاد کے نام پر ـــــ آخر ملا کیا؟ اب پھر کمبخت کمر میں کانٹا سا چُبھا ہوا لگتا ہے۔ ایک دُکھ کی لہر سی اٹھی اور اس کے گلے میں اُبکائی انڈیل گئی۔

بڑی نے جب سے اُسے کچّی امبولی چچوڑتے ہوئے دیکھا تھا، بس جاڑا مار گیا۔ دن بھر مُنہ ڈھلپیٹے بے سُدھ پڑی رہتی۔ اٹھتی بھی تو مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑاتی اور بات بے بات پر جھمکوا ور چمپا کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہوئی۔ اُدھر آگیوان نے اپنے بیج کو نسرتے سُنا، تو ہر طرف سینہ پھُلائے مست پھرنے لگا۔

دوسرا دن چڑھا تو اس بات کو جیسے پَر لگ گئے اور محل مُنارے سُنی گئی۔ آگیوان نے لاکھ چکنی چپڑی لگا، اپنے جذبات میں بہہ کر "بڑی" کو متوجہ کرنا چاہا، لیکن وہ بس "ہوں ہاں" کہہ کر رہ گئی۔

اب جب کبھی اکیلے میں دونوں سَوتوں کا سامنا ہوتا تو بڑی اَولا کر رہ جاتی۔ اب وہ ہر وقت اپنی کوٹھریا میں دُبکی رہتی تھی یا پھر اُنگلیوں پر جمع تفریق کرتی رہتی۔ اب تو اُس نے جھمکوا اور چمپا کو بھی گئی کے پاس جانے سے روک دیا تھا۔

گئی، بڑی کے دُکھوں کو سمجھتی تھی، پر کیا کرتی۔ اُس نے بس اپنے روزمرہ میں فرق نہیں آنے دیا۔ آگوان کے منع کرنے پر بھی وہ گھر داری میں جُٹی رہتی۔ ہر بات بڑی سے پوچھتی، لیکن وہ موم نہ ہوئی۔

دن گئی کو چڑھتے جاتے تھے اور چہرے کی رونق، بڑی کی گھٹتی جاتی تھی۔ آگیوان، باتوں کے پھول کھلاتا، اور "بڑی" سُن سُن کر مرجھاتی۔ پانچواں ماہ چڑھا تو گئی بھی کمھلانے لگی۔ کتنے ہی جَنے تھے اُس نے، پر اب کی بار کچھ انوکھاپن سا تھا۔ چھٹا لگتے لگتے اُس کی کوکھ خُوب اُبھر آئی تھی اور اس کے جوڑوں میں درد بھی رہنے لگا۔ اب وہ کھٹولے سے لگی رہتی۔

ساتواں، پورا ہوتے ہی، ایک رات اُسے غضب کا درد اُٹھا اور دن چڑھنے سے پہلے اس کی کوکھ نے بیٹی اُگل دی۔ کوٹھڑی کے باہر بیٹھے ہوئے آگیوان نے اندر سے چھاج کی "دھپ دھپ" آواز سُنی، تو اُس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ آتش فشاں کی طرح

پھٹ پڑا۔

"یہ اتنی جلدی کیسے ـــــ ابھی نواں مہینہ کب لگا ہے؟" وہ پاؤں پٹختا، دھاڑ رہا تھا کہ بڑھی نے فلیتہ چھوڑا:

"نواں مہینہ کہتا ہے، ابھی تو سات بھی پورے نہیں ہوئے۔ ایک ایک دن کا حساب ہے میرے پاس۔ لے آگیوان تیجے، تو نے بیٹے کے لیے اسے گھر میں ڈالا، اور یہ بیٹی لے آئی ـــــ اور وہ بھی تیری نہیں، دوسرے کی۔" اتنا کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور ہٹ گئی۔

گئی کے نصیبوں پر طوفان تُلا دیکھ کر دائی نے کہا:

"لڑکی تو پوری دِکھے۔ ست ماہے بچّے کچھ عجب تو نہیں۔" لیکن اُس کی کون سُنتا۔

"تو نے بیٹے کے لیے اسے گھر میں ڈالا، اور یہ بیٹی لے آئی ـــــ اور وہ بھی تیری نہیں، کسی اور کی۔" بڑی کے یہ الفاظ آگیوان کے سر کو جھنجھنا گئے۔ وہ کوٹھری میں جا گھسا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، ویسی کی ویسی رطوبت میں لت پت، گئی کو گھسیٹ کر باہر لے آیا۔ غلیظ گالیاں بکتے ہوئے گرجا:

"حیا مری ـــــ بے شرم، چڑیل ـــــ پرایا تُخم لے کر میرے ہاں آمری۔ اتنی دغا، یہ فریب؟ کرم کے ساتھ دھرم بھی گیا۔ میں نے اُس سگنوے ٹھگ کے پیٹ کا دوزخ کھول کر اپنی چاندی نہ نکال لی، تو اپنے باپ کا نہیں ـــــ لیکن تو پہلے نکل ـــــ چھنال ـ چل پھوٹ یہاں سے۔"

اُس نے بپھر کر ایک ٹھوکر گئی کے دھنسے ہوئے پیٹ میں ماری اور وہ مَری۔ فریادیں کرتے ہوئے تڑپنے لگی۔ تب بھی آگیوان نہ رُکا۔ اُس نے اُسے بازوؤں میں بھر کر اپنے گھر آنگن سے باہر ایک گڑھے میں لاڈالا۔ پھر پلٹا اور رہاٹ پاؤں مارتی، نومولود کو اس پر پٹخ آیا۔ پاؤں سے زمین اُدھیڑتے ہوئے مُڑا اور دائی کو پھٹکار کر باہر نکلتے ہوئے، سب گھر کے افراد سمیت، دروازے بھیڑ کر پڑ گیا۔

گئی کی مُندھی ہوئی پلکوں میں نیلے اور پیلے رنگوں کے آسمان کی گردش تھی تو اُس کی آنکھوں میں

لی کی پیدائش پر چھاج پیٹا جاتا ہے۔

دھند بھر گئی۔ اُسی دُھند لکے میں اُسے، نہ جانے کیوں کر اپنی کوکھ کی کلونس دمکتی دکھائی دی، اور اُس نے اسے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ دُھند بھر اٹھی اور پلکیں جھپک گئیں۔

جب اُس کی آنکھ کھلی ہے تو کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ ماتھے پر سنکھ کی پھونک کا گمان گزرا، اور جب اس نے کروٹ بدلنا چاہی تو سینے پر کیڑے سے رینگتے ہوئے محسوس کیے۔ اس کی کوکھ ہی نہیں پھٹی تھی، اُس کے وجود کے جوڑ بھی کھُل گئے تھے۔ اب وہ خود کو سُرخ رقیق پانی میں تیرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ جانے کب سینے پر کلبلاتے ہوئے کیڑے نے مُنہ کھولا اور "آوں آں آوں آں" سے ملتے جلتے سُروں میں رونے لگا۔

"کون ہے تو، اور اس آسیب زدہ چوحدے میں کیوں کر آن پڑی ہے ـــــ اور یہ ـــ یہ بچہ کس کا ہے؟" بچے کے رونے کی آواز سُن کر کوئی آ کھڑا ہوا تھا اور تفتیش کر رہا تھا۔

سُرخ دہکتے ہوئے چہرے والا سورج، اپنی ہر طرف بکھرتی کرنوں کے ساتھ سیانے بچوں کو اُس طرف ہانک لایا۔ قصبے کے اُس اُجاڑ کونے پر اس چوحدے کے سامنے، جہاں کُنتی اس ننھی سی جان کے ساتھ نیم بے ہوش پڑی تھی۔

"کون ـــ کون ہے ری تو؟"

"کہاں سے آئی ہے؟"

"کون لایا تجھے؟"

"کیسے آئی؟"

"ہے کوئی آگا پیچھا؟"

"بچہ کس کا ہے؟"

یکے بعد دیگرے اُٹھتے ہوئے سوال، مکھیوں کی طرح اس کے کانوں میں بھنبھنا رہے تھے، بدن میں ذرا سی جُنبش ہوئی، اور پھر خاموشی ـــــ چُپ سی لگ گئی۔ اب ایک بے چین لڑکی نے ہمت کر کے ایک کنکر اس پر اُچھال دیا۔ پاس ہی کھڑے سیانے بر جے کی تین، چار کنکریاں فضا کو چیرتی ہوئی آئیں اور اُسے آلگیں۔ اُس نے پلکیں اٹھا کر چاروں اطراف میں نگاہ کی۔ جائزہ لیا، اور جب اپنی طرف اُٹھے ہوئے کنکر پتھر دیکھے تو ریڑھ کی ہڈی کو ایک جھٹکا دے کر اُٹھ بیٹھی۔ قریب ہی

پڑا ہوا ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور سامنے پٹخ دیا:

"لو ـــــ لو اس سے مارو ـــــ مار ڈالو۔" اُس نے اتنا کہا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نڈھال ہو کر گر گئی۔

اب تو جگت بُوا سے نہیں رہا گیا۔ وہ لڑکوں کی بھیڑ کی بھیڑ کو ہٹاتی ہوئی آئیں، ایسے میں کوئی کٹورا بھر دودھ دلیا لے آیا۔ یُوں ایک دن جیسے تیسے ٹل گیا۔ سب ڈر کے بھاگ کھڑے ہوئے، تب بھی سہمے سہمے سے دو لڑکے وہاں سے نہیں ہٹے۔ ایسے میں کسی کی آنکھوں میں جو قرار دیکھا تو اُن دونوں میں سے بڑے نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مائی ری! ہم بھی بھوکے ہیں۔" جانے کون سا جادو جاگا، کہ کسی نے باہیں پھیلا دیں اور وہ دونوں اُن میں سمٹ گئے۔

چار چھ دن تک تو کوئی نہ کوئی آتا، دیر یا سویر ـــــ اور کچھ نہ کچھ اُس کے پاس کھانے کو دھر جاتا، لیکن جب اُس سے دو جی اور آ جڑے، تو سب رُک گیا۔ پھر وہ دونوں بچے آبادی میں بھیک مانگتے اور کھاتے نظر آئے تو لوگوں کی اُمڈتی ہوئی عنایات سمٹ سی گئیں۔

اب صبح شام، سرجو اور چندو جو بھیک مانگ کر لاتے، اُسی پر گزر بسر تھی۔ نیا نو دن کا دیا دو دن کا۔ اُس چوحدے میں سب نے ایک عورت کو اِدھر اُدھر ہوتے دیکھا۔ وہ آپ ہی آپ سے باتیں کرتی، گالیاں بکتی رہتی، پر اُس چوحدے سے باہر قدم نہ دھرتی تھی۔ اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ سگنوا، اُس مرنے جوگی "نئی" کو ساتھ لیے، بچّوں کو اس انجانے دیس میں چھوڑ کر کہیں اور جا مرا ہے۔ سرجو اور چندو نے بھی ایسا کچھ ہی بتایا تھا۔

اب اُس چوحدے میں چھوٹے بڑے، چار بھوتوں کے سائے تھے۔ کبھی ننھی سی کلکاری اور کبھی بھوک کی سسکار، اُن سایوں کے ساتھ ڈوبتی اُبھرتی رہتی۔ دن گزر رہے تھے اور اب اس چوحدے کی یہ نئی آبادی، لوگوں کے لئے نئی نہیں رہی تھی۔ اوّل اوّل تو کسی کا آگا پیچھا جاننے کی خواہش لوگوں کے دلوں میں بیدار ہوئی تھی، پر جب جگت بُوا اور مقامی عورتوں نے اُسے "پگلی دُکھیاری" کے نام سے پکارا تو سب اُسے پاگل اور دُکھیا جان کر مُنہ موڑ گئے۔ پر بچّوں کی بھیک سے چار پیٹ کہاں بھرتے ہیں۔

"یُوں تو بستی میں کھُسر پھُسر پہلے سے تھی کہ دُکھیا پر نکھار آنے لگا ہے۔" منچلوں میں بات چل نکلتی:

"اپنے وقتوں میں تو خوب جوبن ہو گا، اس پر۔"

"بھئی سُننے کو تو یہاں تک سُنا ہے کہ چوحدّے میں رات کو لوگ آویں جاویں۔ کھاس کر، مٹیار لٹھ

بھَیروں جی کے چورستے پر بھنگ گھوٹ کر پینے والے، اُجڈ، گنوار بھنگی چرسی۔ رات یہیں بتاتے ہیں ___

پر کون سُنتا ہے؟ کسی کو کیا لینا۔ اپنی مصیبتیں تھوڑی ہیں جو ___"

بَم تو اُس وقت پھٹا، جب اس دُکھیا پگلی کا پیٹ پھُولا۔

لوگ باگ، دیکھا دیکھی، "چھی۔ چھی" کرتے بولے:

"ارے اس بستی کے پاپ کا گھڑا بھر گیا ___ اب پھُوٹے گا۔" پھر ایک دھماکہ ہو ہی گیا ___ پگلی

نے بیٹا جنا۔ بستی کے بڑے بوڑھے اتنے عرصہ سے سوچ رہے تھے کہ اس کلموہی، بدبخت کو یہاں سے

نکال باہر کریں، پر کچھ نے تو پگلی سمجھ کر اور کچھ نے اس بدکار کی طرف داری کرتے ہوئے، جان بُوجھ کر چُپ

سادھ لی تھی۔ بستی کا ہر فرد من ہی من میں اپنے آپ کو اُس پگلی کے گناہ میں شریک سمجھتا تھا یہی بات

اس پگلی کو وہاں بنائے رکھے تھی۔

ایک دن گھپ اندھیرے میں گُنّی کے کانوں میں بھَیروں جی کے پروہت کی بُدبُداہٹ سنائی

دی ___ "اگر تجھے یہاں رہنا ہے نا، تو ___ پاگل، باؤلی بن کر رہ ___ ورنہ آبادی میں تیرا گزر نہیں۔

میں خود ڈر لگا، دسہرہ کے دنوں میں پاگل کا سوانگ رچاؤں ___ تبھی ٹِکا ہوا ہوں یہاں ___"

اسی پروہت کا سہارا تھا اُسے۔ بچّوں کی خیر خبر لیے رکھتا تھا۔ جب تب۔

گُنّی کو زندگانی کے بوجھ اور سانس کی چلتی تلوار نے اس قدر مار رکھا تھا کہ کیسے گزرتی ہے اور

کیوں کر گزرتی ہے، کی سوچ ہی نہیں آئی۔ زچگی کے وقت کوکھ میں لگی، آگیوان کی ٹھوکر اور پھر نکلتے آنسوان

کی آگ اسے اس قدر مار گئی، جھُلسا گئی کہ اُس سے کچھ سوچے سمجھے نہ بنتا تھا۔

انہی دنوں، جانے کیسے اُس کا پہلا شوہر یکایک اُس سے آن ملا:

"گُنّی ___ تیرا یہ حشر دیکھ کر آنکھیں جلتی ہیں۔ تجھے سگنوا کے حوالے کیا ___ میں نے گناہ

لے ایک دیوتا کا نام

سہیڑا۔" اُس نے کہا تھا۔

دن چڑھا تو وہ دائیں بائیں ہو گیا، اور اگلی رات پھر آیا۔

"تیری کوکھ میں انگارے بھر کر، میں بھی کب سُکھی رہا ـــــ آج بھی تیرے جَنے ہُووں کو پَروں تلے لیے بیٹھا ہوں۔ دُوسری کلائی میں چُوڑی نہیں ڈالی ـــ"

گنگی کو چُپ دیکھ کر بولا: "کچھ تو بول ـــ جانے دے، جو ہُو، سو ہوا ـــ"

"وہ، دونوں ہیں؟"

"نصیبوں کی بات ہے ـــ چھوٹے کو تپ چڑھا ـــ بچا نہیں" اتنا کہہ کر اس نے اپنی آنکھوں کے کونوں کو مَل کر پلکیں جھکا لیں۔ گنگی نے گہری، ڈوبتی ہوئی سانس لی، تو بولا:

"جو ہُوا، ہری نام کو مان، اور میرے ساتھ چل۔ ہم ایک بار پھر گرہستی کا سامان کریں گے۔"

"سچ؟" گنگی کے مُنہ سے جانے کیسے پُھوٹ پڑا۔

"سچ کہتا ہوں ـــ قسم لے لے ـــ بیاہ تو میں نے ہی رچایا تھا تُجھ سے ـــ اصل دین دھرم کا دھنی تو میں ہی ہوں نا تیرا ـــ وہ سب تو یار دغا باز۔"

"بر جو تین بچے پڑے ہیں، ان میں تیرا ایک نہیں ـــ بڑا برجُو اور تھا، اُسے سگنوا نے جانے کدھر کیا ـــ" گنگی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تیرا میرا، اب چھوڑ ـــ تیرے، سو میرے ـــ برجُو کو بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ اپنا بیٹا، اب بانس چھُونے لگا ہے ـــ تجھے بہت پوچھتا ہے کبھی کبھار ـــ اور دل چھوٹا کر تلے ہے اب۔ تو چل میرے ساتھ ـــ وہ کتنا خوش ہو گا۔" اس نے آنکھیں چمکا کر کہا تھا، اور اندھیرا پڑتے ہی پسر گیا تھا۔ گنگی، اس میں کچھ ڈھونڈ نکالنے کے لیے اپنی آنکھیں کھوئے ہوئے تھی۔

تیلی رگڑ کر اس نے بیڑی کو آگ دکھائی، اور سلگتی ہوئی دیا سلائی کو گنگی کے چہرے کے قریب لا کر بجھا دیا۔ پھر ایک گہرا کش لے کر اُس نے دُھواں گنگی کے مُنہ پر چھوڑ دیا۔

"ـــ تو، کل سویرے، ہم سب لوگ لاری پر بیٹھے ہوں گے ـــ بول، ٹھیک ہے نا؟" یہ کہتے گنگی کو اس نے اپنی طرف پھیر لیا۔ وہ کچھ کھنچی بھی، لیکن اپنے گھر بار کی چاہ نے اُسے ڈھیلا کر دیا۔

"بیاہ اور دین دھرم کے ناتے یوں نہیں ٹوٹا کرتے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے گنگی کو اپنی اور کھینچ لیا،

ناتہ جوڑنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا، اور وہ اُسے نہ روک سکی۔

(۶)

وہ کب روک سکی تھی، کسی کو۔ سویرے پَو پھٹی۔ گہری جیسے رنگوں کی کمند ہو، پر سورج دکھائی نہیں دیا۔

اُس نے آج سرجو اور چندو کو بھیک مانگنے نہیں جانے دیا تھا۔ وہ دن چڑھے تک آنے والے کی راہ تکتی رہی تھی۔ پر جانے والے کب آئے۔ آیا کچھ اور ہی۔ دن پر دن بیتتے چلے گئے، اور جب اس کی خبر ملی تو کُٹی نے اپنا ماتھا پیٹ لیا، بال نوچ ڈالے، چہرہ پیٹ ڈالا۔ سرجو اور چندو کو مار بھگایا، اور آگوان کی دی ہوئی آگ کو وہیں کھٹنے میں ڈال کر ساری آبادی میں بکتی جھکتی پھرا کی۔ لوگوں نے ہمدردی جتائی، ڈھایا، کھلایا، پر کچھ ہی دنوں بعد اُس کی کوکھ کو پھولتے دیکھ کر دھتکارا، پھٹکارا، لیکن پگلی جان کر کچھ دیا بھی۔

اب اُس کا بسیرا، پھر اُسی چبوترے میں تھا۔

(۷)

قصبے کی کچّی راہوں پر سُرخ تکون کی سفید موٹر کار دوڑ رہی تھی۔ دُھول اُڑاتی ہوئی۔ گھر گھر چرچے تھے ــــ بچّے دوڑ رہے اچھے۔ چوک میں پنچائت گھر کے سامنے، شامیانہ تنا ہوا تھا۔ مرد عورتیں ذرا سہمے سہمے ہوئے اُدھر کا رُخ کرتے تھے۔ دھمکا اور بہلا پھسلا کر پیادہ کارندے انہیں اُس طرف ہانک لے آتے تھے۔ وہ سہمے سہمے سے اُس شامیانے میں جاتے اور نیا کمبل اور پیلا کاغذ لیے مرے مرے باہر نکلتے۔

"تو بھی لے گی کمبل اور نوٹ؟"

پھاٹک پر کھڑے سفید براق لباس والے نے پوچھا تھا۔ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی اور اس کی بغل سے چپٹا، سرخ لوتھڑا سا بچّہ، اس کی چھاتی چُسر رہا تھا۔ اس کے پیچھے، ایک کے بعد تین چندو اور ننھی ــــ ٹھنڈ سے ٹھٹھرتے، ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ، سامنے کمبلوں کے ڈھیر د

جا رہے تھے۔ وہ سب کو وہیں چھوڑ کر، پھاٹک میں سے ہوتی اندر جا گھسی ٹیبل پر رجسٹر پھیلائے آدمی کے سامنے جا کھڑی ہوئی ـــ چُپ چاپ۔

"نام؟"

"کچھ نہیں جی"

"کچھ تو ہوگا"

"تو ـــ کُئی"

"کُئی؟" پوچھنے والے کو عجیب سا لگا۔

"مرد کا نام؟"

"کون مرد؟"

"تیرے والا"

"کون سے والا جی؟ پہلا ـــ دوجا ـــ تیجا ـــ؟؟؟"

"کیا بکتی ہے۔ اپنے بچوں کے باپ کا نام بتا"

"کون سے والے کا؟ ریکھو، برجو، سرجو، جندو، ننکی، چُھٹکا ـــ کس کے باپ کا؟"

"رہنے دے۔ پہلا بچہ کب ہوا؟"

"جب میں بہت چھوٹی تھی"

"چھوڑ ـــ اپنا کیا نام بتایا تھا؟"

"کئی، کُئی جی ـــ جیسے کنواں، ویسے کُئی۔ چُھٹپنے میں میرا مُنہ بہت چھوٹا تھا۔ تب کھاتی بہت تھی۔ کہتے ہیں، "مُنہ سوئی، پیٹ کُئی"، تو ماں باپ نے کُئی نام رکھ دیا ـــ آگے بھی تو کُئی کا بکھ ملا، مجھ کو ـــ"

"وہ کیسے؟" اب اُسے پگلی کی باتوں میں مزہ آنے لگا تھا۔

"ہاں، کُئی ـــ والی وارث نہیں ـــ لاوارث، بے سہارا ـــ جس کا جی چاہے جی مُنڈیر سے رسّی کھول، چرخی ہلا کر ڈول ڈالے ـــ بھرے اس میں سے ـــ پر مجھ قسمت کی ہیٹی کو تو بھرے۔ ایک کے بعد ایک، اور میں گزرتی گئی جی ـــ"

یہ سب کہتے سنتے، اُس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی، اور وہ بغیر کچھ لیے، تیزی سے مڑ چلی تھی، پھاٹک کی طرف، پَر اس رجسٹر والے کا اشارہ پاکر دوکاندار اُسے پکڑ کر شامیانے کی طرف لے آئے۔ وہ "نہیں نہیں" کہتی رہی تھی۔

اُسے سُرخ ٹکون والے شامیانے کے قریب منڈلاتا دیکھ کر ہی لوگ بات لے اُڑے تھے۔ پھر جب وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں پر لڑکھڑاتی ہوئی، بغل میں کمبل دابے، پھاٹک سے نکلی تھی تو اُودھم مچاتے ہوئے بچوں نے اُسے آگھیرا تھا، اور اس کے پیچھے ہو لیے تھے۔

پھر جب کسی سیانے نے یہ جملہ کسا کہ "سب کو لُبھاتے بے شوہر کی ماں"، تو لڑکوں نے اسے اپنا نعرہ ہی بنا لیا۔ اب وہ آگے آگے، اپنا پہلو کمبل سے ڈھلنپے ہوئے، چھٹکے کو اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ پیچھے۔ اس کا آنچل تھامے، سرجو، چندو اور ننھی تھے۔ سرجو ننکی کا بازو تھامے ہوئے چل رہا تھا۔ اُس کے بعد نعرہ لگاتے ہوئے لڑکوں کا ٹولہ تھا۔

"سب کو لُبھاتے بے شوہر کی ماں"، کا نعرہ سُن کر تو یُوں سمجھو، مردوں اور عورتوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے تھے۔ پیپل والے چوراہے میں تو لڑکے چُہلوں پر اُتر آئے۔ کوئی اُس کا کمبل کھینچ رہا تھا، تو کوئی اس پر کنکر اُچھالتا تھا۔ ایک کنکری، ننکی کو جا لگی تو وہ بلبلا اٹھی۔ اس پر وہ پلٹی اور مارنے کو جھپٹی تو سب بھاگ کھڑے ہوئے، پَر پھر اکٹھے ہو گئے۔ پھر وہی نعرہ اور وہی مار۔ وہ رو پڑی۔

عین اسی لمحے، اس کی نظر اگلی گلی کے سرے پر دُبکے کھڑے، ایک بڑے لڑکے پر ٹھہر گئی۔ وہ آنکھ بچا کر چھُپ گیا۔ نعرے اب بھی بلند ہو رہے تھے۔ کنکروں کی بارش اب بھی ویسی ہی تھی، پَر اُسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اُسے تو بس یہ یقین ہو چلا تھا کہ ہو نہ ہو، سامنے کی گلی کے دوسرے سرے پہ کھڑا لڑکا اس کا اپنا برجُو تھا۔

"برجُو، اتنا بڑا ہو گیا ـــــ"، پر دوسرے ہی لمحے خیال آیا ـــــ اُس کا اپنا برجُو ہوتا تو اس کی یہ دُرگت بنتے دیکھتا بھلا؟، جلدی سے آ، اس کے آگے ڈھال نہ بن جاتا؟؟ اور وہ۔ اسے اپنے سینے میں نہ بھر لیتی؟

یکایک ایک کنکر "کھن" سے اس کے ماتھے پر آ بجا، پھر بھی اس نے توجہ نہ کی ـــــ "پر تھا برجو ـــــ نہ پہچانے مجھے، جائے بھاڑ میں، اپنے باپ کی صورت"۔

راہ میں اٹھتی، دیکھتی وہ سورج ڈوبنے سے پہلے اپنے چو حدے کے سامنے جا پہنچی تھی۔
"جے بھیروں جی کی! یہ تو نے اچھا کیا۔ میری بات مانی، تو کیسے گرم کمبل لے آئی۔" سامنے پیرو بہت کھڑا تھا۔ دائیں بائیں دیکھ کر قریب آگیا اور پھسپھسایا:
"کبھی ہمیں بھی سلائے، اپنے ساتھ اس کمبل میں؟" لیکن اس نے گنئی کی شعلہ بار آنکھوں سے اٹھتی ہوئی لپٹیں دیکھ لی تھیں اور سٹک گیا تھا ایک طرف۔

آج تمام دن کے بھوکے تھے سب کے سب۔ سرجو، دو پتھروں کے درمیان بیچا روٹی کے ٹکڑوں کو اپنے سامنے بکھیر کر بیٹھ گیا تھا۔ اور چندو اور ننکی اس کے قریب جا بیٹھے تھے۔ ننکی، باسی روٹی کے ایک ٹکڑے کو چوسنے میں مگن تھی۔ گنئی، چھٹکے کے منہ میں چھاتی ٹھونس کر، نڈھال سی گر گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سب کے سب گٹھڑیاں بن گئے، نیا کمبل لپیٹ کر پڑ گئے۔ نئی اون کی گرماہٹ نے انہیں بھوکے پیٹ بھی جلد سلا دیا۔

گنئی کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ گھڑی دو گھڑی تو وہ کروٹیں بدلا کی، لیکن اب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"مائی ری ـــــ او مائی" گھپ چپ اندھیارے میں ایک آواز گونجی۔
"مائی ری ـــــ او مائی"، کی تیز آواز کے ساتھ ہی، اس کھنڈر کی دہلیز سے ایک سایہ ابھرا اور پکارا:
"مائی ـــــ اے مائی"، کی آواز نے گنئی کو چھوا، لیکن جلد ہی وہ اپنے وجود کی دکھن میں ڈوب گئی۔ اس نے جب کروٹ لی ہے تو، پھر وہی آواز: "مائی ـــــ اے!"
"کون ہے؟" اب اسے آواز کی سن گن لیتے ہی بنی۔
"میں ـــــ میں برجو ـــــ تو نے نہیں پہچانا مجھے؟ میں کھڑا تھا وہاں ـــــ"
سایہ اب اندر آ کر وجود میں ڈھل چکا تھا۔
"پہچان گئی تھی تجھے ـــــ کیوں آیا ادھر؟" وہ درد میں ڈوبی آواز میں بولی۔
"ہاں ـــــ میں تجھے لینے آیا ہوں ـــــ چل اب، اپنا گھر ہوگا ـــــ دیکھ، میں کتنا کما لیا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ چُپ ہوگیا۔ تب "کھر" کی آواز آئی۔ اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی کی لَو، اندھیرے کو نگل گئی۔ بیڑی سُلگی اور دھواں پھیل گیا۔

"باپو بھاگ گیا نئی کے ساتھ ــــ ماں میں نے کتنے دُکھ جھیلے ــــ پر اب سب ٹھیک کروں گا۔ اب میں بڑا جو ہو گیا ــــ پورا مرد ــــ دیکھ ــــ"

اتنا کہہ کر وہ آنسوں اور اُمیدوں کے ساتھ اس کے پاس کھسک آیا۔

"آ مرد ــــ اُجالے کے دیکھے بھالے مرد ــــ اندھیرے میں تو بھی آ ــــ"

اِن سلگتے ہوئے الفاظ کے ساتھ وہ سیدھی ہو کر پسر گئی۔

سیّد ولی اللہ
ترجمہ: یونس احمر

دوکنارے

روزانہ جب وہ دفتر سے گھر آتا تو ڈِک چیر پر بیٹھ جاتا اور عبدُل اس کے سامنے دو زانو ہوکر پاؤں سے موزے اُتارنے لگتا۔ اس کے روزانہ کے اس معمول سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اس طرح اس کو کوئی روحانی خوشی ملتی ہے البتہ جب وہ جوتا اُتارنے کے لئے پاؤں آگے بڑھاتا تو اس کو محسوس ہوتا جیسے اُس کے پاؤں پتھریلی چٹان جیسے وزنی ہو گئے ہیں۔ اُس نے سوچا تھا کہ دن گذرنے کے ساتھ ساتھ اُس کا یہ ٹھاٹ باٹ آہستہ آہستہ جاتا رہے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔

آج بھی عبدُل نے اُس کے پتھر جیسے وزنی پاؤں سے پہلے جُوتے اُتارے پھر موزے۔ عبدل کام کاج میں بڑا ہی پھرتیلا، چُست، نرم گفتار اور سیدھا سادا تھا۔ اس کو گھر سے انتہائی محبت تھی۔ وہ اپنے مالک کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اب افسرالدین نے چپل پہن لی اور عبدل جوتے اور موزے لے کر تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اندر چلا گیا۔ افسرالدین کو معلوم ہے کہ جوتے رکھنے سے پہلے عبدل اُن میں پالش کرے گا اور موزے کو برآمدے میں الگنی پر سوکھنے کے لئے رکھ دے گا۔ اُس کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں کہ وہ روزانہ موزے تبدیل کر سکے۔

دو سال پہلے کی بات ہے۔ تب افسرالدین کے پاؤں سے جُوتے اُتارنے والا کوئی نہ تھا اور نہ اُس نے سوچا ہی تھا کہ کبھی اُس کی زندگی میں ایسا انقلاب آبھی سکتا ہے۔ دو سال پہلے وہ ایک میس MESS میں رہتا تھا ــــ جہاں نہ ہوا کا گذر تھا نہ روشنی کا۔ اُس کے کمرے کی نم آلود دیواروں میں جو تصویریں چپکی ہوئی تھیں اُن تصویروں کی طرح اُس کے ذہن کے پردے پر اُس وقت کے سارے

نقوش آج بھی تازہ ہیں۔ وہ ان نقوش کو نہ صرف دیکھ سکتا ہے بلکہ ایسا محسوس بھی ہوتا ہے جیسے وہ اُس دیوار کو ہاتھ بڑھا کر چھو بھی سکتا ہے۔ اور پھر اُس کا ٹوٹا پھوٹا تخت، باسی بھات، بغیر نمک کا سالن، سڑی گلی مچھلیاں، گندے گلاس میں پانی — یہ ساری باتیں اُس کی موجودہ خوش گوار زندگی کو اُس کے ذہن سے مٹا نہ سکیں۔ یہ درست ہے کہ آج وہ "میس" کی زندگی سے بہت دُور ہے لیکن یہ دُوری آج بھی اُس کی آنکھوں سے بہت قریب ہے۔ "میس" کے کمرے کی نم آلود دیواریں چپکی ہوئی تصویروں کی طرح اُس کے چہرے کی ایک ایک لکیر اس بات کی شاہد ہے کہ وہ اسی فضا میں علم و دانش کی دیواریں پھلانگ سکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جن ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ اُس نے اَن گنت راتیں گذاری ہیں اور جن کی صحبتوں میں اس نے بہت کچھ حاصل کیا ہے وہ اس کی نئی زندگی کے سفر میں شریک نہیں لیکن ان کے قدموں کی چاپ آج بھی اُس کو سُنائی دے جاتی ہے اور اُس کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان ہی کے ساتھ زندگی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ دراصل اس کا وجود "میس" کا ایک جزو لاینفک بن چکا ہے۔

افسر الدین یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جس زندگی کو وہ خدا حافظ کہہ چکا ہے اُس زندگی سے اس کو کوئی پیار نہیں — اور پیار ہو بھی تو کیوں۔ جو زندگی سراسر دکھ درد اور کراہوں سے عبارت ہو اُس سے پیار کیسے ہو سکتا ہے۔ تاہم گذری ہوئی زندگی سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دو سال کی نئی زندگی کو وہ پورے طور پر قبول نہیں کر سکا ہے۔ اس نئی زندگی کا صرف بیرونی چہرہ اس نے قبول کیا ہے۔ اس کے باطنی خدوخال تک وہ آج تک نہیں پہنچ سکا۔ جب وہ خستہ و ماندہ ہو کر ڈِک چیئر پر بیٹھتا ہے تب درحقیقت اُس کو تھکن محسوس نہیں ہوتی بلکہ موجودہ زندگی کے اشارے ہی اُس کے لئے سب چیزوں پر مقدم ہوتے ہیں۔

تاہم یہ ساری باتیں اُس کو ذرا بھی مضطرب نہیں کرتیں۔ کیوں کہ اُس کو معلوم ہے کہ زندگی کے دھارے کو بدلنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ یہ بات قابلِ فہم ہے کہ موجودہ زندگی کے بارے میں اُس کے جو محسوسات ہیں وہ ذہن میں تازہ ہیں لیکن ایک جو اس کے ذہن کو بار بار جھنجھوڑ جاتی ہے وہ اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس کی زندگی میں جو خوشگوار دن آئے ہیں وہ نہ جانے کیوں خوف اور اندیشوں سے بھرپور ہیں۔ اس کی وجہ نہ اس کی سمجھ میں آتی ہے اور نہ

وہ سمجھنے کی کوشش ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ اس کے دکھ اور افلاس کے دن دُور ہو گئے ہیں اور نئی زندگی کا جو تابناک سورج طلوع ہوا ہے اُس نے اس کی مالی پریشانی ختم کر دی ہے لیکن پھر خوف اور اندیشوں کا سبب کیا ہے؟

افسرالدین کا قد لمبا اور کاٹھ مضبوط ہے۔ وہ اب کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر برآمدے میں آکر قمیص اور بنیان اُتارتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے اُس کی بنیان پسینے سے بھیگ گئی ہے۔

"عبدل" گمبھیر آواز میں وہ نوکر کو آواز دیتا ہے۔ اس آواز میں اس کی نئی زندگی کی علامت شامل ہے۔ آواز سُن کر عبدل دوڑا دوڑا آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تولیہ ہے جسے وہ افسرالدین کے سامنے بڑھا دیتا ہے۔

عبدل کی طرف دیکھے بغیر وہ پوچھ بیٹھتا ہے — "بیگم صاحبہ اُٹھ گئی ہیں یا ......؟"

"جی نہیں!"

یہ سُن کر افسرالدین غسل خانے کی طرف مُڑتا ہے لیکن غسل خانے میں داخل ہونے سے پہلے اس کے دل میں یکایک ایک پرچھائیں سی دوڑ جاتی ہے بالکل اس طرح جیسے پھیلے ہوئے آسمان پر دیکھتے دیکھتے سیاہ بادل کے ٹکڑے دکھائی دے جائیں۔ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی بیوی حسینہ ہی اُس کے خوف اور اندیشوں اور نئی زندگی کے شدید احساس کا سبب ہے۔ دو زندگیوں کے درمیان جو پُل ہے اُس کے بیچوں بیچ ہاتھ بڑھائے اور راستہ روکے حسینہ کھڑی ہوئی ہے۔

ایسی بات اُس کے ذہن میں کبھی نہیں آئی تھی اسی لئے وہ چند لمحوں کے لئے چُپ چاپ کھڑا رہتا ہے۔

افسرالدین کے خُسر ارشد علی اور اُس کے مرحوم والد ارباب علی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے لہٰذا سرکاری ملازمت اُن کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اُن کا خاندان مشرقی بنگال کے جانے پہچانے خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ارشد علی روپے پیسے کی طرف سے بے فکر ضرور تھے مگر زندگی

کے بہت سے معاملوں میں وہ سکھی نہ ہو سکے۔ ان معاملوں میں ان کی ازدواجی زندگی بھی شامل ہے۔ اُن کی بیوی مریم خانم سگی خالہ زاد بہن بھی تھیں۔ بنگال کے اعلیٰ مسلم خاندانوں میں قریبی رشتہ داروں کے ساتھ شادی بیاہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ آپ اس کو قریبی عزیز داری کا نتیجہ سمجھئے یا مریم خانم کی روکھی پھیکی طبیعت کہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کبھی خوشگوار نہ ہو سکے۔ اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد سے تو مریم خانم میکے ہی میں رہنے لگی تھیں۔ ارشد علی ملازمت کی وجہ سے زیادہ تر سفر پر رہتے تھے۔ لیکن جب زندگی کی ساری مصنوعی نیرنگیوں سے جی اُوب گیا اور انھیں اپنی سپاٹ زندگی میں بہار آفرینی کی ذرا بھی اُمید باقی نہ رہی تو وہ اپنی چھ سالہ بچی حسینہ کو اپنے پاس لے آئے۔ بچی کو اپنی بیوی مریم خانم سے حاصل کرنے کے لئے اُنھیں سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

جب وہ حسینہ کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے تو ٹرین کے خالی ڈبے میں ان کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ وہ بہت دیر تک چُپ چاپ اس کی طرف دیکھتے رہے پھر یکایک شدتِ جذبات سے آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"کھڑکی سے ذرا ہٹ کر بیٹھو بیٹی۔ انجن کی راکھ ہوا کے ساتھ آنکھوں میں داخل ہو سکتی ہے۔"

لیکن حسینہ یوں خاموش بیٹھی رہی جیسے اُس نے باپ کی بات سنی ہی نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے ذرا بلند آواز سے پھر کہا۔ "ادھر آؤ۔" مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹی نہ ہی اُس نے جواب دیا۔ البتہ ارشد علی نے محسوس کیا کہ چھ سال کی اس بچی کی آنکھوں میں جذبات کی آندھی پل رہی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک کتاب کھولی اور پڑھنے میں منہمک ہو گئے اور حسینہ کھڑکی پر چہرہ رکھے سو گئی۔

حسینہ اُن کے ساتھ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکی۔ ارشد علی نے سوچا تھا کہ جس طرح پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہوئے درختوں میں بھی پھول پھل آنے لگتے ہیں اسی طرح ان کی زندگی میں بھی کبھی بسنتی ہواؤں کا ایک آدھ جھونکا آجائے گا مگر اُن کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ کیوں کہ چند ہی روز گذرنے کے بعد انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ بچی کی رگوں میں ماں کا خون دوڑ رہا ہے۔ ذرا سی بات پر وہ آگ بگولہ ہو جاتی ہے اور کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اور ایک دن تو ایسا ہوا کہ معمولی سی بات پر حسینہ نے صبح ہی سے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ ارشد علی کو دفتر میں اطلاع بھیجی گئی وہ دوڑتے دوڑے آئے۔ انہوں نے سمجھا شاید بچی کو کچھ ہو گیا ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلوایا۔ بچی کو شہزادے

شہزادی کی کہانیاں سنائیں، بلائیں لیں، پیار کیا مگر کسی طرح بھی اُس کا رونا بند نہ ہوا۔ آدھی رات تک رُک رُک کر وہ روتی رہی۔

دوسرے روز حسینہ کو لے کر ارشد علی ٹرین سے مریم خانم کے پاس روانہ ہو گئے۔ منزل پر پہنچتے ہی انہوں نے مریم کے چہرے پر ایک فاتح کی مسکراہٹ دیکھی۔ انہوں نے مریم سے مخاطب ہو کر کہا "کام کاج بہت ہے حسینہ کو میں زیادہ وقت دے نہ سکا۔"

مریم خانم نے سر پر آنچل رکھتے ہوئے حسینہ سے پوچھا "ارے تُم تو بہت کمزور ہو گئی ہو، کیا تمہارے ابا نے تمہیں کھانے کو کچھ نہیں دیا؟"

ارشد نے بچی کے منھ سے سوال کے جواب کا انتظار کیا۔ انہوں نے سوچا۔۔۔شاید بچی ان کی محبت و شفقت کا اعتراف کرے گی لیکن اسی دوران نہ جانے اس کے ذہن میں کیا خیال آیا کہ وہ ایک دم سے باہر نکل گئی۔ شاید وہ اس سوال کا جواب دینا نہ چاہتی تھی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ارشد علی نے دھیمی آواز میں کہا۔" بالکل ماں جیسا مزاج ملا ہے اس کو۔"

"تو سارا قصور ماں کا ہے۔" یہ کہہ کر مریم خانم نے سر کا آنچل درست کیا۔

"قصور جس کا بھی ہو، مجھے اُمید ہے کہ بڑی ہو کر وہ ایسی نہیں رہے گی۔"

مریم خانم نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس نے صرف اتنا پوچھا۔" آپ کی ٹرین کا وقت کیا ہے؟"

اس سوال کا جواب وہ فوراً نہ دے سکے۔ البتہ یہ سوال سن کر اُن کے چہرے پر ایک پرچھائیں سی دوڑ گئی۔ پھر وہ چونک اُٹھے اور بولے۔۔۔"ساڑھے پانچ بجے۔"

"تو پھر چائے کے لئے کہہ دوں۔"

دونوں کے لئے بلاشبہ یہ خوش آیند خبر تھی کہ ٹرین کے آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

حسینہ کا زیادہ وقت ماں کے پاس ہی گذرا۔ بچپن نے جوانی کی سرحد چھو لی اور حُسن نکھرتا گیا۔ حُسن کے نکھار کے ساتھ اس کی طبیعت کی درشتی نہیں گئی۔ کچھ دنوں کے بعد ارشد پنشن لے کر اپنے گھر واپس آ گئے۔ اس دوران مریم خانم کے اندر بھی ایک تبدیلی نظر آئی۔

شاید اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ساری زندگی جس کش مکش میں گذری ہے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور شاید اسی لئے وہ ارشد علی کے ساتھ از سر نو زندگی گذارنے پر مجبور ہوئی۔ لیکن اس قربت میں بھی بُعد تھا۔ محبت اور اجنبیت میں کش مکش جاری رہی۔ جس طرح اس جھگڑے کی اصل وجہ تلاش کرنے کی انہوں نے کبھی تکلیف گوارا نہیں کی اسی طرح ملن کی ضرورت پر انہوں نے کبھی نہیں سوچا۔ دونوں ایک ہی مکان میں رہ کر ایک دوسرے کے لئے اجنبی کیسے ہو سکتے ہیں ان کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی کہ اُن کی خواب گاہ الگ الگ ہے بلکہ دن کا بیشتر حصہ ارشد علی یا تو اپنے کمرے میں یا برآمدے میں حقہ کھینچتے یا کسی خیال میں مگن گذار دیتے۔ مریم خانم کی دنیا بھی الگ تھی وہ بھی کسی خیال میں سدا غرق رہتی۔

ارشد علی کے دل میں رفتہ رفتہ اپنے خاندانی جاہ و منال کی طرف سے نفرت کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ وہ سوچتے۔ زندگی نے انہیں سکون دیا اور نہ کوئی خوشی دی۔ کاسۂ گدائی یونہی خالی لوٹا دیا گیا۔ اس کی ذمہ داری اُن کی نظر میں اُن کے خاندان پر ہے۔ انہیں اس بات کا پختہ یقین ہو چلا ہے کہ زندگی کی دوڑ میں جس کو کوئی تجربہ کوئی علم و آگہی نہیں وہ تمام عیش و عشرت اور مال و متاع کے باوجود بالکل اکیلا ہے۔

اس دوران خاندان کے اعزہ و اقربا کی طرف سے حسینہ کی شادی کا پیغام آنے لگا لیکن ارشد علی حسینہ کی شادی خاندان سے باہر کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بیٹی کا رشتہ کہیں اور تلاش کرنا شروع کر دیا۔ یکایک ان کی نظر انتخاب افسرالدین پر پڑ گئی۔ ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے افسرالدین کی شخصیت میں ان کو انمول موتی مل گیا ہو۔ لڑکا دیکھنے سننے میں منفرد تھا۔ ملازمت بھی اچھی خاصی تھی۔ افسرالدین کش مکشِ زندگی کی آگ میں تپ کر کندن ہوا تھا جو ارشد علی کی نظر میں کامیاب زندگی گذارنے کے لئے یہ کافی تھا۔ چنانچہ انہوں نے مزید تاخیر کئے بغیر حسینہ کو افسرالدین کے سپرد کر دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مریم خانم کی مرضی اس شادی میں شامل نہ تھی۔

شادی کے دو دن بعد ارشد علی نے اپنے داماد کو بلایا۔ عطر کی خوشبو سے افسرالدین کے کپڑے مہک رہے تھے۔ وہ ارشد علی کے سامنے رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ ارشد علی نے محسوس کیا کہ جو بات کرنے کے لئے انہوں نے افسرالدین کو بلایا ہے وہ اتنی زیادہ مہ کرسب

کچھ کہنا زیادہ مشکل ہے۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے کہا۔

"حسینہ کے بارے میں ایک بات بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں ـــ میری بیٹی نازونعم میں پلی بڑھی ہے۔ اس کو کبھی محسوس نہیں ہونے دیا گیا کہ وہ محبت و پیار سے خالی ہے۔ یہ بات ہمیشہ تم کو ذہن میں رکھنی ہوگی۔"

داماد کے چلے جانے کے بعد ارشد علی نے سوچنا شروع کیا۔ "میں نے اپنا فرض دیانتداری سے ادا کر دیا ہے۔ اب میں خود کو ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔"

باہر شام کی ہوا جاگ اٹھی ہے۔ افسرالدین کے مرزے عقبی برآمدے میں الگنی پر ہوا سے جھول رہے ہیں۔ غسل کرنے کے بعد اس نے خود کو تازہ دم محسوس کیا اور ڈریک چیئر پر بیٹھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ حسینہ کے ساتھ اظہار محبت کرنے میں اس کو دیر نہیں لگی۔ اس کی محبت میں طوفان جیسا ہیجان تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک حسین دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ لیکن اس احساس کے ساتھ وہ توہمات اور شکوک کا بھی شکار ہو گیا۔

برآمدے میں سایہ پھیلنا شروع ہو گیا ہے اور سامنے کھلے ہوئے میدان میں دھوپ کی شعاعیں چمکنے لگی ہیں۔ افسرالدین نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر عبدل کو آواز دی۔ "بیگم صاحبہ سو کر نہیں اٹھیں اب تک؟" جب عبدل کی طرف سے جواب نہ ملا تو اس کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ حسینہ ہنوز نیند سے نہیں جاگی ہے۔ اب اس کا اضطراب بڑھنے لگا تھا۔ اسی اضطرابی کیفیت میں اس نے سگریٹ کے کئی کش لے ڈالے۔ چند لمحے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور برآمدے سے ہوتا ہوا کمرے میں آہستہ سے داخل ہوا۔ اس نے سوچا شاید اس کے قدموں کی آواز سے حسینہ نیند سے جاگ جائے گی۔ پلنگ کے نزدیک پہنچ کر وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ حسینہ کے سیاہ لمبے بال تکیہ کے نیچے پھیلے ہوئے ہیں۔ گہرے خواب کے نشے میں اس نے حسینہ کے چہرے میں کشش سی محسوس کی۔ جب کچھ وقت گذر گیا تو اس نے آواز دی ـــ "کب تک سوئی رہو گی۔ اب تو شام ہونے والی ہے چائے نہیں پیو گی؟"

پہلے تو افسرالدین کو حسینہ کے جاگ جانے کا کوئی تاثر نہیں ملا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس کی

آنکھوں میں جیسے خواب کا افسوں ٹوٹا اور پھر کروٹ لے کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ افسرالدین نے سوچا شاید حسینہ ایک بار اس کی طرف دیکھے گی لیکن اُس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اُس نے حسینہ کی اَدھ کھلی آنکھوں میں اضطراب کی جھلک دیکھی۔ اُس نے غصے میں کہا۔" دن رات سونا اور سونا" اور یہ کہتے کہتے وہ باہر جانے لگا لیکن برآمدے میں رک کر ذرا اونچی آواز میں اس نے کہا۔

"چائے بناؤ"۔

عبدل نے مالک کی آواز سنی اور چائے تیار کرنے کے لئے باورچی خانے کی طرف بھاگا چائے پیتے پیتے افسرالدین نے کن انکھیوں سے حسینہ کی طرف دیکھا لیکن یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ اس کی نظریں اخبار سے ہٹی ہوئی ہیں۔ چائے پی چکنے کے بعد وہ پھر کمرے میں آیا، جوتے پہنے اور حسینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔" کلب جاؤ گی؟"

حسینہ نے جواب دیا۔" نہیں۔ جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا ہے!"

"دیر تک سونے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہوگا۔" افسرالدین نے کہا۔

حسینہ خاموش رہی۔ افسرالدین کو جواب کی توقع بھی نہیں تھی۔ آج وہ اکیلا ہی کلب روانہ ہوگیا۔ کلب شہر سے دور تھا۔" یہاں تاش کی بازی خوب جمتی ہے۔" آج افسرالدین زیادہ تر خاموش رہا اس لئے اس کے تینوں ساتھیوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ باہر سیاہ بادل اُمنڈتے آرہے تھے۔ اس نے سوچا تاش کی بازی آج خوب جمے گی۔ اس کے علاوہ مہینے کا یہ پہلا ہفتہ تھا، جیب میں پیسے بھی کافی تھے۔ افسرالدین کو آج جیسے تاش کا نشہ چڑھ گیا تھا۔ کبھی سوچتا جلدی اُٹھ جانا چاہیئے" پھر فیصلہ بدل دیتا۔ اور جب موسلا دھار بارش شروع ہوئی تو پھر گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا ــــ

کافی رات گذرنے کے بعد جب اندھیرے میں وہ ٹارچ لائٹ کی مدد سے باہر نکلا تو اس کے دل میں ایک سوال جاگا۔ کیا اتنی رات تک کھیل کے نشہ نے اس کو گھر جانے سے روکے رکھا۔ لیکن اس سوال کا جواب اس کو نہ ملا۔ جب تک کلب میں تاش کھیلتا رہا، دو بار چائے اور کٹلیٹ سے اس نے اپنی بھوک مٹائی تھی۔ اسی لئے جب وہ گھر پہنچا تو سیدھے کمرے میں آکر بستر پر دراز ہوگیا۔ گھر کے ایک کونے میں لالٹین کی مدھم روشنی سے عبدل کا چہرہ نظر آیا لیکن افسرالدین نے اُس سے کچھ

نہیں کہا۔ اُس نے اس مدھم روشنی میں حسینہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی اچھی طرح نظر نہ آیا۔ البتہ آج اُس کے سر کے بال تکیہ کے نیچے جھول نہیں رہے تھے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے حسینہ جاگ رہی ہو۔ اُس نے سوچا کیا وہ اب تک میرے لئے جاگ رہی ہے! نہیں ایسا نہیں ہوسکتا! ابھی اس کے ذہن میں مختلف خیالات آ رہے تھے کہ یکایک حسینہ کی آواز سُنائی دی۔ اس کے منھ سے جو الفاظ سنائی دئے وہ پتھر سے بھی زیادہ وزنی تھے۔ اُس نے کہا تھا۔

"آپ کو میرے سونے رہنے پر اعتراض ہے جو مجھے بالکل پسند نہیں۔"

افسرالدین نے فوراً اس کا جواب نہیں دیا۔ پہلے تو اس نے اپنے من کی خاموشی میں اُمیدوں کو شیشے کی طرح ٹوٹتے ہوئے سنا اور پھر جب شیشے کا ایک ٹکڑا اُس کے جسم میں گھستا ہوا محسوس ہوا تو وہ چونک اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

"میں ایسا کیوں کہتا ہوں جانتی ہو؟"

حسینہ نے جواب نہیں دیا۔ اُس کو معلوم تھا کہ حسینہ اس کے سوال کا جواب نہیں دے گی پھر بھی وہ جواب کا انتظار کرتا رہا۔ اُس نے سوچا آج وہ یہ جان کر رہے گا کہ آخر قربت کے باوجود یہ فاصلہ کیوں۔ آخر کب تک ہم اجنبی بنے رہیں گے!

اسی اثنا میں اُس کے کانوں میں آواز آئی۔ یہ آواز حسینہ کی چوڑیوں کی تھی۔ اُس کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی افسرالدین کو گمان ہوا کہ حسینہ داہنی بائیں کروٹ لے کر نیند کو بلانے کی کوشش کر رہی ہے اور چند لمحوں کے بعد ہی اُسے نیند آجائے گی۔ اس کی اس حرکت پر اُس کے دل میں غصّے کی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں لیکن یہ چنگاریاں حسینہ کی نیند میں حارج نہیں ہوئیں۔

افسرالدین اکثر یہ سوچتا کہ ایسی لڑکی سے شادی کرنا جس کے بارے میں پہلے سے کچھ معلوم نہ ہو محبت کو پروان نہیں چڑھا سکتا۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے۔ آج اس کا یہ خیال یقین میں بدل چکا تھا۔ اب اس کی یہ اُمید کہ شاید ایک دن حسینہ کے دل میں محبت کا چراغ کو دے گا موہوم ثابت ہونے لگی۔

شادی کے بعد افسرالدین نے بہت کچھ سوچا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ سب اُس کی خام خیالی ہے۔ اُس کو معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی نہ ناٹک ہے اور نہ ناول۔ اور اس زندگی کو محض خواب د

خیال کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ آپٹڈیل ازدواجی محبت کی اہمیت کم نہیں۔ یہاں نمائش اور نام ونمود کو دخل نہیں کیونکہ ظاہری نمائش ازدواجی محبت کو پنپنے نہیں دیتی۔ لیکن ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں نہ تو رنگ روپ کی گھٹا ہی برسی اور نہ محبت کا الاؤ ہی محسوس ہوا۔ یہاں تو محبت کا وہ بیج ہی نہیں پھوٹا جسے دیکھ کر یہ یقین کیا جاسکتا کہ اس میں کبھی پھل پھول بھی آئیں گے اور یہ ایک تناور درخت بن جائے گا۔

ان ساری باتوں سے افسرالدین کے دل میں مایوسیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن جو بات اس کو سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ آخر حسینہ کے دل میں اس کے لئے محبت کی ایک آدھ کرن کیوں نہیں پھوٹتی؟ اس سوال کا جواب اُسے کبھی نہیں ملا۔ البتہ اُس کے دل میں ہمیشہ یہ اندیشہ جاگتا رہا کہ حسینہ کے ساتھ شادی کے معاملہ میں ارشد علی کے علاوہ اور کسی کو یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ اس نے کبھی اس بارے میں حسینہ کا مدعا معلوم کرنا نہیں چاہا۔ لیکن حسینہ کا یقیناً اپنا کوئی خیال ضرور ہوگا۔ افسرالدین کو اس کا علم تھا کہ اس کی شادی کے مخالفین میں سب سے آگے مریم خانم تھیں۔

افسرالدین کو اِدھر اُدھر سے اتنا پتہ چل گیا تھا کہ ارشد علی کے مخالفین نے شادی کی مخالفت کیوں کی تھی۔ شادی کی مخالفت کی وجہ افسرالدین کی غربت اور افلاس زدہ زندگی تھی۔ لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ زندگی میں اس نے بڑی جد وجہد کی ہے اور اس جد وجہد کا نتیجہ تھا کہ اس کی زندگی میں افلاس کی جگہ آسودگی آگئی تھی۔

تو کیا اس کی پچھلی زندگی ہی حسینہ کی نفرت کا باعث بنی؟

اس کے علاوہ افسرالدین کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ارشد علی اور مریم خانم کی ازدواجی زندگی میں ہمیشہ ایک خلا سا رہا۔ اس خلا کی وجہ اس نے جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ لیکن کبھی کبھی اس کو یہ گمان ہوتا کہ جس تنازعہ سے ان کی زندگی میں ناآسودگی پیدا ہوئی شاید اس کا سایہ ان کی ازدواجی پر بھی پڑ رہا ہے۔ کیا حسینہ اس تنازعہ کی راہ پر چل رہی ہے؟

ممکن ہے یہ سب افسرالدین کا صرف واہمہ ہو۔ شاید حسینہ کی کمزوری کا سبب اُس سے جواب سے مل جائے۔ اس کی ذہنی تربیت کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ کسی سے اُس کو محبت نہیں ہوسکتی۔ جس

خاندان میں وہ پلی بڑھی ہے وہاں کسی کو کسی سے محبت کرنے کی تربیت ہی نہیں ملی۔ شاید حسینہ نے اپنی ازدواجی زندگی کو دیگر سماجی رسوم کی طرح محسوس کیا تھا۔ اُس کو اس زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم جو محبت و خلوص اور اُمید و آرزو سے عبارت ہے۔ حسینہ اکثر سوچتی کیا محبت کرنا فرضِ منصبی ہے؟ اور کیا ازدواجی زندگی ڈر اور خوف کے بغیر ممکن نہیں ---؟ افسرالدین اس موضوع سے کیسے بے فکر ہو جائے کہ اس کے دل میں عشق و محبت کی جو بھوک دہک رہی ہے وہ بھوک کوئی معمولی نہیں۔ ممکن ہے ایسے لوگوں کی اکثریت ہو جن کے دلوں میں اس بھوک کا وجود ہی نہیں اور جنہوں نے اپنی ازدواجی زندگی میں عشق و محبت کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو۔ ایسے لوگ عام طرح کی زندگی گذارتے ہیں جن کو صرف دولت کمانے کا جنون ہوتا ہے۔

افسرالدین چت لیٹا لیٹا پریشان سا ہو گیا لیکن اُس نے کروٹ نہیں لی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے جنبش کی تو ہو سکتا ہے حسینہ کو اس کے خیالات و جذبات کی گونج سنائی دے جائے۔ انتہائی خاموشی اور سکوت میں رات کا کارواں گذر رہا تھا۔ لیکن اس کو یہ بھی محسوس ہونے لگتا کہ رات کے خاموش لمحات اس کے سامنے خار پشت کی طرح منھ پھاڑ ہوئے ہیں۔ یکایک کھلے ہوئے دریچے سے تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا جس نے مچھر دانی میں جنبش پیدا کر دی اور اس کے بے چین دل کو بھی قرار سا آیا۔

اسی اثنا میں افسرالدین نے رُخ پھیر کر حسینہ کی طرف دیکھا۔ اس کے سر کے بال اب تک بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن کمر پر رکھے ہوئے ایک ہاتھ میں ذرا بھی جنبش نظر نہ آئی۔ اس نے سوچا جس بات کے کہنے کے لئے وہ اتنی دیر سے حسینہ کے جاگ اُٹھنے کا انتظار کر رہا ہے شاید اب وہ بات نہ نہیں سکے گا۔ اس احساس سے اُس کو دُکھ نہیں ہوا۔ کیوں کہ اُس کو معلوم ہے کہ وہ ساری باتیں کہہ نہیں سکے گا۔ اگر اس نے کہنے کی جرأت بھی کی تو اس کو اپنا سینہ چیر کر دکھانا ہو گا۔ اور یہ کام کسی کے لئے ممکن نہیں۔ جو عورت قریب ہو کر بھی اتنی دور ہو، اس سے اپنے من کی کیفیت کیسے بیان کی جا سکتا ہے۔

یکایک افسرالدین کا ایک ہاتھ ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح ایک اور ہاتھ کو چھو گیا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نئی چمک نظر آئی جس میں استہزا کا عنصر نہیں تھا۔ جس تاریکی

سے سیاہ رات جنم لیتی ہے اور جہاں اس کی نہ رکنے والی طغیانی تخلیق پاتی ہے وہاں اس سے پیدا ہونے والی بھوک کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ حسینہ کی آنکھوں میں درگزر کرنے کی علامت موجود ہے۔ انسان اس کے بغیر بچ بھی نہیں سکتا۔ حسینہ کے بالوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو اس کے احساسات میں ہل چل پیدا کرنے لگی۔ اس کے سیاہ بال تیز ہواؤں سے بکھر کر چہرے کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس کا چہرہ کتنا نازک اور گداز ہے۔ حسینہ کو یہ معلوم ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر کامیابی حاصل کرتا ہے در اصل یہی راستہ اس کے لئے زندہ رہنے کا ہے۔ انسان صرف زندہ رہنے کا خواہشمند ہے وہ تنہا یا کسی ساتھی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حسینہ کا خوبصورت چہرہ یکایک تارے کی طرح دمکنے لگا اور افسرالدین اُدھر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے بعد گہری تاریکی کی کوکھ سے ایک آواز پیدا ہوئی۔ اول اول افسرالدین چونک پڑا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں ہوا مطلق نہیں۔ البتہ اس کے کانوں میں دُور سے کسی پرندے کی آواز سنائی دی۔ اُس کو محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھوں سے نیند کوسوں میل دور ہے اور اس کا دل بھاری پتھر کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔

دوسرے دن جب افسرالدین خواب سے بیدار ہوا تو اس نے دریچے سے آسمان کو دیکھا جہاں بادل کے ٹکڑے جمع ہو رہے تھے۔ حسینہ بھی آج جلد خواب سے بیدار ہو گئی تھی۔ لیکن افسرالدین کو اُس کے جلد بیدار ہو جانے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد حسینہ نے بالوں کو ایک جھٹکا دیا اور پھر خواب گاہ میں چلی گئی۔ افسرالدین نے اُس کے قدموں کی آواز سنی لیکن اُس کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس کی خواب گاہ میں پرانے دنوں کی ڈریسنگ ٹیبل تھی جس کے سامنے وہ بیٹھ گئی اور بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ افسرالدین بھی کمرے سے برآمدے میں آگیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عبدل فوراً چائے بنا کر لے آیا اور اُس کے سامنے رکھی ہوئی بید کی بنی ہوئی میز پہ چائے کی پیالی رکھ گیا۔ افسرالدین ایک گھونٹ چائے پیتے ہوئے بولا۔ "آج دوپہر دورے پہ جانا ہے۔" اگرچہ دورے پر دو ہفتے بعد جانے کا پروگرام تھا لیکن اُس نے یکایک طے کر لیا کہ آج ہی جانا ہے۔ اس نے پھر عبدل سے کہا "مُنیر کی ماں سے کہہ دینا کہ وہ رات نہیں آ کر سو جایا

کمرے۔ جب بھی افسرالدین کہیں دورے پر جاتا ہے تو منیر کی ماں خواب گاہ سے ملحق ایک چھوٹے کمرے میں رات گذار جاتی ہے۔

دیر خاصی ہو گئی تھی۔ افسرالدین نے دھیمی آواز میں حسینہ سے کہا۔ "آج دورے پر جا رہا ہوں عبدل منیر کی ماں کو یہاں رات گذارنے کے لئے اطلاع کر دے گا۔"

حسینہ نے یہ پوچھنا بھی مناسب نہ سمجھا کہ وہ کتنے روز کے لئے دورے پر جا رہا ہے۔ افسرالدین نے خود ہی کہا۔ "پرسوں واپس آجاؤں گا۔"

ڈاکیہ نے تین خط دیئے۔ دو خط حسینہ کے نام تھے اور ایک افسرالدین کے نام۔ حسینہ کے نام جو دو خط تھے اُس نے اُس کے آگے بڑھا دیئے اور خود اپنا خط کھولنے لگا۔ لیکن پڑھنے سے پہلے اُس نے تحریر پر نظر ڈالی۔ وہ سوچنے لگا۔ ازدواجی زندگی کا مذاق تو ختم ہونے کو آیا لیکن اس کہانی کا اختتام کہاں ہوگا۔۔؟

اس سوال کا جواب اس کو نہیں ملا۔ البتہ اس کو اس بات پر یقین ہے کہ وہ دوبارہ اپنی زندگی کو خزاں سے ہمکنار نہیں کرے گا۔ اس جہنم میں داخل ہونے کے لئے اس نے محنت و مشقت کر کے آسودگی حاصل نہیں کی ہے۔ اس کو یہ سوچ کر سکون سا محسوس ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "میں ارشد علی نہیں ہوں!"

اب اس نے خط کو پڑھنا شروع کیا۔ خط اس کی ماں نے لکھا تھا۔ اس میں خوشی کی کوئی بات نہ تھی بس اس میں یہی تحریر تھا کہ ماں کی صحت گر رہی ہے۔ پیسوں کی تنگی ہے۔ دن بڑی مشکل سے گذر رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

خط پڑھ چکنے کے بعد وہ میز پر رکھنا چاہتا تھا لیکن جی میں کیا آیا کہ اس نے جیب میں ڈال دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حسینہ کی نظروں سے یہ خط گذرے۔ آج حسینہ اُس کے لئے پرائی عورت کا رُوپ دھار چکی ہے۔

دو روز کی بجائے تین روز بعد جب افسرالدین گھر میں داخل ہوا تو اُس نے حسینہ کو قہقہہ

لگاتے ہوئے سُنا۔ اُسے حیرت ہوئی۔ برآمدہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ عبدل نے کہا۔ "بی بی صاحب کی امی آئی ہیں۔" حسینہ کا قہقہہ اب بھی سنائی دے رہا تھا۔ اس نے عبدل سے پوچھا۔ "کب آئی ہیں؟" عبدل نے جواب دیا۔ "پچھلی رات۔"

تھوڑی دیر کے بعد داماد اور خوشدامن کے درمیان ملاقات ہوئی۔ مریم خانم نے ساری کا آنچل سر پر رکھا۔ اس کے چہرے پر گمبھیرتا تھی لیکن حسینہ کا چہرہ نرم و گداز اور سرخ نظر آرہا تھا۔ دونوں کے چہروں کے اس فرق نے اس کو پریشان نہیں کیا۔ دو چار باتوں کے بعد ملاقات ختم ہو گئی۔ رات کو کھانا کھاتے وقت ماں بیٹی کے چہرے بےحد سنجیدہ دکھائی دیتے۔ مریم خانم کے سر پر ساری کا آنچل تھا اور حسینہ انتہائی سنجیدہ بنی بیٹھی تھی۔ اس نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد حسینہ نے باریک آواز میں کہا۔ "کل میں دوپہر کی ٹرین سے اماں کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

مریم خانم بولیں۔ "انشاء اللہ۔"

اس رات کو افسرالدین اور حسینہ کے درمیان سوال و جواب کا تبادلہ نہیں ہوا۔ البتہ دوسرے روز صبح کو جب حسینہ پلنگ سے اُتر کر جانے ہی والی تھی کہ افسرالدین نے کہا۔ "ایک بات کرنی چاہتا ہوں۔" حسینہ کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ پہلے تو اس نے جھٹکا دے کر اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو درست کیا پھر وہ چپ چاپ افسرالدین کی باتوں کا انتظار کرنے لگی۔ افسرالدین نے کہنا شروع کیا۔ "میں نہیں جانتا کہ مجھ سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور نہ تم لوگوں نے ہی اس کی نشان دہی کی۔"

حسینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ افسرالدین کو جب کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے پھر کہا۔ "مجھ کو اپنی کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ میں نے اس پر بہتیرا غور کیا مگر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ بہرحال یہ سب دہرانا بیکار ہے۔ لیکن پھر بھی جانے سے پہلے میری باتوں پر غور کر لو۔"

چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد حسینہ نے کہا۔ "اس سے پہلے بھی یہی بات آپ نے کہی تھی۔"

افسرالدین کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی لیکن دھیمی آواز میں اس نے جواب دیا۔ "میری پہلی بات کا تم نے جواب نہیں دیا تھا اس لئے دوبارہ پوچھنا پڑا۔"

حسینہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر بولی ”مجھے نہیں معلوم تمہارے سوال کا جواب کیا دوں؟“
افسرالدین کو خاموش دیکھ کر حسینہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت اسی کمرے میں مریم خانم جائے نماز پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔

دوپہر کے وقت ٹرین میں ہمیشہ بھیڑ ہوتی ہے۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا شور بڑھتا جارہا تھا لیکن فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ افسرالدین کے علاوہ وہاں اور کوئی کھڑا نہیں تھا۔ وہ لوگوں کے چہرے بشرے کا مشاہدہ کرنے میں محو تھا۔ اُسے تیز دھوپ کی شدت کا بھی احساس نہ تھا۔ اُس کے کان سُرخ ہو گئے تھے۔

فرسٹ کلاس ڈبے کی کھڑکی سے لگ کر ماں اور بیٹی بیٹھی ہوئی تھیں۔ حسینہ نے آج لال ساری پہن رکھی تھی اور مریم خانم کا جسم سیاہ برقعہ سے ڈھکا ہوا تھا البتہ چہرہ کھلا ہوا تھا جو دھوپ میں بھی پھیکا نظر آرہا تھا۔ کنکھیوں سے ایک بار افسرالدین نے حسینہ کو دیکھا۔ ماں کے چہرے کی طرح اس کا چہرہ بھی کسی قسم کے فکر سے آزاد تھا۔ اگرچہ ٹرین اب تک روانہ نہیں ہوئی تھی لیکن افسرالدین کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مریم خانم اور حسینہ بہت دور جاچکی ہیں۔ یکایک اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ مریم خانم اور حسینہ آخر جا کہاں رہی ہیں۔ آخر ان کی منزل کہاں ہے اور ان کے دلوں کی اُمیدوں کا خزانہ کہاں چھپا ہوا ہے؟

جب مُسافروں کو دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں تھک گئیں تو یکایک ایک عجیب منظر دیکھ کر وہ بیتاب ہو گیا۔ نہ جانے کیوں مریم خانم کے پہلو میں بیٹھے بیٹھے حسینہ ایک دم سے تڑپ اٹھی اور اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار نظر آنے لگے۔ کیا اس نے اپنا خیال بدل دیا ہے؟ کیا وہ ٹرین سے اُتر جائے گی؟ کیا اس کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ جس شاندار محل میں بند ہے وہ محل اس کے سکون کے لئے سمِ قاتل ہے؟ کیا وہ یہ بھی جان چکی ہے کہ اُس محل میں روشنی کا مینار ہونے کے باوجود دراصل وہاں گھرا اندھیرا ہے؟

افسرالدین کو محسوس ہوا کہ شاید حسینہ ٹرین سے باہر آجائے گی۔ اُس کے پاس سیاہ برقعہ میں ملبوس مریم خانم کی آنکھوں میں خوف کا عنصر بیدار ہو رہا تھا اور دل میں طوفان کی لہریں، لیکن حسینہ اس کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ یقیناً نیچے آجائے گی۔ افسرالدین کے دل میں اضطراب کا طوفان شدید ہوتا گیا۔ اگر حسینہ

واقعی ٹرین سے اتر کر اُس کے پاس آگئی تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ جب وہ یہ دیکھے گا کہ حسینہ کا چہرہ وہ چہرہ نہیں ہے اور آنکھیں وہ آنکھیں نہیں ہیں تب وہ اُس سے کس طرح مخاطب ہوگا؟ اگر وہ آ بھی گئی تو یہاں اب کیا رکھا ہے؟ جو طوفان دل میں جاگا تھا وہ سارے خیالات خشک پتوں کی طرح اڑا کر بہالے گیا ہے اگر وہ آنا ہی چاہتی ہے تو آجائے۔ صرف تین زینے تو طے کرنے ہیں اور پھر پلیٹ فارم۔ یہیں نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔

اب تیسری سیٹی بھی بج گئی۔ افسر الدین کی بیتابی بڑھ گئی۔ اس نے ٹرین کی کھڑکی اوپر کی اور دیکھا، ٹرین اب چلنا شروع ہوگئی تھی۔ یکایک اس کی آنکھوں کے سامنے لال ساڑی لہرا گئی اور پھر ایک چہرہ۔ اس چہرے نے اس کی طرف رُخ کیا اور پھر تلخ اور ہلکا تبسم اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوا۔

پلیٹ فارم جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے ٹرین نے اپنا رُخ بدل دیا اور پھر وہ جلد ہی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ لیکن افسر الدین جہاں کھڑا تھا وہیں پسینہ میں شرابور کھڑا رہا اور اس کی آنکھوں کے سامنے لال اور سیاہ رنگ کی لہریں ناچنے لگیں۔

افسر الدین نے آخر کار ایک چہرہ دیکھا جو اس کے بالکل سامنے تھا لیکن وہ چہرہ نہ تو حسینہ کا تھا اور نہ مریم خانم کا۔ بلکہ وہ چہرہ تھا ارشد علی کا۔ اس کے چہرے پر افسر الدین نے شکست کے گہرے نقوش دیکھے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

احسان اکبر

جے ایلفرڈ پروفروک کا محبّت کا گیت

اس گھڑی آؤ ہم تم چلیں
(ہاتھ پاؤں پسارے ہوئے)
آسمانوں کی میزوں پہ بیمار سی شام
بے ہوش حالت میں جب چت پڑی
ہو۔
چلیں نیم ویران گلیوں کو
اور غیر آسودہ راتوں کی ان شب
پناہوں کو
ہم بڑبڑاتے ہوئے بھی
جنہیں، حد سے حد
رات بھر کے لئے ہی
فقط جھیل پائیں
بہت ہلکے درجے کے فرشی نشستوں
کے ہوٹل۔

جہاں صرف کستورہ مچھلی ہی توفیقِ
مہمانداری ہو

ان راستوں پر
جو مکروہ باطن سے ابھرے ہوئے
ٹیڑھے میڑھے دلائل کے مانند بڑھتے
رہیں

اور پھر آپ کو
بے اماں، بے جہت سے بڑے مسئلے کی
حضوری میں رکھ آئیں۔
مت پوچھیئے "مسئلہ"
آئیں چلتے ہیں، ملنے چلیں

○

خواتین کمرے میں آجا رہی ہیں
فقط ایک اسم ان کی تکرار بہ ہے

(سنجل ... ران .... جلو .... ما...
اڑے اپنا وش) "مائنل سنجلو"
(میری آنکھ میں پیار کو سونگھتی) زرد کُہر
اپنی پُشت بدن کانچ کی کھڑکیوں سے
رگڑتی ہے
اور پیلی رنگت کا مارا دھواں
تھوتھنی کھڑکیوں سے رگڑتے ہوئے
شام کے سارے گوشوں میں
اپنی زباں پھیرتا ہے۔
یہ کُہر آ کر جو نالیوں کے رُکے پانیوں پر
ٹھہر سا گیا ہے
(کہاں جائے گا)
چمنیوں والی کالک نے بس اس کی گردن
دبوچی ہے
پیلا دھواں سر کے بل جو کہ ڈھلوان
چھت سے گرا
نرم اکتوبری شب کی تہ غوش کی تہ میں
ہی کا بس ہو رہا
گھر کے چاروں طرف پھر گیا
سو گیا۔

○

ابھی وقت ہے
(پالتو بلیوں کی طرح) پُشت کو کھڑکیوں
سے رگڑتے ہوئے
کوچہ بازار کے بیچ مُڑتے ہوئے
ایسے بھورے دھوئیں کے لئے
اور بھی وقت ہوں گے
ابھی اور اوقات ممکن ہیں
اس رُوپ کو اوڑھنے کے لئے
اوٹ میں جس کی ہم
روبرو ہونے والوں کا بھی سامنا
کر سکیں
(وقت ہوں گے ابھی توڑنے جوڑنے
کے لئے)
وقت تعدیم کا
وقت تقویم کا
کام کے وقت آئیں گے
کام آزمانے کے وقت آئیں گے
وقت، جو آپ کے نام کے کچھ سوال
آپ کے سامنے کی رکابی میں
رکھتے اٹھاتے رہیں گے
(رکابوں میں ٹہرے سوالوں کی بتّی)

ابھی وقت تو آپ کے اور میرے واسطے
بھی ہے
خود گومگو کی صلیبوں پہ لٹکی ہوئی
سینکڑوں ساعتوں کا بھی ہے
ناشتے اور صبوحی سے بھی قبل آجائیں گے
سینکڑوں وقت
تشہید، تجدید کے
پھر سے تردید کے
خواتین کمرے میں آ جا رہی ہیں
وہی "مائکل اینجلو"

وقت اس سوچ کا بھی تو آئے گا
کیوں اب نہ جرأت کے زینے پہ کوئی
قدم آزماؤں
کہ پل لوٹ آنے، اترنے کا آجائے گا
ف جذبات کیسا لگے گا
(مری کھوپڑی پہ چمکتی ہوئی) چاند کو
دیکھ لیں گے وہ جب
اور کہیں گے کہ
"لو، یہ تو سر سے گیا"
میرا باقاعدہ صبح کا وہ لباس اور ٹھوڑی

تک اٹھی ہوئی کالر
ان میں اک سادہ سے پن سے اڑسی
ہوئی
قیمتی اور قرینے سے باندھی گئی
میری نیکٹائی کی بات ان کی نظر میں
نہ ہوگی
وہ جب کہہ رہے ہوں گے
[illegible] اس شخص کے سر پہ سے بازو
[illegible] گئیں تو دیکھو
[illegible] کی جرأت
کروں؟
جبکہ مجھے [illegible] ہے
اس میں ترمیم بھی
[illegible] تجدید بھی
دوسرے پل میں ہے

مگر میں انہیں ان کے سب سلسلوں
ساتھ پہلے ہی سے جانتا ہوں
سحر شام کے عصر کو
عصر کے وقت کو
آپ اپنی حیات اور اوقات کو

میں نے کانی کے چمچ سے ناپا ہوا ہے
صدا اگیت کی دور کمرے سے جو آ رہی ہے۔
ہیں اس کے تلے
یک قلم ختم ہوتی ہوئی سُن رہا ہوں
جو آواز مرنے کو ہے
فرض اب کیا کریں ؟
کیا کہیں ؟

○

دیکھی بھالی ہیں آنکھیں
مری دیکھی بھالی ہیں آنکھیں
تمہاری جو تجرید اصولوں میں کر کے
اصولوں کو زنجیر کر دیں
سو جب پن کے ساتھ ایک دیوار میں
جڑ دیا جاؤں
آزاد ہونے کو تڑپوں
شب و روز اور اپنے جینے کے اسلوب
کے پن کا چُبھتا ہوا کند سر
جسم و جاں میں سے کیسے اُگل پاؤں گا
ابتداء کیا ہو ؟
کیا فرض کیجئے ؟

○

یہ نسوانی بازو — میں ان سب کو پہلے ہی
سے جانتا ہوں
یہ چوڑی چڑھی آستینیں، یہ بلّور بازو
یہ خالی سی باہیں
(دیے کی مگر روشنی میں روپہلے چمکتے روؤں
بھری باہیں)
آخر بہک کیوں رہا ہوں ؟
مہکتے ہوئے دامنوں کے سبب سے ؟
یہ بازو ہیں جو میز پر سو گئے ہیں
وہ بازو بھی جو شال اوڑھے ہوئے ہیں
(یہ حالات ہیں
ان میں)
اب فرض کیا کیجئے
ابتداء کیا کریں ؟

○

کیا مجھے صرف اتنا سا کہنے کا بھی حق ہے
جو کہہ سکوں
"نارسا کھڑکیوں میں سے باہر کی دلچسپیوں
رونقوں میں
فقط اک نظر کی شراکت ہے جن کا
کمال

ان اُداسی کے مارے ہوئے،
جبرِ تنہائی دیدہ مکینوں کے سب تنگ
کوچوں ہی کو اک سحر کے سمے دیکھ آیا
تھا"؟

جن کی سبھی حسرتوں کا غبار
ان کی چلموں میں
سینوں میں ہے
(ایسا ہوتا مری آدمی والی آنکھیں نہ
ہوتیں)
کسی کیکڑے کا جنم لے کے آتا
کہ جو زسردیوں والے ویران،
اداس اور۔) خاموش سے پانیوں
پر
(عذابوں سے آلودہ سوچوں سے بچ کر)
یہاں سے وہاں تک تھرکتا، سرکتا،
پھیلتا

○

وہ دن کے ڈھلے مطمئن نیند سوئی ہوئی
لمبی مخروط شکل انگلیوں سے سنورتی
ہوئی کوئی ہموار (معمول کی) شام
(اس شام میں)

ان نگاہوں کی پھر خوابگیں حالتیں
یا تھکاوٹ کا اظہار
یا کسلمندی کا کوئی تاثر
(تم ان سے تاثر نہ لوگے؟)
کبھی نیند دیوی کو دیکھا ہے؟
جو آپ کے اور مرے سامنے فرش پر
خواب میں کھو گئی ہے

وہی ہے
اب آئس کریم اور چائے کے سارے
لوازمات

پھر
وقت کے عیش و نعمت سے بھرپور
مصرف کے بعد
ابتدار کیسے ممکن ہے اس کی
کہ لمحے کو نحے کے بحران تک کھینچ کر
لے چلوں

اگرچہ میں تائب ہوا
اور (گناہوں پہ) رویا
ادا بھی کیے فرض روزوں، نمازوں کے
لیکن
پلٹیں (بہت روبرو) ہیں

اور ان میں (سبھی کی نگاہیں ہیں)
خود میرا سر ہے
مگر میں ہیمر نہیں ہوں (سلومی کے وقتوں
کا

جو میرا سر آج اک تھال میں ہو،
عجب صورتِ حال ہے جو نگہ تو کجا
اپنا سر تھال میں ہے)
(بزرگی زدہ سر جو گنجا بھی ہے)
اب جو کہنا تھا
(اتنی پلیٹوں کے ماحول میں شاید)
اتنا اہم بھی نہیں۔
میز پر
(غیر ارادی سہی پھر بھی اک)
غیر محتاط سی میری حرکت پہ پھر
با ادب سرزنش خانِ ساماں کی
الاماں!
اپنی عظمت کے لمحے کو
(کھانے کی اس میز پر
ان گنہ گار آنکھوں سے)
دم توڑتے اس طرح دیکھ آیا
کر المختصر ڈر گیا ہوں

یہ خود آپ کہیئے
بھلا کیسا لگتا
اگر چائے، چٹنی، شراب، درد دونوں کے
ان باہمی انفرادی مراسم
کی نازک سی باتوں کے اس شیشہ خانے
کے اندر
جہاں ٹوٹنے والے برتن سے تھے
تن تازہ ہو کے
میں جب (روح اور جسم کے کرب کی)
بات کرتا
(جو موضوع و آدابِ محفل سے کوئی
تعلق نہ رکھتی
خصوصی کرم اور رعایت یہ ہوتی کہ
سب کا پسندیدہ موضوع چننے کی خاطر)
کوئی مسکرا کر
اسے ٹال دیتا
یہ دنیا تو خود ایک عالم ہے
عالم کا تم کس طرح ایک گولہ بنا لو گے؟
تاکہ لڑھکنے میں بھی اس تمہارے بڑے
عالمی مسئلہ کی ڈھلانوں سے
اترے

اب ایسے میں (اس دوست لڑکی سے)
کہنا
کہ میں ہوں لزارس
وہی داستانوں کا بوڑھا بھکاری
جو عیسیٰ کے "قُم" تک فنا کے مراحل میں تھا
موت کے بعد کی زندگی جو ہے جیسی نہیں ہے؟
میں اس کا وحیدِ زماں رازداں ہوں)
سو مجھ کو سنانی ہیں (کچھ تلخ سچائیاں)
اس پہ نرمی سے تکیہ پہ سر ٹیک کر جو وہ
کہہ دے
"یہ، خیر اپنا مطلب نہ تھا
میں تو قطعاً یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی"

○

کہ پھر شام کے اس سہانے سمے
جب گلی صحن میں آبی چھڑکاؤ کے بعد
چائے کی چسکی، کتابوں کی چسکے بھری
بحث سے ہمزباں ہو
گھٹتے عزاروں کے سب ریشمی مرحلے
سامنے ہوں
کوئی کس طرح کہہ سکے
کچھ جو کہنا ہے
فانوس جادو کے مانند کس طرح سے
نقش ڈھالے
کہ نقشہ رگوں تک کا پردے پہ آجائے۔
کہنے کی گنجائش کیا رہی؟
شال کو پھینک کر جسم کو جب وہ آزاد
کرتی ہو
کھڑکی (بڑھانے) کو جاتے ہوئے
میری تقریر کے اس محل پر یہی کہہ دے
"میرا یہ مطلب نہ تھا"

○

کوئی شہزادہ ہیملٹ نہیں ہوں
مجھے ویسا بننا بھی لازم نہیں تھا
کہ میں تو فقط چھوٹے درجے کا ایسا ندیم
اور مصاحب ہوں،
جو آبرو مند اور وضع دار آدمی ہے،
جو اوروں کی خدمت میں جینے کو اک
فخر جانے،
وہ کردار جو داستاں کو کہیں باب دو
باب آگے چلا دے،
جسے مشورہ نذر کرنا ہو شاید
وہ محتاط سادہ مزاج اور مؤدب معاون ہوں،

جسکی سیاست متانت کا کردار ہے ۔
اپنا کردار غازی ہے گفتار کا
شُستہ بخشیں مرا ذوق ہیں
بعض اوقات تو اس قدر بولنا میرے
حصّے میں آیا
کہ لفظوں کا اسراف ایک مضحکہ بن گیا
خود مجھے احمقانہ لگا

○

برف سر پر مرے اب اتر آئی ہے
اپنی چندیا پہ اب جس قدر بال باقی ہیں
ان کا تقاضا ہے اب مانگ سیدھی نکالا
کروں
اب تو پتلون کے پائنچے "ٹرن" کروا ہی لوں
(نرم پھل بھی غذاؤں میں ہوں)
اشتہا آرڈوؤں کی (رجواں نرم گولائیوں کی
بھی) ہے
(پچھلا دن ہے)
فلالین کے برف رنگت کے پاجامے پہنوں
ٹہلنے بھی جایا کروں ساحلوں تک
یہ پانی کی پریاں
جو نغمے سناتی ہیں اک دوسرے کو
وہ سب سُن چکا ہوں
مجھے تو گماں تک نہیں ہے کہ میرے لئے
بھی وہ گائیں گی
لہروں کے کاندھے پہ بہتے ہوئے
دُور ہوتے ہوئے
میں انہیں دیکھتا ہوں
ہوا اک تھپیڑا لگاتے ہوئے جب سمندر
کا پانی بلوئے
تو پیچھے کو پھینکے گئے، لہر کے ملگجی رنگتوں
والے پٹّوں کی بھی مانگ سیدھی نکلتی ہے
(میری طرح)
ہم سمندر کے ایوان میں بے سبب دیر تک
رک گئے ہیں
سمندر کی ان بیٹیوں کے لئے
جو کہ زرسل میں گوندھی ہوئی سُرخ کھوری سی
مالائیں پہنے
ان ساعتوں تک، یہاں ہم رکیں گے
کہ پھر آدمی کی صدائیں
ہمیں آ جگائیں
(جگائیں) کہ ہم ڈوب جائیں

رابندر ناتھ ٹیگور
ترجمہ: یونس احمر

رابندر ناتھ ٹیگور کی دو نظمیں

افریقہ

ابتدائے آفرینش کے پہلے جُگ میں جب فضا کُہر آلود تھی
اور خالقِ لم یزل نے جب عالم انتشار میں اپنی ہی تخلیق کو
بار بار تخریب کے ہاتھوں دوچار کیا
اور اپنے سر کو انتہائی بے صبری میں جھٹکا دیا
تو پُر شور اور خشمگیں سمندر نے
ایشیا کی چھاتی سے تم کو (افریقہ) کھینچ لیا
اور گھنے درختوں کی حفاظت میں دیدیا
جہاں تاریکی کا راج تھا اور روشنی انتہائی مدھم تھی
وہاں تم نے تنہائی اور فرصت کے اوقات میں
سربستہ رازوں سے آشنائی کی،
پانی، مٹی، اور آسمان کی نا فہم زبانوں کو سیکھا
چشمہائے فطرت کے قدیم سحر نے تمہارے
لاشعور ذہن کو بیدار کیا

تم نے دہشت، ڈر اور ہراس کا مذاق اڑایا
کیونکہ تم خود ہیبت ناکی کا دیو پیکر بن کر ابھرے تھے
تمہاری دھمکیوں کے بلند ہوتے ہوئے پرچم اور
تباہی و بربادی کے طبل کی تال پر رقص کے نقطۂ عروج نے
خوف و ہراس کے بازو کھول دیئے!

ہائے، گھنے درختوں تلے چھپے افریقہ
تمہارے سیاہ نقاب کے پیچھے
تمہارا انسانی روپ نظروں سے اوجھل رہا!
آج زنجیروں سے لیس دوسری قوموں کے لوگ تمہارے قریب آئے
جن کے دانت تمہارے جنگلی بھیڑیوں کے پنجوں سے بھی تیز تھے
غلاموں کے سوداگر آئے
جن کی آنکھوں میں نفرت کی وہ گہری تاریکی تھی
جو تمہارے گھنے جنگلوں کو بھی مات کر رہی تھی
تہذیب کے وحشیانہ حرص و ہوا نے غیر انسانی حرکات کا مظاہرہ کیا
تم گریہ و زاری کرتے رہے اور تمہارے لہو اور آنسوؤں کے قطروں سے
جنگل کی نم آلود مٹی سیراب ہوتی رہی!
تمہارے غنیموں کے آہنی بردار جوتے بدبو اگلتی کیچڑ میں ہمیشہ
کے لئے نفرت کی ایک تاریخ رقم کر کے چلے گئے۔

اس لمحے سمندر کے اُس پار ان کی بستیوں کے

معبدوں میں پجاریوں کی گھنٹیاں
صبح و شام اللہ کے نام پہ بجنے لگیں
بچے ماؤں کی گودیں ہنسنے لگے
اور شاعروں نے سنگیت اٹھائی — حسن اور محبت کی:

آج جبکہ مغربی افق پر اندھیرا ہے
اور طوفانی ہوائیں سرپیٹ رہی ہیں
نہ جانے کتنے جانور اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل کر
دن کے طلوع ہونے کا اعلان کر رہے ہیں!

اے شاعرِ زمانۂ نو، تم بھی آؤ اور
رات کے پچھلے پہر کی، بجھتی ہوئی روشنی میں
افریقہ کے شکستہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو جاؤ
اور اعلان کرو۔ "معاف کر دو، معاف کر دو"۔
نفرت و عداوت اور انسانیت سوز فضا میں
شاید تمہاری یہ آواز تہذیب کی آخری آواز ہو!

رابندر ناتھ ٹیگور

ترجمہ: یونس احمر

کیا یہ سچ ہے؟

اے میرے دوست، اے ہمدم دیرینہ
کیا یہ سچ ہے کہ میری آنکھوں کی شعاعِ نُور
تمہارے دل کے ابر پاروں کو روشنی سے منور کر دیتی ہے؟

کیا یہ سچ ہے
کہ میرے حسین لب، شرمیلی اور لجیلی دلہن کی طرح سُرخ ہیں؟

کیا یہ سچ ہے
کہ میرے قلب نہاں میں شجرِ فردوس کے گلہائے رنگا رنگ ہیں
اور میری آہٹیں میرے قدموں تلے دنیا کی طرح بجتی ہیں؟

کیا یہ سچ ہے
کہ میرے گرم رخساروں کا لمس ہواؤں میں نشہ بھر دیتا ہے،

اے میرے ہمدم دیرینہ
کیا یہ سچ ہے
کہ دن کی روشنی میرے سیاہ بالوں میں چھپ جاتی ہے
اور میرے بازو موت و حیات کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں،

کیا یہ سچ ہے
کہ ساری دھرتی میری ساڑی کے ایک کنارے میں لپیٹی جا سکتی ہے
اور کیا میری آواز سننے کے لئے دنیا مہر بلب ہو جاتی ہے ؟

کیا یہ سچ ہے
کہ صرف میری خاطر تمہارا پریم میرے انتظار میں ہے
جبکہ دنیائیں اور زمانے بیدار ہیں ؟
کیا میری آوازوں اور میرے لبوں سے تم کو سکونِ ابدی مل جاتا ہے !

کیا یہ سچ ہے
کہ تم میری نرم و گداز پیشانی پر ازلی حقیقت کی تحریر پڑھ لیتے ہو !
اے میرے ہمدم دیرینہ
کیا یہ سچ ہے ؟

اسلم فرخی

ابوالفضل صدّیقی

اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ ایک ناول ہاتھ لگا۔ فوراً پڑھ ڈالا۔ کچھ جاگیرداری جھگڑوں سے متعلق تھا۔ جاگیرداری اور زمینداری کے پھندے میں پھنس کر انسان کس طرح مرتبۂ انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے اور دوسرے انسانوں کو قتل، غارت اور برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ دل پر بڑا اثر ہوا۔ اسلوب بھی بڑا دل کش تھا۔ ناول کے مصنف کا نام تھا ابوالفضل صدیقی۔ یوں صدیقی صاحب سے پہلا تعارف ہوا۔ اگرچہ وہ ہمارے ضلع سے متصل بدایوں کے باشندے تھے، لیکن ملاقات ہوئی تو پاکستان بننے کے بعد کراچی میں۔ شاہد بھائی کے یہاں۔ ایک شام شاہد بھائی نے ایک لمبے تڑنگے زمیندار وضع اور شکاری عادات و مزاج کے ایک صاحب سے ملاقات کرائی۔ معلوم ہوا ابوالفضل صدیقی ہیں۔ بڑی مدت سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ ملاقات ہوئی تو ان کی سادہ اور پرخلوص گفتگو سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ زمینداری، اصطلاحات مال اور متعلقہ امور پر ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں لیکن وہ اپنی گفتگو سے کسی کو مرعوب نہیں کرتے تھے۔ بڑی سادگی سے اپنی بات بات کہہ دیتے اور خاموش ہو جاتے۔

ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ لیث صاحب کے یہاں وہ برابر آتے تھے اس لئے وہاں بے شمار ملاقاتیں ہوئیں۔ جالبی صاحب سے بھی ان کے تعلقات بڑے مخلصانہ تھے۔ اکثر وہاں بھی مڈ بھیڑ ہوتی اور کبھی کبھی صدیقی صاحب غریب خانے یا شعبۂ اردو میں بھی کرم فرماتے۔ صدیقی صاحب ان صاحبان کمال بزرگوں میں تھے جن سے ہر انسان کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔ میں نے

بھی صدیقی صاحب سے خاصہ استفادہ کیا ہے۔ انھیں زمینداری کے حوالے سے اصطلاحات پر بڑا عبور تھا۔ اصطلاحات مال، کچہری، عدالت، تھانے، چوکی کی اصطلاحیں۔ صدیقی صاحب ان سب کے سلسلے میں معلومات کا گنجینہ تھے۔ ان کا ایک افسانہ "بھیا دیوج" نصاب میں شامل تھا۔ اس میں زمینداری کی بے شمار اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ میں نے ایک بار صدیقی صاحب سے ان سب کی تشریح سُنی اور میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ صدیقی صاحب سے جب اس قسم کی کوئی بات دریافت کی جاتی تھی تو وہ بڑے خوش ہوتے تھے اور پوری تفصیل کے ساتھ تشریح کرتے تھے۔ ان کی تحریروں کی طرح گفتگو میں بھی تفصیل کی پوری جلوہ گری ہوتی تھی۔

قیام پاکستان سے پہلے صدیقی صاحب کے لئے لکھنے لکھانے کی حیثیت ضمنی تھی۔ یہ ان کی زندگی کا تجرباتی اور مشاہداتی دور تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب وہ کراچی آگئے تو لکھنے لکھانے کا اصل دور شروع ہوا۔ صدیقی صاحب لکھتے رہے اور جالبی صاحب نے انہیں بہتر سے بہتر کی جستجو میں سرگرم رکھا۔ جالبی صاحب دوسروں سے کام لینے کا ہُنر جانتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ صاحب صلاحیت کی صلاحیت کا زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر طریقے پر اظہار ہو۔ چنانچہ جالبی صاحب کی مسلسل فرمائشوں پر صدیقی صاحب مسلسل لکھتے رہے اور اردو ادب کے سرمائے میں لازوال اضافہ کر گئے۔ صدیقی صاحب کی افسانہ نگاری کا جائزہ مقصود نہیں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ افسانے کی اُس روایت کے آخری امین تھے جو پریم چند سے شروع ہوئی تھی اور ان پر ختم ہو گئی۔ ان کے بعض افسانے نفسیات انسانی کے بڑے عمیق مطالعے ہیں ان کے یہاں دیہات اصل زندگی ہے۔ بھرپور، توانا اور خلوص کی قوت سے مالامال، صدیقی صاحب نے دنیا کو شکاری کی آنکھ سے دیکھا۔ کہتے ہیں کہ شکاری کی آنکھ سے کوئی چیز اوجھل نہیں ہوتی اور اُس میں ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے۔ صدیقی صاحب کے مطالعوں میں یہ دونوں خصوصیتیں ملتی ہیں، جو کچھ دیکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ اس میں بڑی گہرائی ہوتی ہے۔

صدیقی صاحب بڑے صاف ستھرے اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ میں نے انھیں ہمیشہ ایک ہی وضع اور ایک ہی لباس میں دیکھا۔ شیروانی پہنتے تھے اور چونکہ جامہ زیب تھے لہٰذا شیروانی ان پر بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے انھیں ننگے سر نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ٹوپی پہنے رہتے۔ انھیں دیکھ کر لکھنؤ کے سکہ درست کا محاورہ یاد آتا تھا اور محبت تو ان میں ایسی تھی کہ ہر دوست پر جان فدا کرنے

کے لیے تیار رہتے تھے۔ بڑا رکھ رکھاؤ تھا صدیقی صاحب میں۔ بڑے بن کر ملتے تھے اور اپنے بڑے پن کو محبت اور وضع داری سے قائم رکھتے تھے۔ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش رہتے۔ جب ملاقات ہوتی تو بڑی محبت سے آصف کو پوچھتے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں یا ہمارا بیٹا کہاں ہے؟۔ کیا کر رہا ہے؟ لفظ لفظ سے بزرگانہ شفقت اور محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑا بھرپور انداز تھا دراصل صدیقی صاحب ہم لوگوں کے بالکل برعکس ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو زندگی، محبت اور وضع داری کے وسیع مفہوم سے پوری طرح آشنا بھی تھی اور ان مفاہیم سے زندگی میں ایک نیا آہنگ پیدا کرنے کے سلیقے کی حامل تھی۔ اس نسل میں قدروں کا مفہوم بہت واضح تھا اس نسل کے لوگ جس سے ملتے تھے ٹوٹ کر ملتے تھے۔ ان میں ہماری طرح کی منافقت اور خود غرضی نہیں تھی۔ صدیقی صاحب کے ملنے جلنے، آنے جانے میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ ہم لوگ وقت کی تیز رفتاری کا شکار ہو گئے ہیں۔ صدیقی صاحب کے یہاں وقت کی تیز رفتاری کا کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ اپنے وقت پر حاوی تھے۔ ہر کام اطمینان سے کرتے تھے۔ گھبراہٹ یا جلد بازی کی کوئی کیفیت میں نے ان میں نہیں دیکھی۔ کبھی کبھی وہ یونیورسٹی آتے تھے۔ پہلے میرے پاس آتے۔ کچھ دیر بیٹھتے۔ باتیں کرتے۔ میرے کمرے میں بڑا مجمع ہوتا تھا۔ طلبہ، اساتذہ، عام ملنے والے۔ بڑی بھیڑ ہوتی مگر صدیقی صاحب بڑے مطمئن بیٹھے رہتے جیسے یہ ساری بھیڑ بھاڑ زندگی کے معمولات میں ہے۔ اس سے کیا متاثر ہونا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں انہیں جالبی صاحب کے کمرے میں لے جاتا۔ وہاں میرے کمرے سے بھی زیادہ بھیڑ ہوتی۔ صدیقی صاحب نہایت آرام سے صوفے پر بیٹھ جاتے اور اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ جالبی صاحب تھوڑی دیر کے بعد اپنی کرسی سے اٹھ کر صوفے پر جاتے اور صدیقی صاحب سے گفتگو کرتے۔ صدیقی صاحب نہ کسی عجلت کا مظاہرہ کرتے نہ کمرے کے ماحول سے متاثر ہوتے بس آرام سے بیٹھے رہتے جب جی چاہتا اٹھ کر چلے جاتے۔ ان کا آنا یوں محسوس ہوتا جیسے بادِ بہاری کا ایک جھونکا آیا اور گزر گیا۔ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو پھیل گئی۔

صدیقی صاحب کی جو بات مجھے خاص طور پر یاد آتی ہے وہ ان کی انکساری اور فروتنی ہے۔ صدیقی صاحب بڑے افسانہ نگار تھے۔ طرزِ خاص کے حامل تھے۔ دنیاوی اعتبار سے صاحبِ ثروت تھے۔ بڑے زمیندار تھے لیکن میں نے ان کے یہاں کسی قسم کے پندار یا انا کا مظاہرہ نہیں

دیکھا۔ وہ بالعموم اپنی تحریروں کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے تھے میں نے ایسے بہت سے ادیبوں کو دیکھا ہے جو سارے وقت اپنے یا اپنی تخلیقات کے بارے میں فخریہ طور پر اظہار خیال کرتے رہتے ہیں دوسرے کو بولنے کا موقعہ نہیں دیتے اور اگر خدا نخواستہ اگلا کچھ بول پڑا تو ناراض ہو جاتے ہیں صدیقی صاحب میں اس قسم کی خفیف الحرکاتی مطلق نہیں تھی۔ کبھی اپنی ذات یا اپنی تحریروں کو موضوع نہیں بناتے تھے اگر ان کی کسی تحریر کا تذکرہ کیا جاتا تو پہلو بچاتے اور موضوع تبدیل کر دیتے۔ میں نے ان سے ان کے افسانوں کے بارے میں اکثر سوال دریافت کیے۔ وہ سوالوں کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے۔ معلومات فراہم کرتے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کہتے ہیں کہ رسی جل جاتی ہے مگر بل نہیں نکلتا۔ صدیقی صاحب میں زمینداری چھوڑنے کے بعد زمینداری کی خو بو یا اکڑ نہیں تھی۔ میرے خیال میں ان میں اکڑ سرے سے تھی ہی نہیں۔

میرے اور صدیقی صاحب کے درمیان ایک اور بہت گہرا رشتہ بھی تھا۔ اس رشتے کا مرکز حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی ذات گرامی تھی۔ صدیقی صاحب کو حضرت سلطان المشائخ سے وطنی نسبت بھی تھی اور وہ ان کے عاشقوں میں بھی تھے۔ حضرت کے ذکر پر آبدیدہ ہو جاتے۔ آواز گلوگیر ہو جاتی۔ صدیقی صاحب نے مجھے سلطان المشائخ کے والد ماجد خواجہ احمدؒ کے مزار کی پوری تفصیل سنائی تھی۔ وہ بیان کرتے رہے میں سنتا رہا۔ دونوں پر ایک کیف طاری رہا۔ یہ پروگرام بھی طے ہوا کہ ہم دونوں اس مزار کی زیارت کے لیے ساتھ جائیں گے مگر اس کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ میں جب حضرت سلطان المشائخ کے عرس سے واپس آتا تو صدیقی صاحب خاص طور پر مجھ سے ملنے آتے تفصیلی حالات سنتے۔ بڑی طویل نشست ہوتی میں نے محسوس کیا ہے کہ حالات سننے کے دوران ان پر وجد کی سی ایک کیفیت طاری رہتی۔ بڑے انہماک اور توجہ سے سنتے اور بڑے خوش ہوتے۔ بڑی عقیدت تھی۔ ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ یہ عقیدت و محبت بھی ان کی شخصیت کا ایک قابل ذکر پہلو ہے۔

ابو الفضل صدیقی اُردو افسانے ہی کا بڑا نام نہیں کتاب انسانیت کا بڑا نام بھی ہیں۔ بھرپور زندگی۔ بھرپور محبت اور شفقت۔ اسپورٹنگ اسپرٹ کے حامل (میں کوشش کے باوجود ان الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکا) قلم میں بلا کی روانی دائروں میں پھیلتی ہوئی نثر کھلی فضا کی بھرپور عکاسی۔ ناگفتنی کو گفتنی بنانے کا کمال ابو الفضل صدیقی میں سب کچھ تھا اور یہی سب کچھ ہمیشہ یاد رہے گا۔

ابو مسلم صدیقی

میرے بھائی صاحب

کل تک یہی دنیا سبد گل تھی مگر آج ۔ بے رنگ ہے بے آب ہے معلوم نہیں کیوں ؟

بھائی صاحب چلے گئے اور آج بے سنگ و میل کے اس سفر پر چل پڑے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ اور ہمارے باپ دادا کے موروثی روایات کا قلم آج ٹوٹ گیا اور بندوق بھی زنگ آلود ہو کر پرزہ پرزہ ہوگئی ۔ یہ ہمارا خاندانی اور ذاتی نقصان ہے ۔

بھائی صاحب میرے لئے تین حیثیتیں رکھتے تھے ۔سب سے پہلے بڑے بھائی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دوست بھی تھے اور پھر میں ان کا مشیر بھی تھا اس اجمال کی تفسیر یوں ہے کہ وہ میرے بڑے بھائی اس لئے تھے کہ میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں اور ان کے معیّت میں باپ کا سایۂ عاطفت اور دستِ شفقت اور نجی گفتگو میں ماں کی میٹھی لوریاں محسوس کرتا تھا۔ دوست ان کا میں شکار میں تھا ۔ شکار ان کی کہنہ مشقی اور چابک دستی اپنی جگہ مسلّم تھی مگر میں نے فیر کرنے میں پہل کرنے میں کبھی ان کی بزرگی کا لحاظ نہیں کیا اور میری اس حرکت پر وہ مجھ سے ناراض کبھی نہیں ہوئے بلکہ اکثر ہمت افزائی کرتے ہوئے داد دیتے تھے ۔ اگر فیر خالی جاتا تو یہ فقرہ کہتے تھے "ابھی اُس کی عمر باقی ہے ۔ مارنے والے سے جلانے والا زیادہ طاقت ور ہے ۔"
مشیر میں ان کا اس طرح تھا کہ اگر انھیں یہ خبر مل جاتی تھی کہ میں جاگیر پر زرعی فارم پر پہنچنے والا ہوں تو وہ اپنے قلم کی رفتار میں تیزی پیدا کر دیتے تھے اور اپنے افکار کو زیب قرطاس کرنے میں تعجیل کرتے تھے اور میرے پہنچنے پر کہتے تھے کہ " میاں اب تو بس شکار ہوگا، مگر تم پہلے یہ افسانہ کے صفحات ترتیب دے کر کسی رسالہ کو روانہ کر دو ۔ خط میں نے ایڈیٹر کے نام لکھ دیا ہے" ۔ اور یہ کام بہت مشکل

تھا کیوں کہ وہ اوراق پر صفحات کے نمبر نہیں ڈالتے تھے اور مجھے سلسلہ ملانے کے لئے انہیں پڑھنا پڑتا تھا میں کہتا تھا کہ آپ صفحات پر نمبر تو ڈالتے نہیں ہیں مجھے دقت ہوتی ہے تو کہتے تھے کہ "میاں میں یہ اس لئے کرتا ہوں کہ سب سے پہلے تم ہی اس افسانہ کو پڑھنے کا فخر حاصل کرو اور دیکھو میں نے چند عنوانات بھی حاشیہ پر لکھ دیئے ہیں ان میں سے کسی کا انتخاب کر لو اور اکثر عنوان کے انتخاب پر بھی بحث چھڑ جاتی تھی مگر ع

اب فسانے بن گئے وہ قہقہوں کے قافلے

مٹ گئے وہ گفتگو کے غیر فانی سلسلے

بھائی صاحب کو کسی زمانے میں اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ اکثر فرصت کے اوقات میں مجھے انگریزی ادب کی نظموں کے معنی و مطالب کورس کی تیاری کے سلسلہ میں لکھا دیا کرتے تھے انگریزی ادب کی شاعری وہ کیٹس شیلے ورڈز ورتھ، لانگ فیلو اور تھامس گرے سے متاثر تھے گرے کی نظم ELEGY بہت پسند تھی انگریزی نثر میں ایڈیسن کو پسند کرتے تھے۔

وہ جب لکھتے نہیں تھے تو ہر وقت اکتساب علم کرتے رہتے تھے اور پڑھتے رہتے تھے کتابیں پڑھتے پڑھتے اکتا کر وہ فطرت اور ماحول فطرت کا گہرا مشاہدہ کرتے تھے کائنات اور انسان و حیوان حتیٰ کہ جمادات اور نباتات کا بغور مشاہدہ کرتے تھے اور ان کے طرز غور و فکر پر مجھے ولیم میک پیس تھیکرے WILLIAM MAKE PEACE THACKREY کا وہ جملہ یاد آجاتا تھا جو اس مشہور انگریز مصنف نے WASHINGTON IRVING کے مرنے کے بعد اس کے بارے میں لکھا تھا HE READS HUNDRED BOOKS TO WRITE A SENTENCE & WORKED HUNDRED MILES TO MAKE A LINE OF DESCRIPTION.

اور یہ اُن کی اس کاوش کا نتیجہ تھا کہ اگر آج ہم بہ یک وقت آقائے اردو پروفیسر آزاد کی انشار پردازی، اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کی مقربین و مقرب نثر کی رعایت لفظی والی کردار نگاری اور قصہ پن کے ساتھ گھن گرج عبارت آرائی، رشید احمد صدیقی کے تبسم زیر لب کی طنز و مزاح نگاری، پنڈت رتن ناتھ سرشار کے خندۂ دندان نما قسم کی شوخی اور منفرد مرزا رجب علی بیگ کی مقفّع مسجع نثر نگاری، تاریخ کے معلم اول علامہ شبلی نعمانی کی

کات وجزیات نگاری اور کہیں کہیں غالب کی سادگی وپرکاری و بے خودی وہشیاری اور
دی افادی کی پُر تاثیر زورِ قلم کا مزہ لینا چاہیں تو ابوالفضل صدیقی کے نگارشات کا مطالعہ کریں۔

اس دنیا کی وسیع کائنات، اور کرۂ ارض وسما کی پوری فضائے بسیط اُن کی لائبریری
، اور فطرت کا ہر ذرہ اور جزو اُن کی کتاب، وہ درس لیتے تھے کنارے کی اُفتادگی سے، دریا
دانی سے، کھیتوں کی منڈیروں پر گائے ہوئے دوشیزگانِ صحرا کے گیتوں کی لے سے، شبان
وں کی بنسری پر الاپے ہوئے المیہ نغموں سے۔ ہرے بھرے گلابی سر والے طوطوں کے
از پرواز سے، اُڑتی قازوں کی باترتیب قطاروں کی اندازِ رفتار سے نہ صرف عالی شان
بروں کی صَولت و دبدبہ سے جس کی حیرت سے چشمِ تماشہ کو بھی حذر ہو بلکہ گورِ غریباں میں
ن ہستی کے شیرازۂ پریشاں سے، دستِ طفل خفتہ سے رنگین کھلونے کی رفتار سے،
رشاخ گل سورج کی شبنم کے موتیوں میں سُلجھی اُلجھی ہوئی کرن سے، ساکنانِ صحنِ گلشن
آوازی سے، ننھے ننھے رنگین پر طائروں کی آشیاں سازی سے، شام کی ملگجی ظلمت سے
ب کی سیاہ پوشی سے، گلگونہ شفق کی گل فروشی سے، موسم برسات میں سبز بانات کی
ی وردی پہنی ہوئی زمین سے، گرما کے جلتے ہوئے اور جھلستے ہوئے ریگ زاروں سے۔
نمہ کی ترل ترل سے۔ سمندر کی کوہ کو خجل کرنے والی اونچی لہروں کی گھن گرج سے،
ہستان کی ہیبت ناک خاموشی، طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار سے، عظمتِ دیرینہ
ے مٹتے ہوئے آثار سے، شرد پورنا کی پرسکون ومسحور کن چاندنی کی خوابناکیوں سے،
مع دانوں پر پگھلتے موم کی بے خوابیوں سے، ضیاءِ خورشید کو شرمانے والی مرکری بلب کی
ظر کو خیرہ کرتے والی ضو سے، اور نمکولی کے تیل سے جلنے والے دیئے کی کپکپاتی لو سے،
راتوں کے شوخ وشنگ، دیدہ زیب رنگارنگ آتش بازیوں سے منور جلوسوں سے
در جنازے کے ہمراہ چلتے ہوئے انسانوں کے زیرِ لب کلمہ شہادت کی گنگناہٹ میں رواں
رواں سیلِ رواں سے، اندھیری راتوں میں تیز بارش کے گرنے سے سائبانوں کے مسلسل
شور سے، تاریک آسمان پر لہراتی بجلی کی زنجیر سے، نیستانوں کے شیروں کی گنجار سے اور شام
جنگل سے بستی کی طرف آنے والے مویشیوں کی گلوں کی پُراطمینان منمناہٹ سے خس کی

ٹی میں لیٹے ہوئے فرشی پنکھے کی خواب آور عطر بیز ہلکی ہوا سے اور باہر میدانوں میں گرم ریت کے ذروں کی پچکاریاں منھ پر مارنے والے لو کے تھپیڑوں سے، کہساروں میں چہچہاتی چکوروں کے سُریلے شور سے، جنگل میں مست ہو کر ناچنے والے مور سے اور ریت کے ٹیلے پر آ ہو کے بے پروا خرام ناز سے، اونچی فلک بوس عالی شان عمارتوں سے کہ شہروں کی رونق جن کی ممنونِ منت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دیہات کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی خام دیواروں پر پڑے ہوئے بوسیدہ وخستہ وشکستہ چھپروں سے، حضرت گنج روڈ، جناح روڈ، مال روڈ اور آئی آئی چند ریگر روڈ کی چوڑی چکلی چمکیلی رونقوں سے اور گاؤں کی تنگ و تاریک پُرپیچ گلیوں سے، صبح کے پچھلے پہر شبنم میں بھیگے ہوئے نورستہ سبزہ کی پستی سے، عطر بیز نسیم صبح کی مہکتی مستی سے۔ آسمان پر چھوٹتے ہوئے شہاب ثاقب کے بنتے ہوئے روشن مرغولوں سے اور چلچلاتی دوپہر میں خشک و بے گیاہ میدانوں میں اُٹھتے ہوئے ریت کے بگولوں سے، اور یہی وجہ تھی کہ بھائی صاحب نے کبھی "دھانوں کی سبزی اور سرسوں کا روپ" اپنی منظرکشی میں بہ یک وقت ایک قطعہ زمین پر نہیں دکھایا۔ ان کے اسی انہماک فطرت کو محسوس کرتے ہوئے والد صاحب قبلہ نے برجستہ، یہ شعر کہا تھا ؎

محو ہے فطرت میں وہ فطرتِ بھی اُس میں محو ہے
رازِ فطرت کے سمجھنے میں اسے کب سہو ہے (نفیر بدایونی)

بھائی صاحب جو کام بھی ہاتھ میں لیتے تھے اس کے ساتھ پورا انصاف کرتے تھے اس کی پوری تاریخ و ماہیت، کی پوری پوری معلومات نہ صرف اکتسابی طور پر بلکہ مشاہدہ اور ذاتی تجربے سے حاصل کرتے تھے زمینداری و کاشت کاری میں ان کا شمار اُن کاشت کاروں میں ہوتا تھا جن کی نظریں رات کو افلاک پر اور انگلیاں دن کو نبضِ خاک پر رہتی تھیں جس زمانے میں محکمۂ موسمیات کی پیشین گوئیاں نہیں ہوا کرتی تھیں وہ رات کو تاروں سے مزین آسمان کو دیکھ کر بالکل صاف ہونے کے باوجود پیشین گوئیاں کرتے تھے کہ اتنے دنوں یا اتنے گھنٹوں کے بعد بارش ہوگی اور یہ پیش گوئی ہمیشہ سچ ہوتی تھی اور یہ ہی زراعت کے پیشہ میں ان کی کامیابی کا اہم ترین راز تھا۔

ایک مجمع میں زراعت کے محکمہ کے چند اعلیٰ افسران اور چند رُوسار قسم کے زمیندار ان محو گفتگو تھے بھائی صاحب نے ان سے یہ سوال کیا کہ عام دیسی ہل میں کتنے حصّے ہوتے ہیں (اس زمانہ میں ٹریکٹر اور قسم قسم کے ہل ایجاد نہیں ہوئے تھے) رُوسار قسم کے لوگوں نے بات مذاق میں اُڑانے کی کوشش کی پھر بھائی صاحب نے محکمہ زراعت کے افسران سے یہی سوال مکرر پوچھا وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ بھائی صاحب ان کو لے کر کوٹھی سے باہر نکلے۔ باغ کے قریب ہی ہل چل رہا تھا۔ ایک ہل رکوا کر اس کے حصّوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر بتایا کہ یہ "جوا" ہے، یہ "پرس" ہے، یہ "کرڈھ" ہے، یہ "پرہاری" ہے، یہ "پھالا" ہے یہ "مٹھیا" ہے وغیرہ وغیرہ گن کر سارے حصّہ دکھا دیئے۔ ابھی یہ صاحبان ورطۂ حیرت سے نکلے بھی نہ تھے کہ ہالی کے ہاتھ سے رسّی لے کر مُٹھیا ہاتھ میں دبا کر بیلوں کو ہانک کر دور تک ہل چلاتے چلے گئے اور موڑ کر واپس لے آئے۔ روسار قسم کے زمیندار ان اور محکمۂ زراعت کے افسران نے بہ یک وقت مرحبا کہہ کر کہا کہ "یار صدیقی تمہارے پاس بیٹھ کر صرف گفتگو میں ہی لطف نہیں آتا بلکہ انسان کچھ سیکھ کر ہی اٹھتا ہے"۔

باغبانی کا شوق ہوا تو ہزاروں درخت مختلف پھلوں کے نصب کر دیئے، ارادہ تھا کہ ایک لاکھ درخت آم کے لگائیں گے مگر ہزاروں نصب کرنے کے بعد یو۔پی گورنمنٹ کے قانون کاشت کاری کے جلد بدلنے سے بد دل ہو گئے۔ تقسیم برصغیر سے قبل ان کی مشہور کتاب رموز باغبانی چھپ کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکی تھی جو کہ علاوہ اور پھلوں کے آم پر مسلمہ طور پر سند ہے آم کی قلمیں بھی خود باندھ لیتے تھے ایک قلمی آم "قندِ عارف" کے موجد بھی تھے جو کہ نانا میاں کے باغ کے آم "بھوڑ والہ گولہ" پر کامیاب قلمیں باندھ کر تیار کیا تھا اور ہمارے رہائشی قصبہ "عارف پور نوادہ" کے نام پر اس کا نام "قند عارف" رکھا تھا۔ اندھیرے میں آم کے پتے باغ سے منگوا کر ٹٹول کر بتا دیتے تھے کہ یہ فلاں آم ہے۔ اس کا امتحان کئی مرتبہ ہوا تھا۔

شکار میں دراصل اُن کی کامیابی کا راز بھی اُن کے گہرے مشاہدہ کا مرہونِ منت تھا وہ جانوروں کی جبلت پر بدلتے ہوئے موسم میں ان کے مزاج کی کیفیت سے پورے پورے واقف تھے بھیڑیوں کی فطرت کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ آدم خور جانوروں کے متعلق کہا کرتے تھے کہ اس کی فطرت "چور" کی سی ہو جاتی ہے، کیوں کہ یہ اپنی اصلی غذا بھی جنگلی جانوروں کے بجائے انسان

اور ان کے بچوں اور پالتو جانوروں کو اپنی غذا بنا کر قانون فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے
اور یہ احساس اس کی فطرت بدل دیتا ہے اور چور کی طرح چالاک اور حساس ہو جاتا ہے۔

گھوڑوں اور کتوں کے بابت بہت اچھی معلومات رکھتے تھے اور آپ کو یہ معلوم کر کے
تعجب ہوگا کہ نر کتوں کو "آختہ" کرا دیا کرتے تھے اور تجربہ کیا تھا کہ یہ کتے خاص طور سے گرے
ہاؤنڈ زیادہ طاقت ور اور سنجیدہ مزاج ہو جاتے ہیں اور شکار میں بڑے کار آمد ہوتے ہیں۔

کتوں کے بھونکنے، گیدڑوں کے ہونکنے گلداروں کے دھاڑنے اور چرخ کے خون
کو منجمد کرنے والے قہقہوں کے انداز سے یہ پہچان کر بتا دیتے تھے کہ یہ آوازیں جانوروں کو
دیکھ کر نکالی جا رہی ہے یا انسانوں کو دیکھ کر۔

اندھیری رات میں آواز پر کامیاب نشانہ لگا دیتے تھے۔ ایک دفعہ قازوں کے شکار کے
لئے جھیل کے کنارے اندھیری رات میں بیٹھے تھے۔ جھیل سے متصل باغ تھا اس کے درخت سے
الو کے بولنے کی آواز آئی۔ میں نے کہا کہ بھائی صاحب یہ کم بخت الو بول رہا ہے۔ بولے ایک دفعہ اور آواز
نکالنے دو۔ اگلی آواز کے ساتھ ہی ایک فیر ہوا اور الو درخت سے نیچے۔ بھائی صاحب نے غیر
منقسم برصغیر میں نہ اسلحہ ایکٹ کی پابندی کی اور نہ کبھی شوٹنگ پرمٹ لیا۔ ہمیشہ بلا لائسنس کی
بندوق و رائفل اعلیٰ قسم کی استعمال کی۔

سانپ بہت مارا کرتے تھے۔ اگر جنگل میں بھی کوئی سانپ سامنے بل میں گھس جاتا یا اس کی
گھسٹن سے اندازہ کر لیتے کہ ابھی گھسا ہے تو بل کھدوا کر نکال کر مارا کرتے تھے اور اکثر بقول خود
لاٹھی یا ڈنڈے سے "کٹ کٹا" دیا کرتے تھے اُن کو سانپ ملتے بھی بہت تھے گھر میں اندھیری رات
میں سیاہ سانپ کی پھنکاروں پر گراپ سے سانپ مارا تھا۔ ایک زمانہ میں سانپ زندہ
پکڑنے کا شوق ہوا تھا۔ ایک غیر پیشہ ور سانپ پکڑنے والے سے ٹریننگ لی تھی اور غالباً
ایک سانپ اس کی معیت میں پکڑا بھی تھا مگر منجھلے بھائی نے والدہ سے جاسوسی کر دی اور
انھوں نے قسم لے کر اس شوق سے باز رکھا۔ کالے سانپ کو گنے کے کھیت میں دبوا کر اس
گنے کے رس سے دق، کالی کھانسی اور دمہ کا کامیاب علاج نکالا تھا۔

بھائی صاحب نے کبھی کوئی مقدمہ نہیں ہارا۔ بست شدہ گاؤں میں تو مقدمہ بازی کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر جن گاؤں میں   داری تھی وہاں کبھی کبھی شریک زمینداروں سے نوبت عدالت وکچہری کی آجاتی تھی۔ فریق ثانی کے گواہ کو آخر وقت تک توڑتے تھے اور کبھی کبھی در عدالت سے چلتا کر دیتے تھے۔ قانون سے بہت اچھی واقفیت رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ قانون کے علاوہ مقدمہ کی ترکیب وپیروی بہت بڑی چیز ہے۔

عام طور پر علاقہ میں "بڑے صاحب" کہلاتے تھے اور مشہور تھا کہ یہ نہایت سخت قسم کے جاگیر دارانہ مزاج کے زمیندار ہیں مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا وہ فصل کی خرابی کے وقت کاشت کاروں کو معمولی لگان کے التوا کے ساتھ بلا سودی تقاوی بشکل فیس بھی دیا کرتے تھے کاشت کار کی موت کے وقت اس کی چوپال پر جاکر اس کے متعلقین سے اظہار ہمدردی کرتے تھے اور اس کے لڑکوں کے سروں پر ہاتھ رکھ دیتے تھے مگر اک ذرا کھڑے کھڑے چلے جاتے تھے۔ ہاں البتہ کاشت کار کی سرکشی، در بغاوت پر بہت ناراض ہوتے تھے اور خود ہی سزا دیا کرتے تھے۔ کاشت کاروں کی آپس کے جھگڑے کبھی عدالت یا تھانہ تک نہیں جاتے تھے خود ہی فیصلہ کرکے گاؤں کے لوگوں کی موجودگی میں جرمانے کرتے تھے یا گوشمالی کرا دیا کرتے تھے۔ گاؤں کی کوٹھی میں کوئی عورت داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ سوائے چوکیدار کی بڑھیا کے۔ اس کے ذریعہ گاؤں کی ان بیوہ کاشت کار عورتوں کے کہ جن کے بچے چھوٹے تھے، کی خیر خبر منگوا کر ان کی مدد و دست گیری کرتے تھے۔

وہ گاؤں کی زندگی کے اتنے نباض تھے کہ جانتے تھے کہ عام حالات میں گاؤں کے کاشت کاروں میں کس جنس کی روٹی کھائی جاتی ہے یعنی گندم، جو، چنا، مکئی، باجرہ، جوار یا ساٹھی وغیرہ کی۔ کہا کرتے تھے کہ گندم کی روٹی عام کاشت کار کے یہاں صرف بیساکھ اور جیٹھ میں کھائی جاتی ہے۔ اور تجربہ سے یہ بات سو فی صد درست ثابت ہوئی تھی، ایک مرتبہ ہمارا ایک نوجوان موروثی کاشت کار جو کہ فارم پر ملازم تھا حسب معمول رات کو آیا، میں نے پوچھا کہ کھانا کھا آئے، اس نے کہا ہاں۔ جیٹھ کا مہینہ تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا کھانا تھا اس نے کہا کہ گیہوں کی روٹی میں نے پوچھا کہ سالن کیا تھا، اُس نے کہا کہ میاں گیہوں کی روٹی کو سالن کی کیا ضرورت ہے۔ بھائی صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس رات کھانا بھی باوجود میرے

اور باورچی کے اصرار کے نہیں کھایا اور ٹھیک سے سوئے بھی نہیں۔ کہاکہ زمین سے غلہ اگانے والے اور ترکاریاں پیدا کرنے والے ہاتھ روکھی روٹی کھاتے ہیں۔ صبح تڑکے اٹھ کر بولے کہ یہ بات تو ہمارے آبا و اجداد کے وہم و تصور میں بھی نہیں آئی تھی۔ سیدھے پائیں باغ میں گئے۔ کارندے کو بلا کر ہدایت کی کہ دو بیگہ زمین باغ میں کھیت کی اور شامل کر دو اور مالی کو ہدایت کی اس فاضل رقبہ پر صرف ترکاریاں کاشت کی جائیں گی اور کٹھل کے درخت لگا دیا۔ اس کی پیداوار گاؤں کی رعیت کے لئے بالعموم اور فارم کے ملازموں کے لئے بالخصوص مخصوص کی جاتی ہے وہ اپنے حسب منشاء ضرورت بلا قیمت استعمال کریں گے۔

بھائی صاحب تاریخ اسلام پر بہت اچھی نظر رکھتے تھے اس سلسلہ میں اُن کی معلومات بہت وسیع تھیں تاریخ اسلام کے تمام اہم واقعات، مثلاً سانحہ شہادت حضرت عثمان غنیؓ و واقعہ کربلا کے وجوہات اور اس کے دور رس نتائج۔ علاوہ ازیں دیگر مشہور واقعات خارجیوں کا وجود میں آنا۔ معتزلہ کا ابھرنا، جزیہ کا جواز اور برمکیوں کا عروج و زوال اور مشہور جنگوں کے حالات ان کے اسباب و نتائج جن میں جنگ صفین اور جنگِ جمل بھی شامل تھیں۔ مسلمانوں کے ہسپانیہ میں عروج و زوال کی داستان ان سب پر بڑی اچھی طرح روشنی ڈالا کرتے تھے اور بڑے پُر اثر انداز میں بیان کرتے تھے۔

سیاسی یا معاشرتی معاملات میں کسی بڑے سے بڑے افسر کو خیال میں نہیں لاتے تھے ہمیشہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن جیتنے والے مسلمان ممبر نے کانگریس کی وزارت یو۔پی اسمبلی کی ۱۹۳۷ء میں قبول کر لی اور پہلے ہی دورے پر بدایوں بذریعہ کار آئے۔ ہمارے آبائی مسکن سے متصل چار سڑکوں کے جنکشن پر بھائی صاحب نے اُن کا استقبال کیا۔ شہر کے کانگریسی نیتا بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بھائی صاحب نے سونے کے خاص دان میں پان پیش کیا۔ چاندی کے گلاس سے پانی پلایا۔ چاندی کے عطر دان سے عطر پیش کیا اور جب یہ سب کچھ ہو چکا تو کانگریسیوں کے کانگریس زندہ باد کے نعروں کے جواب میں مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے لگوائے اور غدار ملت واپس جاؤ کے پُر شور نعروں سے فضا گونج گئی۔ اور منسٹر صاحب رات کی تاریکی میں منہ چھپا کر دورہ

کینسل کر کے چلے گئے۔ بھائی صاحب نے کہا کہ عطر پان پیش کرنا اسلامی فریضہ تھا اور نعرے لگوانا سیاسی تقاضہ۔

بدایوں میں آزادی کے فوراً بعد ایک نہایت متعصب قسم کے مہا سبھائی ذہنیت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا تقرر ہوا۔ یہ شخص میرے درپۂ آزار تھا۔ ایک مقدمہ توہین عدالت کا خود بحیثیت مستغیث دائر کیا۔ جس کے جواز کو میں نے عدالت سیشن میں چیلنج کر کے خارج کرا دیا۔ پھر ایک مقدمہ میری تقریر کے خلاف دائر کرا دیا۔ جس کو میں نے ابتدائی مرحلہ میں تحقیقات کے دوران ختم کرایا۔ پھر میرے ڈرائیور سے ایک معمولی سا حادثہ کار کا ہو جانے کی بنا پر دائر کرا دیا، جس کا میں نے اپنے اثر و رسوخ سے تصفیہ کر لیا۔ پھر مجھے کرفیو توڑنے کی بنا پر بند کرنے کی کوشش کی میں حراست میں جانے سے پہلے ہی بھاگ گیا، ان حالات میں سب کا مشورہ ہوا کہ میں پاکستان ہجرت کر جاؤں، مگر میں جائداد وغیرہ کے معاملات کی وجہ سے اس وقت ملک چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ بھائی صاحب نے ان سب حالات کی بذاتِ خود پیروی کی تھی ایک دن کلکٹر کے یہاں مجھے ساتھ لے کر چلے گئے چند ہندو کانگریسی جو کہ دراصل جن سنگھی ذہنیت رکھتے تھے وہ اندر ہی موجود تھے۔ کلکٹر صاحب آئی۔ سی۔ ایس آفیسر تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے کہ آپ کو اپنی وفاداری کا موجودہ گورنمنٹ کے ساتھ ثبوت فراہم کرنا ہے۔ آپ کی مسلم لیگ میں زبردست ایکٹی وٹیز تھیں آپ کا ماضی بہت مشکوک ہے۔ بھائی صاحب نے برجستہ کہا کہ ماضی شیاما پرشاد مکرجی کا کیسا ہے کہ کون مکرجی، بھائی صاحب نے کہا کہ ہمارے سینٹر کے وزیر مال اور پھر ایک ذرا سکوت کر کے کہا کہ اور معاف کیجئے اُن آئی۔ سی۔ ایس آفیسروں کا ماضی کیسا ہے جو کہ گاندھی ٹوپی میں ریتا بھروا بھروا کر کانگریسی نیتاؤں کو مونچھ پکڑ پکڑ کر جوتے لگوایا کرتے تھے اور کانگریس کے ترنگوں کو نوچ کر پیروں تلے روندا کرتے تھے آج خود گاندھی ٹوپی سر پر منڈھے ترنگوں کو سلامی دیتے ہیں اگر یہ لوگ اپنے ماضی کو بدل سکتے ہیں تو مسلم لیگی بھی اپنے ماضی کو بدل سکتے ہیں۔ کلکٹر چپ ہو گیا، چہرے پر گلہریاں سی اترتی چڑھتی رہیں پھر آہستہ آہستہ اُن کی کتاب ”اہرام“ پر کچھ گفتگو کرنے لگا۔

یہ تھے ابوالفضل صدیقی کے دم خم پرائیویٹ زندگی میں۔ بھائی صاحب نے کلکٹر کی

اس ملاقات کے بعد مجھ سے کہا کہ تم کو اس کے ڈر سے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے یہ فطرتاً بنیا ہے، تمہارے خلاف عملی اقدام کرنے سے پہلے بہت کچھ سوچے گا اور تم کو ڈیفینس آف انڈیا رولز کے تحت بند نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں بھائی صاحب کی نجی زندگی میں بھی مزاج کا پہلوان کا ساتھ نہ چھوٹتا تھا۔ کبھی کبھی جب ہرن زیادہ شکار کر لئے جاتے تھے تو ان کا گوشت ہوا کر انھیں کی کھال کو بچھا کر اس پر چن دیا جاتا تھا۔ ہندو مسلمان کاشت کاروں میں گوشت کی تقسیم کا اعلان گاؤں کے اندر بہانگ دہل کرا دیا جاتا تھا۔ تمام کاشت کار گوشت کے ڈھیر کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ بھائی صاحب بتا رہے تھے کہ ان کی سیٹی کی آواز پر عام لوٹ گوشت کی شروع ہو جائے گی ادھر وہ سیٹی بجاتے تھے ادھر مقدم "لوٹ لو" کا نعرہ لگاتا تھا اور سب لوگ گوشت پر ٹوٹ پڑتے تھے اور بعد میں دیکھنے میں آتا تھا کہ اکثروں کے منہ ہاتھ اور کپڑے گوشت کے خون سے سرخ ہو چکے ہیں کسی کے ہاتھ ایک بوٹی اور کسی نے ڈھیروں لوٹ لیا۔

گاؤں میں کبھی کبھی کاشت کاروں اور رعیت کو سرزنش کرنے کی نوبت آجاتی تھی اس میں بھی جدت طبع دکھاتے تھے۔ ایک مزارعہ نے دوسرے مزارعہ کا پانی زبردستی کاٹ لیا۔ اس کی فریاد پر پانی کاٹنے والے مزارعہ پر گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی رائے سے پندرہ روپئے جرمانہ کئے گئے اور پھر یہ روپیہ گاؤں کے عام راستہ کو جو کہ برسات میں تالاب نے کاٹ دیا تھا، درست کرنے پر لگانے کا حکم ہوا۔ دو دو آنہ پر مزدور بلوائے۔ مجرم کاشت کار آخر انھیں کا کاشتکار تھا اس نے یہ کیا کہ اپنے گھر کے سب آدمی مع ماں باپ۔ بیوی بچوں اور بھائیوں کے مزدوری پر لگا دیئے اور اس کی مزدوری میں سے رقم کا معتدبہ حصہ اس طرح واپس لے لیا۔ بھائی صاحب اس کاشت کار کی اس حرکت سے بہت خوش ہوئے اور اس کو انعام دیا۔

ایک دفعہ بھادوں کے مہینہ میں میں اور بھائی صاحب اور منجھلے بھائی اپنی زمینداری کے موضع کیسلی میں دوپہر کو قیام پذیر تھے۔ اس سے ہمارا ہیڈ کوارٹر والا موضع دار اب نگر ڈیڑھ میل تھا مگر گاؤں میں پینٹھ لگتی تھی۔ بھائی صاحب نے کٹا کر لکھان سنگھ (ایک بوڑھے کاشتکار

کو کچھ پیسے دیئے کہ کمر گاؤں کی پینٹھ (بازار) سے آنولہ کے آئے ہوئے آم خرید کر دراب نگر رات تک بھجوا دینا (اپنے باغوں میں آم ختم ہو چکے تھے)

ہم لوگ دراب نگر واپس آگئے۔ رات کا کھانا کھا کر لیٹ گئے۔ بھادوں کی اندھیری رات تھی۔ آسمان پر بادلوں کے قافلے فیلِ مست بے خبر کی طرح ڈولتے پھر رہے تھے اس وقت ملکھان سنگھ آم لے کر پہنچے آم فوراً بھگو دیئے گئے اور ملکھان نے چلتے ہوئے کہا کہ "بڑے صاحب آم تو آپ کو جلدی پہنچ جاتے میں نے کمر گاؤں کے بازار میں نرائن تیلی اور پرا سنگھ مکھیا دراب نگر سے کہا تھا کہ یہ آم لیتے جائیں اور کوٹھی میں پہنچا دیں مگر وہ دونوں انکار کر گئے۔ بھائی صاحب نے یہ جملہ سن کر ایک دم ایک غراہٹ سی نکالی اور حکم ہوا کہ نرائن تیلی اور پرا سنگھ راؤ کو فوراً حاضر کیا جائے یہ دونوں ہمارے اچھے خاصے رقبہ کے موروثی کاشت کار تھے اور نرائن تیلی ساہوکاری بھی کرتا تھا۔ پرا سنگھ دراب نگر کا سرکاری مکھیا VILLAGE HEAD-MAN بھی تھا۔ پہلے نرائن آیا اس کو ایک دوائی دلوائی کہ جا کر کیلی میں بھاٹ کی دوکان سے ۲ر کے بتاشے لے آؤ۔ دوکان بھاٹ سے میرا نام لے کر کھلوا لینا۔ راستہ دراب نگر اور کیلی کے مابین دو میل کا تھا۔ مگر اس راستہ میں ایک جوہڑ پڑتی تھی، جس میں برسات میں تقریباً کمر کمر پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔ نرائن کی روانگی کے بیس منٹ بعد پرا سنگھ کو حکم ہوا کہ اپنی لٹیا ڈار لے کر کیلی جاؤ اور بڑے کنوئیں سے ایک لوٹا پانی بھر لاؤ۔ منجھلے بھائی نے آہستہ سے کہا کہ نرائن کو تو بہتر بتاشے کیلی کے سوا کہیں اور ملیں گے نہیں یہ پانی کہیں سے بھی بھر لائے گا۔ یہ سن کر بھائی صاحب نے پرا سنگھ سے مزید کہا کہ کنوئیں والے پیپل پر سے پانچ پتے توڑتے لانا اور پیپل کا درخت اس علاقہ میں قریب سے قریب کیلی والے کنوئیں پر تھا۔ چار و ناچار پرا سنگھ روانہ ہوا۔ اس دوران گاؤں کے بوڑھے بھی بلوائے گئے تھے اور وہ کارندے والے حصہ میں بیٹھے چلموں کے دھوئیں کے مرغولہ میں نرائن اور پرا سنگھ پر سزا کی پیشگوئیاں کرتے ہوئے گپ لڑا رہے تھے۔ پہلے نرائن آیا، دھوتی کمر تک اور کٹورادان میں بتاشے مقدم کے حوالہ کئے اور مزید سزا کے انتظار میں عقوبت کی گھڑیاں گزارنے لگا۔ اس سے پوچھا کہ پرا سنگھ ملا تھا۔ اس نے کہا جب کیلی سے نکل رہا تھا تو مجھے راستہ میں ملا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد پرا سنگھ بھی آگیا۔ تمام حاضر مزارعین کوٹھی میں آگئے۔ فیصلہ

سُننے کے لئے رجھائی صاحب نے پرانسکو کو حکم دیا کہ بتاشوں کا شربت اپنے للتے ہوئے کیلی کے پانی میں بنا کر ملکھان سنگھ کو پلا دو اور پیپل کا ایک ایک پتہ گاؤں کے پنچوں کو بانٹ دو۔ اس دوران ہم لوگوں نے آموں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ تقریباً ۳ گھنٹہ کوٹھی کے اندر اور باہر رت جگا رہا اور مجلس برخاست ہوئی۔

بہرحال اب یہ سب کچھ ایک بھولی بسری داستان ہے۔ جہاں تک میرے ذاتی تاثرات کا سوال ہے تو میں یہ کہوں گا کہ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں یک بے آب وگیاہ ریگ زار میں یکہ وتنہا کھڑا ہوں۔ میری حیثیت بادل کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی سی ہے ؎

آنکھ کھلتے ہی جو کھو جائے اندھیرے میں کہیں

ذہن میں الجھے ہوئے ہیں چند بیجاں سے نقوش۔

اور ان میں بھی نہیں ہے کوئی ربط باہمیں۔

خواب دیکھا تھا ترے دامن کی چھاؤں میں کبھی

ایک ایسا خواب جس کا مدعا کوئی نہیں۔

ان کی وفات کے بعد عمرہ پر روانگی سے پہلے میں ان کی قبر پر رخصت ہونے گیا قبر کے پکے چبوترے پر بیٹھ کر کاروانِ خیال تو زادہ ، درباب نگر کیلی اور بھٹالی کی شکار گاہوں سے نکل کر کراچی ، لاڑکانہ ، میرپورخاص ، نواب شاہ ، سانگھڑ ، خیرپور ، شہداد پور ہوتا ہوا کراچی پہنچ گیا مگر یہ قافلہ جب دوبارہ کراچی واپس پہنچا تو صبا رِ اجل نے تاریکی میں قافلہ کو اچک لیا۔ اور میں ان کی قبر پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

آج ہر احساس ہے لاکھوں

ڈھلتا دن اور تیری قبر پر	دیر سے بیٹھا ہوا ہوں سرنگوں
طاری ہے اک مضطر سکوت	اب نہ سوزِ غم نہ وہ سازِ جنوں
محسوس ہوتا ہے مجھے	جیسے تیرے ساتھ میں بھی دفن ہوں

انتظار حسین

جمیلہ ہاشمی

"تم نے میری کہانی ترمورتی پڑھی؟"

"نہیں ابھی نہیں پڑھی۔"

"دوسری کہانیاں؟"

"چھری کے نیچے دم تو لینے دو۔ ابھی تو تم نے مجھے کتاب دی ہے۔ اب پڑھوں گا۔"

یہ ابھی پچھلے برس کی بات ہے جب جمیلہ ہاشمی نے اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ 'رنگ بھوم' جو انھیں دنوں شایع ہوا تھا مجھے دیا تھا۔

دوسری ملاقات میں پھر وہی تقاضا "تم نے ترمورتی پڑھی؟"

"پڑھ رہا ہوں۔ یہ کہانی ابھی نہیں پڑھی ہے۔"

"میں نے ہندو کلچر کے رنگ کی کہانیاں لکھی ہیں۔ کیسی ہیں۔"

"پوری کتاب پڑھ لوں۔ پھر بات ہوگی۔"

تیسری ملاقات جب ہونے کو تھی تو میں نے جلدی جلدی وہ کہانی پڑھی۔ ملاقات ہونے پر پھر وہی سوال اور میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ترمورتی پڑھ لی ہے"۔

"کیسی ہے"

"اچھی ہے"

جمیلہ اس دو لفظی داد سے مطمئن نظر نہیں آرہی تھی وہ کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ میں نے ج

سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کتاب کے بارے میں لکھوں گا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ جمیلہ نے بار بار ایک ہی کہانی کے بارے میں مجھ سے کیوں سوال کیا۔ کیوں اس کہانی کے بارے میں رائے معلوم کرنے اور سننے کے لیے اس کے یہاں اتنی بے چینی تھی۔ میں اس وقت اس کہانی کے بارے میں تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا تو اپنے اس رویے کی تو میں وضاحت کر سکتا ہوں۔ اچھی کہانی مجھ سے فوراً کے فوراً کچھ نہیں کہتی۔ تھوڑا وقت گذرنے کے بعد جب وہ واپس میری یادداشت میں آتی ہے تو پھر اپنے تھوڑے تھوڑے معنی سمجھاتی ہے۔ تو چند مہینوں کے بعد جب مجھے اس کہانی کا خیال آیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ کہانی تو جمیلہ کی دوسری کہانیوں سے مختلف قسم کی کہانی ہے۔

جب جمیلہ نے داد طلب لہجہ میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ دیکھو میں نے ہند کلچر کے رنگ کی کہانیاں لکھی ہیں تو میں نے اس وقت اس بات کو سرسری لیا تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ مجھے یہ پتہ ہے کہ رومانی رنگ میں کوئی کہانی لکھنے والا ہند تہذیب کی طرف جاتا ہے تو اس کی نیت کیا ہوتی ہے۔ وہ وہاں اپنی رومانیت کے لئے غذا حاصل کرنے کی نیت سے جاتا ہے۔ وافر مقدار میں غذا حاصل کی اور واپس آگیا۔ اسی مجموعہ میں اس رنگ کی جو دوسری کہانیاں ہیں ان میں ہند تہذیب کے رنگوں سے یہی کام لیا گیا ہے۔ مگر اس کہانی میں جمیلہ اور رستے پر چل پڑی اور میں حیران ہوں کہ جمیلہ یہاں تو ہند رسم و رواج کی رنگ بھری فضا سے گذر کر سیدھی دیومالا کی اقلیم میں داخل ہو گئی، اور کس کہانی پر جا کر اس کی نظر ٹھہری ہے اور پھر کس خوبی کے ساتھ اس نے آج کے تشکیک زدہ، تعقل پسند ذہن کا دیومالا سے تصادم کرایا ہے اس تصادم نے کہانی کو عجب شکل دی ہے کہ وہ RIDICULOUS اور SUBLIME کی آنکھ مچولی بن گئی ہے اور کس طرح پوری کہانی میں ایک ہلکے ہلکے مزاح اور طنز کی کیفیت سرسرا رہی ہے۔ یہ رنگ جمیلہ کے یہاں پہلے کہاں دیکھنے میں آیا تھا۔

میں اس وقت اس کہانی کے متعلق بس اتنا ہی سوچ پایا تھا۔ اب جبکہ جمیلہ اس دنیا میں نہیں ہے اور اب جبکہ وہ اپنی کسی کہانی کے بارے میں مجھ سے پوچھنے نہیں آئے گی اور اب جبکہ اپنی کسی رائے کے سلسلہ میں مجھے اس کی ناراضگی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے تو میں اس

کے ناولوں، طویل مختصر افسانوں اور مختصر افسانوں کو اپنے حافظہ میں دہرانے کی کوشش کر رہا ہوں، الٹ پلٹ کے دیکھ رہا ہوں، اس بی بی نے اس فن میں کیا کمایا ہے اور اس عمل سے گذرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر 'ترمورتی' مجھے یاد آتی ہے اور اس مرتبہ وہ مجھے اس طرح پکڑلیتی ہے کہ میں چونک پڑتا ہوں۔ آخر جمیلہ نے کیا سوچ کر یہ کہانی لکھی۔ اس کے اندر کیا ہو رہا تھا کہ یہ کہانی ظہور میں آئی۔ کیا وہ شعوری طور پر موت کے مسئلہ سے دوچار تھی یا تحت الشعور کی سطح پر موت سے کچھ اشارے کنائے ہو رہے تھے کہ یہ کہانی لکھی گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہندو دیومالا کی ساوتری تک جمیلہ اپنے رومانی تخیل کی راہ سے نہیں پہنچی ہے۔ کوئی اور پراسرار اشارہ تھا جو اسے موت کے سائے میں ایک لمبی یاترا کرنے والی اس عورت تک لے گیا۔ ساوتری عجب عورت تھی۔ اس کم بخت نے کس جوان کو اپنے شوہر کے طور پر پسند کیا جس کے متعلق اسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ سال کے اندر اندر مر جائے گا۔ ساوتری کس شدت سے اس آنے والے سنگین وقت کا انتظار کرتی ہے اور جب وہ گھڑی آتی ہے تو وہ موت سے الجھ پڑتی ہے۔ یم دوت نے ستیہ وان کی روح قبض کر لی ہے اور اب وہ اپنے ڈیرے کی طرف جا رہا ہے۔ ساوتری سائے کی طرح اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ سمندروں، پہاڑوں آسمانوں سے گذرتی ہوئی اندھیری بھید بھری راہوں پر ایک لمبی یاترا۔ یم دوت جھنجھلایا ہوا ہے کہ ایک عورت کس بے خوفی سے اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ آخر میں مار کھا جاتا ہے اور ستیہ وان کی زندگی اسے واپس کرنی پڑ جاتی ہے۔

اس کہانی کو میں نے پہلے کتنی بار پڑھا تھا اور جب موت سے مقابلہ کی اس کہانی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو اسی قبیل کی ایک اور کہانی کا حوالہ دیتا چلوں۔ اپنشدوں میں بیان ہونے والی وہ کتھا جس میں ایک برہمن دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنا سارا مال و متاع بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اس کا نوخیز بیٹا نشکت پوچھتا ہے کہ باپ میں بھی تو تیرا مال ہوں۔ مجھے تو نے کس دیوتا کو بھینٹ دیا ہے۔ باپ کے منھ سے بیساختہ نکلتا ہے کہ میں نے تجھے یم دوت کو بھینٹ دیا۔ نشکت فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور یم دوت کے ڈیرے کی طرف چل پڑتا ہے۔ یم دوت سے کرنے کے لئے اس کے پاس سوال ہی سوال ہیں۔ یم دوت لاکھ پہلو بچاتا

ہے مگر جواب دینے پہ بالآخر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں نے ان کہانیوں کو پڑھا اور سوچا کہ قدیم ہندو بصیرت نے موت کے تجربے کو گرفت میں لانے کے لئے، اس کی تھاہ تک پہنچنے کے لئے اس کے ذریعہ زندگی کے بھید جاننے کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ ایک دفعہ ایک عورت یم دوت کے گلے پڑ جاتی ہے۔ دوسری مرتبہ ایک نوجوان اسے بحث میں الجھا کر اس سے حکمت کے موتی رول لیتا ہے۔ میں نے کتنی بار سوچا کہ کیا ان میں سے میں کوئی اپنی کہانی نکال سکتا ہوں۔ لیکن ہمیشہ یہی احساس ہوا کہ یہ کہانیاں بڑی ہیں، میں چھوٹا ہوں۔ پتہ نہیں جمیلہ ہاشمی کس عالم میں تھی کہ اس نے ساوتری کی کہانی سے اپنی کہانی نکال لی۔

جمیلہ ہاشمی کے یہاں آکر ساوتری کو ناستکوں کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ اس کے قول و فعل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگتا ہے۔ بے چاری ساوتری۔ ایک بنواری دادا ہیں جو ساوتری پوجا کی رسم ہی کو فضول جانتے ہیں کہ ان کی دانست میں کسی پوجا کسی برت سے ہونی کو نہیں ٹالا جا سکتا۔ پھر مونیک ہے جو سنیاس لینے کے شوق میں مغرب سے یہاں آئی ہوئی ہے مگر اپنی نئی تہذیب کا عطا کردہ تعقل اور تشکیک ساتھ لائی ہے۔ سو وہ ساوتری کتھا یکسوئی کے ساتھ نہیں سن سکتی۔ بیچ بیچ میں شک سر اٹھاتا ہے ــ کوئی موت کی شکل دیکھ سکا ہے کیا ــ کیسی راجکماری تھی۔ اکٹھے سو بیٹے مانگ لئے۔ بچوں کو سنبھالنا تو یوں ہی بہت مشکل ہو گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اچلا جھنجھلا اٹھتی ہے "مونیک کتھا سننے کا یہ طریقہ نہیں۔"

اچلا نے ٹھیک کہا۔ کتھا سننے کے کچھ آداب ہیں۔ یہاں جوتیاں باہر اتار کر آنا پڑتا ہے۔ اچھا ہو کہ راضی برضا ہو کر اپنی تشکیک کو اتنے عرصے کے لئے معطل کر دیا جائے مگر مونیک اپنی تشکیک کو معطل کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ اچلا سے کہتی ہے "تم مجھ سے اس سلسلہ میں سوال کرنے کا حق نہ چھینو بھئی۔"

مگر کہانی کا اپنا ایک سحر ہے مونیک نے اپنی رضامندی سے تو اپنی تشکیک کو معطل نہیں کیا۔ بس کہانی کے سحر میں گم ہوتی چلی گئی۔ شروع میں اس نے شک ظاہر کیا تھا کہ "کیا ساوتری کتھا سچ ہے۔" اور اب جب کہانی ختم ہوئی ہے تو اسے سب کچھ سچ نظر آ رہا ہے۔ مگر اس کے

دو ر

۔ ۔ اب ایک اور سوال سر اٹھاتا ہے "ستیہ دان اور ساوتری اب بھی کہیں ہوں گے"۔

اچلا اس سوال پر کسی قدر حیران ہوتی ہے۔ راست یگ ختم ہو گیا۔ یگ بیت گئے۔

ف دیوتا امر ہوتے ہیں"۔

اور مونیک کہتی ہے: "وہ ایک بار موت کے سمندر دں کو پار کر چکے تھے۔ واپس

لے تھے۔ یم دیوتا کے ساتھ انھوں نے لمبی مسافت طے کر لی تھی۔ پھر انھیں مرنا نہیں چاہیئے

تھا۔"

اچلا سوچ میں پڑ جاتی ہے۔

"وہ کیوں امر نہیں ہوئے"۔ مونیک کا سوال پھر سنائی دیا۔

اب اچلا اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ مونیک کو سرزنش کر سکے کہ کتھا سننے کا یہ طریقہ

ں ہے۔ وہ خود اس پیچ میں پڑ گئی ہے کہ جب انھوں نے موت کا سمندر پار کر لیا تھا تو وہ امر

ں نہیں ہوئے۔ اور مونیک کہہ رہی ہے "اچلا، جب آدمی امر نہیں ہو سکتا۔ جب موت

ا بار اسے چھو جاتی ہے تو پھر بچنے سے کیا ملے گا۔ تم کتھا سنا رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی

ہ دونوں اب بھی ہوں گے۔ پر جب تم کہتی ہو کہ وہ نہیں تو چند دنوں کے لئے موت

لنے سے فائدہ۔ سب سے بڑی شکتی جب دھرم راج کی ہے تو ہم پوری ٹک اس کا پیچھا کرنے

بھی ہمیں کیا ملتا ہے۔ جسے بچا کر لاؤ، وہ لوٹ ہی تو جاتا ہے"۔

اچلا کے پاس مونیک کی اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کہتی ہے کہ اچھا صبح

ی دادا سے پوچھیں گے۔ مگر صبح کو پتہ چلتا ہے کہ بنواری دادا تو سدھار گئے اب کس سے

اجائے۔ مونیک کے سوال کا جواب کون دے۔

وہ وقت گذر جاتا ہے۔ مونیک بھی چلی جاتی ہے۔ مگر بہت وقت بیت جانے پر

چلا اس بات کو بھول نہیں پاتی۔ اسے بنواری دادا یاد آتے ہیں" جو کہا کرتے تھے کہ مرنے

جینے کے بیچ ایک قدم کا فاصلہ ہے، جو اس راستے کو پھلانگ کر اتھاہ ہے کنارہ موت سے

ت جیون میں ہنسی خوشی داخل ہو گئے"۔ اور پھر اسے مونیک یاد آتی ہے جو جانے کہاں

م رہی ہوگی، جانے اسے کس شئے کی کھوج تھی، کیا اس نے موت سے مکت ہونے کا گر سیکھ

بنا ہوگا"۔ اور مجھے رہ رہ کر جمیلہ کا خیال آرہا ہے کہ جانے اسے کیا ہوا کہ اپنے رومانی انداز میں کہانیاں لکھتے لکھتے اور محبت کی کیفیتوں کو میٹھے لفظوں میں بیان کرتے کرتے موت کے تجربے کی اقلیم میں جانکلی اور ساوتری کے سہارے کتنی دور نکل گئی کہ اب جب میں نے اس کہانی کو پڑھا تو لگا کہ جمیلہ یم پوری کی طرف اڑی چلی جا رہی ہے اور مجھے خیال آرہا ہے کہ کیا یہ کہانی لکھنے کی برکت سے اس کے لئے موت اتنی آسان ہوگئی کہ مرے اور جینے کی بیچ کا فاصلہ اس کے لئے سچ مچ ایک قدم کا فاصلہ بن گیا۔

جمیلہ ہاشمی نے آخری فقرہ لکھا "جانے آدمی موت سے مکت ہونا کیوں چاہتا ہے۔ جانے کیوں" اور کہانی کو ختم کر دیا۔ یہ سوال کس نے کیا ہے، افسانے کے مرکزی کردار اچلا نے یا خود جمیلہ ہاشمی نے جس کسی نے بھی کیا ہو۔ جمیلہ ہاشمی کی کہانی یہاں آکر ختم ہو جاتی ہے۔ جمیلہ کی کہانیاں آگے ایک رومانی افسردگی پر ختم ہوا کرتی تھیں۔ اب کے ایک گمبھیر سوال پر ختم ہوئی ہے اسی سے ملتا جلتا سوال نشکت نے یم دوت سے کیا تھا "جب آدمی مرجاتا ہے تو ایک شک پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب وہ نہیں رہا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں وہ ہے۔ اے یم دوت تو مجھے بتا کہ ان میں سے سچی بات کونسی ہے"۔

نشکت نے یم دوت سے کتنے سوال کئے اور ہر سوال کا جواب لے کر مانا اور جب وہ سب سوال کر چکا اور سب سوالوں کے جواب اسے مل چکے تو اس کے اندر کی نجاستیں دھل گئیں اور وہ موت سے مکت ہو گیا۔

مگر جمیلہ کی کہانی میں تشکیک نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ موت سے مکت ہونے کا خیال ہی عبث نظر آتا ہے ـــــ "جانے آدمی موت سے کیوں مکت ہونا چاہتا ہے۔ آخر کیوں۔"

عائشہ صدیقہ

میری ماں

ہم دونوں کا رشتہ ایک روایتی ماں بیٹی کا رشتہ نہیں تھا بلکہ اُن دوستوں جیسا تھا جنھیں زمانے سے ایک دوسرے کی تلاش ہو اور پھر اسی کھوج میں وہ ایک دوسرے کو پالیں۔ ہماری زندگی کے دُکھ سُکھ سب سانجھے تھے۔ میں کہتی امّی میں نے باہر پڑھنے کے لئے جانا ہے تو امّی کہتیں۔ "نہیں بیٹی تمہارے بغیر میں کیسے رہ سکتی ہوں" اور اگر کبھی امّی مجھے لاہور میں بوجوہ چھوڑ کر گاؤں جاتیں تو میری یہی رٹ ہوتی امّی جلدی واپس آجائیں، بس آپ آجائیں، کام ہوں یا نہ ہوں، آپ واپس آئیں اور امّی کاموں کو مختصر کرکے واپس دوڑی چلی آتیں اور زندگی پھر سے مکمل اور بھرپور لگنے لگتی۔

شعور کی منزل میں آنے کے بعد تقریباً ہر انسان بھول جاتا ہے کہ زندگی اسے RUDE SHOCKS دینے کی اہلیت رکھتی ہے اور دیتی بھی ہے۔ جب ۱۰ رجنوری کی رات کو امّی کو میو اسپتال کے اے دی ایچ وارڈ میں لے کر گئے تو مجھے سو فی صد یقین تھا کہ میری امّاں موت سے جیت کر میرے لئے آجائیں گی۔ وہ تو مجاہد تھیں۔ دلیر اور باہمّت تھیں بھلا وہ کیسے موت سے ہارتیں مگر ایسا ہی ہوا اور میری شیرنی جیسی باہمّت، بہادر ماں جس نے زندگی کی اتنی کٹھنائیوں کا اتنے حوصلے اور جرأت مندی سے ہمیشہ مقابلہ کیا تھا موت سے ہار گئی۔

کیا ایسا بھی ممکن تھا۔ میری ماں ایک بلند حوصلہ خاتون تھیں IN SHORT SHE WAS A BORN FIGHTER اور ایک فائٹر میں سروائیو

کرنے اور حالات سے مقابلہ کرنے کی بے انتہا صلاحیت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز یعنی کہ ODDS کا مقابلہ کرتی رہیں۔ آخری دم تک۔

میرے بابا جن کا انتقال ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ اس کے بعد امی کی زندگی کو ایک اچانک فوری تبدیلی کے عمل سے گزرنا پڑا۔ انہیں ایک بیوی، جسے باہر کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔ چھوڑ کر اچانک ایک مرد ایک ہیڈ آف دی فیملی بننا پڑا اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے FEUDAL SYSTEM کے خلاف لڑنے کے لئے سینہ سپر ہوگئیں جو کہ ظالمانہ اور جنونی ہے۔

ادیبوں اور لکھنے والوں کی برادری کو یہ INTELLECTUAL شکایت تھی کہ جمیلہ ہاشمی ایک زمیندارنی ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ جمیلہ ہاشمی اس بیہودہ نظام کا ایک شکار تھی جس نے آخر ان کی جان لے لی۔ ایک ایسا نظام جہاں چادر اور چار دیواری کے تحفظ امن اور انصاف اور اس قسم کے اور نعرے سب بے کار لگتے ہیں۔ جہاں سب کچھ بکتا ہے کمزور کی جان چلی جائے لیکن میری ماں نے ان تمام حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

آتشِ رفتہ میں ایک جگہ لکھتی ہیں :

"دادی اگر دکھ کے سامنے چٹان نہ بنتی تو مٹی کے تودے کی طرح ڈھے جاتی۔ دھیان پور والوں کی سردارنی بیٹی کے دشمنوں اور رشتے داروں کے سامنے جس شان اور جس دل گردے کا ثبوت دیا اس پر سارے اپنے بے گانے حیران رہ گئے۔ دم دم مہر سنگھ کے گھر کی کہاریاں اور چمارنیں گلی سے گزرتیں۔ شاید بین کرنے کی آواز آئے شاید سردارنی کرتار کور انوپ سنگھ کی موت پر آنسو پی جانے والی اب بیٹے کی موت کی خبر سن کر پلو پھیلا پھیلا کر رو دے اور دشمنوں کو یہ دعائیں دے۔ چوپال کی بھیڑ بھاڑ میں بیٹھا سردار مہر سنگھ کہتا ہے بلے بھئی عورت ہے پر مردوں سے بھی زیادہ حوصلے والی۔ دھیان پور والے ہی ایسی شیرنی پیدا کر سکتے ہیں۔"

اور میری ماں جب اس دنیا کے جھمیلے چھوڑ چھاڑ کر دنیا سے چلی گئی تو ہمارے گاؤں خانقاہ شریف جہاں وہ بیاہ کر گئی تھیں اور غیر تھیں وہاں کے لوگ آنسو بہا رہے تھے اور کہتے تھے آج خانقاہ کی شیرنی، اس کی شہنشاہ، اس کا مان سب رخصت ہو گیا ہے ——
دشمنوں کی ایک پلٹن، جو مردوں پر مشتمل تھی، اس کا تن تنہا مقابلہ کرتے آخر میری ماں تھک کر چلی گئی۔ لیکن مجھے تو اپنے دشمنوں سے نہیں اس نظام، اس سسٹم اور اس معاشرے سے گلہ ہے، جو اندر سے گلا سڑا ہوا ہے۔ جو امن اور انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، جس کی وجہ سے انسانی جان بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے لڑتے لڑتے آخر جری بہادر بھی بے بس ہو کر چلے جاتے ہیں۔ نہ جانے ایسا کیوں ہے۔ کیا اس معاشرے کو اچھے لوگوں کی قدر نہیں۔ اچھے اور جینوئن (GENUINE) انسان جو کہ اپنی کنوکشنز (CONVICTIONS) پر ڈٹے رہیں چاہے زندگی کا میدان ہو یا ادب کا۔

وہ نہ صرف ایک GENUINE انسان بلکہ ایک جینوئن رائٹر (GENUINE WRITER) بھی تھیں ایک ایسا WRITER جو کہ P R کے بکھیڑے سے آزاد صرف اپنے کام اور انتھک محنت کا محتاج ہو۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک خط میں امی کو لکھا تھا کہ:

"جب سماج میں HYPOCRATES اور MEDIOCRES
اور بزعم خود غلط قسم کے فنکاروں کا تسلط ہو جائے تو تم جیسے لوگوں کو نہایت
سنجیدگی سے اپنے معیار اور CREATIVITY کو برقرار رکھنے اور جلا
دینے کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔"

مجھے فخر ہے کہ میری ماں کو خوشامد اور فریب کے بجائے محنت کے مشکل فن پر دسترس حاصل تھی۔ وہ ہر SUBJECT پر سالوں RESEARCH کرتیں سقوط ڈھاکہ اور اسپین کے تناظر میں لکھے جانے والے دو ناول جنہیں وہ مکمل نہ کر سکیں اس پر وہ آٹھ دس سال کام کرتی رہیں۔
وہ لکھتیں تو اپنی تخلیقی آسودگی (CREATIVE SATISFACTION) کی خاطر۔
ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اُس اِنر سیلف (INNER SELF) کی سردا لوُل

(SURVIVAL) کا ہوتا تھا، جو کبھی اپنے آپ سے چھپ نہیں سکتا۔ آپ کا اندر کا اصل اور سچا انسان اور شاید ان کی زندگی کے مقصد کی غمازی یہ دعا کرتی ہے جو انہوں نے اپنے آخری دنوں میں لکھی تھی اور جس کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتی ہوں۔

"اے خدا ہم تجھ سے آزادی اور علم اور انصاف اور عزت کے سوالی ہیں۔

ہماری آرزوئیں پوری کر۔

ہم کٹھنے وقت کے ہاتھوں اسیر ہیں،

جہالت اور ذلت میں گھرے ہیں۔

ہم پشیمان اور خستہ حال ہیں

اور ظلم کی قربان گاہوں پر چڑھائے جاتے ہیں۔

ذلتوں کے مارے لوگ۔

ہمیں زندگی کی کرن دے

ہم میں صالح رہنما پیدا کر

اے خدا ہمارے بڑوں کو احساس ذمہ داری دے۔

عوام کو علم، اعتقاد اور یقین کی روشنی عطا کر

اے خدا موت اور بیچارگی کے درمیان خون ناحق سے محبت کی کھیتی اُگے اور اے چمن تو آباد رہے تاکہ تیری آبیاری کرنے والے تجھے سنوارتے رہیں۔ تجھ سے خوشی حاصل کریں تجھے تعمیر کرتے رہیں۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی

تھی جن سے گفتگو...

۷ار نومبر ۱۹۲۹ء کو گوجرہ میں پیدا ہونے والی جمیلہ ہاشمی ۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء کو لاہور میں وفات پا گئیں۔ یہ سب کچھ یوں اچانک ہوا کہ قضا و قدر کی اس سفاکی پر یقین نہیں آتا، جیسے مردانہ ہو چیل جھپٹا ہو۔ چیل آئی اور زندگی کے ہاتھوں سے، جھپٹا مار کر، جمیلہ ہاشمی کو ابدی فضاؤں میں اڑا کر لے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور میں ایک مختصر سی کہانی چھپی۔ کہانی کا نام تھا "دو خط"۔ پڑھی تو اچھی لگی اس کے بعد اور کئی کہانیاں اس افسانہ نگار کی پڑھیں اور وہ بھی اچھی لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اردو افسانے میں نیا اور تازہ خون شامل ہو رہا ہے۔ جب بھی جمیلہ ہاشمی کی کوئی کہانی چھپتی میں شوق سے پڑھتا۔

۱۹۵۹ء کے دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور نئے سال کا سورج نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ طلوع ہونے کے لئے تیار تھا۔ انھیں تاریخوں میں کراچی میں رائٹرز کنونشن ہوا۔ اس وقت کراچی متحدہ پاکستان کا دارالحکومت تھا اور مشرقی پاکستان ہمارے جسم قومی میں دل کی طرح دھڑکتا تھا۔ ادیبوں کے اس کنونشن کے سلسلے میں میرے اور قرۃ العین حیدر کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ بعض ادیبوں کو کراچی اسٹیشن سے لاکر انہیں ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جائے۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا سفر اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ ریل ہی وہ تیز رفتار سواری تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی تھی۔ ہوائی جہاز کے سفر کا مزا اور اخبارات میں بیان چھپوانے کا چسکہ ابھی نہیں پڑا تھا اور تعلقاتِ عامہ کے دفاتر بھی نہیں کھلے تھے۔ اُس زمانے کا ادیب آج

سے ادیب کے مقابلے میں یقیناً پسماندہ تھا۔ وہ زیادہ پڑھتا تھا اور زیادہ بحث کرتا تھا اور حیات و کائنات، سماج اور زندگی کے مسائل پر ایسے غور کرتا تھا جیسے یہ اس کے اپنے مسائل ہوں اور انھیں سلجھانا اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہو۔ میں اور عینی بیگم (قرۃ العین حیدر کو ہم سب اسی نام سے پکارتے تھے) اسٹیشن گئے اور چند ادیبوں کو ان کی قیام گاہ تک پہنچا دیا۔ انھیں ادیبوں میں سفید گرم چادر لپیٹے ایک صحت مند نوجوان سی لڑکی بھی تھی۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی خاتون ہیں جن کے افسانے میں نے "لیل و نہار" میں پڑھے تھے۔ نام جس نے آج ساری اردو دنیا میں مسلسل اور اچھا لکھنے سے اعتبار کا درجہ پالیا ہے، جمیلہ ہاشمی تھا۔ اسے نام کی مناسبت کہیئے یا تذکیر و تانیث کی مطابقت۔ اس دن سے مرنے کے دن تک، دوستی و خلوص کا رشتہ ماہ و سال کی گردش سے بے نیاز ہو کر قائم رہا۔ آج یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ رشتہ سدا سے تھا اور سدا رہے گا۔ جمیلہ ہاشمی کا نام نیا دور کراچی کی مجلس ادارت کی آج تک زینت ہے۔

ابھی پچھلے دنوں جمیلہ ہاشمی ۸ ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو میری بیٹی کی شادی میں شرکت کے لئے کراچی آئی تھیں اور ۷ ار دسمبر ۱۹۸۷ء کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی جب وہ شادی کی تقریبات سے نمٹ کر اپنی بیٹی عاشی کے ساتھ اپنے گاؤں خانقاہ شریف جا رہی تھیں۔ ان دس دنوں میں وہ خوش و خرم رہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ گانے بجانے میں شریک ہوئیں۔ مہندی میں آن لگیں۔ ولیمے میں شرکت کی۔ پرہیز بھی کیا۔ بد پرہیزی بھی۔ پرہیز میری مروت میں اور بد پرہیزی اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر۔ میں شاید واحد آدمی تھا جس کا وہ لحاظ کرتی تھیں۔ ایسا لحاظ جیسا بہنیں بھائیوں کا کرتی ہیں۔ وہ ذیابیطس کی مریض تھیں۔ میٹھا کھا رہی ہوتیں تو مجھے دیکھ کر پلیٹ دور کر دیتیں، جس دن بد پرہیزی کا ارادہ ہوتا اور نیت ڈانوا ڈول ہوتی تو میرے ساتھ کھانا نہ کھاتیں۔ جمیل صاحب! میں نے ناشتہ دیر سے کیا ہے۔ میں بعد میں ٹھہر کر کھاؤں گی۔ جب لاہور یا خانقاہ شریف سے آتیں تو میرے سب بہن بھائیوں سے ملتیں۔ میری بیوی کی تو ایسی گرویدہ تھیں کہ تعریف کرتے کرتے زبان سوکھ جاتی۔ اپنی بیماری کا کبھی ذکر نہ کرتیں۔ جمیلہ بی کیسی ہیں آپ۔ میں پوچھتا۔ اچھی ہوں جمیل صاحب۔ نیا ناول شروع

کر دیا ہے۔ موضوع فوراً بدل جاتا اور مسلم اسپین کی تاریخ پارینہ کا قصہ چھڑ جاتا جس پر وہ اپنا نیا ناول لکھنے کی تیاری گزشتہ دو سال سے کر رہی تھیں۔ جمیل صاحب! یہ ناول آپ کو پسند آئے گا اور اس بار آپ مجھ سے ضرور کہیں گے جمیلہ بی! یہ وہ تحریر ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں بھی جمیلہ بی سے بہت توقعات رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ایسے ناول یا افسانے لکھیں کہ زندگی ہی میں کلاسیک بن جائیں۔ آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں میں اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ جمیلہ ہاشمی نے اردو ادب کو ایسی کہانیاں، ناولٹ اور ناول دیئے ہیں کہ ان کا نام تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ آتش رفتہ، روہی اور دشت سوس وہ ادب پارے ہیں جو آنے والے زمانوں میں بھی تازہ و زندہ رہیں گے۔

۱۹۷۹ء میں میری بیوی اور جمیلہ ہاشمی نے حج کا پروگرام بنایا۔ طے پایا کہ میں اور میری بیوی کراچی سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور جمیلہ ہاشمی اور ان کے میاں سردار احمد اویسی لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور ہم سب ۱۸ اکتوبر کو معلم کے ہاں ملیں گے۔ ۱۸ اکتوبر کو ہم دونوں سارے دن ان کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہیں آئے۔ تین چار دن بعد کسی نے کراچی کا اخبار "جنگ" لا کر دیا تو ایک خبر پر میری نظر جمی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ میاں سردار احمد اویسی اُس وقت وفات پا گئے جب اُن کا جہاز جدہ کے ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا۔ ان کی میت کراچی واپس لائی گئی۔ جمیلہ ہاشمی اور ان کی اکلوتی بیٹی عائشی ساتھ تھے۔ سردار احمد ہیرا آدمی تھے۔ سیدھے سادے، شریف النفس اور وضع دار۔ جمیلہ ہاشمی کا ایسا خیال رکھتے جیسے مالی تازہ گلاب کا رکھتا ہے۔ ساری ذمہ داری، گھر کی باہر کی، خود اٹھاتے اور جمیلہ کو لکھنے پڑھنے کے لئے تازہ دم رکھتے، جو وہ کہتیں وہ کرتے۔ عائشی کو ہر دم اپنے ساتھ رکھتے، جو اس کے منہ سے نکلتا پورا کرتے۔ ناز و نعم میں پلی یہ بچی اب بن باپ کے رہ گئی تھی اور جمیلہ بھی جائداد کے جھگڑوں اور مقدموں سے نمٹنے کے لئے اکیلی رہ گئی تھیں جس پامردی سے انہوں نے زندگی کے جھمیلوں کا مقابلہ کیا جمیلہ کی زندگی کا وہ نیا رُخ سامنے آیا جو اب تک چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے بیٹی کے ساتھ مل کر زمینوں اور جائداد باغ کے انتظام کو ایسے سلیقے سے چلایا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلے باپ کی لاش عائشی اپنے گاؤں لے کر گئی تھی اور ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء

کو وہ اپنی ماں کی لاش اپنے گاؤں لے کر گئی تاکہ آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دے۔ مصحفی نے کہا تھا ؎

کیا تماشا نظر آتا ہے انہیں، حیراں ہوں
یار کیوں خاک کے پردے میں چھپے جاتے ہیں

۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء میں اسلام آباد میں تھا کہ کراچی سے فون آیا۔ جمیلہ ہاشمی بہت بیمار ہیں اور انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں کل رات سے داخل ہیں۔ میں نے لاہور ٹیلی فون کیا۔ عائشی نے اٹھایا وہ رو رہی تھی۔ انکل میں کیا کروں۔ امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انکل میں کیا کروں۔ میں نے تسلی دی۔ ڈھارس بندھائی اور کہا میں ابھی دوبارہ فون کرتا ہوں۔ کشور ناہید کو فون کیا۔ وہ نہیں ملیں۔ سائرہ ہاشمی کے گھر فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملیں۔ انتظار حسین کو فون کیا وہ بھی نہیں ملے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج لاہور خالی ہو گیا ہے۔ دوبارہ عائشی کو فون کیا۔ جمیلہ ہاشمی کے بہنوئی یعقوب خان صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات ساڑھے دس بجے کے قریب اچانک طبیعت خراب ہوئی، فوراً ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو بلڈ پریشر کی مشین خط مستقیم بنا رہی تھی۔ خون میں شکر کی سطح ۳۹۶ ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے دماغ متاثر ہو گیا تھا۔ رات سے لے کر دوسرے دن ایک بجے تک انہیں زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی کوششیں مسیحائے لاہور کرتے رہے۔ جب سانس کا دھاگا ٹوٹنے لگتا تو وہ سانس بحال کرنے اور زندہ رکھنے کے لئے پسلیوں اور سینے کو دباتے۔ بجلی کے جھٹکے دیتے۔ اس عمل سے پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ دس بارہ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد وہ آس نراس کی کیفیت سے باہر نکلے اور ایک بج کر تین منٹ پر اعلان کیا کہ مریض نے دم توڑ دیا ہے اور وہاں چلا گیا ہے۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے پوچھا عائشی کہاں ہے؟ وہ دھاڑے مار کر رو رہی تھی۔ انکل میں کیا کروں۔ امی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ میں نے مقدور بھر تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا میں جلد پہنچتا ہوں۔ اس وقت تک جمیلہ ہاشمی کی میت ہسپتال میں تھی۔ گھر نہیں آئی تھی۔ میں نے اسلام آباد سے لاہور پہنچنے کے انتظامات کیے اور ساڑھے تین بجے کے قریب پھر فون کیا۔ عائشی فون پر تھی۔ اب اس کے آنسو سوکھ

دور
چکے تھے اور سارا غم دل میں اتر گیا تھا۔ انکل میں امی کی تدفین کہاں کروں ۔" بیٹا" ! میں نے
ہا" اپنے گاؤں ہیں۔ میں انشاء اللہ ۴ بجے کے جہاز سے پہنچ رہا ہوں۔ انکل تو پھر ہم میت کو
یک گھنٹے میں خانقاہ شریف لے جائیں گے۔ میں نے پھر تسلی تشفی کی باتیں کیں اور فون رکھ دیا۔
بھی فون رکھا ہی تھا کہ اختر جمال کا فون آیا۔ بھائی ! میں نے بہن سے بات کی ہے۔ میں بھی آپ
وگوں کے ساتھ خانقاہ شریف چلوں گی ۔ اور جنوری کو ہم تینوں اسلام آباد سے لاہور، لاہور
سے ملتان اور ملتان سے کار میں خانقاہ شریف پہنچے تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ قبرستان پہنچے تو
جمیلہ ہاشمی کی قبر پر حافظ صاحب قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ مہاوٹ کی ہوا تیر کی طرح
جسم میں پیوست ہو گئی۔ ہوا سرد اور تیز ہو تو آنسو بھی آجاتے ہیں۔ میں نے آنسو پونچھے اور ہوا
کے رُخ کی طرف پیٹھ کر لی۔ فاتحہ پڑھی اور جمیلہ ہاشمی کے باغ میں آگیا جہاں گلاب کے بے شمار
پودے دم سادھے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ کشور ناہید اور نثار عزیز بٹ تصویر غم بنی ساکت و
صامت سر جھکائے بیٹھی تھیں اور مصحفی مجھ سے کہہ رہے تھے۔

تھی جن سے گفتگو ہمیں، وہ یار مر گئے
جنسِ سخن کے اپنی خریدار مر گئے۔

میراجی

ایک تضاد

کوہ سے زرّیں اذیت کے گذر جانے کے بعد
مرغِ نغمہ شام کو اک پل میں مرجانے کے بعد
ہاں، پس از فریاد و قلبِ دہر کی لرزش کے بعد
دن کی نم آلودہ زرد و لالہ گوں کاوش کے بعد
تیرگی کے داغ دل سے کس طرح دھوؤں گا میں
جاگتے ہی جاگتے پھر صبح تک رووں گا میں

ہاں وہی میں دن کو جس کی آنکھ تھی اور آفتاب
ہاں وہی میں جس نے دیکھا دہر لبریزِ حیات
ذہنِ انسانی مرا کہتا ہے کھا کر پیچ و تاب
دیکھ لے، حسنِ مناظر کو نہیں حاصل ثبات
قلبِ مے خانہ کی ہائے و ہُو کا عادی ہے مرا
کچھ تعلق ہی نہیں مجھکو سکونِ سنگ سے
مجھکو خوش آتی نہیں ہے امن کی شب گوں فضا
روح کو تسکیں ملے گی ایک پیہم جنگ سے

میرا جی

ایک خاموش عورت سے

عشرتِ انگیز دہن ہے کہ خمِ دورِ جہاں
تازگی وقت کے گذران سے بڑھ کر اس کی
خامشی پیرہنِ چست کی مانند عیاں
ایک اک لہر بنی عکسِ سمندر اس کی

دیکھ کر اس کو خیالِ درِ مقصود آیا،
آب آہنگ رواں جلوہ کناں ہو جیسے
خلشِ دستِ تغافل کا یہ گہرا سایہ
موجِ مے پھول کے دامن میں نہاں ہو جیسے

جنبشِ لب سے مرے سامنے آجائے گا،
دیکھو خاموش رہو مجھکو ابھی تاب نہیں
ایک اک لفظ مرے دل میں سما جائے گا
یہ ابھی غنچۂ گرمِ جوششِ خونناب نہیں

اس خمِ دورِ زماں پر جو شفق پھولی ہے
اس کو تم ساکنِ محرابِ زماں رہنے دو
میرے افسردہ تصوّر میں ہے اک اور ہی شے
میں جہاں پہنچا ہوں، تم مجھکو وہاں رہنے دو

میراجی

گیت

پنچھی کیا جانے کون آئے!
ہونی کی ہر ریت نرالی بیٹھی گھات لگائے
اونچی ڈال پر کرے بسیرا، پنچھی کیا جانے کون آئے!

جی میں سوچے آنچ نہ اس کو دُور جگت سے جس کا ڈیرا
من ہی من میں جوت جلے گی چاہے اُجالا چاہے اندھیرا
اونچی ڈال پر کرے بسیرا، پنچھی کیا جانے کون آئے

رات کے دل میں بھید چھپے ہیں، بھید بھنور ہے گھوم گھمیرا
چین کی راہ نہ پائے مُورکھ جس کے دل پر ڈالیں گھیرا
اونچی ڈال پر کرے بسیرا...

اندھیارے کا دھوکا جیسے کوئی یہ بولے سب کچھ تیرا
نئی اُمنگ میں ڈوب کر سوچے اب تو جلدی آئے سویرا
اونچی ڈال پر کرے بسیرا...

بھور بھئے بن بستی گھومے کوٹ کوٹ کا لگائے پھیرا
سانجھ سمے تھک جائے پکارے کون ہے تیرا کون ہے میرا
اونچی ڈال پر کرے بسیرا . . . . .

سنگ کا کاج ہے بھول بھلیاں سب ہیں بیری کوئی نہ تیرا
دکھ سکھ کا ہے بندھن جیسے آگے پیچھے سانجھ سویرا
اونچی ڈال پر کرے بسیرا . . . . .

بھید کا پردا کتنا گہرا اُدھر اُجالا ادھر اندھیرا
اِس کی تھاہ نہ پائے، گیانی کون مسافر کون لٹیرا
اونچی ڈال پر کرے بسیرا . . . . . .

دُور ہی دُور سے لہرا وُلی پاس گئے پر ایک تھپیڑا
جیون راگ سنے ہر کوئی جس دھن میں راگی نے چھیڑا
اونچی، ڈال پر کرے بسیرا، پنچھی کیا جانے کون آئے

ڈاکٹر آفتاب احمد

راشد کی یاد میں

'ماورا' کو شائع ہوئے کچھ عرصہ گذر چکا تھا اور ن۔م۔ راشد شعرِ نو کے امام کی حیثیت سے میری نسل کے نوجوان پڑھنے لکھنے والوں کے دل و دماغ میں بسنے لگے تھے، لیکن میں نے راشد صاحب کو کبھی دُور سے بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ان کی کوئی تصویر ہی میری نظر سے گذری تھی، لہٰذا بطور شخص راشد کا کوئی نقشہ میرے ذہن میں موجود نہیں تھا، ہاں ان کے بارے میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب سے ایک واقعہ ضرور سُن رکھا تھا اور وہ یہ کہ راشد ایک زمانے میں علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک سے وابستہ رہ چکے تھے اور ملتان کے دوران قیام میں وہاں کے خاکساروں کے سالار تھے۔ اُسی زمانے میں انہیں گورنمنٹ کالج میں مجلسِ اقبال کی ایک تقریب کے لئے دعوت دی گئی۔ راشد بیلچہ بردار خاکسار سالار کی وردی میں ملبوس کالج پہنچے اور جونہی کالج کے بیرونی گیٹ میں داخل ہوئے تو لاہور کے خاکساروں کے ایک جیش نے ان کو سلامی دی۔ مجلس میں راشد نے اپنا مقالہ پڑھا اور تقریب بخیر و خوبی انجام کو پہنچی کوئی ہفتہ بھر بعد کالج کے انگریز پرنسپل کو پولیس کی طرف سے ایک رپورٹ آئی تو صوفی صاحب کی پیشی ہو گئی اور اُن سے جواب طلب کیا گیا۔ صوفی صاحب نے پرنسپل کو سمجھایا کہ راشد کالج کے ایک نامور پُرانے طالب علم ہیں اور اسی حیثیت سے ان کو مجلسِ اقبال کی ایک تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کوئی خاکساروں کا اجتماع نہیں تھا اس پر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

راشد صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۳ء کی گرمیوں میں ہوئی میرے دوست امجد حسین اور میں دہلی گئے تو میرا جی مرحوم نے ہمیں اپنے ہاں دوپہر کے کھانے پر بُلایا۔ ہم دونوں

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ فرشی محفل ہے، ریڈیو سے متعلق میراجی کے کچھ اور ملنے والے بھی موجود تھے اور ایک ذرا پکتے رنگ کے دراز قد صاحب جن کے سر کے بال غائب تھے، چہرے پر چشمہ لگائے، سفید قمیص اور شلوار پہنے ایک گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے نیم دراز ہیں یہ تھے ن۔م۔راشد۔

راشد کو دیکھتے ہی مجھے صوفی صاحب کا سنایا ہوا واقعہ یاد آ گیا، مگر ظاہر ہے کہ میں خاموش رہا، میراجی نے راشد سے امجد کا اور میرا حلقۂ ارباب ذوق کے حوالے سے تعارف کرایا مگر دو چار رسمی باتوں کے علاوہ کوئی خاص بات نہ ہو سکی۔ محفل میں راشد صاحب کا انداز کچھ صدر نشین کا سا رہا، کھانے کے بعد شعر کی فرمائش ہوئی تو انہوں نے اپنی ایک زیر تصنیف نظم سنائی جس کا ایک مصرع مجھے آج بھی یاد ہے:

میں اپنی تہذیب کی سیہ چھت کی چھپکلی بن کے رہ گیا ہوں

میرا خیال ہے کہ یہ مصرع راشد کی کسی بعد کے زمانے کی نظم میں ایک بدلی ہوئی صورت میں موجود ہے مگر اس وقت یہ یاد نہیں آرہا کہ وہ نظم کون سی ہے، اُس زمانے میں تو مجھے راشد اور فیض کا تمام کلام حفظ تھا اور میں راشد پر ایک مضمون بھی لکھ چکا تھا جو راشد سے اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد "ادب لطیف" میں شائع ہوا، یہ مضمون میں نے میراجی کی موجودگی میں حلقۂ ارباب ذوق لاہور کے ایک جلسے میں پڑھا تھا۔ راشد سے میرا تعارف کراتے ہوئے میراجی نے اس کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ جب یہ مضمون پڑھ رہے تھے تو میں ان کے پاس بیٹھا تھا اور میں نے دیکھا کہ ان کے مسودے میں صرف نثر ہی نثر لکھی ہے، نظموں کے حوالے یہ زبانی سنا رہے ہیں۔ میراجی نے یہ بات جیسا کہ انہوں نے صراحت بھی کر دی اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بھی کہی تھی کہ کون کہتا ہے کہ نظم آزاد کو یاد نہیں رکھا جا سکتا!۔

راشد صاحب سے دوسری ملاقات تقسیم کے بعد لاہور میں ہوئی، بیچ میں وہ فوج کے تعلقات عامہ سے منسلک ہو کر ملک سے باہر چلے گئے تھے اور اب اس ملازمت سے فراغت پا کر واپس ریڈیو میں آ گئے تھے۔ لاہور میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ آزاد کشمیر ریڈیو میں رہے اور پھر ریڈیو پاکستان پشاور میں اور وہیں سے ۱۹۵۱ء میں وہ یو این کی انفرمیشن سروسز کے

کے لئے منتخب کر لئے گئے اور پھر جو وہ ملک سے نکلے تو سوائے ان چار برسوں کے جو انہوں نے کراچی میں گذارے، راشد چھٹیاں گذارنے یا ایک سے دوسرے ملک جاتے ہوئے دوران سفر ہی میں لاہور یا کراچی آتے رہے۔ البتہ یہ ہے کہ وہ جب بھی آتے ملتے ضرور اور بہت سے معاملات کی طرح وہ اس معاملے میں بھی بڑے باقاعدہ آدمی تھے، اکثر اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو آنے سے پہلے اطلاعاً اپنے پروگرام کی ایک نقل بھجوا دیا کرتے تھے تازہ نظموں کی ٹائپ شدہ کاپیاں بھی بھجواتے رہتے تھے یا ملنے پر دے دیتے تھے۔ وہ ملک سے باہر رہتے تھے مگر ملک سے قریبی تعلق برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ سال دو سال میں ایک آدھ چکر، دوستوں سے ملاقاتیں اور خط و کتابت سب اسی خواہش کی مختلف شکلیں تھیں، تا آنکہ ۱۹۵۸ء میں ان کا تقرر یو این کے انفرمیشن سنٹر کراچی میں ہو گیا۔ کراچی میں راشد کے کئی ایک احباب پہلے سے موجود تھے مثلاً غلام عباس جن سے راشد کی خوب گھلتی تھی۔ ریڈیو کے پرانے ساتھی ذوالفقار علی بخاری، سید رشید احمد، حمید نسیم اور ضیا جالندھری کچھ عرصے کے بعد آغا حمید بھی کراچی کے چیف ایڈمنسٹریٹر بن کر آ گئے جنہیں راشد اپنے احباب میں عزیز ترین گردانتے تھے۔

کراچی میں راشد ۱۹۶۱ء کے آخر تک رہے۔ میں بھی اس زمانے میں وہیں تعینات تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جب میں نے ان کو قریب سے دیکھا اور ان سے میرے ذاتی تعلقات استوار ہوئے۔ وہ یو این کے افسر تھے اور ان کو بڑی معقول تنخواہ ملتی تھی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں طارق روڈ پر رہتے تھے جو ابھی بازار نہیں بنا تھا۔ مرسیڈیز گاڑی چلاتے تھے جو انہوں نے ذاتی استعمال کے لئے خرید رکھی تھی۔ چھٹی کے دن سیر تفریح اور تیراکی کے لئے سمندر کے کنارے جاتے تھے۔ غلام عباس صاحب کے ساتھ شطرنج کی بازی اور حقہ نوشی تقریباً روز کا معمول تھا۔ کبھی کبھی شام کی محفل کا اہتمام بھی کیا کرتے جس میں اپنے کراچی کے اور دوسرے شہروں سے آنے والے احباب کو بلاتے۔ ایک دو مرتبہ فیض صاحب کو بھی بلایا، فیض کے ساتھ دوسروں کے ہاں بھی شام بسر کیا کرتے تھے۔

ایک ایسی ہی شام کا ایک واقعہ مجھے یاد آیا کہ جس سے راشد بہت لطف اندوز ہوئے تھے۔ فیض صاحب کے ایک سیاسی دوست اور جیل کے ساتھی محمد حسین عطا، کراچی میں کاروبار کرنے لگے تھے وہ اب بھی کراچی ہی میں ہیں، ایلفنسٹن اسٹریٹ پر میٹروپول کی جانب والی نکڑ یعنی اس زمانے کے ایکسیلسیئر

ہوٹل کے قریب ہی میر ینا ہوٹل انہی کا تھا، شاید اب بھی ہو، عطا صاحب صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں، وہ شاید راشد کو راشد کے قیام پشاور کے زمانے سے جانتے تھے اور ان کی شاعری کے بہت قائل تھے، ایک دفعہ جب فیض صاحب کراچی آئے تو عطا صاحب نے ان کی اور راشد کی ایکسیلسیئر ہوٹل میں دعوت کی جہاں ان دنوں ایک مصری بیلی ڈانسر پرنسس امینہ کا فلور شو ہو رہا تھا، ایک خاص بات اس میں یہ تھی کہ ڈھول بجانے والا اس ڈانسر کا شوہر تھا جو کسی انگریز لارڈ کا چھوٹا بیٹا تھا، اس دعوت میں فیض، راشد اور دونوں کے کالج کے ساتھی سید رشید احمد اور میں شامل تھے ہم لوگ جب وقت مقررہ پر ہوٹل کی سب سے اوپر والی منزل پر واقع ہال میں پہنچے تو دیکھا کہ عطا صاحب کے تعلقات کی بنا پر ہوٹل والوں نے واقعی بڑا اہتمام کر رکھا ہے، منیجر نے خود ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اسٹیج کے قریب والی ان دو میزوں میں سے ایک پر بٹھا دیا جن پر نہایت بڑھیا قسم کے مشروبات مع لوازمات بڑے سلیقے سے آراستہ تھے، فلور شو میں ابھی دیر تھی۔ آخر جب اس کا وقت قریب آنے لگا تو فیصلہ ہوا کہ اس سے پہلے کھانا کھا لیا جائے۔ ہم لوگ ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ فلور شو کی تیاری میں ہال کی رنگین بتیاں جلنے بجھنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی ہوٹل کے منیجر کچھ اور مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے انہیں ہماری میز کے ساتھ والی میز پر لے آئے۔ ان مہمانوں میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو بھی تھے، انہوں نے فیض صاحب کو دیکھتے ہی کسی قدر استعجاب اور بڑی بے تکلفی کے لہجے میں پوچھا

"FAIZ, WHAT ARE YOU DOING HERE?"

فیض صاحب نے سر اٹھا کر ایک نظر ان پر ڈالی، پھر چھری کانٹا سنبھال کر اپنی پلیٹ پر جھک گئے اور بڑی بے پروائی سے جواب دیا: "عیش"! ـــ یہ لفظ انہوں نے ہر ہر حرف کی آواز کو ابھارتے ہوئے کچھ اس انداز سے ادا کیا کہ جیسے ان کا تعلق ان کی زبان کے بوسے لے رہا ہو۔ ہم سب فیض صاحب کے اس جواب سے محظوظ ہوئے مگر راشد صاحب سب سے زیادہ۔ وہ بعد میں بھی بڑا لطف لے لے کر اس کی داد دیتے رہے یہاں تک کہ اسے سکندر اور دیو جانس کلبی کے اس مشہور مکالمے سے جا بھڑایا کہ جس میں سکندر کے اس سوال پر کہ اسے کیا چاہیئے۔ دیو جانس کلبی نے اپنے بوریئے پر بیٹھے ہوئے صرف اتنا کہا تھا کہ "ذرا ایک طرف کو ہٹ جاؤ اور دھوپ مت روکو"۔

کراچی سے راشد صاحب کا تبادلہ نیو یارک ہوا تو بہت خوش ہوئے وہ سفر کی تیاریوں میں

مصروف تھے کہ اچانک ان کی بیگم کا انتقال ہو گیا، یوں تو وہ مدت سے بیمار بلکہ صاحبِ فراش چلی آتی تھیں مگر موت ان کی اس طرح ہوئی کہ ڈاکٹر نے انٹراوینس انجکشن دیتے ہوئے ضروری احتیاط نہیں برتی نتیجہ یہ کہ دوا کے ساتھ ہوا کا بلبلہ بھی نس میں چلا گیا اور وہ آن کی آن میں جاں بحق ہو گئیں، اتفاق سے عباس صاحب اور میں بھی اس وقت راشد صاحب کے ہاں بیٹھے تھے، راشد صاحب اس ناگہانی صدمے سے سن پٹا گئے۔ پھر بھی انہوں نے بڑے حوصلے سے کام لیا۔ چند دنوں میں اپنے آپ کو سمیٹا سفر کے انتظامات مکمل کئے اور ۱۹۶۱ء کے آخیر میں اپنی بیٹیوں اور بیٹے کو لے کر نیویارک روانہ ہو گئے۔

کراچی کے دوران قیام میں جب میں نے راشد صاحب کو ذرا قریب سے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اندر سے بڑے تنہا ہیں، ان کو دوستوں کی محبت اور رفاقت کی شدید طلب رہتی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی شاعری کے بارے میں غیر معمولی طور پر حساس ہیں، میرا اس دور کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ملنا جلنا رہا ہے۔ مگر میں نے شاعری سے راشد کا سا گہرا انہماک کسی اور شاعر میں نہیں دیکھا۔ وہ اکثر مضامین تازہ کی تلاش، نظموں کے نئے نئے زاویے سوچنے اور مصرعوں کی تراش خراش کی فکر میں غلطاں و پیچاں نظر آتے تھے اور اسی لئے ان کو اپنی شاعری کی عام نہیں بلکہ خاص پرکھ اور نقد و نظر والی داد و تحسین کی طلب بھی رہتی تھی چنانچہ ان دونوں طلبوں میں سے کسی ایک طلب کے سلسلے میں جب کبھی کسی وجہ سے ان کا دل دکھتا تو وہ یا انتہائی مغموم اور آزردہ ہو جاتے یا سخت برہمی اور تلخی کے اظہار پہ اتر آتے۔ راشد کی زندگی میں شاید آغا حمید ہی ایک ایسے شخص تھے جو شروع سے آخر تک راشد کی اس دوگونہ طلب کی تشفی کرتے رہے۔ شاید پہلی طلب سے بھی زیادہ دوسری طلب کی تشفی جو راشد کو زیادہ عزیز تھی، میرا یہ تاثر راشد اور آغا حمید سے ملاقاتوں اور دو ایک بار دونوں کی ان باہمی ملاقاتوں کے دوران قائم ہوا کہ جن میں اتفاق سے میں بھی موجود تھا بہرحال اس کا اندازہ آغا حمید کے نام راشد کے ان خطوط سے بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے جو ایک عرصے کے بعد "ن۔م۔راشد ایک مطالعہ" میں شائع ہوئے مگر آغا حمید کے ساتھ بھی باوجود تمام قرب و خلوص کے راشد کی زود حسی کا عالم دیکھئے کہ جب ایک دفعہ آغا حمید نے ایک خاص کام سے متعلق خط کے جواب میں تاخیر کی اور راشد نے شکایت کا خط لکھا تو اس کے

القاب میں "پیارے حمید" کو "محبِ گرامی"، متن میں "تم" کو "آپ" اور آخر میں "تمہارا" کو "مخلص راشد" سے بدل دیا۔ آغا حمید کے نام پورے مجموعہ خطوط میں یہی ایک خط ہے جو اس انداز سے لکھا گیا ہے۔

راشد بڑے سچے اور کھرے آدمی تھے بطور شاعر ہی نہیں بطور شخص بھی وہ اپنا ذاتی محاسبہ کرتے رہتے تھے اپنی زود حسی کے سلسلے میں ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے کہ شکر ہے کہ خدا نے آسودہ حالی بھی دی اور عزت بھی مگر اقتدار نہیں دیا، پھر خود ہی بتایا کہ ریڈیو کے زمانے میں مجھ سے بعض لوگوں کو تکلیف بھی پہنچی ہے جس کی وجہ سے مجھے بڑی کوفت اور ناخوشی کا احساس ہوا تھا اپنی زود حسی کی بنا پر وہ اپنے دوستوں کی بعض معمولی اور ہنسی مذاق میں کہی ہوئی باتوں سے بھی اپنی ناخوشی کا سامان بہم کر لیتے تھے۔ پہروں بیٹھے سوچا کرتے کہ فلاں نے جو یہ بات کہی تو کیوں کہی اور کبھی کبھی اپنے رنگ میں اس سے انتقام بھی لیتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ذوالفقار علی بخاری صاحب سے اکثر خفا رہتے تھے۔ دراصل بخاری صاحب نے بڑی شوخ طبیعت پائی تھی وہ کبھی "عذر مستی" رکھ کر اور کبھی یونہی ترنگ میں آکر اپنی بے مثل اداکارانہ صلاحیت کے سہارے بعض بڑے بڑے شاعروں کے اچھے خاصے اشعار کو ٹھٹھوں کے انداز میں پڑھ کر مضحکہ خیز بنا دیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اقبال تک کو نہیں بخشتے تھے اور اقبال کی مشہور غزل:

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

کا ایسا حلیہ بگاڑتے تھے کہ کیا کہیئے۔ جوش کے کئی ایک اشعار بھی ان کا تختۂ مشق بنتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے فیض کو اپنے سامنے بٹھا کے ان کی غزل:

گلوں میں رنگ بھرے، بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

کا ایسا مذاق اڑایا کہ خود فیض کا چہرہ بھی ہنستے ہنستے سرخ ہوگیا۔ بخاری صاحب اس معاملے میں راشد کی حساسیت سے واقف تھے مگر کبھی کبھی ان کی رگِ شرارت ایسی پھڑکتی تھی کہ وہ راشد کی نظموں اور مصرعوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرے سامنے بھی یہی معاملہ ہوا۔ راشد صاحب سخت بدحظ ہوئے اور بخاری صاحب سے نہ ملنے کا عہد کر لیا۔ میں نے کہا بھی کہ یہ ان کی

محض شوخی اور شرارت تھی مگر راشد صاحب نے اسے اپنی توہین گردانا۔ بہرحال کچھ دنوں کے بعد بخاری صاحب راشد کو منانے ان کے گھر چلے گئے۔ مگر راشد کا دل صاف نہیں ہوا وہ اس قسم کے مذاق کو کبھی بھولتے ہی نہیں تھے۔

اپنی شاعری کے بارے میں راشد صاحب کی زود حسی کی ایک اور مثال میرے نام ان کے ایک خط سے بھی واضح ہے جو "نیا دور" کے اسی شمارے میں شامل ہے۔ اس خط میں انہوں نے مجھے یہ اطلاع دی ہے کہ ان کو میرے ایک ہم نام آفتاب احمد خاں (آج کل کراچی میں این ڈی ایف سی کے چیرمین ہیں) نے ضیاء جالندھری کے حوالے سے بتایا ہے کہ ان کے تازہ نظموں پر فیض نے اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا حالاں کہ انہیں ضیاء محی الدین نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے راشد صاحب کو جواب میں لکھا کہ آپ سنی سنائی باتوں کا نوٹس مت لیا کیجیے مگر بات یہ تھی کہ وہ فیض کی رائے کا کھوج لگاتے رہتے تھے۔ راشد فیض کی شاعرانہ صلاحیتوں سے زیادہ ان کے علم اور ناقدانہ صلاحیتوں کے قائل تھے، اور فیض راشد کی شاعرانہ صلاحیتوں کے۔ فیض جب مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تو ان کالج کے طلبہ مشاعروں میں راشد کا طوطی بولتا تھا۔ فیض صاحب نے خود مجھ سے کئی بار کہا کہ کبھی شاعر تو ہم میں سے راشد تھا ہم نے تو کالج میں یہی سوچا تھا کہ کوئی ترجمے یا تنقید کا کام کریں گے مگر رفتہ رفتہ ہم شاعر ہی ہو گئے۔ شروع شروع میں تو دونوں نے ایک دوسرے کے لئے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ راشد نے اپنی پہلی کتاب "ماورا" فیض کے نام معنون کی اور فیض نے اپنی پہلی کتاب "نقش فریادی" کا دیباچہ راشد سے لکھوایا، مگر شاعری اور زندگی میں دونوں کے راستے الگ الگ تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ اور بھی الگ ہوتے گئے۔ راشد کو فیض کے ادبی اور سیاسی مسلک سے اختلاف تھا اور اس پر وہ برملا اعتراض بھی کرتے رہتے تھے۔

"ایران میں اجنبی" کی ایک نظم ہے "تہمت" جس میں "اشتراکی مسخرے" کی پھبتی بھی کہی گئی ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نظم فیض کے بارے میں ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نظم کے مخاطب تھے مولانا چراغ حسن حسرت جو فوج میں تعلقات عامہ کے افسر کی حیثیت سے راشد صاحب کے ساتھی بھی رہے تھے اور ہم پیالہ و ہم نوالہ بھی۔ راشد صاحب زبان و لغت

کے معاملے میں ان کی قابلیت کے قائل تھے اور ان سے بدکتے بھی تھے۔ انہوں نے کہیں "سرِ جام شراب" خاکسار تحریک سے راشد کی وابستگی کے حوالے سے انہیں "آمریت کا خواہ" کہہ دیا تھا جس پر راشد بگڑ گئے اور یہ ہجو کہہ ڈالی حالاں کہ مولانا حسرت غریب کہاں کے اشتراکی تھے ۔۔۔

البتہ "ایران میں اجنبی" ہی کی ایک اور نظم "انقلابی" کا خطاب یقیناً فیض سے ہے اور اس میں "پنڈی سازش کیس" کی طرف واضح اشارہ ہے:

یہ تاریخ کے ساتھ چشمک کا ہنگام تھا؟
یہ مانا تجھے یہ گوارا نہ تھا،
کہ تاریخ داںوں کے دامِ محبت میں پھنس کر
اندھیروں کی روحِ رواں کو اجالا کہیں
مگر پھر بھی تاریخ کے ساتھ
چشمک کا یہ کون ہنگام تھا؟

تاریخ کو اس نظم میں ایک ایسی "عروس" کہا گیا ہے جو "جدائی کی دہلیز پر زلف در خاک، نوحہ کناں"، "غمزدہ" اور "مضطرب جاں" ہے اور جس کے ساتھ "انقلابی" نے "چشمک" کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کوشش کو راشد کس نظر سے دیکھتے تھے وہ نظم کے آخری بند سے صاف نمایاں ہے:

مگر تو نے دیکھا بھی تھا
دیوتا نارسا کا حجرۂ تار
جس کی طرف تو اسے کر رہا تھا اشارے
جہاں بام و دیوار میں کوئی روزن نہیں ہے
جہاں چارسو بادو طوفاں کے مارے ہوئے راہگیروں کے
بے استخواں ایسے بکھرے پڑے ہیں؟
ابد تک نہ آنکھوں میں آنسو نہ لب پر فغاں!

۔۔۔ رائعے کے بعد کہ جو راشد کی اس نظم کا موضوع ہے، عام اس سے کہ "انقلابی" نے تاریخ کے

ساتھ جو "چشمک" بھی تھی اس کی نوعیت کیا تھی بطور شخص ہی نہیں بطور شاعر بھی فیض کی مقبولیت اور شہرت کا گراف جو ایک زمانے میں راشد کی مقبولیت اور شہرت کے گراف سے ذرا نچلی سطح سے شروع ہوا تھا برابر اونچا اٹھتا گیا ملک میں بھی اور ملک سے باہر بھی۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ روس کے متعلق راشد کے خیالات کچھ بھی رہے ہوں وہ انٹرنیشنل سول سرونٹ تھے اور یو این میں کئی روسیوں سے ان کی اچھی خاصی ملاقات تھی جن میں سے ایک دو کو انہوں نے مجھے بھی ملوایا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کا افسر اعلیٰ بھی اس زمانے میں ایک روسی تھا، بہرحال وہ روس سے اتنے بے تعلق نہیں تھے اور ظاہر ہے کہ روس میں برصغیر کے ادب و شعر سے دلچسپی رکھنے والے حلقے جدید اردو شاعری میں راشد کے مقام اور مرتبے سے ناواقف نہیں تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۶۵ء میں روسی ادیبوں کی انجمن کی طرف سے راشد کو روس کے دورے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے اسے نہایت خوشی سے قبول کیا اپنے ساتھ وہ اپنے بیٹے شہریار کو بھی لے گئے جو اس وقت شاید اسکول کی آخری جماعت میں تھے اور جن کے بارے میں راشد صاحب نے مجھے نیویارک میں کسی قدر محظوظ ہو کر بتایا تھا کہ وہ انگریزی میں شعر کہنے لگے ہیں، بہرحال راشد صاحب اور شہریار ماسکو پہنچے مگر ہفتے عشرے کے بعد ہی ہندوستان پاکستان کی جنگ چھڑ گئی اور پہلے ہی دن جب بی بی سی نے یہ خبر دی کہ ہندوستانی فوجیں لاہور میں داخل ہو گئی ہیں تو راشد سخت پریشان ہوئے انہوں نے دورہ منسوخ کیا اور لندن روانہ ہو گئے۔

راشد صاحب اگر اپنے دوستوں سے محبت اور رفاقت کی طلب رکھتے تھے تو وہ کم سے کم اپنے ان دوستوں سے کہ جن سے انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو محبت اور رفاقت برتنے کے اہل بھی تھے۔ وہ بہت اچھے میزبان تھے اور دوستوں کی خاطر تواضع کا انہیں شوق تھا ان کی میزبانی میں خلوص کے ساتھ اہتمام کا عنصر بھی شامل رہتا تھا، ہاں اپنے دوستوں سے بھی وہ یہی توقع رکھتے تھے اور اس میں کمی کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس سلسلے میں فیض صاحب کے رویے کے متعلق ساقی فاروقی نے راشد پر اپنے مضمون میں راشد کے حوالے سے جو واقعات لکھے ہیں وہ راشد صاحب نے مجھے بھی سنائے تھے مگر اس رنگ میں نہیں جس میں ساقی نے انہیں پیش کیا ہے۔ مجھ سے انہوں نے کہا اس میں ایک ایسی آزردگی پائی جاتی تھی جو کسی ایسے دوست کی بے توجہی سے پیدا ہوتی ہے

آدمی اپنی محبت کی بنا پر کچھ زیادہ کی توقع رکھنے لگتا ہے۔ ساقی نے لکھا ہے کہ راشد صاحب نے چند ایک دوسرے احباب سے بھی ان واقعات کا ذکر کیا تھا ضرور کیا ہوگا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ محض اپنا دل ہلکا کرنے کے لئے ان کا مقصد ان واقعات کی تشہیر نہیں تھا اور نہ فیض صاحب کی تضحیک۔ خود ساقی نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنے مضمون میں ان کو دہراتے ہوئے اپنے آپ سے بہت الجھے مگر پھر سوچا کہ اس کے بغیر راشد کی پوری شخصیت کا احاطہ نہیں ہو سکے گا اس پوری شخصیت میں وہ پہلو بھی آجاتا ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے البتہ ساقی کے بیان سے یہ پہلو مترشح نہیں ہوتا۔

بعض اوقات تو راشد اپنے دوستوں سے اپنی محبت اور شفقت کا اظہار اس انداز میں کرتے تھے کہ آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، میں جب ڈاکٹریٹ کے طالب علم کی حیثیت سے لاس انجلیز پہنچا تو راشد نیو یارک میں تھے۔ چند ہفتوں کے بعد میری بیوی نیو یارک وارد ہوئیں، دوسرے دن صبح ان کو لاس انجلیز کا جہاز پکڑنا تھا۔ پی آئی اے والوں نے نیو یارک میں ان کے قیام کے لئے ایئر پورٹ ہوٹل میں سب انتظام کر رکھا تھا اس کے باوجود راشد صاحب اپنی بیٹیوں کو لے کر نیو یارک کے ہوائی اڈے پر پہنچے، میری بیوی کا استقبال کیا، وہ انہیں جانتے بھی نہیں تھے، کیوں کہ ہماری شادی چند ہی ہفتے پہلے ہوئی تھی، ان کو ہوٹل میں پہنچا کے گھر لوٹے تو مجھے فون کیا، ان کے ہوٹل کا نمبر مجھے دیا دوسرے دن صبح لاس انجلیز کی فلائٹ کے بارے میں جملہ تفصیلات سے آگاہ کیا جو بہر حال مجھے پہلے سے معلوم تھیں اور پھر خالص بزرگانہ ہدایت کی کہ ایئر پورٹ پر وقت سے پہلے پہنچ جانا بعض اوقات جہاز جلدی بھی سفر طے کر لیتا ہے، یہ تھی راشد صاحب کی وہ باقاعدگی جو زندگی کے اکثر شعبوں میں وہ روا رکھتے تھے مگر اس موقع پر اس میں محبت اور شفقت کی چاشنی بھی تھی۔

چند ہی ہفتوں کے بعد اس قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ مجھے اور میرے دوست ڈاکٹر ہمایوں خاں کو جو آج کل ہماری وزارت خارجہ کے سیکرٹری ہیں اور اس وقت میرے ساتھ ڈاکٹریٹ کے طالب تھے یونیورسٹی کے طلبہ کے ایک گروپ کے ہمراہ فیلڈ ٹرپ پر نیو یارک جانا تھا، میں نے فون پر راشد صاحب کو اس کی اطلاع دی اور ہمایوں کے بارے میں بھی بتایا اس لئے کہ راشد پشاور میں رہ چکے تھے اور ہمایوں کے خاندان والوں کو جانتے تھے۔ نیو یارک پہنچنے پر جب اپنے ہوٹل سے راشد صاحب کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے ہم دونوں کی خاطر مدارت کا پورا پروگرام بنا رکھا ہے ان دنوں وہ مسٹر

کے ناول PASSAGE TO INDIA کی ڈرامائی تشکیل براڈوے کے ایک تھیٹر میں دکھائی جا رہی تھی جس میں ضیا محی الدین بھی حصہ لے رہے تھے۔ راشد صاحب خود تو کھیل دیکھ چکے تھے مگر انہوں نے ہمایوں اور میرے لئے اس کھیل کے دو ٹکٹ لے رکھے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں نے وہ کھیل دیکھا اور بیک اسٹیج جا کر ضیا سے بھی مل آئے۔

نیو یارک سے میں واشنگٹن گیا اور مجھے واشنگٹن اتنا پسند آیا کہ میں نے اپنا تبادلہ جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں کروالیا اور چند مہینوں کے بعد ہم لوگ واشنگٹن ڈی سی آ گئے۔ اب اپنے کام کے سلسلے میں بھی مجھے نیو یارک جانا پڑتا تھا۔ لہٰذا راشد صاحب سے میل ملاپ زیادہ رہنے لگا۔ اسی دوران میں انہوں نے مجھ سے یو این کے اسکول میں اپنی سب سے چھوٹی بچی کی استانی شیلا کا ذکر کیا۔ اور اس کے بعد اس خاتون سے اپنے بتدریج بڑھتے ہوئے تعلقات کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتاتے رہے۔

ایک دفعہ جب میں اور میری بیوی نیو یارک پہنچے تو اسی شام راشد صاحب نے شیلا کو ہم سے ملانے کے لئے اپنے گھر چلنے پر بلایا اور اس کے بعد شیلا کو اور ہم دونوں کو چینی کھانا کھلانے نیو یارک کے مشہور و معروف چائنا ٹاؤن کے کسی اعلیٰ ریستوران میں لے گئے۔ چینی کھانا راشد صاحب کی خاطر مدارات کا ایک جزو ہوتا تھا۔ وہ خود اس کے بہت شوقین تھے اور اپنے ذوق و شوق کا اظہار اس طرح بھی کرتے تھے کہ چھری کانٹے کی بجائے ہمیشہ چوپ اسٹکس سے کھاتے تھے۔

دو ایک شامیں ہماری کچھ امریکن دوستوں کے ساتھ گذریں اور پھر ایک شام راشد صاحب کے پرانے رفیق کار جی۔ کے۔ فرید کے ہاں کہ وہ بھی ریڈیو سے یو این کی انفرمیشن سروسز میں چلے گئے تھے کہ ان سے اور ان کی بیگم سے میری بھی یاد اللہ تھی اور وہ دونوں میری بیوی کے خاندان کے پرانے جاننے والے بھی تھے۔ فرید صاحب کا گھر فلشنگ میڈوز میں تھا جہاں شروع شروع میں یو این کا صدر دفتر ہوا کرتا تھا۔ اب وہاں یو این کے اہل کاروں کی ایک بستی بن گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ فرید صاحب نے راشد صاحب کو بھی بلایا۔ میں نے محسوس کیا کہ راشد صاحب نے ہماری دعوت قبول کرنا کچھ پسند نہ کیا۔ بعد میں مجھ سے کہنے لگے کہ بہت دور جگہ ہے۔ تم نے ٹال دیا ہوتا۔

اب تمہارے ساتھ مجھے بھی جانا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ فرید صاحب نے ہمیں کار میں لے جانے اور
واپس پہنچانے کی پیش کش بھی کی تھی میں دُوری کا بہانہ کیسے کرتا، اصل بات یہ تھی کہ راشد کی شامیں
تو اب شیلا کے ساتھ گذرتی تھیں اور فرید صاحب نے شیلا کو بلایا نہیں تھا۔ راشد کی طبیعت کچھ
مکدر تو ہوئی مگر چونکہ فرید صاحب نے دوستانہ خلوص سے بہت تاکید کی تھی لہٰذا وہ ہمارے ساتھ
فرید صاحب کی کار میں دفتر کے اوقات کے بعد یو این کے صدر دفتر ہی سے روانہ ہوگئے۔ فرید
صاحب کے گھر پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ کچھ دیر کے بعد دوسرے مہمان بھی آ گئے اور گپ شپ شروع
ہوگئی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ راشد صاحب غائب ہیں۔ میں نے فرید صاحب سے پوچھا تو انہوں
نے ذرا شرارت آمیز لہجے میں مجھے جواب دیا کہ اوپر کے کمرے میں اپنی مخدومہ کے ساتھ فون پر محو گفتگو
ہیں۔ یہ گفتگو ساری شام مختصر وقفوں کے ساتھ جاری رہی اور آخر کار واپسی کا وقت آ گیا۔ راشد
فرید صاحب کے ہاں ہمارے بندھے چلے تو گئے تھے مگر اپنا انتقام انہوں نے اس طرح لیا کہ ان
کی محفل میں سکون سے بیٹھ کے نہیں دیا۔

نیویارک میں ہمارے اسی قیام کے دوران راشد صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ شیلا سے شادی
کا فیصلہ کر چکے ہیں، مگر شیلا کے آخری فیصلے میں ابھی دیر ہے۔ وہ یورپ جائیں گی اور اپنے ماں باپ
سے بات کریں گی۔ شیلا کے والد اطالوی تھے اور والدہ انگریز اور ان کا ایک گھر لندن میں تھا اور
ایک روم میں۔

چند مہینوں کے بعد راشد اور شیلا واشنگٹن آئے اور ہوٹل میں ٹھہرے۔ ہمارے ہاں دو ایک
دفعہ کھانے پر آئے۔ اب کے شیلا کا انداز صاف کہے دیتا تھا کہ وہ راشد سے شادی کرنے والی
ہیں، مگر راشد صاحب کو طرح طرح کے توہمات نے گھیر رکھا تھا۔ اس ملاقات کے دوران انہوں نے
اکیلے میں اپنے ان توہمات کا مجھ سے بارہا ذکر کیا۔ کبھی ان کو رنگ و نسل کا فرق پریشان کرتا تھا اور کبھی
عمروں کا تفاوت اور سب سے زیادہ وہ رقیب کہ جس کا سایہ شیلا کے ماضی میں لرز رہا تھا اور
راشد کو اُس اندیشے نے مار رکھا تھا کہ شیلا کے یورپ جانے پر وہ کہیں نمودار نہ ہو جائے اور
بنی بنائی بات بگاڑ دے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں راشد کے اندر "شوق کی وارفتگی" اور
"خریداری کی طلب" نے ایک حشر بپا کر رکھا تھا۔ شیلا سے ان کا معاملہ راشد کے لئے ایک معرکہ

بن گیا تھا وہ عشق نہیں کر رہے تھے ایک مہم پر رواں تھے جس میں انہوں نے "متاعِ عقل و دل و جاں" کی بازی لگا رکھی تھی اور جس میں انہیں بہر حال کامیاب ہونا تھا۔ وہ اپنے آپ کو قدیم اُردو شاعروں کا "ناکام و نامراد اور غمزدہ عاشقِ زار" دیکھنے پر ہرگز تیار نہیں تھے، وہ تو ہمیشہ ان کی طنز کا ہدف بنا رہا تھا۔

آخر شیلا یورپ گئیں۔ اس دوران میں راشد صاحب کے دل نے بہت پیچ و تاب کھائے مگر ان کے سب خدشات باطل ثابت ہوئے شیلا واپس آگئیں۔ سب معاملات بخیر و خوبی طے پا گئے تھے۔ شادی لندن میں ہوئی اور کچھ دنوں کے بعد دونوں میاں بیوی نیویارک لوٹ آئے اور ایک ساتھ رہنے لگے۔

اب کے جو میں اور میری بیوی نیویارک گئے۔ راشد اور شیلا سے ملے تو دیکھا کہ شیلا نے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ فرنیچر، کراکری، کٹلری، ہر چیز نئی اور خوبصورت، کمروں کی آرائش و زیبائش میں بھی ایک نیا ذوق نظر آتا تھا۔ شیلا نے بڑے قرینے سے روایتی انگلش ہائی ٹی سے ہماری تواضع کی۔ راشد صاحب اس نئے ماحول میں خوش بھی تھے اور سرگوشیوں میں مجھ سے یہ شکایت بھی کئے جا رہے تھے کہ زندگی میں یہ سب کچھ بھی ہونا چاہیئے مگر اسراف کے ساتھ نہیں۔ تم نے تو دیکھا تھا بھلا گھر کے پرانے سامان میں کیا خرابی تھی پھر خود ہی ہنسے اور کہا مگر اب گھر کی ملکہ جو فرنگی ٹھہری ______ راشد صاحب کا مسئلہ دراصل یہ تھا کہ زندگی کی ہر پرواز میں ان کی آنکھ ہمیشہ اپنے "نشیمن" پر لگی رہتی تھی اور یہ نشیمن تھا ان کا تخلیقی جوہر جس کے سامنے ان کے لئے دنیا کی ہر چیز ہیچ تھی، شیلا بالکل اور طرح کی خاتون ہیں ___ اُن کے لئے راشد کا شاعر ہونا ایسی بے بہا اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اور اس کی وجہ محض زبان سے ناآشنائی نہیں تھی۔

راشد صاحب اور شیلا سے اگلی ملاقات ۱۹۷۱ء کے موسم بہار میں لاہور میں ہوئی وہ دونوں شام کے کھانے پر ہمارے گھر آئے۔ دیر تک گپ ہوتی رہی۔ شیلا کو لاہور کی ہریالی اور کھلی فضا تو پسند آئی مگر لوگوں کے عادات و خصائل، سڑکوں پر کوڑا کرکٹ۔ انٹرنیشنل ہوٹل میں صفائی ستھرائی کی کمی کے بارے میں انہیں بہت شکایات تھیں۔ یہاں کچھ لوگوں سے مل کر ان کو یہ خیال بھی ہو گیا تھا کہ وہ یہاں ہمیشہ اجنبی ہی رہیں گی گھل مل نہیں سکیں گی۔ اس گفتگو کے دوران راشد صاحب کی عجیب کیفیت

تھی کبھی وہ شیلا کی ہاں میں ہاں ملاتے اور کبھی ان کی باتوں کی تردید کرتے۔ ایک آدھ مرتبہ یہ تردید کسی قدر ناخوشگوار بھی ہو گئی۔ اس ساری بحث کے پیچھے دراصل ایک ہی بنیادی سوال تھا کہ جس نے راشد صاحب کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا یعنی یہ کہ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بقیہ عمر کہاں بسر کریں۔ بات یہ تھی کہ دماغی طور پر تو راشد صاحب بڑے جدت پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ مغرب کے ادب اور مغرب کے خیالات ہی کے نہیں مغرب کی عام روزمرّہ زندگی کے طور طریقوں کے بھی بہت قائل تھے۔ ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں اپنے ہاں کے طور طریقوں کو ہدف تنقید بھی بنایا کرتے تھے۔ اور آخر میں تو انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات بھی مغرب ہی سے انتخاب کی تھی۔ لیکن اس مغرب پسندی کے باوجود وہ اصل میں تھے دیسی آدمی اور انہیں وہ خاک بہرحال بہت عزیز تھی جس سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں مجھے تہران جانے کا اتفاق ہوا۔ راشد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نہایت اچھے علاقے کے نہایت اچھے گھر میں رہتے تھے۔ مجھے اپنے کچھ ایرانی دوستوں سے بھی ملوایا۔ حسب معمول تہران کے ایک اعلیٰ ریستوران میں کھانا بھی کھلایا۔ شیلا ان دنوں لندن گئی ہوئی تھیں۔ اُن سے ملاقات نہیں ہوئی میں نے محسوس کیا کہ اب راشد صاحب کی یہ ادھیڑ بن کچھ اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ ملازمت سے فارغ ہو کر وہ کہاں رہیں' ایران میں کہ انگلستان میں کہ پاکستان میں وہ اس سلسلے میں جس شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے اس کا براہِ راست تعلق ان کی ازدواجی زندگی سے تھا۔ دلی نظر کا وہ معاملہ کہ جسے انہوں نے ایک زمانے میں معرکہ بنا کر سر کیا تھا اب ان کے اندر کا ایک معرکہ بن گیا تھا۔

راشد صاحب سے میری آخری ملاقات راولپنڈی میں ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔ اس میں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے بیٹے شہریار نے جو مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد پاکستان فارن سروس میں شامل ہو چکے تھے' ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کی ہے اور اس پر اطمینان کا اظہار کیا کہ سروس اور بیوی کی وجہ سے اس کا پاکستان سے تعلق تو رہے گا اور اپنے بارے میں یہ اطلاع دی کہ آخر انہوں نے انگلستان میں بس جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ یہ فیصلہ ان کی اپنی مرضی کے سراسر خلاف تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں شیلا کی مرضی کو زیادہ دخل تھا اور راشد صاحب

نے شیلا کی خاطر اور اپنے چھوٹے بیٹے تنزیل کی تعلیم کے پیشِ نظر اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس فیصلے کا قائل کر لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ وطن اور احباب سے دوری اور انگلستان میں رہتے ہوئے اپنی بے اماں ذہنی تنہائی کے خیال سے خائف تھے۔

اس سلسلے میں ان کے آخری زمانے کے خطوں کے بعض جملے اب بڑے بامعنی اور اہم معلوم ہونے لگے ہیں، مثلاً ۱۰ مارچ ۱۹۷۳ء کے ایک خط میں اپنے دوست امین حزیں کو لکھا ہے "یہ جانتا ہوں کہ آئندہ زندگی کے لئے سب سے بڑا سہارا پاکستان ہی ہے۔ وہیں عزیز اور دوست بھی ہیں اور وہیں میری تمام ادبی شہرت بھی"۔ مرنے سے کوئی چار ہفتے پہلے یعنی ۱۲ ستمبر ۱۹۷۵ء کو ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام ایک خط میں جواب میں تاخیر کی وجہ یہ بتائی ہے "بہت سے دن پے در پے ایسے گذر جاتے ہیں کہ کچھ لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انگلستان میں رہ کر سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ ان احباب سے دور ہو گیا ہوں جنہیں اہلِ دل میں شمار کرتا ہوں اور جن کے ساتھ گفتگو مایۂ الہام بنتی تھی"۔

معلوم ہوتا ہے کہ دوری اور محرومی کا یہ احساس ایک احساسِ زیاں کی صورت اختیار کر کے راشد کے دل کا بوجھ بن گیا تھا۔ انگلستان میں ان کی زندگی کی کوئی تصویر میرے ذہن میں نہیں کیونکہ اس دوران میں نہ میں وہاں گیا اور نہ ان سے کوئی ملاقات ہوئی۔ یہ مدت تھی بھی بہت مختصر۔ راشد ۴ اگست ۱۹۷۴ء کو انگلستان پہنچے اور ایک سال دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء وہ ایک لمحے میں اس جہان سے رخصت ہو گئے۔ مرنے سے پہلے وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکے تھے کہ انہیں سپردِ خاک نہیں نذرِ آتش کیا جائے۔ ممکن ہے اس میں راشد کی وہی جدت پسندی کارفرما ہو کہ جس کی بدولت انہیں ہر بات میں پابستگیٔ رسم و رہ عام اور روایت سے ہٹ کر طرح توڑ لینے کی روش پسند آتی تھی اور پھر یہ بھی ہے کہ آگ سے اپنی والہانہ شیفتگی کا اظہار وہ اپنی نظم "دل مرے صحرا نورد پیر دل" میں آگ کو "رنگوں کا خزینہ" اور "لذات کا سرچشمہ" کہہ کے کر ہی چکے تھے۔ مگر کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا ہے کہ راشد نے اپنی مٹی انگلستان کی مٹی کو سپرد نہ کر کے کہیں انگلستان میں بس جانے کے خلاف اپنا انتقام تو نہیں لیا تھا؟! —

ڈاکٹر آفتاب احمد

ن م۔ راشد: شاعروں کا شاعر

(۲۵ سال کے بعد)

راشد پر میرا ایک مضمون "شاعروں کا شاعر" اصلاً دو حصوں میں لکھا گیا تھا۔ یہ دونوں حصے ۱۹۶۱ء میں 'سات رنگ' کے دو شماروں میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ پچیس برس بعد جب ڈاکٹر جمیل جالبی نے "ن۔م۔ راشد۔ ایک مطالعہ" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تو اس میں اس مضمون کے دونوں حصوں کو (۱) اور (۲) کی تقسیم کے ماتحت شامل کیا گیا۔ میں نے ان پر ایک نظر ڈالی تو مجھے احساس ہوا کہ ان میں راشد کے فقط پہلے دو مجموعوں یعنی 'ماورا' اور 'ایران میں اجنبی' کو جانچا گیا ہے۔ یا چند ایک ایسی نظموں کا جو اس وقت تک 'نیا دور' میں چھپ چکی تھیں اور جو بعد میں راشد کے تیسرے مجموعے "لا = انسان" میں شامل ہوئیں۔ مضمون کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ راشد کے باقی ماندہ کلام یعنی تیسرے اور چوتھے مجموعے "لا = انسان" اور 'گمان کا ممکن' کا ایک جائزہ بھی اسی میں شامل کیا جائے۔ "پچیس برس بعد" کے عنوان سے یہ اضافی مضمون اسی غرض سے پیش خدمت کر رہا ہوں۔

جب "شاعروں کا شاعر" پہلے پہل دو حصوں میں شائع ہوا تو راشد کراچی میں مقیم تھے۔ میں بھی اس زمانے میں وہیں تھا۔ راشد نے یہ مضمون پڑھا تو مجھے یاد ہے کہ انہیں اپنے بارے میں میری یہ رائے گراں

شاعر لفظوں کے مجسمہ ساز ہیں اور وہ نظمیں نہیں کہتے۔ سانچے میں ڈھلے ہوئے مجسمے تیار کرتے
خاص طور پر پسند آئی اور انہوں نے مجھ سے اس کا اظہار بھی کیا۔
یہ بات برسوں بعد اس وقت ایک اچنبھے کے ساتھ میری یاد میں اُبھری جب راشد کا تیسرا
لا = انسان شائع ہوا اور میں نے دیکھا کہ اس کی پہلی نظم کا عنوان تھا "حسن کوزہ گر"۔
یں راشد نے تخلیقی فن کار کے لئے کوزہ گر (مجسمہ ساز) کی علامت کا انتخاب کیا تھا، میرے اس گمان
جود کہ حسن کوزہ گر کے پردے میں خود راشد بول رہے ہیں۔ وثوق سے کچھ کہنا مشکل تھا اس لئے
ر کو ہمیشہ یہ اصرار ہوتا تھا کہ ان کی نظمیں تو ڈراما ئی خود کلامی کا نمونہ ہیں۔ لوگ ناحق اُن کے کردار کی
شاعر کی شخصیت کا عکس تلاش کرتے ہیں۔ مگر جب راشد کا چوتھا مجموعہ "گمان کا ممکن" شائع
بات بالکل واضح ہوگئی۔ اس مجموعے میں حسن کوزہ گر کے سلسلے کی تین اور نظمیں شامل ہیں اور
حسین بٹالوی نے اس مجموعے کا جو ابتدائیہ تحریر کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب لندن میں ملاقات
دوران راشد نے مجموعے کا مسوّدہ پاکستان میں اشاعت کے لئے اُن کے سپرد کیا تو انہوں نے راشد
دی نظم سنانے کی فرمائش کی اور راشد نے "حسن کوزہ گر" کے سلسلے کی آخری نظم سنائی:

"نظم کے بعد ہم اس کے سیاق و سباق اور تمثیلات پر گفتگو کرنے لگے اور میں نے پوچھا" راشد صاحب یہ
ہ کہ آپ نے تخلیقی عمل کے لیے شاعر کی بجائے کوزہ گر کا سمبل کیوں انتخاب کیا اور پھر یہ کہ اس نظم کی جہاں زاد
علامت کے ماورا کون شخصیت ہے؟" اس کے جواب میں راشد صاحب نے ایک طویل اور
دلچسپ ذاتی داستان سنائی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید میں یہ داستان قلم بند کر ڈالتا لیکن اب
ب۔ اُن کی زندگی میں ان کے ناراض ہوجانے کی صورت میں معافی مانگی جاسکتی تھی مگر
نہیں۔"

میں نے یہ ساری تفصیل برسبیلِ حکایت بیان کی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حسن کوزہ گر
سمجھنے کے لئے اس امر کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ راشد نے تخلیقی فن کار کے لئے شاعر کی بجائے
کوزہ گر کا سمبل کیوں انتخاب کیا اور یہ سمبل کیسے اُن کے ذہن میں آیا۔ اسی طرح ذاتی کرید کی بات
اور ہے ورنہ یہ جاننے کی کبھی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ اس نظم کی جہاں زاد ایک علامت سے
ماورا کون شخصیت ہے۔

"حسن کوزہ گر" جو چار حصّوں پر مشتمل ہے راشدؔ کے آخری دور کی نظموں میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ راشدؔ اپنی اس قسم کی نظموں کو ڈرامائی خود کلامی اور اُن کے مرکزی کردار کو 'میرا فسانہ' کا نام دینا پسند کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کا 'میرا فسانہ' حسن ہے اور وہ مخاطب ہے اپنی محبوبہ جہاں زاد سے۔ مثلث قدیم کے ایک زاویے کے طور پر حسن لبیب نامی ایک رقیب کا بھی ذکر کرتا ہے اور اپنی بیوی کا بھی جسے وہ محض 'سوختہ بخت' کہہ کے یاد کرتا ہے۔ یہ تمام کردار ایک رومانوی اور الف لیلوی قسم کی فضا میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں جو بغداد، رودِ دجلہ، کشتی و ملاح، حلب اور اس کی کارواں سرائے کا حوض، بوڑھے عطّار یوسف کی دکان اور اسی قسم کے دوسرے حوالوں سے ترتیب پاتی ہے۔ افسانہ کچھ یوں ہے کہ حسن نامی ایک کوزہ گر۔ اپنے فن کا والہ و شیدا اپنے کوزوں اور تغاروں کی دنیا میں رہنے والا یکایک 'جہاں زاد' کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس ابتدائے عشق کا حال حسن کی زبان سے سنیئے:

جہاں زاد، نو سال پہلے
تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی
کہ میں نے، حسن کوزہ گر نے
تری قاف کی سی افق تاب آنکھوں
میں دیکھی ہے وہ تابناکی
کہ جس سے مرے جسم و جاں، ابر و مہتاب کا
رہگزر بن گئے تھے

جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات
وہ رودِ دجلہ کا ساحل
وہ کشتی وہ ملّاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ جاں رنج بر کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود —
اس کی جاں اس کا پیکر

مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو اُبھرا نہیں ہے!

اس ربط اولین نے حسن کی دنیا کو تباہ و برباد کر دیا وہ نو سال تک سرگرداں اور دیوانہ وار پھرتا رہا۔ اس دوران اس نے اپنے کوزوں کی جانب بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ کوزے اس کے دست چابک کے پتلے بھی تھے اور اس کی معیشت کے ذمہ دار بھی۔ حسن کی بیوی سوختہ بخت، اس قسمت کے مارے حسن کو یاد دلاتی کہ "محبت امیروں کی بازی" ہے اور اسے اس کے ویراں گھر اور بھوکے بچوں کا واسطہ دے دے کر ہوش میں آنے کی تلقین کرتی رہی۔ لیکن حسن کے دل کے روگ میں کوئی کمی نہ آئی۔ بلکہ اس نے الٹا اپنے فن سے حسن لگن کو بھی ختم کر دیا۔ اس عالم میں رات کی سرد گوں تیرگی میں حسن، سرد مو پریشاں، پھر جہاں زاد کے در کے آگے کھڑا فریاد کرتا ہے:

میں انسان ہوں لیکن
یہ نو سال جو غم کے قالب میں گزرے!
حسن کوزہ گر آج اک تودۂ خاک ہے جس
میں نم کا اثر تک نہیں ہے
جہاں زاد بازار میں صبح عطار یوسف
کی دکان پر تیری آنکھیں
پھر اک بار کچھ کہہ گئی ہیں
ان آنکھوں کی تابندہ شوخی
سے اٹھی ہے پھر تودۂ خاک میں نم کی ہلکی سی لرزش
یہی شاید اس خاک کو گِل بنا دے:
تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور کوزوں کی جانب
گِل ولا کے سوکھے تغاروں کی جانب

معیشت کے اظہارِ فن کے سہاروں کی جانب
کہ میں اس گل ولا سے، اس رنگ و روغن
سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے
دلوں کے خرابے ہوں روشن!

یہاں یہ بات خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ "جہاں زاد" کی صورت میں پہلی بار راشد کی شاعری میں ایک ایسی عورت آئی ہے کہ جس سے میرِ افسانہ کا تعلق محض جنسی آسودگی تک محدود نہیں، بلکہ جسمانی لذت اندوزی عاشق کے لئے ایک نئی روحانی سرشاری، ایک سچے اور اعلیٰ انسانی رشتے کی استواری اور ایک نئی تخلیقی اپج کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ انسان کی اندرونی کیمیا بدلنے میں عشق کا جذبہ جو کچھ کر سکتا ہے اس کا یہ تصور اس سے پہلے راشد کی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتا۔

حسن کوزہ گر نمبر ۲ میں حسن کی اپنی مفلسانہ زندگی، اپنی تنہائی اور محرومی کا بیان ہے۔ اپنے اس سیہ جھونپڑے کا ذکر ہے جو اس کے افلاس کے روندے ہوئے اجداد کی نشانی ہے، جہاں "سوختہ بخت" اُسے دیکھتی ہے اور دیر تک دیکھتی رہ جاتی ہے جہاں وہ دونوں شب و روز کے بڑھتے ہوئے کھوکھلے پن میں اک سادہ محبت کا کھیل کھیلتے ہیں۔ کبھی مل کر رو لیتے ہیں، کبھی ہنس لیتے ہیں اور کبھی گا لیتے ہیں مگر اس جھونپڑے میں کچھ بھی تو نہیں۔

یہ مرا جھونپڑا تاریک ہے، گندہ ہے، پراگندہ ہے
ہاں کبھی دور درختوں سے پرندوں کی صدا آتی ہے
کبھی انجیروں کے، زیتونوں کے باغوں کی مہک آتی ہے
تو میں جی اٹھتا ہوں
تو میں کہتا ہوں کہ لو آج نہا کر نکلا!
ورنہ اس گھر میں کوئی سیج نہیں، عطر نہیں ہے،
کوئی پنکھا بھی نہیں،
تجھے جس عشق کی خو ہے
مجھے اس عشق کا یارا بھی نہیں!

یہاں مجھے جوشؔ کے ابتدائی دور کا ایک بے مثل شعر بے اختیار یاد آیا کہ جس کے بعد خود جوشؔ نے ایسے نازک اور نرم احساس میں لپٹا ہوا شعر شاید ہی کبھی کہا ہو'

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا!

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا میں کہہ یہ رہا تھا کہ 'جہاں زاد کی زندگی کے مقابلے میں حسن کو اپنی بے سروسامانیوں اور مالی و مادی محرومیوں کا احساس ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی جذباتی فراوانیوں کا بھی اپنی اسی دورنگی کا اظہار وہ یوں کرتا ہے!

تو ہنسے گی اے جہاں زاد عجب بات
کہ جذبات کا حاتم بھی ہیں
اور اشیا کا پرستار بھی ہیں
اور ثروت جو نہیں اُس کا طلب گار بھی ہیں!
تو جو ہنستی رہی اُس رات تذبذب پہ مرے
میری دورنگی پہ پھر سے ہنس دے!
عشق سے کس نے مگر پایا ہے کچھ اپنے سوا؟
اے جہاں زاد،
ہے ہر عشق سوال ایسا کہ عاشق کے سوا
اس کا نہیں کوئی جواب
یہی کافی ہے کہ باطن کی صدا گونج اٹھے!

گویا عشق کا حاصل آخری تجربے میں یہی ہے کہ" باطن کی صدا گونج اٹھے" یعنی تخلیقی زندگی کو ایک نئی تحریک میسر آجائے۔ "حسن کوزہ گر نمبر ۳ میں یہی بات نہایت بیّن اور واضح طریقے سے کہی گئی ہے۔ محبوب کے حُسن و جمال کا نور و نغمہ فن کار عاشق کے قلب و نظر کو جس طرح گرما دیتا ہے اور اس کی تخلیقات کو جس طرح ایک نئی تابندگی بخشتا ہے اس کا ایسا خوبصورت اظہار مشکل ہی سے کہیں ملے گا۔

سبو و جام پر ترا بدن، ترا ہی رنگ، تیری نازکی برس پڑی
وہ کیمیا گری ترے جمال کی برس پڑی
میں سیلِ نورِ اندروں سے ڈھل گیا!
مرے دروں کی خلق یوں گلی گلی نکل پڑی
کہ جیسے صبح کی اذاں سنائی دی!
تمام کوزے بنتے بنتے "تو" ہی بن کے رہ گئے
نشاط اس وصالِ رہ گزر کی ناگہاں مجھے نگل گئی —

حسن کوزہ گر ۳، میں حسن کی زبانی ایک ایسے شہرِ مدفون کا ذکر ہے کہ جس کی ہر گلی میں ہزاروں برس بعد حسن کے بنائے ہوئے جام و مینا و گلدان کے ریزے ملتے ہیں؛ اور کہنہ پرستوں کا ایک انبوہ اس رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں، کو الٹنے پلٹنے میں مصروف ہے۔ مگر حسن جہاں زاد کو خطاب کرتے ہوئے پوچھتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا خبر کہ مرے رنگ کس دھنک سے، کون سی تتلیوں کے پروں سے آئے تھے، اور میں نے کون سے حسن، کون سی ذات اور کس خد و خال سے کوزوں کے چہرے اتارے تھے اور یہ کہ :

انہیں کیا خبر کیسا آسیبِ مبرم مرے غار سینے پہ تھا
جس نے مجھ سے (اور اس کوزہ گر سے) کہا
"اے حسن کوزہ گر، جاگ
دردِ رسالت کا روزِ بشارت ترے جام و مینا
کی تشنہ لبی تک پہنچنے لگا ہے!"

دردِ رسالت، یعنی اظہار اور رسائی، کا وہ کرب کہ جس سے ساعتِ تخلیق میں فن کار گزرتا ہے اور جو اس 'آسیبِ مبرم' یعنی تخلیقی جوہر کی دین ہے کہ جس سے فن کار کے غار سینے کو نجات نہیں، اس مسئلے کا بیان، بلکہ تخلیقی زندگی کے مختلف مراحل کا بیان، فن کی تجلی، اس کے تسلسل اور پھیلاؤ اور فن کار کا اپنے فن میں خدا ہونے کے احساس کا اظہار حسن کی زبانی یوں ہوا ہے!

جہاں زاد میں نے — حسن کوزہ گر نے —

بیاباں بیاباں یہ دردِ رسالت سہا ہے
ہزاروں برس بعد یہ لوگ
ریزوں کو چنتے ہوئے
جان سکتے ہیں کیسے
کہ میرے گل و خاک کے رنگ و روغن
ترے نازک اعضا کے رنگوں سے مل کر
ابد کی صدا بن گئے تھے؟
میں اپنے مساموں سے، ہر پور سے،
تیری بانہوں کی پہنائیاں
جذب کرتا رہا تھا
کہ ہر آنے والے کی آنکھوں کے معبد پہ جا کر چڑھاؤں —
یہ ریزوں کی تہذیب پالیں تو پالیں
حسن کوزہ گر کو کہاں لا سکیں گے؟
یہ اُس کے پسینے کے قطرے کہاں گن سکیں گے؟
یہ فن کی تجلی کا سایہ کہاں پا سکیں گے؟
جو بڑھتا گیا ہے زماں سے زماں تک
خزاں سے خزاں تک
جو ہر نوجواں کوزہ گر کی نئی ذات میں
اور بڑھتا چلا جا رہا ہے
وہ فن کی تجلی کا سایہ کہ جس کی بدولت
ہمہ عشق ہیں ہم
ہمہ کوزہ گر ہم
ہمہ تن خبر ہم، ہمہ بے خبر ہم

خدا کی طرح اپنے فن کے خدا سر بسر تم!

مختصر یہ کہ "حسن کوزہ گر" میں عشق اور فن کے ارتباط باہمی کو جس عنوان سے راشد نے اپنا موضوع بنایا ہے اس کی مثال اردو کی جدید شاعری میں کوئی اور نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے یہ نظم ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

فن کار کے درد رسالت کا ذکر بھی اس انداز سے کہیں کم ہی ہوا ہوگا حرف و معنی اور اظہار اور رسائی یا ترجمانی یعنی EXPRESSION AND COMMUNICATION کا مسئلہ ہمیشہ سے راشد کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ "لا = انسان" کی ایک نظم "اظہار اور رسائی" میں راشد نے اس کے بارے میں یوں سوچا ہے۔

"۔۔۔ مُو قلم ساز، گلِ تازہ، تھرکتے پاؤں
بات کہنے کے بہانے ہیں بہت
آدمی کس سے مگر بات کرے؟
بات جب حیلۂ تقریبِ ملاقات نہ ہو
اور رسائی کہ ہمیشہ سے ہے کوتاہ کمند
بات کی غایتِ غایات نہ ہو!"

فن راشد کے نزدیک "کشفِ ذات کی آرزو" ہے۔ یہ بات صراحتاً انہوں نے اسی عنوان کی اپنی ایک نظم میں کہی ہے۔ ایک اور جگہ اس کا یوں اظہار کیا ہے:

"میر ہو، مرزا ہو، میراجی ہو
اپنی ہی ذات کی غربال میں چھن جاتے ہیں۔"

ویسے تو کشفِ ذات کی آرزو اور اظہار و ترجمانی کا مسئلہ فن کار کی تخلیقی کاوش کا بنیادی مسئلہ ہے لیکن راشد کے ہاں اس کو ایک اور نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے کسی قدر تفصیلی بحث درکار ہے جس کا آغاز ان کی ابتدائی نظموں سے کرنا پڑے گا۔

راشد نے اپنے پہلے مجموعے کی ایک نظم "شاعرِ درماندہ" سے گرد و پیش کی دنیا کے معاشرتی اور سیاسی مسائل سے ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے اور اس میں وہ کسی ترقی پسند شاعر سے پیچھے نہیں، مگر خارجی

حقائق سے اُن کا وہ تعلق جو 'ماورا' اور 'ایران میں اجنبی' کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ بتدریج کم ہوتا گیا۔ اس سلسلے میں کچھ اور عرض کرنے سے پیشتر میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں ترقی پسند تحریک سے راشد کو اختلاف ضرور تھا چونکہ ان کے خیال میں اس تحریک سے وابستہ مصنفین ایک خاص سیاسی نظریے کی پیروی کرتے تھے، راشد کے نزدیک ادیب اور شاعر کے لیے لازمی تھا کہ وہ صرف اپنے VISION یا رویا کو پیش نظر رکھے۔ ترقی پسند تحریک کے بنیادی تصور یعنی ادیب اور شاعر کی سماجی ذمہ داری کے بارے میں راشد کو اُن سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ چنانچہ "لا = انسان" میں راشد کا جو ایک طویل مصاحبہ شامل ہے۔ اس کی ابتدا ہی میں جدید شاعری کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے۔ "ہم سب کی خواہش تھی کہ اردو شاعری کو زندگی کے موجودہ اور روز افزوں حقائق کے قریب لایا جائے۔ یہ گویا حالی اور اقبال جیسے عظیم پیش روؤں ہی کی تمنا کا پرتو تھا"

اسی مصاحبے میں آگے چل کر اردو کے جدید ترین شاعروں پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے ادیب اور شاعر کی سماجی ذمہ داری کے بارے میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے۔

"بحیثیت ایک مکتبِ شعر کے جدید ترین شاعروں کا یہ گروہ کسی اجتماعی ذمہ داری کا قائل بھی نظر نہیں آتا۔ انہیں اس دانش کے اظہار سے بھی غرض کم ہے جس کا حامل شعر ہمیشہ رہا ہے۔ یہ شعر کو بیشتر ذاتی خوشنودی کا ذریعہ جانتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ہاں زندگی کے لیے گہری اور جوشیلی محبت ضرور پائی جاتی ہے اور انسانی تہذیب کے بعض صحت مند عناصر کا ذکر بھی ان کے کلام میں ملتا ہے۔ لیکن یہ کسی قسم کی مسئولیت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں بعض اسی بے نظمی کے شاعر ہو کر رہ گئے ہیں جو تہذیبوں کے زوال کا باعث ہوتی ہے۔ اجتماعی تحتِ شعور کی عکاسی کرنا برحق لیکن اگر یہ عکاسی معاشرے کی نارسائیوں کو دُور نہ کر سکے تو کم از کم اسے ان بے اطمینانیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہیئے۔ جن سے آج کی دُنیا اٹی پڑی ہے۔ زندگی کھیل تماشے سے کہیں زیادہ ہے اور صرف طفلانہ ذہن اسے کھیل تماشا سمجھ کر خوش ہو سکتے ہیں"۔

اس رائے کے برملا اظہار سے پہلے بھی راشد ادب میں سماجی ذمہ داری کے قائل تھے اور اس پر عمل پیرا بھی۔ جیسا کہ 'ماورا' اور 'ایران میں اجنبی' کی اکثر نظموں کے فکر و احساس سے ظاہر

ہے۔ یہ فکر و احساس "لا = انسان" کی کئی نظموں مثلاً دل مرے صحرا نوردِ پیرِ دل، اسرافیل کی موت، "میرے بھی ہیں کچھ خواب" میں بھی نمایاں ہے۔ یہ نظمیں دراصل اس مجموعے کی اشاعت سے سات آٹھ سال قبل راشد نے کراچی میں اپنے چار سالہ قیام کے دوران کہیں۔ "میرے بھی ہیں کچھ خواب" شاید اس دور کی آخری نظم ہے، اور اس میں راشد نے اجتماعی زندگی کے بارے میں اپنے فکر و احساس کا بڑا پُرجوش اظہار کیا ہے۔ نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے!

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب!
اس دور سے اس دور کے سوکھے ہوئے دریاؤں سے،
پھیلے ہوئے صحراؤں سے، اور شہروں کے ویرانوں سے
ویرانہ گروں سے میں حزیں اور اداس!
اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب!

ان خوابوں کی وضاحت کرتے ہوئے راشد نے انہیں "آسودگیٔ مرتبہ و جاہ" سے معصوم اور "خود زیست کا مفہوم" قرار دیا ہے۔ یہ خواب ان خوابوں سے مختلف ہیں جو "اجداد کے خود ساختہ اسمار" "اجڑے ہوئے مذہب کے اوہام" اور "مجذوبِ شیراز کے افکار" کے نیچے مدفون ہیں۔ یا جو آزاد ذہن اور انہیں ذات بہت محبوب بھی ہے مگر وہ خود ہی اس ذات کے جاروب بھی ہیں۔ یہ ان خوابوں سے بھی مختلف ہیں "جو گردشِ آلات سے جو یندۂ تمکین" ہیں جن کے لئے اس دہر کی تزئین "بندگیٔ قاضیٔ حاجات" سے ہے اور جن کا آئین "ہوس جور" کے سوا کچھ نہیں یا جن کو "کل کی خبر" تو ہے مگر "جز کی خبر گم" جن کے لئے "دیدۂ تر" کا مرتبہ ہیچ ہے۔ "دل ہیچ ہے سرا تنے برابر ہیں کہ سر ہیچ — عرضِ ہنر ہیچ" — یہ سب کچھ کہنے کے بعد راشد اپنے خوابوں کی صراحت یوں کرتے ہیں۔

کچھ اور مرے خواب ہیں کچھ اور مرا دور
خوابوں کے نئے دور میں نے مور و ملخ نے اسد و ثور
نے لذتِ تسلیم کسی میں نہ کسی کو ہوسِ جور

سب کے نئے طور!

. . . .

وہ خواب ہیں آزادیٔ کامل کے نئے خواب

ہر سعیٔ جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب

آدم کی ولادت کے نئے جشن پہ لہراتے جلاجل کے نئے خواب

اس خاک کی سطوت کی منازل کے نئے خواب

یا سینۂ گیتی میں نئے دل کے نئے خواب

اے عشقِ ازل گیر و ابد تاب

میرے بھی ہیں کچھ خواب

میرے بھی ہیں کچھ خواب!

یہاں راشد نے اپنے خوابوں کی نوعیت بیان کرتے ہوئے۔ مذہب، تصوف، انفرادیت پسندی۔ اور ہم عصر دنیا میں اجتماعی زندگی کے جملہ تصورات اور تجربات، سرمایہ داری اور اشتراکیت وغیرہ پر بے لاگ طنز کے نشتر چلائے ہیں اور انہیں یکسر مسترد کر دیا ہے۔ لیکن آخر میں اپنے خوابوں کی صورت گری کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی عینیت پسندی سے آگے نہیں بڑھی۔ عینیت پسندی کا رجحان راشد کے ہاں شروع ہی سے موجود ہے۔ اپنی ابتدائی نظموں میں وہ انسان کی "جنتِ گم گشتہ" "خواب کی بستی" اور اسی قسم کی دوسری موہوم فضاؤں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو "میرے بھی ہیں کچھ خواب" میں راشد نے اپنی عمر بھر کے معتقدات کو یکجا کر دیا ہے۔ کیوں کہ یہاں جن تصورات اور تجربات کو انہوں نے مسترد کیا ہے وہ جستہ جستہ اس سے پہلے ہم اپنی نظموں میں مختلف مقامات پر ان کو مسترد کر چکے تھے۔ اور یہاں جن خوابوں کا ذکر کیا ہے ان کے خواب وہ اس سے پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ گویا اس نظم میں انہوں نے آخری بار ایک ... میں "کشفِ ذات کی آرزو" پوری کی۔ اپنی ذات کے اس حصے کے کشف کی آرزو کہ جس کا خارجی زندگی کے حقائق سے تھا۔ میں یہاں اس امر کو تاکید سے دہرانا چاہتا ہوں کہ سماجی

بعض نظموں میں بھی موجود ہے بخصوصیت سے "دل مرے صحرا نورد پیر دل" "اسرافیل کی موت" اور "میرے بھی ہیں کچھ خواب" ہیں یہ وہ نظمیں ہیں جہاں ترجمانی اور رسائی کوئی مسئلہ نہیں بنی اور نہ قاری کے لئے شاعر کی بات سمجھنا محال ہوا۔ مگر "لا = انسان" اور "گمان کا ممکن" ان دونوں مجموعوں کی اکثر نظموں کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جوں جوں راشد خارجی حقائق کی عکاسی سے دور ہوتے گئے۔ بطور شاعر ترجمانی ان کے لئے ایک مسئلہ بنتی گئی۔ اور ان کی رسائی کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔ "لا = انسان" اور "گمان کا ممکن" کی بیشتر نظموں کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ جیسے ان کے پاؤں زمین سے اکھڑے ہوئے ہیں اور وہ ایک ذاتی اور اجنبی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اب ان کی شاعری کے نشانات اور علائم بھی کچھ زیادہ ہی ذاتی اور اجنبی ہونے لگے۔ راشد "کشف ذات کی آرزو" تو پوری کرتے رہے مگر یہ ذات وہ ذات نہیں تھی جو خارجی حقائق سے دست و گریباں رہتی تھی۔ یہ تو محض اپنی ہی الجھنوں کو سلجھانے میں لگی ہوئی تھی، ور جہاں بینی کی بجائے دروں بینی کا شکار تھی۔ یہ درست سہی کہ یہ رجحان بھی راشد کے ہاں شروع ہی سے موجود تھا مگر اب یہ زیادہ نمایاں صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ اب راشد اور ان کے پڑھنے والوں کے درمیان وہ اگلا سا قریبی ربط و تعلق باقی نہ رہا۔ نظموں کا تو کیا ذکر ان کو اپنے مجموعوں کے ناموں تک کی تشریح کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

راشد بڑے سچے فن کار تھے۔ ان پر جو گزرتی تھی وہ خود بھی اس کا ادراک رکھتے تھے۔ یہ ان کی دروں بینی کا ایک مثبت پہلو تھا۔ چنانچہ اپنی "تنگنائے ذات" میں گرفتار ہو کر رہ جانے کا جاں گداز درد و کرب اسی دور کی ایک نظم "مجھے وداع کر" میں بے اختیار ابل پڑا۔

مجھے وداع کر

اے میری ذات، پھر مجھے وداع کر

. . . .

اپنے آپ کے سیاہ غار میں

بہت پناہ لے چکا

میں اپنے ہاتھ پاؤں

دل کی آگ میں تپا چکا!

مجھے وداع کر

کہ آب و گل کے آنسوؤں

کی بے صدائی سن سکوں

حیات و مرگ کا سلامِ روستائی سُن سکوں

میں روز و شب کے دست و پا کی نارسائی سُن سکوں!

یہاں اپنی ذات کے بندھنوں سے نکل کے "آب و گل کے آنسوؤں کی بے صدائی"۔ "حیات و مرگ کا سلامِ روستائی" اور "روز و شب کے دست و پا کی نارسائی" تک پہنچنے کی کیسی بے لاگ تمنا کا اظہار ہے اور اس تمنا کا مقصود محض اپنے ذوق رہائی کی تشفی نہیں بلکہ اپنی تخلیقی تگ و تاز اور سعی و کاوش کے ذریعے کارِ جہاں کا بارِ امانت اٹھانے میں ہاتھ بٹانا ہے:

مجھے وداع کر

کہ شہر کی فصیل کے تمام در ہیں وا ابھی

کہیں وہ لوگ سو نہ جائیں

بوریوں میں ریت کی طرح ــــ

مجھے، اے میری ذات،

اپنے آپ سے نکل کے جانے دے

کہ اس زبان بریدہ کی پکار ــ اس کی ہاؤ ہو ــــ

گلی گلی سنائی دے

کہ شہرِ نو کے لوگ جانتے ہیں

(کاسۂ گرسنگی لئے)

کہ اُن کے آب و نان کی جھلک ہے کون؟

میں اُن کے تشنہ باغچوں میں

اپنے وقت کے دھلائے ہاتھ سے

نئے درخت اگاؤں گا

میں اُن کے سیم و زر سے — اُن کے جسم و جاں سے —

کو تار کی نہیں ہٹاؤں گا

تمام سنگ پارہ ہائے برف

اُن کے آستاں سے میں اٹھاؤں گا

انہی سے شہرِ نو کے راستے تمام بند ہیں —

خارجی زندگی اور شہر کے لوگوں کی زندگی میں شرکت کا یہ عزم و ارادہ ہی شاعر کو ایک نئی تب و تاب عطا کر سکتا ہے اپنی ذات کی قید میں رہ کر تو اس کی قوتِ حیات شل ہو چکی ہے۔

مجھے وداع کر

کہ اپنے آپ میں

میں اتنے خواب جی چکا

کہ حوصلہ نہیں

میں اتنی بار اپنے زخم آپ سی چکا

کہ حوصلہ نہیں

راشد کی یہ بے اطمینانی اپنی جگہ مگر زیادہ بنیادی سوال تو یہ ہے کہ سماجی ذمہ داری کے احساس و فکر کی دنیا چھوڑ کر "تنگنائے ذات" کی طرف رجوع کرنے میں کون سے داخلی اور خارجی عوامل کارفرما تھے؟ اس سلسلے میں وثوق سے کچھ کہنا تو ممکن نہیں، لیکن شاید راشد کی اس دور کی نظموں کے زمانے میں یعنی آخری چودہ پندرہ سال میں ان کی زندگی کے ماحول سے اس کا کچھ سراغ مل سکے۔ کراچی میں چار سالہ قیام کے اختتام پر ۱۹۶۱ء کے آخر میں راشد نیویارک چلے گئے۔ اس کے بعد وہ تعطیلات گزارنے وطن آتے رہے مگر انہیں پاکستان میں طویل مدت کے لئے ٹھہرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس دوران وہ نیویارک میں رہے۔ تہران میں رہے اور آخر ملازمت سے فراغت پانے کے بعد لندن سے سو میل دور ایک قصبے میں جا بسے۔ وطن سے دور دیارِ غیر میں اُن کی ذاتی زندگی کے عام رنگ ڈھنگ نے انہیں زندگی کے خارجی حقائق کی دنیا سے دور رکھا۔ نیویارک اور

لندن میں تو اُن کو وہ مواد کہاں میسر آتا جس نے اُن کے سماجی ذمہ داری کے احساس و فکر کو گرما رکھا تھا۔ رہا تہران تو اب وہ جنگ کے زمانے کا تہران نہیں تھا جس میں تیام کے دوران "ایران میں اجنبی" کی نظمیں لکھی گئی تھیں۔ یہ تہران "رضا شاہ آریہ مہر" کے زمانے کا تہران تھا کہ جب ظاہری نمود و نمائش اور دولت کی ریل پیل نے اس شہر کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔ خود راشد بھی اب وہاں انگریزی فوج کے سپاہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ یو این کے اطلاعاتی مرکز جیسے مؤقر ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے متمکن تھے۔ اسی دوران اُن کا ایک اپریشن بھی ہوا جس کے بعد ان کی صحت اور توانائی میں بھی بہت فرق آگیا۔

مختصر یہ کہ اب راشد کے فکر و احساس میں وہ تیزی اور طراری اور وہ اُمنگ باقی نہ رہی جس نے "دل میرے صحرا نورد پیر دل" جیسی نظم لکھوائی تھی۔ جس میں وہ "تمناؤں کے بے پایاں الاؤ کے قریب" "نغمہ درجاں رقص برپا خندہ برلب" تھے یا "اسرافیل کی موت" جیسی نظم جس میں انہوں نے "آوازوں کا رزق بند ہونے" کا ماتم کیا تھا۔ یا "میرے بھی ہیں کچھ خواب" جیسی نظم جس میں انہوں نے "آزادی کامل" اور "آدم کی ولادت کے نئے جشن" کے گیت گائے تھے۔ ان تمام نظموں میں وہ شوکتِ الفاظ، وہ زورِ بیان وہ لہجے کی بلند آہنگی بلکہ ایک قسم کی وہ خطیبانہ تب و تاب ہے کہ جو راشد کے ہاں اس سے پہلے اور بعد میں کبھی نظر نہیں آئی۔

ان نظموں کے بعد کے دور کی نظموں میں راشد کے ہاں جو ایک نمایاں رجحان ابھرا اس کا میں ذکر کر چکا ہوں یعنی یہ کہ وہ ایک ذاتی اور اجنبی دنیا میں داخل ہو گئے۔ اُن کی شاعری کے نشانات اور علائم بھی کچھ زیادہ ہی ذاتی اور اجنبی ہونے لگے۔ ترجمانی اُن کے لئے ایک مسئلہ بنتی گئی اور اُن کی رسائی کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔ اس رجحان کے ساتھ ساتھ زندگی کے بارے میں اُن کے نقطۂ نظر میں بھی ایک نمایاں تبدیلی آئی۔ راشد کے پہلے دو مجموعوں کی کئی ایک نظموں میں راشد کے ہاں اس یقین کا اظہار ملتا ہے کہ کسی نہ کسی دن انسانوں کی انا بیدار ہو کر ایک نئی دنیا کا آغاز کرے گی۔ "میرے بھی ہیں کچھ خواب" اُن کی اس رجائیت پسندی کا آخری اظہار ہے۔ مگر اس کے بعد کی بعض نظمیں ایک مثیالی اور ملگجی، جذباتی فضا کی خبر دیتی ہیں۔ "اندھا جنگل" "زندگی اک پیرہ زن" "اندھا کباڑی" اور "تعارف" سب اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

"میرے بھی ہیں کچھ خواب" کے پس منظر میں دیکھئے تو "اندھا کباڑی" واقعی ایک دردناک نظم ہے۔ اس کا "میرِ افسانہ" یعنی اندھا کباڑی شہر کے گوشوں میں "بکھرے ہوئے، پا شکستہ، سر بریدہ خواب" کہ جن سے شہر والے بے خبر ہیں۔ ڈھونڈتا پھرتا ہے:

کہ اُن کو جمع کروں

دل کی بھٹی میں تپاؤں

جس سے چھٹ جائے پرانا میل

اُن کے دست و پا پھر سے اُبھر آئیں

چمک اٹھیں لب و رخسار و گردن

جیسے نوآراستہ دولہوں کے دل کی حسرتیں

پھر سے ان خوابوں کو سمت رہ ملے!

اور پھر:

"خواب لے لو خواب"

صبح ہوتے چوک میں جا کر لگاتا ہوں صدا —

"خواب اصلی ہیں کہ نقلی؟"

یوں پرکھتے ہیں کہ جیسے اُن سے بڑھ کر

خواب داں کوئی نہ ہو!

خواب گر میں بھی نہیں

صورت گر ثانی ہوں بس —

ہاں مگر میری معیشت کا سہارا خواب ہیں!

مگر بازار میں اس جنسِ گراں کا کوئی خواہاں نہیں۔ شام کو "اندھا کباڑی" ان سونے کے خوابوں کو مفت بیچنے پر تیار ہو جاتا ہے لیکن مفت سُن کر لوگ اور ڈر جاتے ہیں کہ ان میں کہیں کوئی دھوکا کوئی شعبدہ کوئی سحر نہ ہو اور آخر:

رات ہو جاتی ہے

خوابوں کے پلندے سر پہ رکھ کر

منہ بسورے لوٹتا ہوں

رات بھر پھر بڑبڑاتا ہوں

"یہ لے لو خواب —

اور لے لو مجھ سے ان کے دام بھی — —

خواب لے لو، خواب —

میرے خواب —

لیکن "لا = انسان" کی ایک عجیب و غریب نظم "تعارف" میں تو راشد ٹوٹے پھوٹے، بھولے بسرے خوابوں کو جمع کرنے کا خیال بھی ترک کر چکے ہیں۔ یہاں تو وہ انسانوں کے ایک گروہ کو بے دریغ موت کے آغوش میں سلا دینا چاہتے ہیں!

اجل، ان سے مل،

کہ یہ سادہ دل

نہ اہلِ صلوٰۃ اور نہ اہلِ شراب،

نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب،

نہ اہلِ کتاب —

نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین

نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمین

فقط بے یقین

اجل، ان سے مت کر حجاب

اجل، ان سے مل!

بڑھو، تم بھی آگے بڑھو،

اجل سے ملو،

بڑھو، نو تونگر گدو

نہ کشکولِ دریوزہ گردی چھپاؤ

تمہیں زندگی سے کوئی ربط باقی نہیں

اجل سے ہنسو اور اجل کو ہنساؤ!

بڑھو، بندگانِ زمانہ، بڑھو بندگانِ درم

اجل، یہ سب انسان منفی ہیں،

منفی زیادہ ہیں، انسان کم

ہو ان پر نگاہ کرم!

اس نظم کی تلخی بالکل عیاں ہے اور راشد کی ایسے انسانوں سے کمل مایوسی کا اظہار کرتی ہے۔ جو "بندگانِ زمانہ" اور "بندگانِ درم" ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کا زندگی سے کوئی ربط باقی نہیں وہ "فقط بے یقین" ہیں، منفی انسان ہیں، "منفی زیادہ ہیں۔ انسان کم" اور ستم یہ ہے کہ راشد خود بھی بے یقین لوگوں میں سے تھے اور ہر قسم کے یقین کو خود بھی مسترد کر چکے تھے۔ اُمید کی وہ کرن جو راشد نے انسانوں کی، ناگی بیداری کی صورت میں دیکھی تھی آخری دور کی نظموں کی مٹیالی اور ملگجی، فضا میں کھوئی گئی اور راشد کو سہارا دینے والی کوئی چیز بھی باقی نہ رہی۔

ادیب اور شاعر کی سماجی ذمہ داری کے بارے میں راشد کے خیالات کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس معاملے میں اُن کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا اور اس کی بنا پر وہ ترقی پسند ادیبوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ "لا = انسان" میں شامل "مصاحبہ" میں راشد نے اپنا یہ نقطۂ نظر تفصیل سے بیان کیا ہے:

"آپ جانتے ہیں کہ میری شاعری "نصب العین" سے خالی نہیں۔ لیکن وہ نصب العین ذاتی ہے۔ میرے اپنے وجود اور میری اپنی سرشت کی مخلوق ہے۔ میری شاعری میں انسانی صورت حال کے بارے میں شدت احساس کم نہیں ہے لیکن یہ احساس کسی ایسے سیاسی عقیدے کے ساتھ وابستہ نہیں جو میرے وجود سے باہر لا کر یا میری خاطر کسی اور نے تیار کیا ہو۔ میرے نزدیک حقیقت کے بے شمار پہلو ہیں۔ ان میں سے جتنے بھی نظر آسکیں اُن کی عکاسی کی ادب میں گنجائش ہے۔ اور یہ عکاسی کسی عقیدے کے تحت محدود نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ عکاسی قطعی طور پر لکھنے والے کی ذاتی

حساسیت پر مبنی ہے:

آگے چل کر انہوں نے اس بات کی مزید وضاحت کی ہے:

"شاعر کسی ملک کا رہنے والا کیوں نہ ہو۔ اور اس ملک کے لوگوں کا جذبۂ غالب کچھ ہی کیوں نہ ہو ۔۔۔ شاعر اپنا ایک رویا بھی رکھتا ہے۔ صرف اُن اشیاء اور حالات کا رویا نہیں جو موجود ہوں۔ بلکہ اُن کا بھی جو موجود نہیں اور جنہیں موجود ہونا چاہیئے۔ ایسا رؤیا فریبی قومی محیط کے ماوراء ہو سکتا ہے۔ گو یہ رؤیا اس کی وسعت اور شدت کیسی ہی کیوں نہ ہو محض کسی عدم سے نمودار نہیں ہو سکتا۔ ہر رؤیا کے پاؤں کسی موجود اور فوری حقیقت پر استوار ہوتے ہیں۔

" سوال یہ ہے کہ اِس رؤیا کی نوعیت کا فیصلہ کون کرتا ہے؟ شاعر کے دوست، رشتہ دار، سیاسی گروہ، حکومتیں ۔۔۔؟ کیا شاعر اپنے رؤیا کے حصول میں ان میں سے کسی کا دستِ نگر ہے؟ یا کیا یہ رویا شاعرانہ الہام کی ان غیر مرئی کارگاہوں میں تیار ہوتا ہے جو عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ وہ عام انسان جن کی احتیاجات اپنی نوعیت کے اعتبار سے فوری اور محدود ہوتی ہیں؟"

" در اصل ہر رؤیا کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ذاتی اور انفرادی ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر اسے رؤیا کہنا مشکل ہے۔ اسی لئے شاعر کے رؤیا کی ساخت پرداخت میں کسی دوسرے انسان یا گروہ یا حکومت کا دخل بے معنی ہے۔ اگر شاعر کے پاس اپنا رؤیا نہ ہو تو وہ افراد یا گروہوں یا حکومتوں کی طرف سے سیاسی اور اجتماعی منجم بن کر رہ جاتا ہے، جس کی قیاس آرائی محض موجودہ اعداد و شمار پر مبنی ہوتی ہے۔ گویا شاعر اپنے رویا کا خود ہی معمار ہے اور یہی اُسے رہنا چاہیئے۔"

راشد نے اس بیان میں دو ایسی باتیں کہی ہیں جو آپس میں مطابقت نہیں رکھتیں۔ اگر رویا کسی عدم سے نمودار نہیں ہو سکتا اور ہر رویا کے پاؤں کسی موجود اور فوری حقیقت پر استوار ہوتے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی ساخت و پرداخت میں ایسے انسانوں اور گروہوں کا دخل نہ ہو جو موجود اور فوری حقیقت ہی کا حصہ ہوں۔ راشد نے شاعر کے رؤیا کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے کہ جیسے وہ پیغمبرانہ وحی کا درجہ رکھتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شاعر کا رؤیا اُس کے ماحول کے اثرات سے

آزاد نہیں ہو سکتا۔ مانا کہ شعرا کو تلامیذ الرحمٰن بھی کہا گیا ہے۔ مگر یہ تلمذ محض تخلیقی صلاحیت کی بخشش تک ہی محدود سمجھا جانا چاہیئے۔

اس بحث میں سب سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ شاعر کے رؤیا سے مراد کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ دنیا کے عظیم شعرا کے رؤیا کی نوعیت کیا تھی۔ جارج سنتیانا GEORGE SANTAYANA نے اپنی کتاب "تین فلسفی شعرا" میں لیوکریشیس ڈانٹے اور گوئٹے کے رویا کا تجزیہ کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ یہ تینوں شاعر بالترتیب یورپی فلسفہ کی تاریخ کے تین اہم ادوار یعنی نیچرلزم، سپر نیچرلزم اور رومانٹسزم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ لیوکریشیس کے رؤیا کا منبع یونانی فلسفہ تھا۔ ڈانٹے کے رؤیا کا منبع زمانہ وسطیٰ کی عیسائیت اور گوئٹے کے رؤیا کا منبع روسو کی رومانیت۔ گویا ان تینوں عظیم شاعروں کے رؤیا کے پاؤں فکری سطح پر اپنے اپنے زمانوں کی موجود اور فوری حقیقت پر استوار تھے۔ اسی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ شکسپیر کا رؤیا نشاۃ الثانیہ کے تصورات کا مرہون منت تھا اور ملٹن کا رؤیا پروٹسٹنٹ عیسائیت کا۔ انگریزی کے انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے شاعروں یعنی کولرج، ورڈز ورتھ، شیلے اور کیٹس کے رؤیا رومانی فلسفے سے متاثر تھے۔ مشرق میں رومی اور حافظ و سعدی کے رؤیا اپنے اپنے رنگ میں اسلامی فکر اور اسلامی تصوف کی بنیادوں پر قائم تھے۔ ہمارے زمانے میں اقبال کے رؤیا میں اسلامی فکر کے علاوہ بعض مغربی تصورات کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر شاعر کا رؤیا اپنے زمانے کی "موجود اور فوری حقیقت" اور اس کی فضا میں پھیلی ہوئی فکری لہروں سے اپنا خام مواد حاصل کرتا ہے۔ جو چیز اس کے رؤیا کو شاعر کا رؤیا بناتی ہے وہ وہی ہے جسے راشد نے جوئس کے مشہور مقولے کا ترجمہ کرتے ہوئے اندھے کباڑی کی زبانی "دل کی بھٹی میں تپاؤں" کہا ہے۔ شاعر اس خام مواد کو اپنے رگ و پے میں اتار کر اور اسے اپنے تخلیقی تجربے کی آنچ دے کر کیا سے کیا بنا دیتا ہے، یہی اس کے رؤیا کی وہ صورت یا ساخت و پرداخت ہے جس میں کسی دوسرے انسان یا گروہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ خود ہی اس کا معمار ہوتا ہے اور خود ہی اس کا پاسبان۔

یہ تو شاعر کے رؤیا کے بارے میں ایک عام نظری بحث تھی۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بطور

اعر خود راشد کے رؤیا نے اُن کے طویل ذہنی سفر میں انہیں کن کن وادیوں سے گزارتے ہوئے آخر
ں منزل تک پہنچایا، جیسا کہ میں نے عرض کیا شروع میں تو راشد کو ایک 'وادیٔ نہاں' ایک 'خوابوں کی
ستی' یا "انسان کی جنت گم گشتہ کی تلاش رہی یعنی ایک موہوم اور عینیت پسندانہ آدرش کی تلاش۔
ں کے بعد راشد نے عورت کے حسن و جمال سے "اخذ نور و نغمہ" کرنے اور "زندگی کی لذتوں سے
سینہ بھرنے" میں جسم و جاں کی آسودگی پائی۔ مگر اس آسودگی میں بھی بے حاصلی کی خلش باقی رہی۔
سوائے "حسن کوزہ گر" کے سلسلے کی نظموں کے۔ جہاں جنسی لذت اندوزی، عشق کی سرشاری ایک سچے
نسانی رشتے کی استواری تک پہنچتی ہوئی اور تخلیقی مہمیز کا کام دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس دوران میں
راشد کے رؤیا نے انہیں سماجی ذمہ داری کا احساس بھی دلایا اور ان کے دل میں انسانوں کی انا
ی بیداری کی وہ شمعِ امید بھی روشن کی جس کی بنا پر انہوں نے ایک نئی دنیا، ایک نئی آزادیٔ
کامل اور آدم کے ایک نئے جشنِ ولادت کے خواب دیکھے لیکن آخر میں یہ سب خواب ریزہ ریزہ
ہو گئے اور راشد "تنگنائے ذات" کے ایسے "قفس" میں اسیر ہو کر رہ گئے کہ جس کی تیلیوں سے
نہ کوئی نور چھنتا تھا اور نہ فضا کی پہنائیاں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کیفیت نے ان کی "حسرتِ پرواز"
بھی سلب کر لی اور انہیں مایوسی کے اندھیروں کے سپرد کر دیا۔

میں نے اپنے ۱۹۶۱ء کے مضمون میں اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ راشد کے دوسرے
مجموعے "ایران میں اجنبی" کو "ماورا" جیسی پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی حالانکہ اس کی نظمیں راشد
کی پختہ تر تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ان کا تیسرا مجموعہ "لا = انسان" ان کی زندگی میں شائع ہوا اور اس
میں راشد نے اپنے قاری سے ذہنی قربت حاصل کرنے کے لئے ایک طویل 'مصاحبہ' شامل کرنے
کا اہتمام بھی کیا جس میں انہوں نے اپنی شاعری اور اپنے تنقیدی معتقدات کے بارے میں
سیر حاصل معلومات بہم پہنچائیں۔ اس کے باوجود یہ مجموعہ کوئی خاص ہیجان پیدا نہ کر سکا۔ چوتھا
مجموعہ "گمان کا ممکن" راشد نے خود ترتیب دیا مگر ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اس کا بھی کوئی چرچا نہ ہوا۔
واقعہ یہ ہے کہ راشد کی زندگی ہی میں ان کی بزم میں چل چلاؤ شروع ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل اور زیادہ
سے زیادہ 'شاعروں کا شاعر' بنتے چلے گئے۔ تنقید نگاروں کا موضوع تو وہ رہے اور اب بھی

ہیں مگر اب ان کے نغمے اردو کی جدید شاعری کے عام قارئین کے دلوں کی دھڑکنیں تیز نہیں کرتے نہ ان کے سامعین کی رگوں کو چھیڑتے ہیں۔ آئندہ کیا صورت ہوگی اور آنے والے زمانے میں بطور شاعر راشد کو کس نظر سے دیکھا جائے گا اس کا بہت کچھ انحصار اس بات پر ہے کہ اس ہر آن بدلتی ہوئی دنیا میں ہمارا معاشرہ کیا رنگ بدلتا ہے۔ نئے معاشرے میں اردو زبان کی کیا حیثیت اور مقام طے پاتا ہے۔ ادب و فن اور جملہ تخلیقی سرگرمیوں کو کس قابل قرار دیا جاتا ہے اور ادیب و شاعر کیا نئے انداز اختیار کرتے ہیں۔ میں ان اندیشوں کا اظہار اس لئے کر رہا ہوں کہ آج دنیا بھر میں ادب و فن اور جملہ تخلیقی سرگرمیوں کا مستقبل مخدوش سمجھا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں ہمارے ہاں یہ کس انجام کو پہنچیں، ایک انجام تو وہ ہے جو راشد کی بے پناہ حسّاسیت نے تصوّر کی آنکھ سے "حسن کوزہ گر ۴" کے آخری بند میں دیکھا ہے یعنی یہ کہ ہزاروں برس بعد "شہرِ مدفون" میں "داستانِ فنا" کہنے والے "کہنہ پرستوں" کے درمیان "حسن کوزہ گر" اپنی "طلب" اور "بصیرت" کے نشانات کی اہمیت کا اثبات کر رہا ہے:

یہ کوزوں کے لاشے جو ان کے لئے ہیں
کسی داستانِ فنا کے وغیرہ وغیرہ —
ہماری اذاں ہیں، ہماری طلب کا نشاں ہیں
یہ اپنے سکوتِ اجل میں بھی یہ کہہ رہے ہیں:
"وہ آنکھیں ہمیں ہیں جو اندر کھلی ہیں
تمہیں دیکھتی ہیں، ہر اک درد کو بھانپتی ہیں ہر اک حُسن کے راز کو جانتی ہیں
کہ ہم اک سنسان حجرے کی اُس رات کی آرزو ہیں
جہاں اک چہرہ، درختوں کی شاخوں کے مانند
اک اور چہرے پہ جھک کر، ہر انسان کے سینے میں
اک برگِ گل رکھ گیا تھا
اُسی سب کا دزدیدہ بوسہ ہمیں ہیں!"

ن۔م راشد

بنام ڈاکٹر آفتاب احمد

(راشد صاحب کے یہ چند خطوط جو فی الحال میرے کاغذات سے مجھے ملے ہیں پیش خدمت ہیں، یہ سب ان کے اور میرے قیام امریکہ کے زمانے میں لکھے گئے، راشد اقوام متحدہ کے صدر دفتر نیویارک میں تھے اور میں ڈاکٹریٹ کے طالب علم کی حیثیت سے پہلے لاس انجلیز میں اور پھر واشنگٹن میں)

۲۸ رمئی ۱۹۶۲ء نیویارک

عزیز آفتاب۔

تمہارا خط مل گیا اور چیک بھی۔ شکریہ۔ وہ نظم جس کی پاکستان میں بسم اللہ ہوئی تھی۔ خدا خدا کر کے مکمل ہوئی۔ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ اُمید نہیں ٹائپ میں نظم کا پڑھنا تمہارے لئے کچھ مشکل ہوگا۔ دوسرے صفحے پر کچھ ایشیائیوں کچھ فرنگیوں اور کچھ روسیوں کی طرف اشارات ہیں جن کے "خوابوں" سے الگ خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں زحمت نہیں دینا چاہتا۔ لیکن اگر اس نظم کے بارے میں دو حرف لکھ سکو تو شاید کراچی کی کسی شام کا آدھا بासा را لطف آجائے۔

فیض کے لینن پرائز ملنے پر کراچی کے بعض اخباروں میں بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ بعض حضرات خطوں میں (اخباروں کے نام اپنے خطوں میں) فیض کی "خدمات" پوچھ رہے ہیں۔ بعض نے اپنے آپ کو یہ خدمات گننے پر مامور کر لیا ہے۔ "نوائے وقت" اس "گھوڑ دوڑ" میں پیش پیش ہے!

نیویارک میں تمہارا قیام بے حد مختصر رہا پھر کب آ رہے ہو۔ بچے جولائی کے شروع میں کیمپ جا رہے ہیں۔ اگست کے تیسرے ہفتے واپس آئیں گے۔ ان دنوں میں مکان بالکل خالی ہوگا۔ اگر آؤ تو چھٹیاں میرے ساتھ گزارو۔

شمیمہ بہن کو سلام اور دعائیں۔ اُمید ہے انہیں امریکہ آہستہ آہستہ خوش آنے لگا ہوگا۔ مخلص راشد

۲۹ر مئی ۱۹۶۲ء نیویارک۔

عزیز آفتاب۔ نظم کے دو نئے صفحے مکرّر بھیج رہا ہوں۔ ان میں تمہیں ہر بند کے آخری مصرعے میں ترمیم نظر آئے گی۔ اصل میں یہ مصرعے لکھنے کے بعد یا بدل دیئے تھے یا حذف کر دیئے تھے کیوں کہ میں ایک بار پھر "عروضیوں" کے حملۂ جارحانہ سے ڈر گیا تھا۔ لیکن مکرّر غور کرنے کے بعد احساس ہوا کہ اِن مصرعوں میں جو زحاف لگایا ہے۔ وہ موسیقی کے اعتبار سے اور ایک طرح کے نئے تجربے کی خاطر ضروری ہے۔ اگر یہ مصرعے پوری بحر کے اندر رہیں تو ان میں ایک قسم کی کمزوری سے آجاتی ہے اور ان میں سُم کا سا اثر پیدا نہیں ہوتا۔ دوستوں میں مرزا نقی سے اس بارے میں گفتگو ہوئی۔ وہ موسیقی کے ماہر ہیں۔ اُنہیں ان مصرعوں کو اپنی اصل حالت سے بدلنے پر بڑا غصّہ آیا۔ چنانچہ اُن کی رائے نے جو تقویت بخشی اُس بنا پر انہیں اپنی اصلی شکل میں لکھ رہا ہوں۔ جدید فارسی شاعری میں اس قسم کے RHYTHMIC PATTERN سے بڑا کام لیا گیا ہے۔ خاص طور پر انقلاب ایران کے زمانے کی شاعری میں۔ اُمید ہے تمہیں یہ ترمیم پسند ہو گی۔

مخلص
راشد

۱۵ر جون ۱۹۶۲ء نیویارک

عزیز آفتاب۔ تمہارا ۱۸ر جون کا لکھا ہوا خط ملا۔ خیال یہی تھا کہ تم مصروف ہو گئے۔ اس لئے خط نہیں لکھ سکے۔ پاکستان میں جن "احباب" کو نظمیں بھیجی ہیں۔ وہ معلوم ہوتا ہے "سکوت سخن شناس" میں" مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں!۔ تمہاری سخن شناسی کبھی سکوت کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ایک حد تک حیرت تھی کہ تم نظموں کی، خاص طور پر اس نظم کی رسید تک نہ دو جس کی اُٹھان تمہیں محبوب تھی!

"اے عشق ازل گیر۔۔۔" کی تکمیل میں بعینہٖ وہی چیز حائل تھی، جس کا تکمیل کے بعد بھی تم نے گلہ کیا ہے۔ یعنی ذہن اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ یہ خواب کس حد تک مبسوط

ہوں اور کس قدر مجرد رہیں۔ بے شک نظریاتی شاعر نسبتاً مبسوط خواب بیان کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے شاعروں میں رومی اور اقبال کے سوا کم ہی کسی کی مثال مشرقی شاعری میں ملتی ہے۔ خواب حافظ بھی دیکھتا ہے۔ خواب ایک معاشرے کے داغ جیسا شاعر بھی دیکھتا ہے۔ لیکن ان کے فکر کی اٹھان ایسی ہے کہ خواب ہمیشہ مجرد رہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی الوہی مشن کے شاعر نہ تھے۔ لیکن خواب دیکھنے اور دکھانے سے انہیں کون باز رکھ سکتا تھا؟ مجھے اپنی نظم میں جو خامی نظر آئی یہ ہے کہ میں نے ایک حد تک۔ اپنی عادت سے ہٹ کر۔ اپنے خواب مجسّم کر دیئے ہیں۔ مثلاً اجسام سے انکار اور مفہوم سے گفتار کے پیوند کی دنیا، یا ہر سعی جگر دوز کے حاصل کی دنیا یا ہر سعی جگر دوز کی حامل دنیا، نسبتاً مجسّم اور مبسوط دنیا ہے۔ اور میں ان کا ذکر یوں کر رہا ہوں جیسے کہ میں خداوند تعالےٰ کا گماشتہ مقرر کیا گیا ہوں! یہ نظم بے شک پیغمبرانہ گرم جوشی کی نظم نہیں ہے۔ اور نہ یہ منشا تھا کہ یوں ہو۔ لیکن اس کا خاص نغماتی تار و پود، اس کے تاثر میں ممد ہوا ہے۔ یعنی اس احساس کے تاثر میں ممدّ ہوا ہے جو اس نظم کی خشتِ اول ہے۔ یہ آخر احساس ہی کی نظم ہے، عقیدے اور تلقین کی نظم نہیں۔ اور اگر محض عقیدے اور تلقین کی نظم نظر آنے لگے تو بے حد ناکام نظم ہے۔ تاہم اس سے زیادہ اپنے خوابوں کو مجسّم کرنا۔ مقالہ (یا جواب مضمون؟) لکھنے کے برابر ہوتا۔ ہماری شاعری میں بہت جواب مضمون لکھے گئے ہیں۔ خاص طور پر اقبال کی شاعری اور اکثر "اشتراکی" شاعروں کی شاعری، بیشتر جواب مضمون پر مشتمل نظر آتی ہے۔ جس "یقین کی گرمی" کا ذکر تم کر رہے ہو۔ وہ محض جواب مضمون کی تکرار کا سراب ہے۔ اور کچھ نہیں۔ "تاکید" اور "یقین" کو باہم ملتبس کرنا ممکن ہے۔ لیکن جائز نہیں۔ اس نظم میں ایک حد تک عقائد نے ضرور راہ پائی ہے۔ مثلاً اس دور کے بارے میں یا مذہب، تصوف اور تہذیب کے بارے میں جو اشارات ہیں، عقیدے کی حد تک پہنچتے ہیں، تاہم وہ اس نظم کی بنیاد نہیں۔ "سر اتنے برابر ہیں کہ سر ہیچ" سے مراد یہ نہیں کہ سر واقعی برابر ہیں۔ بلکہ یہ مفہوم لینا چاہیئے کہ بعض طبقے سروں کو برابر سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سروں کا اوسط ان کے نزدیک قلیل سے قلیل تر رہ جاتی ہے! اور اس سر کا رتبہ بھی گر جاتا ہے جس کے

نذر" سفید مادّہ" دوسرے سروں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔ اس نظم کے آخری بند میں ایک معمولی تبدیلی ہے۔ وہ تم اپنی نقل میں کر لو تو ممنون ہوں گا۔ مصرع :

"ہر سعیِ جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب "

یوں بدل دیا ہے :

"ہر تاب و تب و سوز کے، ہر سعیِ جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب"!

اس سے اس بند کے مصرعوں کا توازن میرے نزدیک بہتر ہو جاتا ہے۔ اور " سعیِ جگر دوز" کو بھی ایک حد تک تقویت ملتی ہے۔ "تعارف" میں آخری مصرعے میں " بندگانِ سیاست" کی بجائے " بندگانِ زمانہ" کر دیا ہے۔ تاکہ یہ التباس نہ ہو کہ میں اُن نئے سیاستدانوں پر کوئی اعتراض کر رہا ہوں جو ہمارے اپنے ملک میں نئے آئین کے نئے گھونسلے سے اُڑ کر نکلے ہیں! یا اُن کی حمایت کر رہا ہوں جو اس آئین کے مخالف ہیں۔ اس نظم کا بھی اپنے ملک سے براہِ راست تعلق ذہن میں نہ تھا۔ لیکن محسوس ہوا کہ " وجود کی اُس منفیت" کا شکار ہمیں سب سے زیادہ ہیں جس پر اس نظم میں طنز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہم سب سے کم مثبت انسان ہیں۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے۔ ہم پر محض طاری ہو گیا ہے۔ ہم نے کسی سعیِ جگر دوز سے حاصل نہیں کیا۔ ہم ایک سلبی زندگی پر مطمئن ہیں۔ اور انحطاط کی سب سے بڑی دلیل یہی سلبی زندگی ہے جو کسی فرد یا قوم پر غلبہ پالے۔

" زندگی ہے پیرہ زن"۔ شروع تو اُس عام مشاہدے سے ہوئی تھی، جو تمہیں بھی بارہا پیش آیا ہو گا۔ یعنی گلی میں کاغذ اور دھجیاں جمع کرتی ہوئی کوئی دیوانی بڑھیا۔ زندگی کے ساتھ اُس کی تشبیہہ کا خیال " ذاتی حادثے" کی بنا پر نہیں آیا۔ بلکہ اس سوچ کی بنا پر۔ جو مجھے اکثر مضطرب رکھتی ہے کہ ہم کس قدر ماضی پرست لوگ ہیں۔ ماضی کے سرمایے کو ("کاغذوں کی بالیاں"!) کس قدر سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اُس کے پیچھے کس قدر دیوانہ وار دوڑتے ہانپتے ہیں۔ پھر نگاہیں اپنے ہی قدموں تک آ کر رک جاتی ہیں۔ کیوں کہ وہیں، اپنی ہی تہذیب میں وہ دفینے نظر آتے ہیں، جن کا وجود نہیں۔ دفینوں

کی جگہ ایک پرانا، گہرا، سونا کنواں ہے۔ جس میں سنگریزے ہیں اور جس میں ہماری اپنی صدا گونج کر رہ جاتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ماضی پرستی دیوانگی سے زیادہ نہیں۔ اور تاریخ نگاری، یا تاریخ پر ناز، یا ماضی کی "تحقیق و تدقیق" بے کار مشغلے ہیں مجھے یقین ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم تاریخ سے کوئی سبق حاصل کرتے ہیں تو اپنے کو فریب دیتے ہیں۔ تاریخ کا ہر عمل، حالات کے خاص تار و پود کے ساتھ واقع ہوا تھا۔ جب تک وہ حالات بجنسہٖ موجود نہ ہوں، تاریخ کا کوئی عمل پورے طور پر ایک سا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ قوموں نے یا افراد نے جب کبھی کوئی صحیح معنوں میں متحرک عمل کیا ہے۔ تاریخ سے قطعی طور پر بے نیاز ہو کر کیا ہے۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں۔ یونانی تہذیب، عربوں کا خروج، نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ کا استیلا، موجودہ دور میں روسیوں کا اور اُن کے خیالات کا نفوذ وغیرہ اگر آج ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں نے اسپین میں بڑی خوب صورت تہذیب قائم کی تھی تو یہ کسی طرح اُس خوب صورت تہذیب کے احیاء، یا ویسی ہی خوبصورت تہذیب پیدا کرنے میں مدد نہیں دے سکتا۔ ہمارے حالات، ہمارے گرد و پیش کی دنیا، ہمارے وسائل، ہمارے بیرونی تعلقات سب بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ان کے ساتھ ہماری ADJUSTMENT زیادہ ضروری ہے گزشتہ تہذیب یا تاریخ کے ساتھ ہرگز ضروری نہیں۔ بہر حال میں نظم کے موضوع سے ہٹ کر ایک نئے "بے محل وعظ" کی طرف چل نکلا ہوں اور تمہاری دانش و بینش کے مرتبے کو کم کر رہا ہوں معافی چاہتا ہوں۔

نظموں کے لئے اور موضوع پے در پے سوجھ رہے ہیں۔ لیکن جب تک "استادِ ازل" یہ نہ کہے کہ "لکھو، کیوں کر کہوں؟ کہیں لفظ نہیں ملتے کہیں موزوں بحر ہاتھ نہیں آتی۔ کہیں خیال موجود ہے لیکن "رعنائیت" کا شکار ہے۔ تمنا بہت ہے کہ بہت کچھ لکھ ڈالوں۔ زندگی پاؤں کے نیچے ریت کی طرح تیزی سے نکلی جارہی ہے، جب تک اس ریت پر کھڑا ہوں۔ کچھ منہ سے کہہ ڈالوں! شاید کوئی سن لے!

تم واشنگٹن آجاؤ تو مزید خوش گوار صحبتیں میسر ہوں۔ جب سے آیا ہوں

حکیم خان اور اقبال بٹ کی دعوت کے باوجود واشنگٹن نہیں جا سکا۔ تم آؤ تو اُس ذہنی ضیافت کی امید میں وہاں جا سکتا ہوں، جو تمہارے جیسے دوستوں کی حساس رفاقت ہی میں میسر آ سکتی ہے۔ نیویارک آتے جاتے رہو تو چشمِ ما ـــــ اور بھی روشن اور دلِ ما اور بھی شاد!

شمیمہ بہن کو دعائیں۔

مخلص
راشد

۳ر اکتوبر ۱۹۶۲ء
نیویارک

عزیز آفتاب۔ تمہارا ۲۶۔ستمبر کا لکھا ہوا خط ملا۔ شہر کے وسط سے اُٹھ کر مغربی علاقے میں دریائے ہڈسن کے کنارے ایک ہوٹل میں چند دن گزارے۔ ۲۱ر ستمبر کو مشرق کی طرف منتقل ہوا۔ اور اب ایسٹ ریور پچھواڑے تو نہیں۔ البتہ "پتھر پھینک" فاصلے پر ضرور ہے۔ جب ہم نے سردار اورنگ زیب خان کو برما میں اپنا سفیر مقرر کر کے بھیجا، تو مرحوم نے اپنی سب سے پہلی تقریر میں برمیوں کی محبت کو تسخیر کرنے کے لئے کہا "ہم پاکستانی اور برمی بھائی بھائی ہیں کیوں کہ آپ کے جھنڈے میں بھی ستارہ ہے اور ہمارے جھنڈے میں بھی!" دریا کا قرب میرے اور تمہارے درمیان اسی قسم کا رشتہ ہے۔ اس کے علاوہ حُسنِ اتفاق سے تم بھی اپنے مکان کی ساتویں منزل پر ہو اور میں بھی! پھر تمہارا مکان یونیورسٹی کے قریب ہے، میرا دفتر کوئی چالیس منٹ کی سیر ہے، روز پیدل آتا جاتا ہوں۔ اس سے چودھری ظفر اللہ خان صاحب کے ساتھ مسابقت منظور نہیں جو اس عمر میں بھی ہر صبح سنٹرل پارک میں دو میل کی دوڑ لگاتے ہیں۔ دوڑ تو نہیں ہوتی۔ لیکن چلتے اتنا تیز ہیں کہ اسے دوڑ کے برابر سمجھنا چاہئے! تاہم اپنی اس سیر کو

---

۵ اس زمانے میں پاکستان کے سفارت خانے میں پریس اتاشی تھے۔

صحت کے لئے بڑی حد تک مفید پا رہا ہوں۔ وقت کا زیان اس میں ضرور شامل ہے، لیکن چینی فلسفی کی طرح یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ "جو وقت تم بچا لوگے، اس کا کیا کرو گے؟" تمہارے ہاں ۲۶ ستمبر کو ٹیلی فون لگا۔ ہمارے ہاں ۲۴ ستمبر کو۔ صرف دو دن پہلے! لیکن تمہارے لئے نیا نمبر شاید اس قدر کوفت کا باعث نہ ہو جس قدر ہمارے لئے ثابت ہو رہا ہے۔ جو نمبر مجھے ملا ہے وہ اس سے پہلے شہر کے کسی ہوٹل کا تھا۔ چنانچہ دن کے وقت "ہوٹلانہ" امور کے بارے میں استفسار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن بعض دفعہ راہ گم کردہ جوڑے رات گئے بھی "ڈبل روم" کے لئے ٹیلی فون کر ڈالتے ہیں! بہت جی چاہتا ہے کہ ان کی مدد کا کوئی راستہ نکالوں۔ لیکن کیا کروں۔ آباؤ اجداد میں سے کسی نے "ہوٹل بازی" نہیں کی۔ کبھی کبھی اپنی راہ گم کردگی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب "پائے رفتن" تو ہوتا تھا، "جائے ماندن" نہیں ملتی تھی۔ اسی وجہ سے ان پر ترس کھا کر رہ جاتا ہوں! یہ ہوٹل جس کا نمبر مجھے بخشا گیا ہے، غالباً کبھی ایسے ہی لوگوں کا ملجا و ماوے ہو گا۔ اور کیا معلوم اسی وجہ سے ہوٹل آخر بند ہو گیا ہو۔ اور صرف نمبر رہ گیا ہو۔ نمبر سیال چیز ہوتے ہیں، لہٰذا ہوٹل بند ہونے کے بعد یہ اپنا سفر الگ شروع کر دیتے ہیں!

حکیم خان[1] سے مختصر ملاقات ہوئی۔ وہ کسی بڑے ہاتھی کی سونڈ کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس سے الگ نہیں ہو سکے۔ ہاتھی کے ذکر سے قدرت اللہ شہاب از خود یاد آ گئے۔ پچھلے دنوں جناب صدر کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ دو بھاگ دوڑ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ بھی یہ حسرت لے گئے کہ صدر کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے اتنا وقت نہ نکال سکے کہ جم کر کسی موضوع پر گفتگو ہوتی۔ لیکن ان کی یہ حسرت یک طرفہ تھی، یہاں ایسی خوش گوار صحبت تک نارسائی کا کوئی غم باقی نہیں۔

ضیا[2] نیویارک میں ہے۔ ملاقات کا عزم دو مرتبہ کیا۔ لیکن نہ ہو سکی۔ ٹیلی فون پر طویل گفتگو ہوئی۔ لندن میں ضیا فیض سے ملا ہے۔ فیض وہاں مکان کی تلاش میں تھے تاکہ

---

[1] راشد صاحب کے ایک دوست [2] ضیا محی الدین

ہو سکے تو وہیں رہ کر زندگی کے باقی دن "خدا کی یاد" میں گذار دیں! فیض نے اس ضیا کے سامنے میری تازہ نظموں کی بے پناہ تعریف کی۔ دوسرے ضیا کے سامنے (یعنی ضیا جالندھری) بقول آفتاب احمد خانؔ کے (یعنی بقول سایۂ آفتاب کے!) کہا کہ "آدمی اتنی ہی بات کرے جتنی اس کی حیثیت ہو!" یہ بات درست ہو یا نہ ہو۔ اس نے بے حد سوچ میں مبتلا کر دیا۔ لیکن اندیشہ ہائے دور و دراز کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی کی حیثیت کو جانچنے کے لئے بھی آخر اُس کے مُنہ سے نکلی ہوئی بات سے بڑھ کر کونسی چیز ہے؟ اگر حیثیت سے مراد مالی یا معاشرتی حیثیت نہ ہو۔ تو "تا مرد سخن نہ گفتہ باشد" ہی سب سے بڑا پیمانہ ہے۔ انسان کو ناپنے کا۔ اگر ان نظموں میں "سخن گفتہ" اپنی جگہ کوئی معنی رکھتا ہو تو شاید اسی سے اس خاکسار کی حیثیت جانچنی چاہئے۔ اگرچہ اُس سے پہلے کے "ادبی اور ذہنی اعمال" بھی اس حیثیت کی پستی کی طرف چنداں زیادہ اشارہ نہیں کرتے (اس آخری جملے میں خود ستائی کا پہلو نکل آیا جس سے اکثر گریز کرتا ہوں۔ لیکن اس خیال سے کہہ رہا ہوں کہ فیض اس حیثیت سے بھی ناواقف نہیں ہیں!) تاہم خود ضیا جالندھری ایک حد تک مبالغے کے عادی ہیں اور آفتاب احمد خان اس مبالغے کی نشر و اشاعت سے لذت اندوز ہونے کے عادی!۔ اس لئے نجانے فیض نے کیا کہا ہو۔ اور اُس کی بات راستے کے کس کس موڑ سے گذری ہو!

کسی ویک اینڈ کے لئے آنکلو تو کیا ہی اچھا ہو۔ اگر کسی جیسے کو آؤ تو اسمبلی بھی دیکھ ڈالو۔ چودھری ظفر اللہ خان صاحب کی صدارت کا لُطف بھی اٹھاؤ۔ غلام علی الانا سے بھی ملو۔ وہ اکنامک کمیٹی کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے اور بڑی حسرت سے کہا "راشد! مجھے بھول نہ جانا!" اسی لئے بار بار یاد آ رہے ہیں۔ وعدہ ہائے دروغ کے ذریعے نجات پائی۔ اور اسی دن سے اپنے دفتر کے حُجرے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہوں۔ تاکہ گدائے گوشہ نشین سمجھ کر ہی الانہ صاحب راستہ بدل لیں!

مخلص راشد۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے خطوط

(رام لعل کے نام)

(۱)

ایم. اے. رحمٰن چغتائی

پیر مکی، راوی روڈ، لاہور۔۲

۲۱, مارچ، ۱۹۶۸ء

مکرمی معظمی رام لعل صاحب۔ آداب ونیاز۔ آپ کے لکھے ہوئے افسانے اکثر نظر سے گزرتے ہیں اور ان سے متاثر ہونے کا موقع بھی ملتا ہے۔

نہ تو مجھے کتاب کا نام اور سائز سمجھ آیا ہے۔ بتاؤں تو کیا بتاؤں، لکھوں تو کیا۔ آپ واپسی ڈاک کتاب کا نام اور سائز لکھ دیں۔ میں بصر (بسر) وچشم آپ کی اس آرزو کو پورا کروں گا۔

لکھنؤ میں آپ مہاجر ہیں یا گومتی کی مٹی کے گوتم ہیں؟

آپ کا مخلص، چغتائی

(۲)

۱۷, مئی ۶۸ء

مکرمی معظمی رام لعل جی، تسلیم ونیاز۔

چر کیں جانا پہچانا نام ہے۔ اگر آپ کے آرٹسٹ دوست جنہیں شدھ بدھ بھی ہے،

ادبی، فنی صلاحیتوں کا رجحان بھی صاف ستھرا ہے، مظلوم غالب کا تختۂ مشک (مشق) نہ بناتے تو اس پر کرم ہوتا۔ چرکین کی پامالی ہویا اس کی افتاد کی داد، یہ جدت متوجہ کرنے میں ان کے بہت کام آئی۔

ابسٹرکٹ، مغرب کی نقالی کا مرض تو عام ہے۔ اس میں فرار اور سہل دا . . ی کا اہم حصّہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے چرکین آج بھی توجہ کا مرکز بن سکتا ہے۔ یہاں بھی یہ مرض عام ہے اور میں نے ہمیشہ یہی مشورہ دیا ہے، پہلے تفصیلی تنقید لکھو پھر تخلیق کرو۔ اس سے اس فن مطلق کی مشکل پسندی آسان ہوجاتی ہے۔ ایشور دیکھا کرے اس فن میں آرٹسٹ کا اپنا ہاتھ ہے۔ خالق کا نہیں۔

یہ خیال تو ذہن میں برابر اُبھرتا رہا، آپ کو خط لکھوں۔ آخر جواب دینا بھی تو مرض میں شامل ہے۔ آج مجھے ایک رسالہ موصول ہوا جس کو دیکھنے کا پہلا موقعہ ہے۔ اُردو زبان۔ نگاہ سیدھی آپ کے مضمون پر گئی۔ افسانہ اور قاری۔ میں نے آپ کے اس مضمون کو بالکل ایک افسانہ کی حیثیت سے پڑھا۔ اور محض لُطف اندوزی نہیں ہوا، آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے قاری سے کہیں زیادہ افسانہ نگاری کو ہلارہ دیا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں کا جس خوبی سے آپ نے ایک ایک جملہ میں تجزیہ کیا ہے، قابلِ قدر ہے۔

لکھنؤ آپ کو راس آگیا ہوگا جس کی روایات دہلی سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ آرٹسٹ کو تعصبات کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ میں خود اس سے بلند تر ہوں۔ میں نے بھی ہند و 'بینڈ' پر کم وبیش دوسو کے قریب تصویریں بنائی ہوں گی۔ میں پورے اعتماد سے کہہ رہا ہوں۔ ہندوستان میں اُردو کے ساتھ یہ بے اعتنائی اور پامالی روا رکھنی زیبا نہیں دیتی۔ اس کا طول وعرض اس تنگ دلی کا جواز پیش نہیں کرسکتا۔

یہ آپ نے لکھا نہیں وہ ڈیزائن جو میں نے بنا کر بھیجا ہے آپ کے کسی کام آسکے گا یا مجھے پھر سے بنانا ہوگا۔ گومتی اور راوی میں نمایاں سے نمایاں فرق ہے۔ کسی کام آسکوں تو یاد کرلیا کریں۔

والسلام۔ مخلص، چغتائی آرٹسٹ

(۳)

۱۱ر اپریل ۱۹۶۸ء

مکرمی معظمی رام لعل صاحب، اسلام و نیاز۔

مری دوستی کا سلسلہ اتفاقیہ غیر مسلموں سے بھائیوں کی صورت تھا۔ نہ تو میں اُن کو بھولا ہوں اور نہ وہ مجھے بھولے ہیں۔ مجھے آپ جب چاہیں پکاریں، خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ دوستوں سے، بچھڑے دوستوں سے ایک ہی آرزو ہے، جس مٹی سے تم نے جنم لیا ہے، پنجابی ہو تو پنجابی نہ بھولنا۔

آپ کی نئی کتاب کا ڈیزائن میں نے بنا دیا ہے۔ اگر پسند نہ آئے تو دو تین چار اور جو بھی ارشاد ہوگا پورا کروں گا۔

پسند آجائے تو اس کا بلاک بنوالیں اور مجھے چار پانچ پروف بھیج دیں۔ میں رنگ لگادوں گا اور اس کی خوبصورتی نکل آئے گی۔ اگر کوئی دوست آرٹسٹ ہے تو اُسی سے رنگ لگوالیں۔ وینس سفید اور گوتم سُرخ گھر سے نظر آئے۔ دُور رہنے سے یہی تکلیف پیش آتی ہے۔ بہتر یہی ہے، پروف مجھے بھیج دیں۔ میں اس کو اس کے روپ میں ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا۔

گوتم تو بغیر سر کے ہے اور وینس بغیر بازوؤں کے۔ گل وکٹری آخر پڑے تو کیسے!

آپ کی یاد آوری کا ممنون ہوں۔ آرٹسٹ کی خدمت ایک فرض ہے۔ افسانے اور مضمون لکھنا ایک ہابی ہے۔ یہ ایڈیٹر لوگ، یہ ادیب لوگ آرٹسٹ کا یہ دعوےٰ برداشت نہیں کرسکتے کہ میں افسانہ نگار ہوں۔ یہ سلسلہ ابھی ختم بھی نہیں ہوا مضمون نگار بھی دبے پاؤں کبھی کبھار مار کھا جاتے ہیں۔ بہت کچھ لکھ رکھا ہے۔ یہ سلسلہ ابھی ختم بھی نہیں ہوا۔ یار دوست اپنے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ پیچھا کرتا چلا جاؤں۔

آپ کے افسانے اکثر نظر سے گزرتے ہی رہتے ہیں اور موقع پر پڑھ بھی لیتا ہوں۔ آپ کا فن آپ کا فن ہے۔ قلم میں گرفت ہے اور خود مقصود (؟) ہے۔ خدا آپ کے فن کا سر بلند رکھے۔

آپ کا مخلص، چغتائی آرٹسٹ۔

(۴)

۹ اکتوبر ۱۹۶۸ء

مکرمی معظمی رام لعل جی صاحب، آداب سرکار۔

NEW GENERATION کے مطالعہ سے اپنے کو اطمینان ہی حاصل نہیں ہوا، یہ بھی نظر آتا ہے۔ ہندوستان کا تڑپتا ہوا دل علم وادب کے لئے سرگرم عمل ہے۔
مجھے کچھ ایسا نظر آنے لگا ہے آپ جیسی شخصیتوں کی موجودگی میں اردو پھل پھول لاتا رہیگا۔ اس کی موت واقع نہ ہوگی۔

ہمارے آرٹسٹ نے خطوں میں آپ کے فنی شعور کا جس حسن سے ثبوت دیا ہے، قابلِ قدر ہے۔ ویسے مجھے علم ہے زیادہ سے زیادہ آرٹسٹ مغرب پرستی اور بڑی ارزاں قسم کی نقل نویسی میں کھو گئے ہیں۔ ہماری تہذیبی قدریں آج بھی بے پناہ موجود ہیں۔

میرے لائق جب بھی کوئی خدمت ہو حاضر ہوں۔

آپ کا مخلص، چغتائی آرٹسٹ

کرشن چندر کے خطوط
(رام لعل کے نام)

(کرشن چندر کا پہلا خط مجھے ۱۹۴۵ء میں، جب وہ شالیمار پکچرز پونہ کے پروڈیوسر ڈائریکٹر ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کے ساتھ وابستہ تھے۔
والٹن ٹریننگ اسکول لاہور کینٹ کے پتہ پر موصول ہوا تھا۔ اُس وقت میں وہاں کمرشیل کلرک کا پانچ ماہ کا کورس (دسمبر ۱۹۴۴ء سے اپریل ۱۹۴۵ء) کرنے کے لئے مقیم تھا۔ وہ خط اب میرے پاس محفوظ نہیں ہے لیکن اُس کا ایک اقتباس

میرے افسانوں کے مجموعہ "انقلاب آنے تک" (مطبوعہ ۱۹۴۹ء انٹرنیشنل پبلشرز بنارس) میں شروع کے صفحات پر موجود ہے۔ رام لعل)

(۱)

کوور لاج، چار بنگلہ، اندھیری، بمبئی

۲۶ر نومبر ۱۹۵۷ء

محترمی شری رام لعل جی، آداب۔ آج بدری صاحب (کاوش بدری) مدراس سے تشریف لائے تھے۔ یاد آوری کا شکریہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس سے پہلے بھی آپ سے خط و کتابت ہوئی تھی اور بیسویں صدی اور دیگر رسالوں میں آپ کی تحریروں سے میں بخوبی متعارف ہوں۔

مادر وطن (ہفت روزہ، لکھنؤ، ایڈیٹر نسیم کنجاہی) کا اب تک ایک پرچہ بھی میرے پاس یا مہندر بھائی کے پاس نہیں پہنچا۔ ممکن ہے ایڈریس غلط لکھا گیا ہو۔ ورنہ ڈاک خانے والوں سے ایسی مسلسل چوری کی امید نہیں ہے۔ آپ ذرا دیکھئے گا اور چند پرچے بھجوا دیجئے گا۔ میں حتی الامکان مادر وطن کے افسانہ نمبر میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں آپ مجھے ایک آخری تاریخ سے مطلع کر دیجئے جس کے بعد میرا افسانہ شریک محفل نہ ہو سکے گا۔ میں اُس تاریخ سے پہلے آپ کو افسانہ لکھ کر بھجوانے کی کوشش کروں گا۔

ان دنوں — کچھ عرصے سے — طبیعت افسانہ نگاری پر مائل نہیں ہے۔ ناول لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اپنا یہ شوق پورا کرتا رہتا ہوں — بہر حال کبھی کبھار دوستوں کے زور دینے پر ایک آدھ افسانہ بھی لکھ لیتا ہوں۔ مگر ان میں وہ لطف نہیں پاتا جو پہلے محسوس کرتا تھا۔ جانے وہ موڈ اب واپس کب آئے گا؟

کرشن چندر نمبر کے سلسلے میں۔ آپ سے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ یہ آپ جانیں اور نسیم صاحب۔ نکالیں یا نہ نکالیں۔ میری طبیعت ایسی ہے کہ میں نے آج تک کسی کو یہ نہ کہا، میرے متعلق ایک مضمون لکھ دیجئے یا میری کتاب پر ریویو کر دیجئے۔ یا میرے نام کو رسالے میں اُچھال دیجئے۔ میرا کام

صرف لکھنا ہے اور تنقید نگاروں اور میرے پڑھنے والوں کا یہ کام ہے کہ وہ میرے کھرے اور کھوٹے کو پرکھیں۔ اس لئے میں یہ عرض کرنے کی گستاخی ضرور کروں گا کہ اگر کہیں آپ اس نمبر کے شائع کرنے پر تُل جائیں یعنی بالکل اس عہد کریں تو اس بات کا ضرور خیال رکھیے گا کہ متانت اور سنجیدگی ہاتھ سے نہ جانے۔ ہر طرح کے مضامین اس میں ہوں اور تصویر کے دونوں رُخ اس میں دکھلائے جائیں۔ نہ ایسی مدح وستائش ہو کہ مجھے مُنہ چھپائے نہ بنے۔ نہ ایسی تنقیص ہو جس سے دیبوں یا دلدادگانِ ادب کو کسی طرح کی تعمیری مدد نہ پہنچ سکے۔ یہ متوازن کیفیت پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے اور ظاہر ہے اس کے لئے آپ کو بڑے سنجیدہ اصحاب سے رجوع کرنا ہوگا اور اگر آپ کو اس میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو مت چھاپئے گا ـــــ یہ چند منتشر سے خیالات میں نے اس سلسلے میں آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اُمید ہے ناگوار خاطر نہ ہوں گے۔

اب تو عرصے سے لکھنؤ آنا نہیں ہوا۔ بھوپال میں اپنی علالت کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ البتہ دسمبر کے دوسرے ہفتے میں کلکتہ جا رہا ہوں ـــــ دیکھئے آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہوتی ہے۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا بھائی ـــــ کرشن چندر

(۲)

گوردواس، پندرھواں راستہ کھار ابمبئی ۵۲

۷ر جولائی ۱۹۶۳ء

پیارے رام لعل، عرصہ دراز کے بعد تمہارا کوئی خط ملا۔ تم اپنے انتخاب کے لئے "شانو" لے لو۔ یا جو افسانہ تمہیں پسند آئے وہی انتخاب کر لو۔ اس معاملے میں، مَیں تمہاری رہنمائی نہیں کر سکتا کیونکہ انتخاب تمہارا ہونا چاہیے۔ میرا نہیں۔

۱۹۶۲ء میں بیدی نے کون سے افسانے لکھے ہیں اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ بیدی کا پتہ اس وقت نہ میری ڈائری میں محفوظ ہے نہ ذہن میں۔ (؟) کے گھر پر اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں مگر پتہ یاد نہیں۔ ہے نا عجیب بات! غالباً عبّاس کو یاد ہوگا۔ عبّاس کو لکھ کر معلوم کر لو۔

ادھر کیا کچھ لکھا جا رہا ہے؟ تمہارے فن کا ایک طرح سے رسیا ہوں۔ لیکن اب جی چاہتا ہے تم کوئی طویل چیز لکھو۔ تمہارا، کرشن چندر۔

(۳)

(انگریزی لکھے ہوئے خط کا اردو ترجمہ)

۱۵ چھپرا بلڈنگ، مادھو داس پاستا روڈ، دادر، بمبئی

۳۰ر اپریل ۱۹۶۴ء

میرے پیارے رام لعل، میری بیٹی کپلا اب شادی کے قابل ہو گئی ہے۔ اُسے اب مزید تعلیم میں دلچسپی نہیں رہی۔ وہ گھریلو قسم کی لڑکی ہے، دیکھنے میں اچھی مگر شرمیلی، گھر اور گھر کے کاموں میں دلچسپی رکھنے والی۔ وہ بہت باتونی نہیں ہے اور علم و ادب میں تو اس کی بالکل دلچسپی نہیں ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس قسم کی لڑکی کے لئے کوئی مناسب ور دیکھ کر اُس کی ٹھیک ویڑ و تار طریقے سے شادی کر دی جائے۔

مجھے پتہ چلا ہے کہ لکھنؤ میں کوئی لڑکا ہے جو انجینئر ہے اور اچھی تنخواہ پاتا ہے اور ایک اچھے خاندان سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے والد کا نام و پتہ حسبِ ذیل ہے:۔

(. . . . .)

براہِ کرم لڑکے کے بارے میں جہاں تک ممکن ہو سکے اچھی طرح مزید تفصیل معلوم کرو۔ اُسے خود جاکر دیکھو کہ کس قسم کا لڑکا ہے، خاندان کیسا ہے اور ان کی توقعات کیا ہیں؟ میں یہ ساری باتیں تمہاری رائے کے ساتھ جاننا چاہتا ہوں۔

مہربانی کر کے ستیش بترا سے بھی بات کرو کہ وہ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے اور اگر تم دونوں کسی اور لڑکے کو تجویز کر سکو تو؟ ذات پات کی کوئی پابندی نہیں ہے لیکن لڑکا ضرور اچھا ہونا چاہیئے۔ براہِ کرم مجھے ضرور لکھو۔ میں کلکتہ سے دو ماہ کے بعد ابھی واپس آیا ہوں۔ تمہارا (ماہنامہ) کتاب کا کہانیوں کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا ہیں نے تمہیں یہ خط انگریزی میں کیوں لکھا ہے؟ جواب جلدی دینا۔ تمہارا، کرشن چندر

(۴)

کمرہ نمبر ۳۵، گرینڈ ہوٹل، کلکتہ ۔۱۳

۷ اگست، ۱۹۶۶ء

محترمی رام لعل جی، آداب ۔ آپ کا خط مجھے بمبئی سے ری ڈائریکٹ ہو کے مل گیا ۔ میں پندرہ دن سے کلکتے میں مقیم ہوں ۔ اپنے کام کے سلسلے میں آیا تھا ۔ اب دس اگست کو واپس بمبئی چلا جاؤں گا ۔ یہاں اس قدر مصروفیت رہی کہ بہ ہزار کوشش آپ کے خط کا جواب مفصل طور پر نہ بھیج سکا ۔ بمبئی جا کے لکھوں گا کیونکہ آپ کے خط اور انگریزی مضمون میں کئی متنازع فیہ باتیں ہیں جو غور و فکر کی محتاج ہیں ۔ روا روی میں نہیں لکھا جا سکتا ۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے ۔ عابد سہیل، ستیش بترا اور دوسرے احباب کی خدمت میں آداب ۔ آپ کا کرشن چندر ۔

(۵)

گورو نواس، ۱۵ واں راستہ، کھار بمبئی ۔ ۵۲

۱۸ جولائی ۱۹۶۰ء

پیارے رام لعل، میری غیر حاضری میں تمہارا خط آیا ۔ میں پرسوں جرمنی سے لوٹا ہوں ۔ ڈھائی ماہ کے بعد ۔ تمہارا انگریزی کتابچہ بھی مل گیا ۔ اس کے لئے اپنی کہانی چند دنوں میں بھیج دوں گا ۔

تمہارے افسانوں کے نئے مجموعے کے لئے دیباچہ بھی لکھ بھیجوں گا، تم مسودہ مجھے بھیج دو ۔

بہار ریلیف فنڈ کے دورے پر غالباً نہیں آ سکوں گا ۔ بہت تھک گیا ہوں ۔ یوں دیکھا جائے تو گذشتہ آٹھ ماہ سے سفر میں ہوں ۔ دو دفعہ کلکتہ، تین دفعہ دہلی، ایک دفعہ مالیگاؤں، پھر دہلی، ماسکو، برلن وغیرہ وغیرہ ۔ آخر گوشت پوست کا جسم ہی تو ہے ۔ کب تک اس طرح ساتھ دے گا ۔ چند دنوں کے لئے آرام کرنا چاہتا ہوں ۔ اگر یاروں نے کرنے دیا تو ۔ ورنہ پھر اسی ریل کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ ... ابھی اپنی آمد کے بارے میں وثوق سے کچھ طے نہیں کیا ہے ۔ مگر عباس

بیدی، سردار جعفری، ساحر ضرور آ رہے ہیں اور بنے بھائی بھی۔

عابد سہیل سے اگر ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا۔ انہیں بھی کل پرسوں میں خط لکھوں گا۔ ڈاک اتنی اکٹھی ہو چکی ہے کہ دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔

آج شاعر کا کرشن چندر نمبر ملا ہے۔ خاصہ ضخیم ہے اور دیدہ زیب بھی۔ ابھی تک صرف تصاویر دیکھ سکا ہوں۔ فرصت کے اوقات میں دھیرے دھیرے پڑھوں گا۔ ابھی تک تو ڈاک کا ہول دل میں بیٹھ گیا ہے۔ پہلے اسے دور کرنے کی کوئی سبیل کر لوں۔

ادھر کب آنے کا ارادہ ہے۔ تمہارا کرشن چندر

(۶)

گورو نواس، پندرھواں راستہ، کھار، بمبئی۔ ۵۲

۱۰ ار نومبر ۱۹۶۸ء

پیارے رام لعل۔ خوش رہو۔ عرصہ دراز کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ اس لئے کہ اب خود سے خط لکھنے اور ہلکے پھلکے مضامین (جن سے دل و دماغ پر بار نہ پڑے) یا ترجمے کرنے کی اجازت فی الحال مل گئی ہے۔ اس لئے اب مصنف سے مترجم ہونا پڑے گا۔ ترقی معکوس اسے کہتے ہیں شاید!

میری طویل علالت کے دوران تمہارے تین چار خط ملے۔ تمہارے خلوص اور محبت کا شکریہ۔

یہ احباب کی محبت ہی تھی جس نے مجھے موت سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دی۔

اور کہو، تم آج کل کیا کر رہے ہو؟ یشپال، امرت لال ناگر، عابد سہیل، بھگوتی چرن ورما، حیات اللہ انصاری، آنند نارائن ملا، شمس الرحمن فاروقی اور دیگر احبابِ لکھنؤ کو میرا سلام پہنچے۔ تمہارا کرشن چندر۔

(۷)

گورد نواس، ۱۵واں راستہ، کھار، بمبئی ۵۲

۲۶ نومبر ۱۹۶۸ء

پیارے رام لال، خوش رہو۔ تمہارا خط مل گیا، مجھے اُمید ہے، اب تک تمہیں بھی میرا تفصیلی خط مل چکا ہوگا جس میں، میں نے اپنے صحت یاب ہونے کی خبر دی ہے اور کچھ دوسری باتیں بھی تھیں۔ مجھے اس بات کی دلی مسرت ہے کہ تم لکھنؤ میں بھی جشن کرشن چندر منانے جا رہے ہو۔ صحت اس امر کی ابھی اجازت نہیں دیتی کہ جہاں جہاں جشن کرشن چندر منایا جائے وہاں وہاں خود سے چلا جاؤں۔ بس دو ایک جگہ جاؤں گا۔ اُمید ہے تم میری معذوری سمجھ کر مجھے اس غیر حاضری کے لئے معاف کر دو گے۔ جشن کی تاریخ لکھ دو گے تو بروقت پیغام بھیج دوں گا۔

جشن کے سلسلے میں تم نے بنارس کے جس سرپرست کا پتہ لکھا تھا، وہ چونکہ صاف لکھا ہوا نہیں تھا اس لئے اُس پتے پر جشن کا لٹریچر نہیں بھیجا جا سکا۔ دوبارہ خط میں صاف صاف پتہ لکھ دو۔

جشن کی تاریخیں بڑھا دی گئی ہیں۔ اب یہ جشن کسی جگہ بھی آئندہ تین ماہ میں ہو سکتا ہے۔ یعنی ۲۳ نومبر سے ۲۳ فروری تک۔ یہ اس لئے کہ ضروری انتظامات کرنے میں آسانی ہو۔ اور ٹھیک طریقے سے کام ہو سکے۔

کلکتے سے جے رتن کا خط آیا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ تم اپنے انگریزی رسالے کا بھی ایک شمارہ اس کام کے لئے وقف کر رہے ہو۔

میں نے دراصل یہ سوچ کر اس جشن کی منظوری دے دی کہ اس طرح سے ایک صحتمند روایت کی داغ بیل پڑ سکے گی جس کے ذریعے ایک ادیب کی بھی قومی حیثیت کو منوایا جا سکے گا۔ اور اس جشن سے اس تحریک کو بھی تقویت ملے گی کہ ادیب اور ساہتیہ کار کل ہند پیمانے پر ہماری قومی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں۔

تمہارا، کرشن چندر

(۸)

گورو نواس، ۱۵داں راستہ، کھار، بمبئی۔ ۵۲

۱۲ر دسمبر ۱۹۶۸ء

پیارے رام لعل، خوش رہو۔ کمزور صحت کی بنا پر میں نے دلی جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی یہی صلاح دی ہے۔

تم اپنے حساب سے جشن مناؤ۔ مگر اس کی تاریخ اور پروگرام سے ضرور مطلع کرو۔ اور جشن کے بعد پروگرام کی تفصیل، جو مقالے پڑھے جائیں، ان کی نقل اور جو تقاریر ہوں ان کی ایک کاپی یا ٹیپ مجھے ضرور بھجوا دو۔ اور ہاں تصاویر بھی اس سلسلے میں ضروری ہیں۔ یہ سب ایک کتاب کا حصّہ ہوں گی جو بعد میں اہتمام سے چھاپی جائے گی۔ اس لئے تاکیداً ان سب باتوں کے بارے میں دوبارہ یاد دہانی کرا رہا ہوں۔ تمہارے خط کا انتظار رہے گا۔

تمہارا، کرشن چندر

(۹)

کرشن چندر کے سیکریٹری کا خط ـــــ

گورو نواس، ۱۵داں راستہ، کھار، بمبئی۔ ۵۲

۶ر مئی ۱۹۶۹ء

محترمی، آداب۔ آپ کا خط مل گیا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ کرشن جی ایک طویل مدت تک آپ کو جواب نہ دے سکیں گے۔ کیونکہ ۱۸ر مارچ کی شب کو ساڑھے چار بجے کے قریب ان پر قلب کا شدید دوسرا دورا پڑا۔

پچھلے چھ ہفتے سے وہ آکسیجن پر ہیں۔ اور بمبئی کے مشہور ترین چار ڈاکٹروں کے بورڈ کی نگرانی میں اُن کا علاج کیا جا رہا ہے۔ مگر ابھی حالت ایسی نہیں ہے، جسے اطمینان بخش کہا جا سکے۔

ابھی تک کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ اُمید ہے آپ جیسے مخلص احباب ان کے حق میں دعا کریں گے۔ آپ کا مخلص، پوتم پیلی بھیتی (سیکریٹری)

(۱۰)

(کرشن چندر کے ایک اور سیکریٹری کے انگریزی خط کا ترجمہ)

گورو نواس ۱۵۰ واں راستہ کھار، بمبئی ۵۲

۲۵ رمئی ۱۹۶۹ء

میرے پیارے رام لعل جی، آپ کے ۱۲ رمئی ۱۹۶۹ء کے خط کا شکریہ جو مجھے ۲۵ رمئی ۱۹۶۹ء کو موصول ہوا۔ آپ کی خواہش کے مطابق میں آپ کو شری کرشن چندر کی ایک فوٹو بھیج رہا ہوں۔ براہ کرم سمپوزیم کی رپورٹ اور دوسری تفصیلات تصاویر کے ساتھ جیسے ہی تیار ہو جائیں مجھے بھجوا دیں۔

شری کرشن چندر ابھی تک فراش ہیں اور انہیں لگاتار آکسیجن دی جا رہی ہے۔ اگرچہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہے ہیں لیکن وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں اور انہیں پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ لیکن دن میں اُن سے ملنے کے لئے صرف دو لوگ مزاج پُرسی کو آ سکتے ہیں۔ بہرحال جہاں تک ممکن ہے ان کا علاج بہترین طریقے سے کرایا جا رہا ہے اور ہم ان کی صحت یابی کے لئے پُرامید ہیں۔

اس سال کے آخر میں یا آئندہ سال کے شروع میں جب جشن کی تقریبات منائی جا چکی ہوں گی، مرکزی جشن کمیٹی ایک جامع کتاب شائع کرے گی جس میں مصنفین اور دوسرے اہم اشخاص کے پیغامات اور متعدد مقامات پر منائی گئی جشن کی تقریبات کی تفصیلی روداد اور تصاویر وغیرہ شامل ہوں گی۔ لکھنؤ کی رپورٹ کو اس میں خاص اہتمام سے شامل کیا جائے گا اور ہمیں امید ہے کہ آپ اس کے ساتھ سمپوزیم کی کچھ تصاویر بھی ضرور بھجوائیں گے۔

نیک خواہشات کے ساتھ، آپ کا مخلص، ڈی۔ پی۔ شیٹھے۔

(کرشن چندر کا سیکریٹری)

(۱۱)

گورونواس، ۱۵ واں راستہ، کھار، بمبئی۔ ۵۲

۶ر ستمبر ۱۹۶۹ء

پیارے رام لعل، خوش رہو۔ تمہارا کارڈ ملا جس میں تمہاری دختر نیک اختر عزیزہ شیلا (شیل) موہنی کی شادی کی تقریب کی خوشخبری دی گئی ہے۔ لگن ۹ ستمبر کا ہے۔ کاش میں اس موقعہ پر تمہارے ساتھ ہوتا۔ مجھے بے حد مسرت ہوتی۔ لیکن علالت مانع ہے۔ میری طرف سے خوش نصیب جوڑے کو اس یوم سعید پر بھرپور دعائیں دینا۔

میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ گھر سے باہر کی سڑک پر چل پھر لیتا ہوں۔ پندرہ بیس روز کے بعد بمبئی شہر جانے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی حد تک لکھنے پڑھنے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ مگر ڈاکٹروں نے شرط یہ لگادی ہے کہ صرف ہلکے پھلکے مزاحیہ خاکے لکھوں یا فلسفیانہ مضامین یا ترجمے کروں۔ قدرت کی ستم ظریفی کی داد کیسے نہ دوں۔ مگر شمع ہر رنگ میں جلتی ہے۔ امید ہے تم خیریت سے ہوگے۔

تمہارا، کرشن چندر

(۱۲)

(انگریزی سے اُردو میں ترجمہ)

گورونواس، ۱۵ واں راستہ، کھار، بمبئی۔ ۵۲

۲۳ر دسمبر ۱۹۶۹ء

پیارے دوست رام لعل، میں یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے نئی قیام گاہ منتقل ہو جاؤں گا براہ کرم میرا نیا پتہ نوٹ کرلو جو درج ذیل ہے:

"کرشن چندر، "دی نشں" اپر فلور، دوسری حسن آباد لین، سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو یا اس کے بعد صرف نئے پتہ پر خط و کتابت کرنا۔

نیک خواہشات کے ساتھ، تمہارا مخلص، کرشن چندر

پس نوشت: ٹیلی فون نمبر بہرحال وہی رہے گا (۵۳۷۵۰۰)

(۱۳)

دی نشن" اپر فلور، سینٹ فرانسس ایونیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

۱۴ر جنوری ۱۹۷۰ء

پیارے رام لعل، خوش رہو۔ میں نے مکان بدل لیا ہے۔ پتہ اُوپر درج ہے۔ آئندہ خط و کتابت کے لئے اس پتے کو استعمال کرو۔ اُردو کنونشن میں تمہارا بہت انتظار رہا، تم نہیں آئے۔ عابد سہیل بھی نہیں آئے۔ لکھنؤ میں ہندی اُردو ادیبوں کا جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کی نقل یا بہتر ہو اگر اس کا PHOTOSTAT مع ان تمام ادیبوں کے دستخطوں کے PHOTOSTAT کے مجھے بھجوا دو تو کرم ہوگا۔ یہاں اُردو کمیٹی کے دفتر میں اس کی کوئی نقل یا کاپی نہیں ہے۔ یہ سمجھوتہ دوسرے دن لکھنؤ کے اخباروں میں بھی چھپا تھا اور کسی رسالے کے ٹائٹل پیج پر میں نے اس کا سرورق بھی دیکھا تھا۔ اگر ہو سکے تو یہ سب MATERIAL مجھے بھجوا دو۔ نئے پتہ پر۔ پتہ اُوپر درج ہے۔

اُمید ہے تم خیریت سے خوش و خرم ہوگے۔

تمہارا، کرشن چندر

(۱۴)

" دی نشن" اپر فلور، سینٹ فرانسس ایونیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

۲۶ر جنوری ۱۹۷۰ء

پیارے رام لعل، خوش رہو۔ تمہارا خط مل گیا۔ فنڈ کی کمی تھی۔ یہ زیادہ ضروری تھا کہ دوسری زبانوں کے ادیبوں کو بلوا لیا جائے۔ لہٰذا اس پر عمل کیا گیا۔ دوسری زبانوں کے

بڑے بڑے ادیبوں نے ہوائی جہاز تک کا کرایہ مانگ لیا۔ اس سے اور بھی مشکل پیدا ہو گئی۔ کنونشن کا
مسئلہ ابھی تک باقی ہے۔ اُمید ہے تم حالات سمجھ کر میری معذرت قبول کر لوگے۔

تمہارے اخباروں کے تراشے مل گئے۔ لیکن فوٹو اسٹیٹ نہیں ملے۔ غالباً "شب خون"
نے "کتاب" نے اپنے ٹائیٹل پیج پر یہ فوٹو اسٹیٹ چھاپے تھے۔ اگر فوٹو اسٹیٹ نہ مل سکیں تو
وہ پرچے ہی بھجوا دو۔ مہربانی ہوگی۔ میرا مضمون اس کے بغیر تشنہ رہ جائے گا۔
عابد سہیل اور شمس الرحمٰن فاروقی دونوں کو خط لکھ چکا ہوں۔ اس سلسلے میں یاد دہانی کرا دو۔

تمہارا، کرشن چندر

(۱۵)

(انگریزی سے اردو میں ترجمہ)

دی لنش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز (ویسٹ) بمبئی ۵۴

۱۸ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

میرے پیارے رام لعل، میرے دائیں ہاتھ نے مجھے بہت تکلیف میں مبتلا رکھا۔
اسی وجہ سے یہ خط انگریزی میں ہے اور میرے ہاتھ سے لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس بات کی بھی
توقع ہے کہ اس سے پہلے تمہیں خط نہ لکھ سکنے کی وجہ سے تم میری معذرت قبول کر دگے۔
کیونکہ میں اس کوشش میں تھا کہ تمہیں کیا بھیجوں۔

میں تین ماہ کے لئے ہندوستان سے باہر تھا۔ میں علاج معالجے کے لئے گیا ہوا تھا،
اسی لئے میں نہ تو کوئی نئی چیز لکھ سکا نہ ہی میرے پاس کوئی اخذ شدہ چیز ہے۔ جہاں تک اسکرین
پلے یا کسی فلم کے مکالموں کے مسودے کا تعلق ہے اس کے لئے مجھے فلم کمپنی سے اجازت لینی ہوگی۔
جس کے پاس اسکرپٹ کے حقوق محفوظ ہیں۔ عام طور پر اس معاملے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ہے
لیکن میں ابھی تک یہ طے بھی نہیں کر سکا کہ کس چیز کا انتخاب کروں۔ براہِ کرم مجھے تھوڑا سا وقت اور دو۔
امید ہے تم بخیر ہوگے۔ دیوالی کے لئے نیک خواہشات۔

تمہارا، کرشن چندر

(۱۶)

"دی لنش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

(تاریخ درج نہیں ہے)

پیارے رام لعل، مہندر جی (مہندر ناتھ) نہیں رہے۔ بیس مارچ کی صبح میں انہیں دل کا دورہ پڑا۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ ان کی حالت سدھرنے لگی۔ شام کے چھ بجے تک ان کی حالت بہت سنبھل گئی۔ پھر ایک گھنٹے کے بعد انہیں دل کا دوسرا دورہ پڑا جسے وہ برداشت نہ کر سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا..... میں اس صدمے کو کیسے برداشت کروں گا—؟ تمہارا، کرشن چندر

(۱۷)

(انگریزی سے اُردو میں ترجمہ)

"دی لنش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

۲۸ر مارچ ۷۴ء

میرے پیارے رام لعل، میرے صدمے کے بارے میں تم نے جو اظہار ہمدردی کیا، اس کا بے حد شکرگزار ہوں۔ مہندر ناتھ کی شکل میں میں نے سب سے پیارا بھائی کھو دیا اور تم نے ایک مخلص دوست کھویا۔

تمہارا مخلص، کرشن چندر

(۱۸)

"دی لنش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز (ویسٹ) بمبئی ۵۴

۶ر اپریل ۷۴ء

پیارے رام لعل، مہندر کی یاد میں تمہارا ایک مضمون چاہیئے، یہاں سے ایک خاص

کتاب نمبر جو کچھ بھی شائع ہو رہا ہے ،' اردو میں' شری صابر دت اُسے ایڈیٹ کر رہے ہیں ۔ اگلے ماہ تک شائع کر دینا چاہتے ہیں ۔ اس کے لئے تمہارا ایک مضمون چاہیئے ، مہندر سے تمہاری دوستی ہے (تھی) اس کی زندگی پر اس کے ادب پر جو بھی مناسب سمجھو ۔

یہ کام مہندر کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا ۔ اُسے اس نمبر میں بڑی دلچسپی تھی ۔ اس کی سال گرہ منانے کے بھی ارادے تھے ۔ سبھی تیاریاں ہو چکی تھیں ۔ کسے معلوم تھا کہ سال گرہ کے بجائے برسی کا سانحہ سامنے آئے گا ۔ میری تو جینے کی آدھی خواہش ختم ہو چکی ہے ۔

تمہارے مضمون ، تمہارے خط ، تمہاری خیریت ۔ ان دنوں ہمہ وقت اپنے دوستوں کی زندگی کے لئے دعا مانگتا رہتا ہوں ۔

تمہارا کرشن چندر

(۱۹)

" دی نش " سینٹ فرانسس ایوی نیو ، سانتا کروز ویسٹ ، بمبئی ۵۴

۱۶ / مئی ۷۴ ، ۱۹ء

پیارے رام لعل ، معلوم نہیں اُردو پروموشن فورم کی مجوزہ کانفرنس کی تاریخیں کونسی تھیں ۔ مجھے تو کوئی اطلاع نہیں ملی اب تک ۔ امید ہے ، تم اب اس کانفرنس سے واپس آ چکے ہو گے یا وہ کانفرنس ریلوے ہڑتال کی وجہ سے ملتوی ہو گئی ہو گی ۔

جیسا تم نے مشورہ دیا ہے ، میں ڈاکٹر نریش کو اُن کے پتے پر مہندر جی کے سلسلے میں ایک خط لکھ رہا ہوں ۔ معلوم نہیں تم نے اب تک اکادمی کے لوگوں سے بات کی یا نہیں ۔ میں بھی دو ایک روز میں اُنہیں خط لکھ دوں گا ۔ اگر فی الحال پنشن یا مسودہ چھاپنے میں کوئی اڑچن ہو تو مہندر جی کے زندگی بھر کے ادبی کام کے لئے پانچ ہزار تو دیے جا سکتے ہیں ۔ جیسے احتشام حسین اور دوسرے ادیبوں کے لئے منظور کئے گئے ہیں ۔ اس سلسلے میں تو کوئی اڑچن پیدا نہ ہونی چاہیئے ۔

میں تمہیں اس خط کے ہمراہ ایک بروشیور بھجوا رہا ہوں ۔ یہ اُن لوگوں کے لئے ۔ جو

ادبی امداد کے لئے فیصلے تو کرتے ہیں لیکن اکثر اوقات ممتاز ادبی شخصیتوں کے ادبی مقام سے واقف نہیں ہوتے۔

امید ہے تم خیریت سے ہوگے اور لوگوں سے مل کر مجھے خط لکھوگے۔

تمہارا، کرشن چندر

(۲۰)

"دی نشن" سینٹ فرانسس ایوی نیو سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

۳؍جون ۱۹۷۴ء

پیارے رام لعل، آج تمہارا خط ملا۔ اور بہت دلچسپ فوٹو بھی مل گئے۔ ساحر آج کل "خاموشی" کے موڈ میں ہیں۔ اور ہر بات پر "چپ" سادھے ہوئے ہیں۔ اس لئے جب تک وہ اس موڈ سے باہر نہ نکل آئیں، اُن سے مزید گفتگو نہیں ہو سکتی۔ کسی معاملے پر — ہاں نگم صاحب کو فون کر کے معلوم کروں گا کہ بنک میں کتنی رقم باقی ہے، جو ہو گی وہ فوراً بھجوا دیں گے۔

عمر بن صباح صاحب سے تمہاری تفصیلی گفتگو سے بہت سے اُمور پر روشنی پڑتی ہے۔ مگر اس پہلو کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا کہ جن ادیبوں کو پانچ ہزار کا انعام دیا جاتا ہے اُن کی زندگی بھر کی تخلیق کے صلے میں، وہ انعام کیا صرف ریاستی ادیبوں کو دیا جاتا ہے یا اس کا انتخاب سارے ہندوستان سے ہو سکتا ہے۔ اگر سارے ہندوستان سے ہو سکتا ہے تو اس انعام کے لئے کوشش کرو۔ مہندر کے لئے۔ میں بھی عمر بن صباح کو خط لکھ دوں گا۔

اپنے بھائی کے بارے میں، ہو گنا جی سے خود کچھ کہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ دوسروں کے بارے میں کہنے سے میں گریز نہیں کرتا لیکن اپنے بھائی کے لئے میں اپنے چند بے تکلف دوستوں ہی سے کہہ سکتا ہوں۔ تم خود سوچ کر کسی سے کہلواؤ۔

فورم کے سلسلے میں خود تمہاری کچھ مدد کرتا مگر آج کل بڑے تلخ اور صبر آزما حالات سے گزر رہا ہوں۔ مگر میری عادت بسورنے کی نہیں ہے۔ جو اور جس قسم کے نامساعد حالات

سامنے آئیں انہیں خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہوں۔ صرف اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ غروب
رنگ سے دو تین سال پہلے اتنی فراغت مل جاتی کہ کشمیر کے کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی آپ بیتی
ایک بڑا ناول مکمل کر لیتا۔ چلئے، نہ سہی۔

تمہارا۔ کرشن چندر

(۲۱)

نش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

۱۲ر جون ۱۹۷۴ء

پیارے رام لعل، پانڈے جی کا خط الہ آباد سے آیا ہے۔ شاید تم ان سے ملے ہوگے۔ اور
مضمون کا تذکرہ کیا ہوگا۔ اردو افسانے پر۔ جسے تم اندرا گاندھی "ابھی نندن گرنتھ" کے لئے
نا چاہتے تھے۔ اگر مضمون تیار ہے تو اب بھی وقت ہے بھجوا دو۔ میں انتظار کروں گا۔

تمہارا، کرشن چندر

(۲۲)

نش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

۲۱ر جون ۱۹۷۴ء

پیارے رام لعل، تمہارا خط مل گیا۔ آج ہی میں نے دلی خط لکھ دیا ہے۔ اور یہ اطلاع
ائی ہے کہ مہندر ناتھ کی کونسی کتابیں کتنی تعداد میں پبلشر کے پاس موجود ہیں۔ جواب
ہی مطلع کروں گا۔

تم نے گذشتہ خط میں تحریر کیا تھا کہ اگر ان کی کوئی کتاب ۱۹۷۴ء میں چھاپی جائے تو
پر معقول انعام دیا جا سکتا ہے۔ نئی کتاب تو کوئی نہیں ہے۔ البتہ بہت سی پرانی کتابوں
نئے ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ ہے۔ آہستہ آہستہ ایک کتاب لگے چھ ماہ میں شائع کروں گا۔
ٹھیک رہے گا؟

مہندر کی بہت سی کتابیں OUT OF PRINT ہیں۔

ڈاکٹر نریش کا خط آیا تھا۔ وہ چنڈی گڈھ میں مہندر ناتھ یادگار کمیٹی قائم کر کے فنڈ جمع کریں گے

تم بھی انہیں لکھ دو۔ میں نے آج انہیں شکریہ کا خط لکھ دیا ہے۔

تمہارا، کرشن چندر

(۲۳)

" دی نش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی۔ ۵۴

۱۰ ر اگست ۱۹۷۴ء

پیارے رام لعل، آداب۔ تمہارا خط مل گیا۔ اردو افسانے پر اپنا مسودہ جلد بھیج دو

تاکہ میں اسے 'اندرا گاندھی ابھی نندن گرنتھ' میں شامل کر لوں۔ ساری کتابت ہو چکی ہے۔ صرف دو

مضمون باقی ہیں۔ ایک تمہارا، ایک اعجاز صدیقی کا۔ اب اس سلسلے میں تاخیر سے کام نہ لو۔

تمہیں میری ڈاکومنٹری پسند آئی۔ شکریہ۔ میں نے نہیں دیکھی، ورنہ مہندر جی کو دیکھ کر رو پڑتا۔

غم بھاری ہے اور میں بہت ذکی الحس ہو چکا ہوں۔ معلوم نہیں کیسے کیسے پیاروں کا غم دیکھنا باقی

ہے۔ کل ڈاکٹر نریش آئے تھے۔ میں نے انہیں کل پھر بلایا ہے۔ کیونکہ کل بہت سے لوگ تھے۔ اس لئے

کھل کر باتیں نہ ہو سکیں۔ کل جب آئیں گے تو باتیں ہوں گی۔ پھر تمہیں لکھوں گا۔ ڈاکٹر نریش جی سے معلوم

ہوا کہ تم کسی وجہ سے نہیں آسکے۔ کیا بات ہے؟ میں تو تم لوگوں کے انتظار میں تھا۔

امید ہے، تم خیریت سے ہو گے۔ تمہارے مسودے کا انتظار رہے گا۔

تمہارا اپنا، کرشن چندر

(۲۴)

" دی نش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی۔ ۵۴

یکم اگست ۱۹۷۵ء

پیارے رام لعل، تمہارا خط ابھی ملا۔ ابھی میں نے اسے پڑھ کر عزیز رومیش چندر کو خط تحریر

کیا ہے۔ اُمید ہے تمہیں جلد ہی PAYMENT ہو جائے گی۔ اور ہند سماچار اور پنجاب کیسری کے پرچے بھی مل جائیں گے۔ تم خود بھی آئندہ اُنہیں افسانے بھیجا کرو اور اس پتے پر خط و کتابت کیا کرو۔

SHRI ROMESH CHAND, EDITOR, HIND SAMACHAR DAILY, CIVIL LINES, JULLUNDUR, PUNJAB.

تعارف ہو چکا ہے۔ وہ لوگ بے حد شریف اور معاملے کے کھرے لوگ ہیں۔ اُن سے خود بھی راہ و رسم رکھو۔

میں نے حسن کمال کے ذریعے عمّار رضوی صاحب کو ایک خط اور ایک کاپی مہندر ناتھ یادگار نمبر کی بھجوائی تھی۔ یوپی حکومت کی طرف سے BULK PURCHASE ORDER نہیں ملا۔ مہاراشٹر اور ہماچل پردیش سے مل چکے ہیں۔ ذرا عمّار رضوی صاحب سے مل کر انہیں میری استدعا کے بارے میں یاد دلاؤ۔ اگر اس نمبر کی حوصلہ افزائی حکومت نہیں کر سکتی تو پھر کس کی کرے گی؟ یہ نمبر اس لائق ہے کہ اسے لائبریریوں میں رکھا جا سکے۔ ON MERITS ALONE

امید ہے تم خیریت سے ہو گی۔ تمہارا اپنا، کرشن چندر

(۲۵)

"دی نشں" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی۔ ۵۴

۲۳ راگست ۱۹۷۵ء

پیارے رام لعل، تمہارا خط مل گیا۔ حسن کمال کا کہنا ہے کہ وہ خود یہ نمبر لے کے احمد جمال پاشا کے ہمراہ عمّار حسن رضوی صاحب کے ہاں گیا تھا۔ اور انہیں میرا خط بھی دے دیا۔ اور یادگار نمبر بھی اور آن سے BULK PURCHASE کی استدعا بھی کی تھی۔ بہر حال اس خط کے ہمراہ میں عمّار حسن رضوی کے لئے ایک خط روانہ کر رہا ہوں۔ اسے تم پڑھ کر انہیں دے سکتے ہو۔ نمبر کی ایک اور کاپی بھی تمہیں ارسال کی جا رہی ہے۔ اسے بھی اُنہیں دے دینا۔ اور اپنی طرف سے بھرپور سفارش کر دینا۔ تاکہ یہ نمبر جو واقعی اس قابل ہے کہ سے لائبریریوں اور تعلیمی اداروں کے لئے خریدا جائے۔ خرید اجائے۔

میں نے سرکاری طور پر ایک عرضداشت انگریزی میں انہیں الگ سے بھجوادی ہے۔ اور ایک کاپی تمہیں بھجوا رہا ہوں۔ اسے بھی تم انہیں دے سکتے ہو۔

تمہارا، کرشن چندر

(۲۶)

"ری نش" سینٹ فرانسس ایوی نیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

۱۰ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

پیارے رام لعل، خوش رہو۔ بھئی کیا معاملہ ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی جو بڑی کانگریس لکھنؤ میں ہو رہی ہے کیا تم اس میں شریک نہیں ہو؟ کیونکہ اس سلسلے میں تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ میں نے انگریزی ہفتہ وار CURRENT بمبئی سے بات چیت کر لی ہے۔ وہ اس کانفرنس کا رپورتاژ تمہارا لکھا ہوا شائع کریں گے۔ ساتھ میں میری صدارتی تقریر اور دیگر ضروری ریزولیوشن وغیرہ۔

اطہر نبی صاحب کا خط، ٹیلی گرام، پھر خط ملا۔ میں نے انہیں اپنی اور سلمیٰ کے آنے کی منظوری دیدی ہے۔ خط اور ٹیلی گرام بھیج چکا ہوں۔ میں یہاں سے ۲۶ر اکتوبر کو براستہ دلّی فرنٹیئر میل سے جاؤں گا۔ ایک دن دلّی میں آرام کروں گا۔ ۲۹ر کی شام میں لکھنؤ کے لئے چلوں گا۔ ۳۰ر کی صبح میں لکھنؤ پہنچ کر ایک دن آرام کر کے دوسرے دن سے کانفرنس کے کام میں لگ جاؤں گا۔ پہلے میں براستہ جھانسی آنے کا سوچ رہا تھا مگر دلّی والا سفر میرے لئے زیادہ آرام دہ ہے۔ اطہر نبی نے لکھا تھا کہ وہ میرا اور سلمیٰ کا سفر خرچ کرایہ وغیرہ میری منظوری کرتے ہی بھیج دیں گے۔ ابھی تک نہیں بھیجا ہے۔ بکنگ کرنے میں کچھ دن تو لگتے ہیں۔ میں اطہر نبی کو خط لکھ رہا ہوں۔ تم بھی اُن سے مل کر دو طرفہ آنے جانے کا ٹکٹ کا کرایہ اور سفر خرچ بھجوا دو تاکہ میں لکھنؤ میں STRANDED نہ ہو جاؤں۔ اس لئے لکھ رہا ہوں۔

مفصل حالات اور صحیح کوائف لکھو کہیں وہاں آ کے بھد نہ اڑے۔

تمہارا، کرشن چندر

(۲۷)

(انگریزی سے اردو میں ترجمہ)

" دی نش " سینٹ فرانس ایوی نیو۔ سانتا کروز ویسٹ۔ بمبئی ۵۴

۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

میرے پیارے رام لال، میں بمبئی اسپتال کے نرسنگ ہوم میں پندرہ روز رہ کر گھر لوٹا ہوں۔ لیکن اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے میں مجھے ابھی اور دو ماہ لگ جائیں گے۔ میں مکمل طور پر آرام کر رہا ہوں۔ پھر بھی مجھے روزآنہ تین یا چار خط پڑھنے اور لکھوانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

میرے خیال میں، تمہاری نیشنل رائٹرس فورم میں شمولیت پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ کوئی بھی سوسائٹی جو حقیقی معنوں میں سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم کی حمایت کرتی ہے اس قابل ہے کہ ہم اُس کے رُکن بنیں اور اس کے آدرشوں کے لئے کام کریں۔ لیکن یہ میری محض ذاتی اور پرائیویٹ رائے ہے۔ میں نہیں جانتا، اس کی سیاسی پیچیدگیوں کے بارے میں تمہارا کیا موقف ہے۔ اس سلسلے میں تم خود معلومات حاصل کر سکتے ہو۔

نیک ترین خواہشات کے ساتھ،

تمہارا مخلص

کرشن چندر۔

(۴۸) آخری خط

"دی ناش" سینٹ فرانسس ایوی نیو سنتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

۲۳ر جنوری ۱۹۷۷ء

پیارے رام لعل، سات ماہ کی شدید علالت کے بعد کچھ دنوں سے اپنے ہات سے خط لکھنے کی اجازت ملی ہے اور ہلکے پھلکے موضوعات پر طبع آزمائی کی اجازت بھی ملی ہے۔ گو ابھی تک گھر ہی میں ہوں۔ باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ شاید ہفتے عشرے میں مل جائے۔

کل بیسویں صدی کے تازہ شمارے میں تمہارے شب و روز کی جھلکیاں دیکھیں اور تم بے طرح یاد آئے۔ سوچا، جلدی سے خط لکھ دوں۔ جانے پھر کیا ہو جائے۔

سلمیٰ کی کتاب پر اپنی رائے لکھنے کا شکریہ۔ وہ ان دنوں علی گڑھ میں ہیں۔ شاید تم نے سنا ہوگا کہ اُن کے والد پروفیسر رشید احمد صدیقی کا پندرہ جنوری کو انتقال ہوگیا۔ سلمیٰ کا پتہ یہ ہے:

MRS. SALMA SIDDIQUI,

CARE MR. RASHID AHMED SIDDIQUI,

ZAKIR BAGH, ALIGARH.

امید ہے، تم خیریت سے ہوگے اور گھر پر بھی ہر طرح سے خیریت ہوگی۔

تمہارا، کرشن چندر

(کرشن چندر کا انتقال دل کا چوتھا دورہ پڑنے پر ۷ر مارچ ۱۹۷۷ء کو بمبئی میں ہوگیا۔)

رضیہ سجّاد ظہیر کے خطوط
(رام لعل کے نام)

(۱)

لکھنؤ ۱۴ ر مئی (سنہ نامعلوم)

عزیزم رام لعل۔ دعائیں۔ حامل رقعہ میرے ایک عزیز خاندان کا بچہ ہے۔ یہاں ریلوے میں کوئی ٹریننگ حاصل کرنے تین مہینے کے لئے آیا ہوا ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو کسی شریف گھر میں اس کے رہنے کا انتظام کردو۔ کھانا وغیرہ تو باہر کھائے گا مگر سامان رکھنے کے لئے کوئی ایسی جگہ چاہیے جہاں سامان محفوظ رہ سکے اور سونے بھر کی جگہ مل سکے۔ بات چیت کر کے دام بھی طے کئے جا سکتے ہیں۔

میں دو چار دن کو یہاں آئی ہوں۔ ۲۰ ر یا ۲۱ ر کو چلی جاؤں گی۔ تم کسی دن مجھ سے ملنے آؤ۔

۱۷ ر یعنی سنیچر کی شام کو حامدہ حبیب اللہ کے یہاں یوتھ فورم کی ایک میٹنگ ہے۔ کوئی چھ بجے غالباً۔ (ویسے مجھے وقت ابھی معلوم نہیں) تم اگر وہاں آجاؤ تو ملاقات ہوجائے۔

شکنتلا اور بچوں کو دعائیں۔ رضیہ آپا

(۲)

۲۴-7 حوض خاص، نئی دہلی

۲ ر جون ۱۹۶۷ء

عزیزم رام لعل، دعائیں۔ تم کو غالباً اس کا علم ہوگا کہ اب کانپور والا فنکشن ۱۶ ر جون کو ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر مہروترہ کا فون آیا تھا۔ تمہارا پتہ میں نے انہیں بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ تم کو براہ راست لکھیں۔ ہم دونوں ۱۲ ر جون کی صبح لکھنؤ پہنچیں گے۔ چونکہ ابھی رزرویشن نہیں کروایا ہے اس لئے ٹرین تم کو نہیں لکھ سکتی، لیکن تم اسٹیشن پر مل جاؤ تو بڑا اچھا ہو کیونکہ تاریخ تو طے ہے۔

یں پروگرام ہے کہ تم لوگ لکھنؤ کے ادیبوں شاعروں کی ایک میٹنگ کرلو تاکہ یہ سب بھی
ہو جائے (کانپور چلنا وغیرہ) اور باقی جو کچھ چاہو۔ یہ میٹنگ اگر ۱۳ رکو ہو جائے یا ۱۴ رکو تو
ت اچھا ہو۔ شہر کے سب شاعر ضرور بلائے جائیں۔ وہ یوسف سرسومی کے ذریعے بلائے
سکتے ہیں۔ پھر میں نے ڈاکٹر مہرو ترہ کو لکھا ہے کہ اگر وہ ایک بڑی پک اپ یا دو جیپیں لکھنؤ
ر کی صبح بھیج سکیں، علی الصباح تو ادیبوں شاعروں میں سے جو اس سے جانا چاہیں جا سکتے
۔ اس طرح ٹھنڈے وقت پہنچ بھی جائیں گے اور ادیبوں شاعروں کو گھروں سے
بھی جا سکتا ہے۔

میں نے لکھنؤ ناگر جی کو کئی بار فون کیا۔ نہیں ملے۔ دو خط لکھے جواب نہیں ——— پتہ
ہیں کیا گڑبڑ ہے۔ بہرحال تم ذرا زحمت کرکے ان سے CONTACT کرو اور کہو کہ ان
ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ بہار کے لئے فنکشن ہے۔ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہونا
ہیئے۔ مختصر سا کوئی افسانہ ان کو پڑھنا ہوگا۔ ڈاکٹر مہرو ترہ مجھے آج یا کل میں پھر فون
ریں گے تو میں تمہیں پھر خط لکھوں گی۔ تمہارا ابھی چلنا بہت ہی اشد ضروری ہے۔ ۹ یا
س منٹ کا افسانہ بھی تمہیں پڑھنا ہوگا۔ جواب فوراً دو۔ ہم دونوں ۱۲ رجون کی صبح لکھنؤ ضرور
پہنچ جائیں گے۔

شکنتلا اور بچوں کو پیار کہنا۔ تمہاری رضیہ آپا۔

(۳)

لی، جون (۱۹۶۶ء)

عزیزم رام لعل۔ دعائیں۔ ہم لوگوں کو ۱۲ رجون کا رزرویشن ملا ہے۔ اس لئے ہم لوگ
۱۲ر کی صبح پہنچیں گے۔ تم نے اپنے یہاں آنے کی جو دعوت دی ہے اس کا بہت بہت شکریہ۔
مگر مجھے آج کل ڈاکٹر نے سیڑھی چڑھنے کو بالکل منع کر رکھا ہے۔ اس لئے مجبوری ہے۔ ہم لوگ
سیدھے وزیر منزل ہی جائیں گے۔ تم اسٹیشن پر آنے کی زحمت نہ کرنا۔ ۱۳ رکو کسی وقت بھی مل
لینا تاکہ ہم لوگوں کو میٹنگ کی اطلاع مل جائے۔ میٹنگ اگر ۱۴ رکو ہو تو بہتر ہے۔
ڈاکٹر مہرو ترا کا ٹیلیفون تقریباً روز ہی آتا ہے۔ تم ناگر جی کو ضرور ٹھیک کر رکھنا۔ میں

مرت لال ناگر

کوشش کررہی ہوں کہ ۱۶ ر کو ہم لوگوں کو کان پور لے چلنے کے لئے وہ لوگ جیپ یا Pick up کا انتظام کردیں۔ کانپور میں بھی P.W.A کی میٹنگ ہے۔ غالباً ۱۷ ر کو۔

اچھا اب لکھنؤ میں ملاقات ہوگی۔ دعاگو، تمہاری رضیہ آپا۔

(۴)

لکھنؤ۔ ۲۶ ر جولائی (۱۹۶۷ء)

عزیزم رام لعل۔ دعائیں۔ جیسا کہ تم کو سجاد ظہیر صاحب کے خط سے معلوم ہوا ہوگا، ساحر[1]، عباس[2] صاحب، بیدی[3] بھائی وغیرہ یہاں آرہے ہیں۔ اگست کے دوسرے ہفتے میں یعنی ۱۰ ر اگست کو بہار اور یوپی ریلیف فنڈ کے لئے۔ میں دو تین دن کو یہاں آئی تھی۔ سوچا تھا کہ تم سے ملوں گی مگر بیمار پڑ گئی۔ اس کام کے لئے حامدہ حبیب اللہ صاحبہ کو کنوینر اور ملاّ[4] صاحب کو صدر بنا کر ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے جس کی بڑی میٹنگ ۲۹ ر کو ہوگی۔ اس کے متعلق سرکلر تم کو ملا ہوگا یا شاید اب ملے۔ تم اس میٹنگ میں ضرور جانا۔ میں اس سلسلے میں مزید اطلاعات وغیرہ تار سے یا فون سے حامدہ بی بی کو دیتی رہوں گی۔ تم وہاں سے پوچھتے رہنا۔ ریلوے کے علاقے سے لوگوں کو لانا اور ٹکٹ وغیرہ کی ہنوائی تمہارے ذمّے ہے۔ زیادہ دعائیں۔ تمہاری، رضیہ آپا۔

(۵)

24 - Y حوض خاص، نئی دہلی - 16

۱۶ ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

عزیزم رام لعل، دعائیں۔ میں انشاء اللہ ۷ ر اکتوبر یعنی کل یہاں سے روانہ ہوں گی اور چار پانچ دن لکھنؤ میں رہوں گی۔ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ بچی کی شادی میں شریک نہ ہوسکی اس کی بہت معافی چاہتی ہوں، مگر اس دن ایسی گڑبڑ ہوئی کہ کیا کہوں۔ بارش اتنی سخت تھی اور پھر ٹیکسی کی ہڑتال تھی۔ بالکل ناممکن تھا کہ پہونچ سکتی۔ اگر تم لکھنؤ میں ملو تو

---

[1] ساحر لدھیانوی [2] خواجہ احمد عباس [3] راجندر سنگھ بیدی [4] پنڈت آنند نارائن ملاّ

ا اچھا ہو۔

میری طرف سے شکنتلا اور بچوں کو دعائیں اور پیار کہنا۔

دعاگو، تمہاری، رضیہ آپا۔

(۶)

ر منزل، وزیر حسن روڈ، لکھنؤ

۱۴ر مئی ۱۹۶۹ء

عزیزم رام لعل، میں کچھ دنوں کو یہاں آئی ہوئی ہوں۔ تم سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔
یہ معلوم نہیں کہ تم کب گھر پر رہو گے اور کب دورے پر چلے جاؤ گے۔ اس لئے اتنی
ر آنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ صحت بھی میری بہت اچھی نہیں ہے۔

میں نے آج صبح اخبار میں پڑھا تھا کہ تمہارے یہاں ستیش سترہ کو رخصت کرنے لیے
ا کی میٹنگ ہے۔ مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ کون سے PWA کی میٹنگ ہے۔ وہ جو تم لوگوں
نئی بنائی ہے یا پرانی۔ اس لئے میں نہیں آئی، کیونکہ نئے کی تو میں ممبر نہیں ہوں۔ حالانکہ میرا
بہت چاہتا تھا کہ ستیش کو خدا حافظ کہوں اور تمہارے گھر آکر تم لوگوں سے بھی مل
ں۔۔۔ بہرکیف۔

اب کی بار عابد سہیل جب دہلی گئے تھے تو انہوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ جب
لکھنؤ آتی ہوں تب ہی PWA کی میٹنگ ہوتی ہے اور یہ کہ میں جب لکھنؤ آتی ہوں PWA
یب نیا سیکریٹری بنا دیتی ہوں ۔۔۔ گویا میں نے کسی کو منع کر رکھا ہے کہ میری غیر حاضری
ں PWA کی میٹنگ نہ ہو یا میں PWA کی کوئی ڈکٹیٹر ہوں کہ حسب اوس، ایک نیا سیکریٹری
دوں۔ مجھے اس بات کا بہت رنج ہے۔ کیا نوجوان ادیبوں کی یہ بھی کوئی تعریف ہے کہ ان
بزرگوں سے بات کرنے کی تمیز نہ ہو؟

بہرکیف تم ضرور مجھے لکھو کہ کب آؤ گے؟ یا وقت بتاؤ تو میں خود آؤں۔ ڈاکٹر نے
ے دھوپ میں نکلنے سے بالکل منع کر رکھا ہے۔ اس لئے میں صبح یا دن کو نہیں نکلتی۔
شام کو ۷ بجے کے بعد نکلتی ہوں۔

تم اگر کسی دن بھی صبح ۷ بجے سے لے کر دس گیارہ کے درمیان آؤ تو میں گھر پر ہی رہتی ہوں۔ ایک ناولٹ میں لگی ہوں۔

میں غالباً ۵ ارمئی تک یہاں ٹھہروں گی۔ ہوسکتا ہے ۱۰ ر کو بھی چلی جاؤں۔ شکنتلا اور بچوں کو دعائیں، پیار کہنا۔

تمہاری، رضیہ آپا۔

(۷)

۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

عزیزم رام لعل، دعائیں۔ امید ہے تم اچھی طرح ہو گے۔ میں آج کل لندن میں ہوں کل ظہیر صاحب کے خط سے یہ اطلاع ملی کہ الہ آباد میں جن پبلشرز کو میں نے اپنا ناول "کانٹے" ہندی میں تین سال قبل چھپنے کو دیا تھا وہ اسے دسمبر ہی میں شائع کر رہے ہیں۔ میں نے گزشتہ تین سال میں اُن لوگوں کو متعدد خطوط لکھے تھے۔ جن صاحب کی معرفت وہ دیا گیا تھا ان کو بھی لکھے تھے۔ جواب نہیں ملا تھا۔ اس لئے وہ میں نے تم کو دے دیا تھا۔ لہٰذا اب فی الحال تم "کانٹے" کو ہندی میں CANCEL سمجھو۔ البتہ "اللہ میگھ دے" کو اُردو میں ضرور شائع کرو۔

میں انشاء اللہ نومبر کے آخر ہندوستان پہونچوں گی اور الہ آباد والوں کے پاس خود جاکر صحیح صورتِ حال معلوم کر کے تم کو بتاؤں گی۔

میں یہاں سے تمہیں ایک خط اور لکھوں گی۔ اگر یہاں سے کچھ منگوانا چاہو تو لکھنا۔ ہو سکے گا تو ضرور لاؤں گی۔ البتہ بجلی کا سامان نہیں آسکتا۔

شکنتلا کو میری طرف سے دعائیں اور بچوں کو پیار کہنا۔

تمہاری رضیہ آپا

---

(۸)

بلگاریہ

تاریخ موصولہ ۱۸ جون ۱۹۶۵ء

عزیزم رام لعل، برلن میں کانفرنس کر کے ہم لوگ بلگاریہ کے وفد کی دعوت پر بلگاریہ آئے ہیں۔ بڑا خوبصورت ملک ہے۔ بڑے حسین لوگ۔ ذرا کے لئے کوئی بدصورت نہیں ملے گا! یہاں سے ہم لوگ ۹ یا ۱۰ کو ماسکو جائیں گے۔ پھر وہاں سے کب روانگی ہوگی یہ نہیں معلوم۔ برلن کی کانفرنس بڑی شاندار ہوئی۔ ۵۷ ملکوں سے وفد آئے تھے۔ پوری کانفرنس چاہ بابل لگتی تھی۔ اتنی قسم کی زبانیں بولی جارہی تھیں لیکن مقصد ایک ہی تھا۔ اچھا ادب، انسانیت، امن اور آشتی اتحاد کا جذبہ۔ جرمنی میں ہم لوگ پندرہ دن رہے۔ وائیمار اور ڈریسڈن بھی گئے۔

سب کو پیار اور دعا کہنا

تمہاری آپا رضیہ

زیب غوری

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ
(آنحضرت صلعم)

عطائے خاص ہے یہ شرحِ آرزو بھی تری
ثناء بھی تیری ہے لفظوں کی آبرو بھی تری

ترا کرم ہیں یہ تیری نشانیاں، ورنہ
مری بساط سے باہر تھی جستجو بھی تری

چلا ہے بادِ صبا سے بھی کچھ پتا تیرا
رہی ہے کچھ گل و لالہ سے گفتگو بھی تری

مرے خدا مجھے گردابِ آگہی سے نکال
ڈبو نہ دے کہیں مجھ کو یہ آب جو بھی تری

ترا نشان ہے فتح و شکست پر غالب
مری پناہ بھی تیری، صفِ عدو بھی تری

یہ گرم رو مہ و انجم کا قافلہ بھی ترا
خلائے سرد و سرا سیمہ نمو بھی تری

بکھرتے پھول بھی تیرے، چٹکتی کلیاں بھی
خزاں بھی تیری، بہارِ شگفتہ رو بھی تری

نواحِ دل میں کبھی اتنی روشنی تو نہ تھی
بھڑک رہی ہے بہت شمعِ آرزو بھی تری
مرے ہی نام ہوں جیسے خطوطِ صبح ترے
مرے ہی واسطے تحریرِ رنگ و بو بھی تری
گھنی مہک سے چھلکتے گلاب بھی تیرے
خنک فضاؤں میں لبریزِ آب جو بھی تری
ہوا میں رنگ ترے لہلہاتے سبزے کا
گھٹا میں روشنیِ موجۂ نمو بھی تری
شفق سے سُرخ ثمردار باغ بھی تیرے
یہ کشت زارِ تمنّائے زرد رو بھی تری
دل و نگاہ میں یہ کیفِ سرمدی بھی ترا
صلائے بادہ سرجوشِ بے سبو بھی تری
یہ اوج و موج و تلاطم یہ زیر و بم بھی ترا
کنارِ بحر یہ محویّتِ نمو بھی تری

اثر زبیری لکھنوی

مُناجات

نشاطِ بیخودی سے آشنا کر
امینِ لذّتِ مہر و وفا کر

مرا سرمایۂ عمرِ دو روزہ
متاعِ جُوئے تسلیم و رضا کر

دلوں کو بخش اعزازِ محبّت
ہمارے ہر عمل کو بے ریا کر

تقاضہ ہے مذاقِ بندگی کا
خلوص اپنی عبادت کا عطا کر

جمالِ آگہی کی آرزو ہے
اثر کو ناز بردارِ دُعا کر

نہیں رزقِ حلال آساں جہاں میں
ہمیں بیگانۂ حرص و ہوا کر

ہمارا نیک و بد ہے تجھ پہ روشن
کہاں جائیں گے ہم نظریں چُرا کر

خبر لے، ورطۂ موجِ بلا میں
سفینہ گھِر گیا ساحل پہ آکر

جہانِ ریب و انکار و خطا میں
ہمیں فہم یقیں سے آشنا کر

دلوں کو احترامِ آرزو دے
طریقِ شوق و سرمستی سکھا کر

نوازش اپنے مسکینوں پہ فرما
خزف ریزوں کو لعلِ بے بہا کر

نہیں تیرے خزانوں میں کمی کچھ
عطا کر اور بے پایاں عطا کر

ملا دے آنسوؤں میں آبِ رحمت
عقیدت کو عناں گیرِ رضا کر

مُناجاتوں کو دے اِذنِ حُضوری
کمالِ آرزو مندی بنا کر

تہی ہے نیکیوں سے کاسۂ عُمر
گدائے مغفرت ہوں کچھ عطا کر

لکھوں تیرے حبیبؐ پاک کے وصف
نواسنج درِ خیر الوریٰ کر

تمنّا ہے کہ دم نکلے تو نکلے
ترے محبوبؐ کے روضہ پہ جا کر

اثر اس رزمگاہِ خیر و شر میں
قرارِ امن و ایماں کی دُعا کر

اثرؔ زبیری لکھنوی

دُرِمکنُون

برنگِ موجۂ عرفاں ہے آج جذبِ دروں
ہر ایک سانس پہ صَلِّ علیٰ میں کیوں نہ کہوں

مہک رہے ہیں نوازش کے پھول ہر جانب
ریاضِ دوستؐ کی ہر اک روش ہے بوقلموں

فضا ہے زمزمۂ جبرئیل سے معمور
نشاطِ قلب ونظر ہے جمالِ آئنہ گوں

رچی بسی ہے ہواؤں میں نکہتِ تنزیل
جمالِ وحی نے پھونکا ہے پڑھ کے کیا افسوں

وہ آستانۂ مجد وشرف وہ حجلۂ ناز
کہ جس کے پاسِ ادب سے خمیدہ ہے گردوں

وہ بارگاہِ نبوت خُلاصۂ کونین
خیال آئے تو بے ساختہ درود پڑھوں

نگار خانۂ قدوسیاں حریمِ رسولؐ
ہے جس کے پرتوِ الطاف کا جہاں ممنوں

وہ مصطفٰےؐ وہ گُلِ سرسبد نبوّت کا
کہ جس پہ خود چمن آرائے دہر ہے مفتوں

وہ جس کے نام کی سوگند کھائے ربِّ جلیل
وہ جس کی ذات کی رعنائیاں ہیں گوناگوں
گلیم پوشِ حرم، حامد و بشیر و نذیر
خدیوِ مسندِ لولاک و وجہِ کُن فیکوں
اسی کا نام ہے توام خدا کے نام کے ساتھ
وہی ہے قلزمِ معراج کا دُرِ مکنوں
محمدؐ عربی رازِ خلقتِ دو جہاں
وہ نظم دہر میں ہستی کا مَطلع موزوں
مسیر نُہ فلک و عرش و کرسی و جنّت
سوارِ اشہبِ بُراق و رازدارِ دُروں
فروغ کنگرۂ عرش جس کا نورِ جمال
وہ جس نے طے کئے عرفاں کے بے کراں ہاموں
انیس خستہ دلانِ جہاں رؤف و رحیم
حبیبِ خلقت و محبوبِ خالقِ بے چوں
بشیر و ناشرِ دینِ مبین و وحی و کتاب
نذیر و ماحیِ ظُلماتِ کفر و کارِ زُبوں
ہے اُس کے رعبِ رسالت سے رعشہ گیر جہاں
مآلِ قیصر و کسریٰ کا ذکر کیا چھیڑوں
یہ آرزو ہے کہ با صد نیاز و ناز اثر
درِ حضورؐ پہ دامن کئے کشادہ چلوں

ضیا جالندھری

تابکے

لفظ اور ہونٹ کے مابین کہیں
سانس اُلجھ جاتی ہے
تیرے آنگن کے بہت پاس کسی گوشۂ نادیدہ میں
ننھی ہاتھوں سے دیوار پکڑتی ہوئی اُمید کی بیل
اپنے ہی غم سے دہکتی رہی دم دم پیہم
اپنے ہی نم سے مہکتی رہی موسم موسم
لفظ اُبھرتے رہے رُک رُک کے سرِ شاخِ نیاز

بیل کے پھول کبھی رنگ، کبھی خوشبو سے
آن کی آن ترے لمس میں جینا چاہیں

محبسِ ذات کی تنہائی کے بعد
اور زمستانِ خموشی کے مصائب سہہ کر
یہی ارمان رہا
تُو انہیں چاہے نہ چاہے لیکن

کبھی پل بھر کو پذیرائی کا اظہار کرے
لمحہ بھر لذتِ شنوائی سے سرشار کرے

آج اس درد کی برسات کے دن
بیل سے ایک مہک اُٹھی ہے طوفاں کی طرح
پھول وا ہونٹوں کے مانند ہیں، ہر برگ ہے اک دیدۂ گریاں کی طرح
اور ہوا کانپ رہی ہے کسی ہمرازِ پریشاں کی طرح

کیا یہ بیتاب دھڑکتے ہوئے لفظ
آج بھی تیری مژہ پر نہ منوّر ہوں گے

اے عقل

محمدؐ ہادی حسین

اس بیدردی سے اے عقل نہ کر حیرت کا پردہ چاک
کچھ ان دیکھی چیزیں میری آنکھ کے آگے رہنے دے
انجانی چیزوں کی گتھی سلجھانے کی فکر نہ کر
پہلے مجھ کو جانی بوجھی چیزوں کا صدمہ سہنے دے
کب تک تیری لاگ لپیٹ کی باتوں کو دُہرایا کروں؟
جو کچھ میرے دل میں ہے وہ کھُلّم کھُلّا کہنے دے
اپنے غم تو میں نے تیرے کہنے پر سب ضبط کئے
اوروں کے غم کو خوں بن کر میری آنکھ سے بہنے دے

یادِ وطن

محمد ہادی حسین

وطن میں رہ کے بھی میں تو جلا وطن ہی رہا
چمن میں رہ کے بھی بیگانۂ چمن ہی رہا
وطن سے دُور وطن کی جو یاد آتی ہے
وطن کو جنّتِ گم گشتہ کیوں بناتی ہے؟
عجیب ہے یہ تماشائے جادوئے دُوری
عجیب ہے یہ فریبِ وصالِ مہجوری
پسند آئے نہ کیوں مجھ کو یہ دیارِ غریب؟
مرے وطن کو یہ لایا ہے میرے دل کے قریب
عزیز تر ہے جو آنکھ سے نہاں ہے وطن
کواکبِ سرِ مژگاں سے کہکشاں ہے وطن

محسن احسان

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے پس منظر پر
ایک نظم

اسیرِ دامِ حریفاں ہیں آپ بھی، ہم بھی
حقیقتوں سے گریزاں ہیں آپ بھی، ہم بھی

فسادِ موسمِ برق و شرر گذر جائے
تو مہرِ صبحِ درخشاں ہیں آپ بھی ہم بھی

اگرچہ دشمنِ انسانیت نہ آپ، نہ ہم
مگر عدوئے دل و جاں ہیں آپ بھی، ہم بھی

جبیں پہ کس نے ہمارے کدورتیں لکھ دیں
کتابِ چہرۂ خنداں ہیں آپ بھی، ہم بھی

مزاجِ غنچہ و گل کو اگر سمجھ جائیں
تو پھر خدائے گلستاں ہیں آپ بھی، ہم بھی

اب اور اپنے دکھوں میں نہ ہم اضافہ کریں
کہ دکھ سے دست و گریباں ہیں آپ بھی، ہم بھی

محبتوں سے ہی کشکول آرزو بھر لیں
گدا لٹے بے سروساماں ہیں آپ بھی ہم بھی

چلو کہ ہم نئے سانچے میں زندگی ڈھالیں
عداوتوں سے پریشاں ہیں آپ بھی ہم بھی

ہوائے جنگ کو ہم اس طرف نہ آنے دیں
نسیم امن کے خواہاں ہیں آپ بھی ہم بھی

محسن احسان

صادقین کے لئے ایک نظم

رنگ کھاتا رہا لفظ پیتا رہا
زندگی
تیرے چہرے میں وہ تازگی اور تابندگی کی رمق دیکھنے کی
تمنا لئے
کتنی تاریک اندھی گپھاؤں میں جیتا رہا
آرزوؤں کے سب چاک اور
خواہشوں کے دریدہ گریبان سیتا رہا
زندگی تو نے دیکھا نہیں
اس کی سب انگلیاں
تیری زلفوں کے پیچاک میں
چند نوخیز بیلے کی کلیاں سجاتے ہوئے مڑ گئیں
روح اس کی توانائیوں کے گلستاں کی
وہ روح پرور ہوا تھی
کہ جس میں

کتنی مہ لقاؤں کے ابر و صبا سے بدن بھیگتے تھے
کوئی رس میں ڈوبی ہوئی پدمنی
کوئی مست، الہڑ، حسیں کامنی
کوئی انگڑائی لیتی ہوئی راگنی
کوئی ہنسی کے نازک سُروں پر
مچلتی ہوئی موہنی
کوئی چمپا کلی
کوئی آہوئے دشت خطا
کوئی مدہوش و سرشار بنتِ حیا
کوئی کالی گھٹا
کوئی آوازِ ناز و نمو
کوئی شمشاد آئینہ رُو
کوئی شام شگوفہ و صبح گہر تاب کی اوّلیں آرزو
اور کوئی موجِ صہبائے کہنہ کا رقصِ غنا
کوئی شبنم بدن
کوئی جادو نگاہ
کوئی شہ پارۂ مہر و ماہ
اُس کی نوکِ قلم سے
حنائی کم و کیف میں ڈھل گیا
اس کا جادو
فقیہانِ یزداں در آغوش پر چل گیا
زندگی تو نے دیکھا نہیں
زندگی تو نے دیکھا نہیں

بلراج کومل

فصل

باہر سے آنے والے
معمول تھا
جب بھی گھر کے اندر آتے تھے
دروازے پر
دستک دے کر آتے تھے
آواز لگا کر آتے تھے

یہ پاس کا گھر
اب بہت دنوں سے سونا ہے
سنتے ہیں، کچھ روز ہوئے
مہمان کوئی
اس گھر میں رات کو آیا تھا
وہ دستک سے
آواز سے

دونوں رسموں سے آزاد تھا شاید
باہر کی دیوار پھاند کر گھس آیا
شب بھر وہ گھر
روشن چہروں والے اس کے خوش رنگ مکیں
تعظیم میں رہ جائے نہ کمی
شعلوں پہ عنایت کرتے رہے
اپنے ہی گوشت سے مہماں کی
بھرپور ضیافت کرتے رہے

سورج اب سر پر آیا ہے
مہماں، میزباں — کوئی نہیں
دستک آواز یا سرگوشی
سب بھولی بسری باتیں ہیں

اب دروازوں پر خاموشی
اب سونی سونی گلیوں میں
اڑتے تنکے
اب چاروں طرف لُو کے جھونکے

یہ فصل تو مہاں کاٹ چکا
یہ فصل وہ اپنے ساتھ سمیٹ کے جا بھی چکا
اب چٹیل بنجر دھرتی میں خود رو پودے
اب اگلی فصل کا کیا ہوگا

موسم اب ایک سا رہتا ہے
اب اگلا موسم کوئی نہیں
اب اگلا موسم کوئی نہیں
اب اگلی فصل کا کیا ہوگا !!
اب اگلی فصل کا کیا ہوگا !!

بلراج کومل

جلتی ہوئی تصویر

وہ طوفاں کی طرح گذرا
چہکتے، بولتے، ہنستے
گھروں کو روندتا
ان کے مکینوں
ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو
کھیلتے بچوں کو، خوابوں کو جلاتا
قتل کرتا
سارے رشتوں کو
فنا کی نذر کرتا
وہ سفر کے موڑ تک پہنچا
بڑا تاریک اور لمبا سفر تھا
تھک گیا تھا، وہ سفر میں
اس کو گھر آنا تھا

گھر تک آگیا آخر

یہ اس کا اپنا گھر تھا
جانا پہچانا
وہی آنگن تھا
روشن دھوپ
آنگن میں اتر آئی تھی
خوشبو تھی، نہ بدبو تھی
خموشی تھی عجب سی، اور
پریشاں زلف جیسے
دیوار و در پر چلچلاتے تھے
بریدہ جسم، چہرے اور اعضا
چارسو بکھرے ہوئے تھے
ماں، بہن، بیٹی، رفیق زندگی
برگد کا برسوں کا پرانا پیڑ
ننھا سا وہ پودا
جس کو اس نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا
یہ سارے لوگ
اس کے گھر پہنچنے تک

نکل کر جا چکے تھے

آخری اپنی مسافت میں

سفر تھا دائرے کا

موسموں کی یورشوں میں

بیج کیسا، فصل کیسی

ایک شعلہ تھا

یا نقش سوختہ تھا

ایک سیلاب بلا

وہ کون تھا، کیا تھا؟

سفر تھا دائرے کا

ایک برگ بے اماں

جلتی ہوئی تصویر تک پہنچا

بھیانک خواب کی

تعبیر تک پہنچا۔

امین راحت چغتائی

دستک ہو کواڑوں پر

کن گلیوں میں آنکلے!
آنچ آئے دریچوں سے،
بے نام سی دستک پر کھل جائیں جو دروازے
شعلے سے لپک جائیں،
رہگیر جھلس جائیں،

کچھ بند کواڑوں پر،
دستک بھی نہیں ہوتی،
وہ شور خموشی کا برپا ہے مکانوں میں
گلیوں میں صدا آئے،
کشکول لیے کوئی درویش ہی آجائے،
کچھ لفظ دعا کے ہی دہلیز سے در آئیں؛
یہ بھی تو نہیں ہوتا۔
آنگن میں کوئی کب تک آ آکے پلٹ جائے!

کب تک کوئی خوابوں کو آنکھوں میں چھپا رکھے ؛
پھٹتے ہوئے لاوے کو سینے میں دبا رکھے ،

آندھی ہی کہیں اُٹھے ،
طوفاں ہی کہیں آئے ،
پٹ کھلتے چلے جائیں ، زنجیر اُکھڑ جائے ،
پھر زور سے بارش ہو ،
ہر چیز بھگو ڈالے ، آنگن ہو کہ پیراہن ؛
اک سوندھی سی خوشبو ہو پھیلی ہوئی سارے میں ۔

پھر یوں ہو کہ تھم جائے طوفان بھی ہولے سے ،
تپتی ہوئی دیواریں آسودہ نظر آئیں ،
کچھ چہرے دُھلے سے ہوں بے رنگ مکانوں کے ،
جب بادِ خنک آئے ،
دستک ہو کواڑوں پر ؛
پٹ کھلتے چلے جائیں ۔

مقبول الٰہی

گلستاں خارزاروں کے تلے

چلی ہے رسم دُنیا میں
گلستانوں میں ہمسایوں کے
کانٹے خوب سے بوئیں
چُبھیں جب خار یہ اُن کو
وہ روئیں
اور پسِ دیوار
اپنے قہقہے اُٹھیں
ڈبوئیں گریہ و زاری

نہ سوچیں یہ کبھی
کہ ایک دن
خود کاشتہ کانٹے
تناور اور بے سایہ شجر کا رُوپ دھاریں گے
اور اُن کانٹوں کی فصلیں پک کے
آندھی اور بگولوں کے جہانِ بے اماں میں پھیل جائیں گی

گلستاں خارزاروں کے تلے
روندے ہوئے بےکار و بےبس تلملائیں گے

یہی کانٹے
جو خود بوئے تھے اِن ہی کاشت کاروں نے
چبھیں گے اِن کے اپنے پاؤں میں فرشِ زمیں بن کر
تو اِن کی اُف
تو اِن کی آہ
اِن کی چیخ
اِس گنبد نُما کابن کے لَٹّھے گی
پسِ دیوار سے لیکن
نہیں ہوگا بلند اِک قہقہہ بھی
اس صدائے گنبدِ گریہ پہ چھانے کو
نہیں ہوگا . . . .
نہیں ہوگا۔

رب نواز مائل

افسانوں کے پڑھنے پر ایک نظم

چلو ایسے فسانے سارے پڑھ ڈالیں
کہ جن سے درد کی زنجیر کٹ جائے
کہ جن سے اپنے ہونٹوں پر ہنسی آئے
کہ جن سے خوف یکسر خاک ہی پائے
کہ جن سے ہستیٔ روشن، وفا کی ہو
کہ جن سے اپنی ہر صورت صدا کی ہو
کہ جن سے زندگی بس اِک خُدا کی ہو
کہ جن سے واہمے کیا اپنی خوشبو دیں
کہ جن سے سلسلے ہم ذوق ہی کے لیں
کہ جن سے تازہ سا، نت زیست کا سوچیں

خود میں فسانے رکھتا ہوں

میں خود میں رکھتا ہوں وہ فسانے
کہ جن سے خوشبو، یہ اِن رُتوں کی
ہزار تیور نئے رکھے گی
میں خُود میں رکھتا ہوں وہ فسانے
کہ جن سے اپنی یہ ہستیٔ کم
فنا بکف سی کہاں ملے گی
میں خُود میں رکھتا ہوں وہ فسانے
کہ جن سے دِل کی گرہ کھُلے جب
تو آسماں، تک خوشی دِکھے گی

ماہ طلعت زاہدی

محور

یہ سچ ہے چاند بے معنی ہُوا
وہ اس گھڑی مجروح دل کی دست گیری پر نہیں مائل
پُرانے راستوں پر گھاس اونچی ہوگئی
مُدت سے اس جانب کوئی نکلا نہیں
گویا زمانہ اک نئی کروٹ بدلتا ہے
مگر اب بھی،
دھڑک اُٹھتی ہے کوئی یاد
پلکوں پر چمک اُٹھتے ہیں جگنو
دل میں مد و جزرِ بے پایاں سے اک عالم سا رہتا ہے
نئے رستوں پر بھی موسم پُرانے ڈھنگ سے آگھیرتے ہیں
اور آنکھیں ڈھونڈا کرتی ہیں پسِ پردہ کسی کو
گرچہ —
زمانہ اپنی ہی رفتار پر نازاں
کسی خاطر میں ہم افتادگانِ خاک کو لاتا نہیں
پھر بھی ذرا ٹھہرے تو وہ دیکھے
ہماری مُٹھی بھر مٹی سے کیسے کیسے گُل بوٹے نکلتے ہیں
وہ کیا جانے کہ اُس کی
گردشِ صد سال کا محور بنا رہتا ہے اک لمحہ
ہماری آرزو کا ایک لمحہ —

ماہ طلعت زاہدی

میں شکنتلا نہیں ہوں

مجھے بھولنے سے پہلے
گھڑی بھر کو سوچ لینا!
کسی دیوتا کا سر پہ نہیں سایہ
آسماں میں کوئی گھر نہیں ہے میرا،
کسی بے اماں گھڑی میں جو مجھے پناہ دے دے
میں اسی زمیں سے پھوٹی
اسی خاک میں چھپوں گی
مرے پیار کا ترانہ مرے سچ کا ترجماں ہے
کھلے پانیوں کا جادو کہ ہواؤں کا نشہ ہے
مرا حسن بے کراں ہے
مگر اتنا یاد رکھنا
مرے ہونے کی گواہی کوئی بھی نہ دے سکے گا
کہ تمہاری اپنی آنکھوں سے مرا پتہ چلے گا
مجھے دل میں قید رکھا تو ابد کا راستہ ہیں
اگر ایک بار کھوئی
تو فنا مرا مقدر
کہ میں موج وقت جیسی
ابھی ہوں، ابھی نہیں ہوں
میں شکنتلا نہیں ہوں۔

سحر صدیقی

اُداسی کیا نہیں کرتی ؟

اداسی کیا نہیں کرتی
کبھی دل کے جزیرے میں ہنسی کی کشتیوں کے بادبانوں کو بھگوتی ہے
کبھی لفظوں سے ان کی معنویت چھین لیتی ہے
کبھی برسوں میں آتی ہے مگر عمر رواں کی ساعتوں کو چوم لیتی ہے
کبھی یادوں کے شہروں سے پرانے لوگ اپنے ساتھ لاتی ہے
کبھی یہ سبز بارش سے کسی بے سمت رستے پہ ہمارا نام لکھتی ہے
اُداسی کیا نہیں کرتی ۔

کسی بے نام جنگل میں مہری آنکھوں کی چھاؤں اس کا رستہ روک لیتی
ہے

یہ کہتی ہے
چلو اس شخص کے چہرے پہ یادوں کی گواہی یوں لکھیں ۔
کہ ذات کے دکھ پھول ہو جائیں

اُداسی کیا نہیں کرتی ؟
کسی کے دل کے کاغذ پر اگر یہ دستخط کر دے
تو تارے ٹوٹ جاتے ہیں
سہارے چھوٹ جاتے ہیں
پیارے روٹھ جاتے ہیں
حدودِ جسم میں سہمی تمنا کانپ جاتی ہے
تو کہتی ہے :
اداسی پھول ہوتی ہے
اسے کھلنے نہیں دینا
اسے کالی ہوا کے سامنے سنگسار کر دینا
حدودِ جسم میں سہمی تمنا کو بھلا یہ کون سمجھائے
کسی کالی ہوا سے پھول کب سنگسار ہوتے ہیں ؟

سحر صدیقی

ہر جنم کی بے اختیار خواہشیں

اگر میں خواب بن جاؤں
پرانے شہر سے ہجرت کی خواہش کرنے والوں کو دکھائی دوں
ڈرے سہمے ہوئے لوگوں کو تسکین دوں
پرانے گلستاں پہ نئے رنگوں کو پھیلاؤں
کوئی برسوں کا بچھڑا ڈھونڈ لے مجھ کو کسی کی بند آنکھوں میں
محبت کا دیا ہر نیند کی دہلیز پہ رکھ دوں
سمندر پہ تیرا وعدہ ستارہ شام سے لکھ دوں
جزیروں کی ہواؤں کو اداسی میں دلاسہ دوں
افق کے ہونٹ پہ سورج کا بوسہ معتبر کر دوں
میں پر اسرار باتوں میں چھپی لڑکی کی کاپی میں کوئی تصویر رکھ جاؤں
یہ مشکل ہو
یہ نہ ہو تو
تری آنکھوں میں سو جاؤں
یقیناً خواب ہو جاؤں۔

رؤف خیر

صبحِ کاذب

یہ سچ ہے
جھوٹی حکایتیں من گھڑت لطیفے سنانے والے نے یہ کہا تھا
کہ لومڑی ــــ باز کی بہن ہے
جو شاخِ زیتون شوق سے نوش کر رہی ہے
تمام نابستہ شیر سرکس کے اپنے پنجروں میں جا چکے ہیں
جناب دجال ایک مہدی کے روپ میں
گاہ مشرق میں گاہ مغرب میں جلوہ فرما ہیں
اوس و خزرج میں پھر لڑائی ٹھنی ہوئی ہے
فرات گنگا میں مل رہا ہے
نشان ہر شہر ہے فلسطین بے نشاں کا
گمان کیا کیا ہے بدگماں کا
پھر اس روایت کے بعد راوی نے یہ بھی چپکے سے کہہ دیا تھا
کہ ذکر اس کا کہیں نہ کرنا
یہ جھوٹ ہے سب یقیں نہ کرنا
اور اس قدر زور کا قہقہہ پڑا تھا
جو دیدۂ تر میں آ کے ٹوٹا

سے

تنظیم الفردوس

اُلٹے عکس

کنارِ بحر
مچلتی موج پر نظریں گڑائے
سرکتی ریت پر پاؤں جمائے
کھڑے ہو تم
اور یہ دیکھتے ہو
سنہری ریت جیسی لڑکیاں
تمہارے ارد گرد بکھری ہوئی ہیں
سمندر رنگ آنکھوں
آسماں جسموں
سے گزر کر تم
یہ بھی دیکھ لینا
خبیث افکار کے سفر نے
کریہہ اعمال کے اثر نے
تمہیں کچھ اس طور سے ہے بدلا
کہ بھوتوں کی طرح تمہارے

دونوں پیر غائب ہیں
کیا یہ جانتے ہو تم!
ان حسیں چہروں میں
ایک شکل وہ بھی ہے
جو تمہاری یادوں میں
کچھ اس طرح کھوئی
کہ دور اندھیروں میں جا سوئی
اور آج
اک مخصوص لمحہ میں
عالمِ ارواح سے
اذنِ سفر پاکر
تم سے ملنے پہنچی ہے
اور تم یہ کہہ رہے ہو
"اس کے پیر الٹے ہیں"

فاروق حسن

اپنے والد کے لئے نظم

کوئی پتّہ ہلا اور نہ طوفاں اٹھا
صرف ہمسائے میں چند بے جان
ٹھٹھری ہوئی انگلیاں ابروؤں تک گئیں۔
کچھ دعائیں لبوں پر ہلیں۔
چند تیزی سے مسجد سے آتے ہوئے لوگ،
رونے کی آواز سے
راستے میں ٹھٹھک کر رُکے ایک پل،
اور اتنی ہی تیزی سے اپنے گھروں کی طرف چل دئے۔
سائیکل پہ کوئی گھر سے باہر گیا۔
کھڑکیاں بند تھیں اور گلی چپ رہی۔
اس نومبر کے دن
دوسرا کوئی بھی حادثہ نہ ہوا۔
کیا عجب شخص تھا
کتنا خاموش تھا،
کتنی آہستگی سے رہا۔
کتنی آہستگی سے یہاں سے گیا۔
سخت گرمی کے دن
کاش اُس کے لئے
ایک بادل کا ٹکڑا اُڑے
دیر تک اس کے مسکن پہ سایہ کرے۔

فاروق حسن

جن دنوں کے بچپن میں

جن دنوں کے بچپن میں
جسم کی نمائش کے
بے وصال لمحے تھے
چودھویں کا سورج بھی
دیر سے نکلتا تھا
چھ برس کے لڑکے کو
گھاس آسماں جتنی
پھول بھائیوں جیسے
تتلیاں پرندے تھے

سردیوں کے سورج کی
گول دھوپ کے دھبے
گھٹتے، پھولتے، بڑھتے

آنکھ بند ہونے پر
تیرتے تھے پلکوں پر
آم کے درختوں سے
جھولتی ہوئی رسّی
پاؤں کے انگوٹھے سے
پیٹ کے دہانے تک
جان کھینچنے والی
موت کا تماشہ تھی

چاند بھر کے سو رہنا
دن میں گھومنا پھرنا
دن کی سُرخ آندھی میں
پتلیوں کا ناٹک تھا
بھوت اور جادو تھا۔
اور نہر کا پانی
چائے کی پیالی میں
دودھ کا سمندر تھا،
چھ برس کے لڑکے کی

خوف کے تصور سے
ہر خوشی توانا تھی
ایک دن مگر سورج
وقت پر نکل آیا
ایک روز آندھی میں
ریت کی ملاوٹ تھی
اور گھاس پاؤں میں
لیٹتی لپٹتی تھی۔

فاروق حسن

میں نے اُس ماضی کو

میں نے اُس ماضی کو ڈھونڈ لیا ہے
جس میں رہنا ہے
میں نے اُسے ایجاد کیا ہے
اُس میں کتنے رنگ بھرے ہیں
اُس کے نقش نکھارے ہیں
باپ کی خاموشی والی محنت سے
اُس کو دھویا ہے۔
آلائش سے پاک کیا ہے
اُسے سجایا ہے لوگوں کی
چاہت والی باتوں سے
میں نے اُسے سیراب کیا ہے
نہر کے گدلے پانی سے
اس کی زمین کی کالی مٹی

میں جو پھول اگائے ہیں
اب وہ مہکنے والے ہیں۔

حال اور مستقبل کے سارے
جھگڑے جھوٹے ہوتے ہیں
کون کہے کس کی قسمت میں
کل کے دن کیا لکھا ہے۔
کل کا دن موجود بھی ہے ؟
میری عمر کے سب لوگوں کو
اب واپس گھر جانا ہے۔

فاروق حسن

ہو چکیں غالبؔ بلائیں

مسئلے اب کون سے باقی ہیں
جو سُلجھے نہیں ۔
دُھند ساری چھٹ چکی،
برسات کے بادل برس کر راہ اپنی ہو لئے۔

کیاریوں میں کھاد جو ڈالی تھی
اُس سے پھُول پتے بھی کھلے ۔
پھر خزاں اور برف کا موسم گیا
آگ جس سے گیلی لکڑی سے بہت برسوں
دھواں اُٹھتا رہا تھا، جل بجھی،
ٹوٹ کر خواہش پہ گرنے،
دل سے دل کی بات کرنے کے لئے ،
جو حوصلہ درکار تھا،
جاتا رہا ۔
معجزہ تو اب کوئی ممکن نہیں
دھیمی بارش میں مگر
کالی چھتری کے تلے چلتے ہوئے
اُس کی قربت کا ابھی امکان ہے ۔

فاروق حسن

صرف اگر تم جانتے!

صرف اگر تم جانتے
کتنا کڑوا درد ہے
دوری اور تنہائی کا
کتنی ظالم دھوپ ہے
سورج والے دیس کی
تپتی چادر ریت کی
اوڑھ کے اپنے جسم پر
پتھر پتھر کاٹ کے
سخت صعوبت راہ کی

کالا کوٹھا قید کا
اور بے انت کدورتیں
سارے جھگڑے جھیل کر
ہونٹوں تک پہنچی ہوئی
جاگتی جیتی خواہشیں

صرف اگر تم جانتے
چاہت کی دشواریاں
صرف اگر تم جانتے

پرتو روہیلہ

ایک رنگ دو تصویریں

(ایک انگریزی نظم سے متاثر ہو)

یہ اک امریکی بچے نے کہ جس کے گھر کی چھت پر قرمزی ٹائل چمکتے تھے
کہ جس کے لان میں پھولوں کی رنگینی شفق کو ماند کرتی تھی
کہ جس کی ماں کا گہرا سرخ سایہ اپنے آسودہ تناظر کا نہایت اہم عنصر تھا
بہت ہی بے جھجک انداز میں پوچھا
ممی بتلائیں رنگِ سرخ کیا ہے کیسا ہوتا ہے
ممی بولیں سنی یہ رنگ ہے کھلتے گلابوں کا
جوانی سے دمکتے عارضوں کا، رس بھرے سیبوں کا، خواہش کی شرابوں کا
گلاب آسا لبوں کا، حسن کا، نغموں کا، سازوں کا، ربابوں کا
غرض یہ رنگ ہے ہستی کے سب شاداب بابوں کا
ہزاروں میل اس سے دور پاکستان کی اک خیمہ بستی میں
کہ جس میں موسموں کی شدتوں نے روحِ انساں بھی جلا دی ہے
کہ جس میں بے دری نے اپنے آنگن کی مسرت بھی بھلا دی ہے
یہی اک بچہ افغاں نے پوچھا اپنی مادر سے

ادے[1] بتلاؤ رنگ سرخ کیا ہے کیسا ہوتا ہے
ادے نے بکھرے بالوں کو سمیٹا اور پھر کچھ سوچ کر بولی
زماڑو یا[2] یہ رنگ سرخ تو اک استعارہ ہے
اصولِ حق پہ مرنے کا شہادت کے نصابوں کا
رواں قدروں سے ٹکرانے کا جابر کے عتابوں کا
مخالف قوتوں کی قہرمانی کا عقوبت کا عذابوں کا
مرے سینے کے زخموں کا ترے بابا کے خوابوں کا
تری بہنوں کی اُجڑی مانگ کا روتے شبابوں کا
ترے بھائی کے بہتے خوں میں غیرت کے حبابوں کا
زمینِ آدمیت پر ہلاکت کے سرابوں کا

---

[1] پشتون بچے اپنی ماں کو 'ادے' کہہ کر پکارتے ہیں۔
[2] پشتو بمعنی میرے بیٹے۔

پرتو روہیلہ

یہ شفّاف جھیلیں

یہ کیسی جھیلیں ہیں جن کے شفّاف پانیوں میں رنگوں کے طاؤس ناچتے ہیں
یہ کیسی جھیلیں ہیں جن کی موجوں میں بلبلیں سی چہک رہی ہیں
یہ کیسی جھیلیں ہیں جن میں سارا تضادِ سمتوں کا مٹ گیا ہے
بلادِ مشرق، سوادِ مغرب میں ضم ہوئے ہیں
جہت کی تفریق مٹ گئی ہے
یہ فاصلوں کے طویل میدان ایک تل میں سمٹ گئے ہیں
یہ کیسی جھیلیں ہیں جو کہ مغموم رہ نوردوں کو روکتی ہیں
جو اجنبیوں کے سیدھے رستے میں آپڑی ہیں
یہ کیسی جھیلیں ہیں سردِ موسم میں جن کی گرمی دلوں کی تہ تک پہونچ رہی ہے
یہ کیسی جھیلیں ہیں جو زبان و بیاں کی ساری قیود کے باوجود ناشناؤں
کے دل کے سب راز جانتی ہیں
خموش رہ کر بھی بولتی ہیں
یہ کیسی جھیلیں ہیں جن میں انجان آسمانوں کے ماہتاب اپنا سونا بکھیرتے ہیں
یہ کیسی جھیلیں ہیں جن کی ہر موج راگنی ہے

یہ کیسی جھیلیں ہیں شعر حافظ سنا رہی ہیں
مسافروں کو لبھا لبھا کر نشانِ منزل بھلا رہی ہیں
میں رہ گزیدہ سفر فشردہ بھی ایسی اک جھیل کے کنارے کھڑا ہوا ہوں
مری زباں پر ازل مسافت کی تشنگی ہے
مگر یہ رہ رہ کے سوچتا ہوں
کہ ایسے شفاف پانیوں میں اتر بھی جاؤں
تو ان کی تہ تک بھی جا کے ان کا نہ ہو سکوں گا
سو کیوں نہ اپنے وطن کے گدلے سے ایک جوہڑ میں ڈوب جاؤں
کہ میری مٹی بھی گدلے پانی میں مل کے ایک قالب میں ڈھل تو جائے گی

(سٹوٹ گارٹ ۔ جرمنی)

پرتو روہیلہ

انکھیاری ممتا

مجھے جورِ شکم اپنے وطن سے لے گئی لندن
تو کچھ عرصے تو میں اپنے عزیزوں دوستوں اور آشناؤں کے یہاں ٹھہرا
بالآخر خود مکاں لینے کی کوشش کی
مگر اس شہرِ بے پایاں کی ہر بستی نے مجھ کو ایک کوڑھی لاش کی صورت سے ٹھکرایا
کہ ہر مالک مکاں مجھ سے بڑے افسوس سے آخر یہی کہتا
کہ ہم رنگ دار لوگوں کو مکاں اپنا نہیں دیتے۔
اس انکارِ مسلسل نے مجھے اس درجہ بدظن کر دیا ماحول سے اپنے
کہ پھر اپنے وطن کی واپسی ہی اس کا حل ٹھہرا
کہ ماں کے واسطے بچے اسی کے ہیں وہ گورے ہوں کہ کالے ہوں
کہ ممتا تو سدا اندھی ہوا کرتی ہے اور اس نے کبھی بچوں کو رنگت سے نہ پہچانا
مگر اپنے وطن آیا ہوں تو محسوس کرتا ہوں
وہ مفروضے غلط ہیں اور ممتا کی بھی آنکھیں ہیں
اب اپنی ماں بھی بچوں کو بہت کچھ دیکھ کر پہچانا کرتی ہے
کہ ہر مالک مکاں مجھ سے بہت بیباکانہ کہتا ہے
کہ پاکستانیوں کو ہم مکاں اپنا نہیں دیتے۔

پرتو روہیلہ

سپاہی کا سوال

حسین شہر کی اس دو رویہ سڑک سے پرے ایک اونچی جگہ جیٹھ کی گرم دوپہر میں
ایک تنہا سپاہی کھڑا ہے

یہ تنہا سپاہی فقط اس بڑی کار کا منتظر ہے
کہ جس کے ہراول میں اک دستۂ عسکری دور باشی کا قرنا بجاتا ہوا دوڑتا ہے
یہ تنہا سپاہی اُسی کار کے اک مکیں کی حفاظت کی خاطر کھڑا
اپنے کانوں کی غربال میں موٹروں کی صداؤں کو یوں چھانتا ہے
کہ وہ دُور باش اس سماعت کی جالی سے باہر نکلنے نہ پائے
یہ انگھڑ یہ کم فکر سادہ سپاہی
جسے راہرو اک نظر دیکھ کر پیش منظر کا اک جزوِ ساکت سمجھ کر گزرتے رہے ہیں
اگر خود نہ سوچے
نہ کوئی سوال اس کے مُرداب خاطر میں ابھرے
تو پھر بھی یہ تنہا سپاہی بذات خود ایسا سوال متیں ہے
کہ جو ایک عرصے سے اس قوم کے عاقلوں اور دانشوروں کے ضمیروں پہ اک
آتشیں تازیانے کی صورت برستا رہا ہے

مگر قوم کے باحیا عاقلوں اور غیور دانشوروں نے سدا عافیت کے حریری
نہاں خانوں میں بند ہو کر اسے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا
تو وہ اک سپاہی کہ جو اس حسیں شہر کی اس دو رویہ سڑک سے پرے ایک اونچی
جگہ جیٹھ کی گرم دوپہر میں چاق و تنہا کھڑا ہے

یہی پوچھتا ہے
بڑی کار کے اے مکیں اور میرے محافظ
کہ تیری حفاظت پہ لشکر ہی کیا ملک کے سب وسائل لگے ہیں
بتا تو نے میری، مرے حق، مرے ملک کی کچھ حفاظت بھی کی ہے۔

پرتو روہیلہ

غزل

آدمیت کے سفر میں دائرہ باقی رہا
آدمی تو مرگیا پر بھیڑیا باقی رہا

وقت کے منصف کا کس نے ہاتھ روکا ہے کبھی
لکھ دیا جمہور نے جو فیصلہ باقی رہا

چھپ گئے تارِ افق میں صبحِ نو کے آفتاب
ایک سعیٔ رائیگاں کا جھٹپٹا باقی رہا

کرچی کرچی ہو گئے امید کے منظر تمام
دکھتی آنکھوں میں سلگتا رتجگا باقی رہا

حکمرانوں کی لکھیں دنیا نے تاریخیں مگر
سرفروشانِ وفا کا تذکرہ باقی رہا

لگ گئی جب آگ ہی گھر میں تو پھر کیا پوچھتے
جل گیا کیا کیا کچھ اس میں اور کیا باقی رہا

کتنا سرکش ہوں کہ پرتوؔ اس فضائے حشر میں
زندگی کرنے کا پھر بھی حوصلہ باقی رہا

پرتو روہیلہ

غزل

عجب جہان تضادات میرے اندر ہے
کہ ہونٹ خشک ہیں سینہ میں اک سمندر ہے

فصیل شہر پہ مامور مفتیانِ کرام
محلسرا اُس میں خوابیدہ سارا لشکر ہے

میں اس نمی پہ زمیں کی یہ کس طرح مانوں
کہ قحط میرے لئے ہی سدا مقدر ہے

خدا ہی رحم کرے اس کی جانِ مسکیں پر
بدست کودک کج فہم اک کبوتر ہے

گراں ہے میرے لئے اپنے قاتلوں کی شناخت
کہ میرے سامنے جو بھی ہے وہ پیمبر ہے

جگر سے اپنے تراشا تھا اک خدا میں نے
کھُلا بروزِ قیامت کہ وہ بھی پتھر ہے

قتیل نسخۂ نو ہے یہ شہر زندہ دلاں
ہر اک طبیب ہمارا تو کیمیا گر ہے

رسولِ وقت ہوں پر تو یہ دیکھتا ہوں میں
افق پہ حشر کے دن کا مہیب منظر ہے

پرتو روہیلہ

غزل

میرے چاروں طرف ہے قیامت بپا نیند آتی نہیں
تو ہی زخمِ جگر کوئی قصّہ سُنا نیند آتی نہیں

سال چالیس جاگا ہوں غم میں ترے اور یہ سوچ کر
یہ صدی بن نہ جائے کہیں رتجگا نیند آتی نہیں

حیف ابھی تو حنا رنگ لائی نہ تھی اور ٹکڑے ہوئے
یہ حسیں صندلیں مرمریں دست و پا نیند آتی نہیں

میرے اسلاف کی آنکھ لگے کو جھپکی تھی عرصہ ہوا
یہ قیامت ہے خمیازہ اس خواب کا نیند آتی نہیں

سبز باغوں کے اثمار کڑوے ہوئے جل گئیں
میرے حاکم کی نیت ہے یہ برملا نیند آتی نہیں

میرے گھر میں جیالے مرے پاسباں خوابِ خرگوش میں
اور باہر محبِّ وطن رہنما نیند آتی نہیں

آنکھ جب سے کھلی ہے نیا ظلم ہے اک نیا جبر ہے
ختم ہوتا نہیں درد کا سلسلہ نیند آتی نہیں

میرے دانا تعاقب میں ہیں چور کے ایک مشعل لیے
اور بارود گھر میں ہے چھت تک بھرا نیند آتی نہیں

آج لات و ہبل مُلتزم پر کھڑے ہیں بڑی شان سے
پھر حرم بن گیا سابقہ بت کدہ نیند آتی نہیں

شہرت بخاری

غزل

میرا تو کہاں ہوتا، وہ اپنا بھی نہیں تھا
دریا تو بڑی بات ہے صحرا بھی نہیں تھا

آندھی کی طرح آیا، گیا برق کی مانند
میں نے اُسے سچ مچ ابھی دیکھا بھی نہیں تھا

رُسوائی کے اندیشے نے سہما دیا دل کو
میں اس سے بچھڑ کر ابھی رویا بھی نہیں تھا

ہجرت کے سوا اور کوئی راہ نہیں تھی
اس شہر میں تم سا کوئی تم سا بھی نہیں تھا

دنیا کی محبت کبھی محسوس نہیں کی
ہر چند کہ میں تارکِ دُنیا بھی نہیں تھا

برپا ہُوا کہرام گھروندوں میں سراسر
بادل ابھی چھایا ہی تھا، برسا بھی نہیں تھا

تھا مان مجھے جس کی وفا کیشی پہ شہرتؔ
یوں چھوڑ گیا گویا شناسا بھی نہیں تھا

شہرت بخاری

غزلیں

وحشت کا کہیں اثر نہیں ہے
کچھ بھی ہے یہ میرا گھر نہیں ہے
تا حدِ فلک کھنچی ہے دیوار
دیوار میں کوئی در نہیں ہے
آغازِ سفر میں قافلہ تھا
اب ایک بھی ہم سفر نہیں ہے
کوفہ ہو، دمشق ہو، مدینہ
سادات کا کوئی گھر نہیں ہے
وہ، وہ تو نہیں جو سامنے تھا
میرا ہے، مرا مگر نہیں ہے
دل اپنے کی احتیاط رکھنا
اس شہر میں آئینہ گر نہیں ہے
اس عہد کی یہ شناخت ٹھہری
سب کچھ ہے مگر نظر نہیں ہے
جینے کی طلب نہیں ہے شہرت
جینے سے مگر مفر نہیں ہے

حاصلِ انتظار کچھ بھی نہیں
یعنی انجامِ کار کچھ بھی نہیں
کیوں نکلنے کی سعی کرتے ہو
دھند کے آر پار کچھ بھی نہیں
حسرتِ وصل کے مقابلے میں
کلفتِ انتظار کچھ بھی نہیں
دشت میں کچھ نہیں سراب تو ہے
باغ میں گل نہ خار کچھ بھی نہیں
کس سے اپنی شناخت لیتے ہو
آئینہ جُز غبار کچھ بھی نہیں
دل میں جھانکو مرے اگر تو کھلے
دامنِ تار تار کچھ بھی نہیں
کون ہم سے ملے کہ پاس اپنے
جُز دلِ داغدار کچھ بھی نہیں
آ نفس دو نفس کو مل بیٹھیں
سانس کا اعتبار کچھ بھی نہیں

شہرت بخاری

غزل

ہر لمحہ تھا سو سال کا ٹلتا بھی تو کیسے
بے آئے شب غم کوئی مرتا بھی تو کیسے

اک آگ تھی جو پھونک رہی تھی دو جہاں کو
وہ دل سے مرے ہو کے گزرتا بھی تو کیسے

ہم پیاس کے ماروں نے عبث آس لگائی
برسا ہوا بادل تھا برستا بھی تو کیسے

گل چیں کی نظر تاک میں رہتی تھی برابر
غنچہ کوئی کھلتا بھی، مہکتا بھی تو کیسے

تنکے کی رکاوٹ بھی نہ تھی غار کی تہ میں
پھر پھسلا ہوا پاؤں سنبھلتا بھی تو کیسے

سایہ نہ کوئی نقش قدم، کوچہ نہ بازار
صحرا کے سفر میں تھا بھٹکتا بھی تو کیسے

سینے میں کوئی شعلہ نہ نظروں میں کہیں برق
شہرتؔ بھلا دل میرا بہلتا بھی تو کیسے

شہرت بخاری

غزل

ہر چند یہاں گرمیٔ بازار بہت ہے
ساتھ اس کے مگر قحطِ خریدار بہت ہے

کیا طُرفہ تماشا ہے طبیعت مرے دل کی
جیتا ہے مگر جینے سے بیزار بہت ہے

محرومِ شرفِ دشت کو رکھا نہیں جاتا
ورنہ تو مجھے خاکِ درِ یار بہت ہے

جب کچھ نہ رہا تب یہ حقیقت ہوئی روشن
بربادی کو اک خواب کا آزار بہت ہے

بہلانے کو دل ذکرِ مکاں رہتا ہے ورنہ
یوں ہے کہ مجھے سایۂ دیوار بہت ہے

گُل جن کے مقدر میں ہے وہ خوش رہیں شہرت
ہم لوگوں کو بس نسبتِ گلزار بہت ہے

ساقی فاروقی

میں ایک لمحۂ مفرور ہوں، دوام نہیں
بہت دنوں سے مرا وقت میں قیام نہیں

مرے نظام کے سب ماہتاب رقص میں ہیں
سحر کی آگ ہوں خاکِ سیاہ و شام نہیں

صدا لگاؤں تو آواز میں گرہ پڑ جائے
مگر سوال کی تقدیس میں کلام نہیں

مرے لئے مرے دل میں جگہ بچے کہ مجھے
یہ شک رہے کہ تری دسترس تمام نہیں

چمن کے رنگ سے جل کر نگاہ پوش نہ ہو
نظر نہ پھیر کہ منظر کوئی حرام نہیں

ساقی فاروقی

غزل

ہر حلقۂ دینار و جواہر سے نکل آ
جینے کی ہوس ہے تو مقابر سے نکل آ

ویرانۂ تہذیب نظارت کے لئے ہے
بکھرے ہوئے خوش رنگ مناظر سے نکل آ

سفاک خیالوں نے تراشے ہیں یہ افلاک
اے میری نظر قیدِ مظاہر سے نکل آ

سب رنگ پریشان ہوئے تیرے سبب سے
تو، کون ہے اب سحرِ مصوّر سے نکل آ

تاریک زمانے ہیں، اجالوں کی خبر دے
آ طالعِ نوروز مرے پھر سے نکل آ

ساقی فاروقی

غزل

ابھی نظر میں ٹھہر، دھیان سے اتر کے نہ جا
اس ایک آن میں سب کچھ تباہ کر کے نہ جا

مجھے حجاب نہیں بوسۂ جدائی سے
مگر لبوں کے پیالے میں پیاس بھر کے نہ جا

مرے خیال میں تیرا کوئی جواز نہیں
خدا کی طرح مری ذات میں بکھر کے نہ جا

سنبھال اپنی نگاہوں میں واپسی کے سوال
مرے جواب کے پندار سے گزر کے نہ جا

ہر ایک راستہ دیوار بن کے حائل ہے
نہ جا کہ دشت نئے سلسلے ہیں گھر کے نہ جا

ساقی فاروقی

غزل

وقت ابھی پیدا نہ ہوا تھا تم بھی راز میں تھے
ایک سسکتا سناٹا تھا ہم آغاز میں تھے

اُن سے پیار کیا جن پر خاموشی نازل کی
اُن پر ظلم کیا جو بند اپنی آواز میں تھے

ہر قیدی پر آزادی کی حد جاری کر دی
ہونٹوں کا اعجاز ہوئے جو نغمے ساز میں تھے

حبس تھا کوئی صبح فروزاں ہونے والی تھی
شام قدم بوسی پر تھی سائے پرواز میں تھے

جس نے خون میں غسل کیا اور آگ میں رقص کیا
حیف کہ سارے ہنگامے اس کے اعزاز میں تھے

ساقی فاروقی

غزل

خدا کرے کہ ستارے سے پھر ستارہ ملے
تجھے غرور مجھے عاجزی دوبارہ ملے

ہزار خواب پریشاں ہوئے ہلاک ہوئے
نظر نہ ہو تو کہاں خون کا نظارہ ملے

صدائے اشک خجل ہے کہ گوشِ عالم پر
مثالِ شیشہ گرے اور پارہ پارہ ملے

ترا خیال مگر ایک کرمِ آتش ہے
پناہ لے مرے دل میں اگر شرارہ ملے

میں ایک قلزمِ بیتاب، اپنی لہروں میں
اسیر ہوں، کسی مہتاب کا اشارہ ملے

احسن علی خاں

غزل

ہوئی دستک، کوئی آیا، نہیں، کوئی نہیں ہے
ہمیں اب پوچھنے والا کہیں کوئی نہیں ہے

بہت آباد ہیں یہ بے در و دیوار سے گھر
محل ایسے بھی ہیں جن میں مکیں کوئی نہیں ہے

جھجکتے ہیں اشاروں سے بھی دل کی بات کرتے
کہ شیشہ گھر میں رازوں کا امیں کوئی نہیں ہے

اب اک اندھے کنوئیں میں گرتے جانا، زندگی ہے
اب اپنے پاؤں کے نیچے زمیں کوئی نہیں ہے

ذرا سُن تو، کہ اب مظلوم نا اُمّید ہو کر
یہ کہتے ہیں سرِ عرشِ بریں کوئی نہیں ہے

احسن علی خاں

غزل

پھر اندھیروں نے راستے روکے
پھر نئے خطرہیں، نئے دھوکے

غم کے ماروں کی سادگی دیکھو
مانگتے ہیں یہ ہر خوشی رو کے

ہم کہ جو پائے عالم نو تھے
گھر کو لوٹے کہاں کہاں ہو کے

ہم سے مت پوچھ صبح کب ہوگی
ہم نے صدیاں گنوائی ہیں سو کے

جز اجل کوئی تو صلہ ملتا
زندگی، تیرے بوجھ کو ڈھو کے

زہر، زنداں، صلیب، یاد آئے
ذہن میں تخم آگہی بو کے

بات انساں کی کیوں سنے احسن
جو فرشتہ ہو وہ اسے ٹوکے

غزل

اب تو بوسیدہ ہو چلے ہیں ہم
ٹوٹنے پھوٹنے لگے ہیں ہم

زخم دل کی کسک چھپانے کو
جسم پر گھاؤ چاہتے ہیں ہم

اب نہیں فکر سود، رنج زیاں
خوار ہونا تھا، ہو چکے ہیں ہم

اب سبھی کچھ ہمیں گوارا ہے
ہائے کتنے بدل گئے ہیں ہم

ہم سے دامن بچا کے چلتی ہے
اے صبا، تجھ کو جانتے ہیں ہم

راہبر کے بغیر ہی احسن
نئی راہوں پہ چل سکے ہیں ہم

احسن علی خاں

غزل

کیا چاہا تھا، کیا پایا ہے، سوچ رہے ہیں
دل بویا تھا، سنگ اُگا ہے، سوچ رہے ہیں

یہ جینا بھی کیا جینا ہے، سوچ رہے ہیں
امرت سے تو زہر اچھا ہے، سوچ رہے ہیں

جس کا جتنا بس ہے، جتنا داؤ چلا ہے
اُس نے اتنا لوٹ لیا ہے، سوچ رہے ہیں

مُڑ کر دیکھا، پیچھے سب لوگ اپنے ہی تھے
پشت سے کس کا تیر آیا ہے، سوچ رہے ہیں

برسوں چل کے ایک مقام شک پر پہنچے
آگے وقت کی منزل کیا ہے، سوچ رہے ہیں

پاسِ ساقی اور لحاظِ بزم سے چُپ ہیں
پیالہ اپنا زہر بھرا ہے، سوچ رہے ہیں

گنگ زبانیں، ویراں چہرے، خالی آنکھیں
شہر نے کیسا جبر سہا ہے، سوچ رہے ہیں

ہم نے احسنؔ تنگ اور اُتھلے دل ہی دیکھے
باہوؔ کہہ گئے دل دریا ہے سوچ رہے ہیں

جمال پانی پتی

غزل

جو مراد جس کے بھی دل کی ہو وہ مراد حسبِ دعا ملے
ترے عکس کو ملے آئینہ، مرے آئینہ کو جلا ملے

ہمیں آتی جاتی رتوں سے کیا کہ ہے شہرِ دل کی وہی فضا
کبھی کوئی داغ چمک اٹھے کبھی کوئی زخم ہرا ملے

رہے اپنا حال یہی اگر تو کریں بھی کیا مرے چارہ گر
کہ کریں جو دامنِ جاں رفو تو دریدہ دل کی قبا ملے

ہمیں دیکھنا تھے یہ دن بھی اب کہ محبتوں کے گلاب سب
جنہیں شاخ شاخ بہم کیا وہی برگ برگ جُدا ملے

میں چراغِ راہ گزر نہیں، مجھے کچھ ہواؤں کا ڈر نہیں
مری لَو ہو اتنی ہی تیز تر مجھے جتنی تیز ہوا ملے

نہ ہو دل کی آگ ہی شعلہ زن تو کہاں کی گرمیٔ انجمن
نہ چراغِ حرف و سخن جلے نہ ضیائے شمعِ نوا ملے

کوئی اس نوا کا ہو قدرداں کہ دکھے دلوں کی ہے ترجماں
مرا ہم نوا مرا ہم زباں کوئی مہرباں ہو تو آ ملے

ذوالفقار احمد تابش

غزل

یہ گُل کدہ، یہ سوادِ دل و نظر دیکھو
یہاں پہ رہتا ہوں میں، آؤ میرا گھر دیکھو

وہیں ہیں سارے مرے خیر و شر کے اندیشے
میں دیکھتا ہوں جدھر تم بھی تو ادھر دیکھو

دلوں میں کس طرح صبحیں نزول کرتی ہیں
ان عارضوں پہ طلوعِ گُلِ سحر دیکھو

میں دھوپ لکھتا ہوں اور روشنی اُگاتا ہوں
کمال کرتا ہوں، آؤ میرا ہنر دیکھو

ہزار سمت وہی عکس جلوہ آرا ہے
وہی ہے پیشِ نظر اور پسِ نظر دیکھو

اسی کے اسم کو دیوارِ حرف پر لکھنا
وہی صدا ہے نمودار، سر بہ سر دیکھو

ہُوا ہے شوق ہمیں سنگ و خشت بونے کا
اُگا رہے ہیں کوئی فصلِ بام و در دیکھو

وہی ہوس ہے ابھی آتشِ بدن بھی وہی
جلا رہا ہوں میں اپنے دل و نظر دیکھو

اُگا رہا ہوں، میں سورج میں چاندنی کا شجر
ادائے شام پہ لکھا زرِ سحر دیکھو

اختر ہوشیارپوری

غزل

خاک اُڑاتے راستوں میں قافلے سب ایک ہیں
دشت و در سب ایک سے ہیں فاصلے سب ایک ہیں

ان کتابوں کے منقش گرد پوشوں پر نہ جاؤ
گو جدا ہیں داستانیں حاشیے سب ایک ہیں

نیلگوں پانی کی تہ میں تختے بھی ہیں چاند بھی
اس زمین و آسماں کے مسئلے سب ایک ہیں

سب کی راتیں مختلف ہیں خواب بھی سب کے الگ
ہاں مگر خوابوں سے پہلے رتجگے سب ایک ہیں

خشک پیڑوں کے لئے مٹی کہاں سے لاؤ گے
ان ردیفوں کے لئے تو قافیے سب ایک ہیں

موجۂ دریا بھی دریا کی خبر رکھتا نہیں
دشت و در میں بے حسی کے سلسلے سب ایک ہیں

ہم کہیں ٹھہریں نہ ٹھہریں ہم کہیں جائیں نہ جائیں
گھر میں بیٹھے دیکھتے ہیں راستے سب ایک ہیں

بند دروازوں میں روزن بھی غنیمت ہیں مگر
روشنی اور تیرگی کے زاویے سب ایک ہیں

اک پرندہ شاخ سے یہ کہہ کے اختر اڑ گیا
کوئی موسم ہو ہوا کے ذائقے سب ایک ہیں

اختر ہوشیار پوری

غزل

نام تھا اک اور کا تصویر تھی اک اور کی
خواب میرا تھا مگر تعبیر تھی اک اور کی

مصلحت یہ تھی کہ مجھ کو چُن دیا دیوار میں
واقعہ یہ ہے کہ وہ تقصیر تھی اک اور کی

انگلیاں میری تھیں جن سے عمر بھر لکھتا رہا
پھر نہ جانے کیا ہوا تحریر تھی اک اور کی

شہر راتوں رات جب پھیلا تو یہ عقدہ کھلا
یہ زمیں تھی اور کی تعمیر تھی اک اور کی

میں نے جس کی عمر کاٹی وہ مرا ہمزاد تھا
وہ مگر ہمزاد بھی تصویر تھی اک اور کی

جس نے جھانکا تھا دریچوں سے وہ کوئی اور تھا
چھت پہ جو پھیلی تھی وہ تنویر تھی اک اور کی

جو زمیں مجھ کو ملی بنجر تھی نا ہموار تھی
اس سے وابستہ مگر تقدیر تھی اک اور کی

میرے ہاتھوں میں تھا اپنا بند و بست اختیار
پاؤں میں اختر مگر زنجیر تھی اک اور کی

اختر ہوشیار پوری

غزل

گھر سے کیا نکلے کہ اپنے ساتھ ویرانے لگے
اور اب ڈر ہے کہیں خود سے نہ خوف آنے لگے

وہ گھڑی بھی حافظے میں آج تک محفوظ ہے
ٹوٹتی دیوار سے جب سائے ٹکرانے لگے

عمر بھر اک دوسرے کی کھوج میں بیٹھے رہے
مجھ کو اس بستی کے سارے لوگ دیوانے لگے

اپنے پیچھے چلتے چلتے میں یہاں تک آ گیا
راستے دیواروں کی صورت نظر آنے لگے

سانس کی کیفیتیں سینے کی دھڑکن بن گئیں
دو قدم چلنے نہیں پائے کہ سستانے لگے

میں نے تو دیکھا یہی ہے زندگی کی دوڑ میں
قافلے چلنے لگے تو رستے بل کھانے لگے

دُور سے اُڑتی ہوئی کونجوں کی ڈاریں دیکھ کر
گاؤں کے گبھرو جواں کھیتوں میں لہرانے لگے

چاند ابھی ابھرا نہ تھا سورج ابھی ڈوبا نہ تھا
لوگ تصویروں کی صورت بام پر آنے لگے

سبز پیڑوں کی وہی شاخیں وہی پگڈنڈیاں
مجھ کو تو اختر یہ رستے جانے پہچانے لگے

جمیل یوسف

غزل

تمناؤں کی دُنیا میں قدم دھرنے نہیں دیتی
جو کرنا چاہتا ہوں زندگی کرنے نہیں دیتی

کوئی صورت نہیں ہے زندگی سے بچ نکلنے کی
غم و آلام کے ماروں کو بھی مرنے نہیں دیتی

اندھیرا لاکھ ہو، مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ روشنی ہے جو مجھے ڈرنے نہیں دیتی

کوئی موسم ہو اُن زلفوں کی خوشبو لے ہی آتی ہے
ہوائے شوق، دل کے زخم کو بھرنے نہیں دیتی

خدا نے میرے اندر کیا خبر کیا چیز رکھ دی ہے
جو سمجھوتہ مجھے حالات سے کرنے نہیں دیتی

مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

گزرتی رَو بدلتی جا رہی ہے ایک اک شے کو
کسی شے سے مجھے الفت کا دم بھرنے نہیں دیتی

جمیل یوسف

غزل

پھر رُک نہیں سکا ہوں کسی بھی چٹان سے
ایسا گرا ہوں روزِ ازل آسمان سے

ہے جبر میں بھی ایک گماں اختیار کا
دو چار ہر قدم پہ ہوں اک امتحان سے

اب میں ہوں اور ہواؤں کی سازش کا سامنا
اک تیر ہوں چلا ہوں تمنا کی کمان سے

اک آئینہ کہ جس میں کہیں بال پڑ گیا
اک سلسلہ کہ ٹوٹ گیا درمیان سے

گُم سُم کھڑے ہیں اب در و دیوار اور میں
وہ لوگ کب کے جا بھی چکے ہیں مکان سے

لفظوں میں اس کا پیچ، نہ حرفوں میں اس کا خم
تصویر اُس کی کیا بنے لفظ و بیان سے

خوشیاں جو مجھ کو مل نہ سکیں اس جہان میں
مجھ کو بلا رہی ہیں نئے اک جہان سے

کچھ بھی اثر نہیں یہاں میری نواؤں کا
شاید اب آئے کوئی صدا آسمان سے

اُس بات کا جمیلؔ مجھے کچھ پتہ نہیں
اقرار کر رہا ہوں میں جس کا زبان سے

جمیل یوسف

غزل

تری آنکھیں، ترا حسنِ جواں تحریر کرتے ہیں
زمیں کی پستیوں میں آسماں تحریر کرتے ہیں

کوئی موسم خزاں سے آشنا اس کو نہیں کرتا
ہم اپنے خون سے جو گلستاں تحریر کرتے ہیں

زمانے کی کوئی کروٹ اسے سنولا نہیں سکتی
ہم اپنی آنچ سے جو کہکشاں تحریر کرتے ہیں

کوئی دیوار اس کا راستہ کیا روک سکتی ہے
ہوا کی لوح پر اپنا بیاں تحریر کرتے ہیں

ہمارا دَور ہم کو بھول جائے، ہو نہیں سکتا
ہم اپنے دور کا نام و نشاں تحریر کرتے ہیں

کسی برخود غلط رہبر کو خاطر میں نہیں لاتے
غلط رہبر کو گردِ کارواں تحریر کرتے ہیں

ہماری سوچ کو کج فہم دنیا دار کیا سمجھیں
ہم ان کی عقل کو وہم و گماں تحریر کرتے ہیں

ہمیں اہلِ جہاں کی شوکت وثروت سے کیا مطلب
ہم ان سب سے الگ اپنا جہاں تحریر کرتے ہیں
ہمارا کامیابی کا تصور ہی نرالا ہے
زیاں اور سود کو سود و زیاں تحریر کرتے ہیں
گزرتے وقت کو آپ رواں کا نام دیتے ہیں
فراغت کو نشاطِ بیکراں تحریر کرتے ہیں
خیال و خواب کو الفاظ میں ڈھالا نہیں جاتا
جو کرنا چاہتے ہیں وہ کہاں تحریر کرتے ہیں
زمانے کو وہ اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے
حقیقت میں ہم اپنی داستاں تحریر کرتے ہیں

جمیل یوسف

غزل

جنوں کی بات نہ کر، آرزو کا ذکر نہ چھیڑ
جہانِ جبر میں حُسنِ نمو کا ذکر نہ چھیڑ

یہاں جو ہونا ہے ہر حال میں وہی ہوگا
خرد کا زعم نہ کر، جستجو کا ذکر نہ چھیڑ

گزرتے وقت کی چالیں ہیں ان کا بھید سمجھ
محبتوں پہ نہ جا، رنگ و بو کا ذکر نہ چھیڑ

غریب بھی ہے پریشاں، امیر بھی لاچار
بلندیوں کو نہ تک، کاخ و کو کا ذکر نہ چھیڑ

یہاں جو شخص ہے تنہا ہے اور اکیلا ہے
تو اپنا حال سُنا، چار سُو کا ذکر نہ چھیڑ

ترا ہی عکس محبت بھی ہے عداوت بھی
تو آپ اپنا عدو ہے عدو کا ذکر نہ چھیڑ

بھلا رہا ہوں میں وہ سانولے سلونے دیار
وہ شام یاد نہ کر، آبجو کا ذکر نہ چھیڑ

راشد مفتی

غزل

جسے علم ہے کہ مجرم کوئی اور ہے کہ میں ہوں
وہی پوچھتا ہے ملزم کوئی اور ہے کہ میں ہوں

مرے طرزِ سخن اور دوں کے بھی خال و خد ہیں اچھا
مگر آئینے سے نادم کوئی اور ہے کہ میں ہوں

مرے کارِ منصبی سے ہے جہاں مرا تشخص
اس ادارے میں ملازم کوئی اور ہے کہ میں ہوں

نئی طرزِ فن کا موجد چلو تم مجھے نہ مانو
روشِ کہن کا خاتم کوئی اور ہے کہ میں ہوں

فقط ایک ڈھونگ ہیں یہ ادب و ہنر کی باتیں
ہے یہ ڈھونگ جس پہ لازم کوئی اور ہے کہ میں ہوں

یہ نہیں کہ مجھ سے یاروں کا سلوک ہے مثالی
مگر آپ اپنا مجرم کوئی اور ہے کہ میں ہوں

میں نئی رتوں کے نغمے تو سنا رہا ہوں لیکن
جسے راس ہے یہ موسم کوئی اور ہے کہ میں ہوں

صفِ ملزماں میں راشد وہ ابھی رکھے گا مجھ کو
اسے علم ہے کہ مجرم کوئی اور ہے کہ میں ہوں

راشد مفتی

غزل

بنا جاتا ہے پیراہن کفن کیوں
یہ مجھ میں پڑ رہے ہیں اتنے رن کیوں

مری تخلیق مٹی سے ہوئی تھی
سراپا آگ ہے میرا بدن کیوں

چھپا رکھی ہے کیا میں نے کوئی بات
مرے سینے میں ہے اتنی گھٹن کیوں

حسد کرتا ہوں کیا میں بھی کسی سے
مرے لہجے میں ہے اتنی چبھن کیوں

یہ دیکھا تھا کسے میں نے پلٹ کر
یہ پتھر ہو گیا میرا بدن کیوں

یہ دنیا بھر سے بیگانہ روی کیا
یہ اپنے آپ میں رہنا مگن کیوں

تو کیا اس واسطے چھینٹے پڑے ہیں
بہت اجلا تھا اپنا پیرہن کیوں

نبھا سکتے نہیں اپنا چلن جب
بدل لیتے نہیں اپنا چلن کیوں

اگر دائم ہیں قدریں خیر و شر کی
خدا سے بڑھ گیا ہے اہرمن کیوں

شرافت کیا ہوئی راشد تمہاری
یہ تم میں آ گیا ہے سفلہ پن کیوں

راشد مفتی

غزل

ہونے دو جو بھی شہر میں تاویل ہو گئی
کیا کم ہے اپنی بات کی ترسیل ہو گئی

دانہ چگا تھا جس نے سدا میرے ہاتھ سے
چڑیا وہ میرے حق میں ابابیل ہو گئی

گھر سے تو خیر ہم کو فراغت ہے مستقل
دفتر میں آج کس لئے تعطیل ہو گئی

لہجہ تو اس کا نرم تھا لیکن نہ جانے کیوں
پیوست جیسے دل میں کوئی کیل ہو گئی

بارش میں جس پہ تھا کئی ندیوں کا انحصار
گرمی پڑی تو خشک وہی جھیل ہو گئی

تعبیر اس سے بھی نہ اگر بن سکی تو کیا
یہ تو ہوا کہ خواب کی تکمیل ہو گئی

اک چیز مانگنے سے بھی مجھ کو نہیں ملی
اک چیز خود بخود مجھے تحویل ہو گئی

دشمن سے راشد اب بھی چکلتے نہیں حساب
اپنی طرف سے اب تو بہت ڈھیل ہو گئی

اندر کے آدمی سے نظر چار کیا ہوئی
اپنی تو جیسے جون ہی تبدیل ہو گئی

راشد مفتی

غزل

فضاؤں میں گردِ سفر رہ گئی
مسافر گیا، رہ گذر رہ گئی

زمیں کو ابھی اور تپنا ہے کیا
گھٹا گھر کے آئی مگر رہ گئی

ستارہ تو کیا ہاتھ آتا کوئی
خلا میں بھٹک کر نظر رہ گئی

گئی رت نے بھی جس کو رکھا تھا زرد
رہی شاخ پھر بے ثمر رہ گئی

بہت شوق تھا ہم کو تشہیر کا
سو چھپنے سے اپنی خبر رہ گئی

بنایا تھا جس کو بدل تیغ کا
دھری کی دھری وہ سپر رہ گئی

سی کے گذرنے کی راشد تھی دیر
سڑک ایک سونی ڈگر رہ گئی

پنہاں

غزل

تہمت زیست یوں اٹھائی ہے
رسم جیسے کوئی نبھائی ہے

کوئی سورج نہ ہوگا شرمندہ
شمع جاں کس لئے جلائی ہے

بھیگتی جا رہی ہیں پلکیں پھر
اس کے موسم کی یاد آئی ہے

زخم سب روشنی سے لگتے ہیں
فصل اب کے عجیب آئی ہے

دیر تک سوچتی رہی پنہاں
اپنی تنہائی کیوں سجائی ہے

خلیق ابراہیم خلیق

غزل

خلیق اب نہ سحر وہ ہے اور نہ شام وہ شام
اگرچہ اب بھی ہیں اِس شہر میں وہ کوچہ و بام

وہ خرقہ جس کو تبرّک سمجھ کے رکھا تھا
فقیہِ شہر کے ہاتھوں وہ ہو گیا نیلام

نہ مجھ سے ذِکر کرو تلخیٔ حوادث کا
کہ پی چکا ہوں میں دُردِ تہِ مئے ایّام

مئے زمانہ کہ پینے میں تلخ ہے، لیکن
دہن اسی سے ہے شیریں، اسی سے لذّتِ کام

بس ایک جھٹکا بدلتا ہے نظمِ عالم کو
سمجھتے کیوں نہیں یہ نکتہ مصلحانِ کرام

یہ آپ اپنی سزا، آپ اپنی عقبیٰ ہے
کہ زندگی کا نہ آغاز ہے نہ ہے انجام

ہر آن اک نئی تخلیق اس کی شاہد ہے
سدا سُہاگ ہے تقدیرِ مادرِ ایّام

وہ نشّہ جس کو مسرّت کا نام دیتے ہیں
تجھے ہو کیسے کہ چکھّی نہیں مئے آلام

وہ دور آبھی چکے جب نگاہِ ساقی میں
نہ ہوگا فرقِ مراتب میانِ خاص و عام

چراغِ لالہ و گل جل اٹھے نفس سے مرے
اگرچہ میں ہوں خلیقؔ اب بھی رندِ تشنہ کام

—

مظفر حنفی

غزل

پتنگ جیسا نہ تھا زور دست و پا میں کوئی
مگر ہمیں بھی اُڑاتا رہا ہوا میں — کوئی

بدن کے غار میں جگنو سا کیا چمکتا ہے
چھپا ہوا ہے کہیں گنبدِ انا میں کوئی

تو کیوں فرات میں سرخی نظر نہیں آتی
اگر حسینؑ ہے اطرافِ کربلا میں کوئی

فریب کھائے ہیں اپنی تلاش میں کیا کیا
فرازِ طور پہ پہنچا کوئی، حرا میں کوئی

ہر ایک شخص مجھے آئینہ دکھاتا ہے
نہیں ہے سنگ مرے دستِ نارسا میں کوئی

لہو کی دھار پہ بہتے چلے گئے سب لوگ
قدم جما نہ سکا راہِ ارتقا میں کوئی

مرے تئیں تو مظفر غزل غزل ہی نہیں
اگر خیال نہ ہو ندرتِ ادا میں کوئی

مظفر حنفی

غزل

مری بساط ہی کیا فکرِ نارسا کتنی
نہ پوچھیے کہ ملی ہے مجھے سزا کتنی

لہو رگوں میں نہیں ہے تو پوچھتے کیا ہو
کہ تشنہ لب ہے ابھی خاکِ کربلا کتنی

نہیں تو کس کو زمانے میں اتنی فرصت ہے
اگر سنو تو مری عرضِ مدّعا کتنی

وہ پاس آکے مہکتی ہے کس قدر یارو
وہ دور سے نظر آتی ہے دل ربا کتنی

سبک قدم تھا کبھی راہِ دشتِ امکاں میں
اُٹھائیے نہ مجھے، عمرِ نقشِ پا کتنی

عجیب کش مکشِ آرزو میں اُلجھا ہوں
یہ گردِ راہ بھی ہے صبر آزما کتنی

جواز پیش کرے گی غزل مظفر کی
جدید رنگ میں ہے ندرتِ ادا کتنی

زیب غوری

غزل

ایسی ویرانی میں سایہ کیسا، سیرابی کیسی
جانے دل کے پودے میں ہے اب تک شادابی کیسی

ہجر کی راتیں اپنی رونق ساتھ ہی لے کر آتی ہیں
اشکوں کا کہیں نام نہیں ہے پھر یہ گہر تابی کیسی

جیسے جیسے رات ہے ڈھلتی رنگت تیرے ہونٹوں کی
سُرخ سے ہوتی جاتی ہے پھر گہری عنابی کیسی

سبزے کو اس بیدردی سے تُند ہوا پامال نہ کر
سرشاری سے لہراتا ہے اس میں سرتابی کیسی

پہلے بھی تھی شام حنائی پھر اُس کی یاد آتے ہی
آئی ہے اِس شیشۂ مے میں اتنی خونابی کیسی

ٹوٹے ہوئے آئینۂ دل سا سُوکھا تال چمکتا ہے
بے موسم کے آن گری ہے کوئی مُرغابی کیسی

زیبؔ اُس کا وہ روشن ہونا مجھ پر کھُلے خزانے سا
میری رسائی تک پہونچی ہے اُس کی نایابی کیسی

ڈاکٹر محبوب راہی

غزل

اچھے نہیں ہیں وقت کے تیور مرے عزیز
رہنا ہے اپنی کھال کے اندر مرے عزیز

تیری منافقت پہ مجھے کوئی شک نہیں
میرے رفیق، میرے برادر، مرے عزیز

آ! تیری تشنگی کا مداوا ہے میرے پاس
میرا لہو حلال ہے تجھ پہ مرے عزیز

احساس جس کا نام ہے وہ چیز مستقل
چبھتی ہے میرے ذہن کے اندر مرے عزیز

اور اس میں تیر کر مجھے ہونا ہے سرخرو
درپیش ہے لہو کا سمندر مرے عزیز

رکھ دے گا ایک روز مجھے توڑ پھوڑ کر
طوفاں دبا ہے جو مرے اندر مرے عزیز

مجھ کو دلا دے کش مکش زیست سے نجات
سینے میں میرے گھونپ دے خنجر مرے عزیز

نادان! واہموں کے تعاقب سے باز آ
کوئی نہیں کسی کا یقیں کر مرے عزیز

مجھ کو نہ رکھ فریب حقائق میں مبتلا
دکھلا نہ مجھ کو خواب کے منظر مرے عزیز

ممکن جو ہو تو اس سے رہائی دلا مجھے
ہے بار دوش مجھ پہ مرا سر مرے عزیز

تجھ کو ہے اپنے قوتِ بازو پہ اعتماد
تو مجھ کو اپنے زورِ قلم پر مرے عزیز

اظہارِ حق سے باز کب آتے ہیں ایسے لوگ
راہی ہو یا ہوں شاد[1] و مظفر[2] مرے عزیز

---

[1] شاد عارفی [2] مظفر حنفی

شمیم روشن

غزل

ستارہ ٹوٹ کے بکھرا اور اک جہان کھلا
عجیب رُخ سے اندھیرے میں آسمان کھلا

طلوعِ صبح سے پہلے میں چھوڑ جاؤں گا
سیاہ رات کے پہلو میں اِک مکان کھلا

پھر اِس کے بعد کوئی راہ واپسی کی نہ تھی
ہوا کے شور میں اس طرح بادبان کھلا

نہ جانے کون مرے خواب لے گیا مجھ سے
کہ عمر بھر نہ کبھی پھر یہ سائبان کھلا

میں جس کو ڈھونڈ رہا تھا اداس راتوں میں
ستارا بن کے وہ پلکوں کے درمیان کھلا

کبھی جو ہاتھ اٹھائے روشن دعا کے لئے
لبوں کے ساتھ سماعت کا بھی گمان کھلا

پروفیسر کرار حسین

کلچر کا مسئلہ

" ادارۂ نیا دور نے کہانیوں اور افسانوں کے حوالے سے تخلیقی سوتوں اور موجودہ صورتِ حال کے بارے میں جو بات اٹھائی تھی، وہ اب ہمارے بنیادی طرزِ احساس کی تلاش اور جستجو تک پہنچ گئی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے ہم اردو کے تمام تخلیقی فن کاروں اور اہل دانش کے افکار کے منتظر ہیں۔

چند برس ہوئے پاکستان ٹیلی وژن کی طرف سے کلچر کے موضوع پر ایک ایسا مذاکرہ منعقد ہوا تھا جس میں تقریباً ہمارے سب اہل دانش شریک تھے۔ خوش قسمتی سے پروفیسر کرار حسین کی اس مذاکرہ میں بنیادی گفتگو اور اس سے متعلق سوال و جواب ہمارے پاس ٹیپ کی صورت میں محفوظ تھے۔ اس گفتگو کو ہم اس بار یوں بھی پیش کر رہے ہیں کہ اس کا بڑا گہرا تعلق ہمارے اٹھائے ہوئے بنیادی مباحث سے ہے۔ جہاں جہاں الفاظ سننے میں نہ آسکے یا کوئی لفظ ٹیپ نہیں ہو سکا وہاں جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

ہم اس پورے مذاکرے کو دو قسطوں میں پیش کر رہے ہیں۔ پہلے پروفیسر کرار حسین صاحب کی گفتگو حاضر ہے۔ اس پر سوال و جواب انشاءاللہ آئندہ شمارے میں پیش ہوں گے۔ (ادارہ)

کلچر کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے شاید یہ زیادہ مناسب ہو کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ یہ کلچر

مسئلہ کیوں اٹھا؟ کیسے اٹھا؟ آخر اب تک بہتے چلے آئے تھے۔ آرٹ بھی تھا فن بھی تھا، علم بھی تھا اور سائنس بھی تھی۔ لیکن یہ سوال اس طریقے سے کہ کلچر کس کو کہتے ہیں؟ ہمارا کلچر کیا ہے؟ یہ سوال پہلے کبھی نہیں اٹھا۔ یہ تو اسی بات سے آپ دیکھیں کہ ابھی اظہار کاظمی صاحب کہہ رہے تھے کہ "اس کو تہذیب کہہ لو، ثقافت کہہ لو، کلچر کہہ لو" یعنی ابھی اس کا نام بھی پوری طرح سے متعین نہیں ہوا۔ اس کی تعریف بھی نہیں ہوئی۔ کلچر کا لفظ خود اس معنی میں جن معنی میں ہم استعمال کرتے ہیں بہت حال کا ہے۔ (یہ بات کہ یہ زندگی کی جانب . . . . تو یہ شاید خود ہمارے زمانے کی علامت ہے) لیکن یہ علامت کوئی زیادہ صحت مندی کی نہیں ہے اس لئے 'HYPERSENSITIVITY' یہ حسِ شدید' یہ ہے مرض کی علامت۔ ہمیں جس وقت کہ کوئی نزلہ ہو جاتا ہے تو اس وقت اس بات کا سوال ہوتا ہے کہ سر ہمارا کہاں ہے؟ ہے بھی یا نہیں ہے اور جس وقت کہ صحت مند ہوتے ہیں اس وقت یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ گردن پہ ایک سر بھی ہے ہمارے جسم میں یا کیا ہے۔

اس بات کو دیکھنے کے لئے یہ مسئلہ کیسے اٹھا۔ یہ خود آگہی کیسے پیدا ہوئی۔ یہ سوال کیسے پیدا ہوا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پہلے پہلے جو ایک شاک (SHOCK) ہوا اس لئے کہ کسی خارجی دھچکے ہی سے آدمی کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو سوچتا ہے، تو وہ اس وقت ہوا جب مغربی کلچر سے ہمارا واسطہ پڑا اور مغربی کلچر سے جو واسطہ پڑا تو وہ ایک خاص انداز کے اندر پڑا یعنی ایک سامراج کی طاقت جو تھی وہ ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس وقت ہمیں اپنا جائزہ لینا پڑا۔ اپنا ردِعمل متعین کرنا پڑا۔ یہ ہوا کہ ہم اپنے چاروں طرف ایک حصار کھینچیں۔ اس کلچر کا مقابلہ کریں۔ اسے قبول کریں یا رد کریں۔ بہرحال یہ سوالات ضرور پیدا ہوئے کہ ہمارا ردِعمل کیا ہونا چاہیئے اس کلچر سے۔ یہ جو ایک نیا حادثہ ہوا ہے، یہ جو نئی بات ہوئی ہے تو اس سے کیا ردِعمل ہو۔ کیا پوزیشن ہو۔

انگریز سامراج جب مسلط ہو گیا تو سیاسی فکر پیدا ہوئی۔ آزادی کی جنگ شروع ہوئی۔ آزادی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس کے اندر کچھ ہندو تھے کچھ مسلمان تھے۔ یہ دو معاشرے جو تھے تو وہ چل رہے تھے۔ ان کے مفادات کے اندر تصادم ہوا۔ اس مفادات کے تصادم سے

اور زیادہ خود آگہی بڑھی یہ محسوس ہوا یہ معلوم ہوا کہ ہم ایک علیحدہ جماعت ہیں علیحدہ معاشرہ ہے
ہمارا۔ اس کے بعد یہ پاکستان بنا اور معاشرہ ایک نئے ماحول کے اندر آیا۔ سماجی ماحول بدلا
گیا۔ سیاسی ماحول بدل گیا تو اب اور زیادہ سوچنے کی ضرورت ہوئی کہ کس طریقے سے ہم
اپنے آپ کو سمجھیں سوچیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے سے اور زیادہ ہمارے
دماغ کو دھچکا لگا۔ اور یہ سوال اپنے تشخص کا اپنی شخصیت کا اپنی آئیڈنٹٹی کا قریب قریب ایک
SURVIVAL کے طور پر اپنی بقا کے طور پر ہمارے سامنے آیا۔ ویسے یہ کلچر کا سوال ہے
ہر جگہ۔ مغرب کے اندر بھی ہے۔ اور شاید اتنی ہی شدت کے ساتھ کچھ عوامل وہاں بھی کام کر رہے
ہیں۔ یہ دو جنگوں کا ہونا پھر روس کے اندر ایک انقلاب کا پیدا ہونا ایک نئی تہذیب کا ابھرنا
یہ خود ایک چیلنج تھا جو پرانی تہذیب کو اور روایتی اقدار کو درپیش ہوا۔ اب معاشرے کے اندر
وہ نظام جو قائم تھا اس کی بنیادیں ہل گئیں۔ اس قسم کے محرکات ہیں جن کی وجہ سے کلچر کا مسئلہ
دنیا میں بھی اور ہمارے یہاں بھی شدید تر صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ میں نے یہ مختصر
بات اس لئے کہی کہ ایک مسئلہ کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری بات ہے کہ ہم یہ بھی سمجھیں کہ وہ
مسئلہ پیدا کس طرح سے ہو گیا؟ کیوں یہ مسئلہ ہوا؟ کیوں یہ زندگی جو تجربہ ہے اور
تجربہ ہونا چاہئے اسے، یہ کیوں تجربہ کی بجائے مسئلہ کی صورت میں ہمارے سامنے
آ رہی ہے، سیاسی مسئلے اور اقتصادی مسئلے تو تھے ہی اب ایک کلچرل مسئلہ جو ہے تو وہ بھی
پیدا ہو گیا۔ اب کلچر کی بغیر اس بحث میں جائے ہوئے کہ کلچر کا اور سویلیزیشن کا کیا تعلق۔
اور تہذیب کس کو کہتے ہیں۔ ثقافت کس کو کہتے ہیں؟ بات کو ذرا آگے بڑھانے کے لئے ایک
لگتی سی تعریف کلچر کی اس طریقہ سے کریں کہ ایک معاشرہ کی اجتماعی زندگی کے اظہار کی جو
مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ یعنی بلند ترین سطح سے لگا کے نیچی سطح تک جو ہمارے بنیادی
عقیدے، حیات و کائنات کے متعلق جو ہمارا ATTITUDE، ہمارے فنون لطیفہ
ہمارا فلسفہ ہماری LEARNING، ہمارا علم، اس علم کا رُخ (اس لئے کہ یہ بھی بڑی
زبردست چیز ہوتی ہے۔ لیکن ہم کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ مسلمان جو تھے تو ان کے یہاں بھی
سائنس تھی۔ اور WEST کے اندر بھی سائنس تھی، لیکن آپ جب اس کی روح کو تلاش کریں

اس کے BACK GROUND کو تلاش کریں، اس کے مقاصد کو تلاش کریں تو اس میں بہت اختلاف
پایا جاتا ہے)۔ تو یہ تمام کی تمام چیزیں ہیں۔ ان چیزوں سے لے کر روزمرہ کی نشست و برخاست
کے طریقوں تک، ملنے جلنے کے طریقے مہمان نوازی کے طریقے۔ اخلاق کا نظام کہ ہم کس بات کو
اچھا سمجھتے ہیں کس بات کو برا سمجھتے ہیں۔ یہ تمام کی تمام باتیں جن سے زندگی کی ایک کیفیت پیدا
ہوتی ہے۔ کوالٹی پیدا ہوتی ہے، ایک قدر پیدا ہوتی ہے جو زندگی کو اس قابل بناتی ہے کہ
زندہ رہا جائے۔ زندگی کے اندر جو قدر و قیمت اور اہمیت پیدا کرنے والی چیز ہوتی ہے تو اس
کو ہم کلچر کہہ سکتے ہیں۔ اس کے پیدا کرنے میں تین عوامل زبردست ہوتے ہیں۔ ایک عامل
اس کا مذہب ہے، دوسرا عامل اس کا ماحول ہے جس میں کہ وہ معاشرہ رہتا ہے اور تیسرا عامل
اس کا تاریخ ہے۔ مذہب اور ماحول اور تاریخ اور مذہب کا لفظ میں یہاں ایک وسیع معنوں
میں استعمال کر رہا ہوں۔ یعنی اس کے اندر اپنے عقیدے، اپنی زندگی کی طرف اور کائنات کی
طرف ATTITUDE، جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں یہ سب کی سب باتیں اس کے اندر شامل
ہیں۔ اور مذہب جو ہے تو وہ ایک عمل انگیز کی طرح ایک CATALYST کی طرح سے معاشرہ
میں کام کرتا ہے اور ہماری زندگی کے بڑے سے بڑے LEVEL سے لگ کے، بڑی سے بڑی
سطح سے لگ کے چھوٹی سے چھوٹی سطح تک کام کرتا ہے۔ اور ایک CATALYST کی طرح
سے خود بدلے بغیر معاشرہ کو اور زندگی کے جو اجزا ہیں ان کو بدل دیتا ہے۔ CHANGE
کر دیتا ہے۔ مثلاً ایران کے اندر جو دین اسلام پھیلا تو اس کو دیکھو۔ ظاہر ہے کہ ایران کے اندر
پیغمبر بھی آ چکے تھے۔ بادشاہتیں بھی قائم ہو چکی تھیں اور کلچر کے اظہار کی جتنی صورتیں ہیں وہ سب
کی سب موجود تھیں۔ حالانکہ اس وقت وہ تہذیب اپنے زوال کے اوپر تھی۔ اس کے اندر ذرا جان
کم ہی تھی۔ اسلام نے یہ نہیں کیا کہ وہ ایک بالکل CLEAN STATE سے ایک صاف سطح
سے شروع ہوا ہو۔ لیکن اس کا اثر یہ ضرور ہوا کہ اس نے ان تمام باتوں کے اندر داخل ہو کے
ان کی صورت ان کی ہیئت جو تھی تو وہ بدل دی اور یہی عمل اسلام کا عرب سوسائٹی کے اندر ہوا۔
اتنا فرق ایک دین کے فروغ ہونے سے پہلے اور دین کے فروغ ہونے کے بعد نہیں ہوا کہ تا جب
کچھ خدوخال پچھلی زندگی کے آپ کو صاف نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب ان کی پوزیشن ان

کی قدر، ان کی اہمیت جو ہے تو وہ بدل جاتی ہے اور اس طریقے سے مذہب زندگی کے تمام درجات کے اوپر جتنے مظاہر ہیں ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔

مذہب کے بعد دوسرا عامل جو ہے تو وہ ماحول ہے اور ماحول میں بھی ایک تو ہے جغرافیائی ماحول کہ جب آدمی ایک جگہ رہتے سہتے ہیں تو آدمی جو سماجی جانور ہے اسے لین دین کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ بات کرنے کو بھی طبیعت چاہتی ہے اور ملنے جلنے سے محبتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور انسانوں کے درمیان خوشی اور غم کے طور طریقے بھی ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے جغرافیائی ماحول جو ہے تو وہ اثر کرتا ہے اور بہت کچھ باتیں یکسانیت کی اقتصادی عوامل سے یا پیداوار کا جو طریقہ ہوتا ہے اس سے بھی قائم ہو جاتی ہیں۔ اس سے بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سے بھی انسانوں کے آپس کے تعلقات اور باہمی رشتے بہت کچھ متعین ہوتے ہیں اور سیاست اور ریاست سے بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ اس طریقہ سے کہ یہ بہت ممکن ہے کہ دو معاشرے بہت دن ایک ایک ریاست کے اندر رہیں اور ان کے اندر ذرا زیادہ ہم آہنگی آجائے۔ یا ایک معاشرہ علیحدہ ہو کے دو علیحدہ علیحدہ خطوں میں بٹ جائے اور بہت دن تک علیحدہ رہنے کے بعد ان کی تہذیب اور ان کا کلچر ایک دوسرے سے مختلف صورت اختیار کرلے اور بہت ممکن ہے کہ جس طریقے سے آج کل مشرقی اور مغربی جرمنی کے اندر ہو رہا ہے۔ ایک بڑا زبردست جذبہ ایک بڑا زبردست عامل ان میں ایک ہونے کا ہے۔ اس لئے کہ ان میں ایک ہونے کی بہت سی باتیں موجود ہیں۔ مگر دوسری طرف سیاسی دباؤ بھی ہے۔ اب ان کے تصادم کے طور پر اگر وہ سیاسی دباؤ بہت زیادہ قوی ثابت ہوا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کا علیحدہ علیحدہ کلچر ڈیولپ ہو جائے تو یہ جغرافیائی ماحول یا معاشرتی اور معاشی ماحول اور سیاسی ماحول اس طور پر اثر انداز ہوا کرتا ہے۔

اب رہی تاریخ۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے کلچر کے تعین میں بہت کچھ ہاتھ ہماری تاریخ اور تاریخی شعور کا بھی ہوتا ہے۔ تاریخی حوادث معاشرے میں ایک خاص قسم کا کلچر پیدا کرتے ہیں ہمارے ہیرو، ہماری فتح، ہماری شکست یہ تمام کی تمام چیزیں بھی ہمیں ایک کرتی ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ فتح اتنا آدمی کو ایک نہیں کرتی جتنا کہ شکست ایک کر دیا کرتی ہے۔ (اس لئے جرمنی کو تو یہ

تجربہ ہٹلر کی شکست کے بعد ہی ہوا ؟ تو یہ تمام چیزیں جو ہیں یعنی تاریخی شعور کا ایک ہونا۔ جو تاریخی حوادث ہوتے ہیں ان کا ایک ہی ردعمل ہونا۔ ان کا ایک ہی جواب دینا۔ یہ چیزیں عام طور سے ایک معاشرہ کو ایک کر کے ایک خاص قسم کی زندگی ایک خاص قسم کا کلچر ان کے اندر پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن اس میں ہم ایک غلطی کرتے ہیں اور وہ غلطی یہ ہے کہ ہم ان مختلف عناصر میں سے کسی ایک عنصر کو لے کے، ان مختلف عوامل میں سے کسی ایک عامل کو لے کر اور تمام تر زور اس پر ڈال دیتے ہیں اور اسی کو تمام کلچر کا اور زندگی کا واحد سبب قرار دیتے ہیں اور زندگی کی تفسیر جو ہے تو وہ بھی اسی کے ذریعے کرتے ہیں۔ مثلاً آپ مذہب کو لے لیں اور یہ کہیں کہ جن کا مذہب ایک ہے ان کی تہذیب بھی ایک ہوگی، کلچر بھی ایک ہوگا تو یہ بات بھی غلط ہے اس لئے کہ جہاں تک کہ دین کا تعلق ہے، مذہب کا تعلق ہے۔ ایران والے بھی مسلمان ہیں اور عرب بھی مسلمان ہیں اور انڈونیشیا والے بھی مسلمان ہیں لیکن ہمارا کلچر اور انڈونیشیا والوں کا کلچر اور ایران کا کلچر اور عرب کا کلچر ایک نہیں ہے اور اگر کوئی اس بات کا دعویٰ کرے تو میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں کلچر کے معنی نہیں جانتا۔ میں یہ بات تو سمجھ سکتا ہوں کہ سب کا دین ایک ہی ہے۔ لیکن یہ بات کہ سب کا کلچر بھی ایک ہی ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

اسی طریقے سے ایک ساتھ رہنا بھی کوئی ایسا عامل نہیں ہے کہ جو تمام کی تمام زندگی کو اور زندگی کے مسائل کو اور زندگی کی کیفیات کو EXPLAIN کر سکے اور اس کی تشریح اور تفسیر کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ دو معاشرے ساتھ ساتھ رہیں اور ساتھ رہنے کے باوجود ان کا تاریخی تجربہ جو ہے وہ بالکل مختلف ہو۔ مثلاً اس جنوبی ایشیا کے اندر ہندو معاشرہ اور مسلمان معاشرہ ایک ساتھ رہے ایک جگہ رہے ایک ملک کے اندر رہے لیکن تاریخی واقعات سے ان کا ردعمل جو ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ مختلف ہو۔ اور ایک معاشرے کے ہیرو دوسرے معاشرے کے ولن بن جائیں۔ ایک معاشرے کے ولن دوسرے معاشرے کے ہیرو بن جائیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندو معاشرہ کا، جو پچھلا ہندو معاشرہ تھا تو اس کا آخری ہیرو رانا پرتاب تھا جس نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا، رانا سانگا وغیرہ کے بعد اور جدید ہندو معاشرہ کا پہلا ہیرو شیوا جی تھا جو اس وقت ابھرا کہ جب ہماری سلطنت، مغلوں کی مسلمانوں کی سلطنت، جو تھی وہ زوال پذیر تھی اور ٹوٹنے والی تھی۔ تو اس طریقے

سے ایک طرف یہ سلطنت جو تھی تو ٹوٹ رہی تھی اور اس میں کچھ شکست و ریخت ہو رہی تھی اور دوسری طرف نئی حکومت انگریزوں کی، سکھوں کی قائم ہو رہی تھی تو اس طرح ایک ہی جگہ رہتے ہوئے بھی تاریخی تجربہ جو ہے تو وہ مختلف ہو سکتا ہے اور محض جغرافیائی ماحول سے بھی کلچر کی وحدت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے اندر بھی کوئی ایسی بات نہیں جس سے تمام کی تمام باتیں اور زندگی کی تمام کیفیت جو ہے تو اس کی ترجمانی یا تفسیر ہو سکے۔ یا اس بات کو لے لو کہ پیداوار کے طریقے جو ہیں وہ ایک ہوں تو یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ قرون وسطیٰ کے اندر مسلم معاشرہ بھی تھا اور یورپ کا معاشرہ بھی تھا اور پیداوار کے طریقے جو تھے تو وہ دونوں جگہ ایک تھے۔ لیکن ایک جگہ سے دوسری جگہ جب آدمی جاتا تھا تو اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک دنیا سے دوسری دنیا کے اندر آ گئے ہوں یا مثلاً اب چین کے اندر اور روس کے اندر زمانہ حال کی تاریخ کو دیکھو تو چین کے اندر اور روس کے اندر قریب قریب ایک طرح کا پیداواری نظام جو ہے تو وہ رائج ہے۔ مگر وہ دونوں اپنے علیحدہ علیحدہ راستوں کے اوپر جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ کیا وجہ ہے اس کی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی وجہ ان کی مختلف تاریخ ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جدید روس جو ہے تو اس کے پیچھے ORTHODOX CHURCH کی پیدا کی ہوئی ذہنیت اب بھی کام کر رہی ہو اور جدید چین جو ہے تو اس کے پیچھے کنفیوشس کی ذہنیت کام کر رہی ہو۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ روس کے اندر چرچ کی بڑی مخالفت ہوئی اور چین میں کنفیوشس کی لیکن سزا بھیجنے کے باوجود اس سے ایک لگاؤ بھی ظاہر ہوتا ہے اس لئے کہ اتنی شدید نفرت تو پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے کہ جب کوئی نہ کوئی تعلق موجود ہوتا ہے۔ بہر حال یہ تو ایک ایسی بات ہے کہ جس کے متعلق رائے مختلف ہو سکتی ہے لہٰذا اس کی حیثیت ایک رائے سے زیادہ نہیں ہے تو اس طرح ایک کلچر کے اندر جو مختلف عوامل کام کرتے ہیں اور ان کا جو مجموعی اثر ہوتا ہے تو اس سے جو زندگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو ہم کلچر کہہ دیتے ہیں۔

اب جب ہم اپنی طرف رجوع کرتے ہیں تو ایک بات ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ اسلام جب جنوبی ایشیا کے اندر آیا تو جنوبی ایشیا کوئی وحشیوں کا ملک نہیں تھا۔ جنوبی

ایشیا کے اندر بڑے بڑے مفکر پیدا ہو چکے تھے۔ بڑی کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ بڑے مذاہب جو تھے تو وہ چل چکے تھے۔ بڑی سلطنتیں جو تھیں تو وہ قائم ہو چکی تھیں۔ یعنی کلچر کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا اس کے اظہار کی کوئی صورت ایسی نہیں تھی جو اس خطۂ زمین کے اوپر جنوبی ایشیا کے اندر پورے فروغ پر نہ پہونچ چکی ہو۔ اب ایک خیال دماغ کے اندر آتا ہے ـــ ہمارے کلچر کو SHAPE دینے اور ہمارے کلچر کی تشکیل کرنے کے سلسلہ میں ـــ اور وہ یہ کہ یہ پورا کا پورا خطۂ زمین، پورا کا پورا جنوبی ایشیا مسلمان نہیں ہوا، وجہ اس کی کچھ بھی سمجھ لو یہ سمجھ لو کہ وہ تائید جو ہے ایک حد تک جایا کرتی ہے یا یہ سمجھ لو کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک بڑی زبردست مزاحمت ہوئی، اپنے آپ کو بچانے کے لئے انہوں نے اپنے CASTE SYSTEM کو، اپنے ذات پات کے نظام کو اور زیادہ سخت (RIGID) بنالیا۔ تو ایک تو یہ بات ہوئی۔ دوسرے ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس جگہ سے کوئی مذہب نکلا وہاں تو وہ پھیلا نہیں یا وہاں وہ مقابلہ نہیں کر سکا اور وہ قلم جو تھی وہ کہیں اور دوسری سرزمین پر جا کر لگی اور وہاں وہ پھر پھیلنا شروع ہو گئی جیسا کہ بدھ مذہب کے ساتھ ہوا یا ایک مشرقی مذہب جو ہے اس نے مغرب میں جا کر اپنا نیا رُخ اختیار کر لیا جیسا کہ عیسائیت کے ساتھ ہوا۔

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ ہمارا تمام کا تمام برصغیر، ہمارا جنوبی ایشیا کا خطہ جو تھا تو وہ پورے کا پورا مسلمان نہیں ہوا۔ اگر یہ سارا کا سارا مسلمان ہو جاتا تو ہمارے کلچر کی نوعیت ذرا دوسری ہوتی اور ہم فخر کیا کرتے۔ یدھشٹر کے اوپر اور بھیم اور ارجن کے اوپر اور گیتا کے اوپر اور VEDAS کے اوپر اور کوئی اس بات کو نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ فخر کرنے کے قابل چیزیں نہیں ہیں اور ہمارے نام بھی بھیم علی ہوتے یا یدھشٹر حسین ہوتے۔ اس لئے کہ اگر یہ نام اب نامانوس نظر آتے ہیں تو رستم علی بھی کوئی ڈھنگ کا نام تو نہیں ہے۔ اس کے اندر بھی دو علیحدہ علیحدہ دائرے ملتے ہیں۔ لیکن ہوتا یہی۔ ہم اس ورثہ پر اگر یہ ہمارا ورثہ ہوتا تو ہم اس پر بڑا فخر کرتے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے ایرانی کرتے ہیں۔ اسی طریقے سے ہم بھی کرتے، لیکن کسی وجہ سے ایسی بات ہو گئی کہ ہم اس ورثہ کو اپنا نہیں سکے۔ وہ دوسروں کا رہا۔ غیروں کا رہا۔ ہمارا نہیں رہا۔ اس میں پھر یہ ہوا کہ اسلام جو اس خطہ کے اندر آیا، اس خطۂ زمین

پر آیا تو پہلے تو عرب آئے۔ اس کے بعد یہ دھارا جو تھا وہ اس طرف سے رک گیا۔ پھر اسلام آیا تو وہ ترک ایرانی کلچر کے بیک گراؤنڈ کے ساتھ۔ اس کے پس منظر کے ساتھ۔ ہمارے اس خطہ زمین کے اوپر جنوبی ایشیا کے اوپر آیا۔ اب بہت دن تک تو جو ہمارا حکمراں طبقہ تھا اس میں اور ان کے وطن وسط ایشیا میں کوئی فرق نہیں تھا (ایران والے بعد میں آنا شروع ہوئے) تو وہ کلچر جو تھا تو اس کو ترک ایرانی کلچر کہہ لو۔ لوگ برابر وہاں سے آتے رہے۔ شاعر بھی آتے رہے، مفکر بھی آتے رہے۔ ایڈمنسٹریٹر، اور حکومت کرنے والے بھی آتے رہے، تو ان سے وہ تعلق جو تھا وہ قائم رہا۔ لیکن کچھ دن کے بعد، کچھ نسلیں گزرنے کے بعد یہ تعلق جو تھا وہ ذرا کم ہوتا چلا گیا۔ وہ زیادہ دیسی ماحول کے عادی ہو گئے اور اسی ماحول میں رس بس گئے پھر ایسا ہوا کہ جو یہاں کے رہنے والے تھے وہ مسلمان ہوئے تو اب ادھر ان کا مذہب تھا اور اُدھر ہندوؤں کا ذات پات کا ایسا سخت نظام تھا کہ جو ایک دفعہ باہر چلا گیا پھر اس کو دوبارہ نہیں لیا جا سکتا، پھر اس سے کوئی تعلق نہیں اس طرح سے یہ دونوں کے دونوں یعنی باہر سے آئے ہوئے مسلمان یا ولایتی مسلمان سمجھ لو اس لئے کہ اس علاقہ کو ولایت ہی کہا جاتا تھا) اور دیسی مسلمان یہ آپس میں ذرا نزدیک تر آتے گئے۔ لیکن اس بات سے بھی ایک بات جو ہے، وہ ہمارے کلچر کے اہمیت کی ایک بات پیدا ہوئی اور وہ یہ ہوئی کہ ہمارے دماغ کے اندر اس جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے دماغ کے اندر جہاں تک کہ باہر کے مسلمان ملک تھے مڈل ایسٹ کے (ادھر انڈونیشیا، وغیرہ کے نہیں مڈل ایسٹ کے)، تو ان کی نسبت سے ایک مرعوبیت ضرور پیدا ہو گئی۔ ادب کے اندر، فلسفہ کے اندر اپنے یہاں کا کوئی کتنا ہی بڑا آدمی ہو تو کوئی بات نہیں مگر یہ بات کہ فتویٰ عرب سے آیا ہے یا ایران کے مجتہد نے یہ بات کہی ہے تو یہ مرعوبیت کی بات تھی اور اب یہ مرعوبیت جو ہے تو اس میں دیکھو کہ جو ہے وہ سید بن رہا ہے یا قریشی بن رہا ہے یا انصاری بن رہا ہے۔ ایک دفعہ ہم میرٹھ کالج کے اندر لیکچرار تھے تو وہاں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں فارسی اور اردو کا پرچہ تھا کہ جس کے اندر زیادہ تر مسلمان لڑکے ہوتے ہیں۔ تو وہاں ایک کالم جو تھا تو وہ نسل کا بھی تھا کہ نسل لکھو۔ اب ہم نے جو دیکھنا شروع کیا تو اس میں جتنے بھی مسلمان لڑکے تھے سب نے اپنے آپ کو سیمیٹک (SEMITIC) لکھا تھا۔ ہمارے ایک استاد بنگالی مکرجی تھے،

وہ کہنے لگے کہ کرار یہ سب ایران سے اور وسط ایشیا سے بھی نہیں آئے، سب کے سب سید سے
عرب سے چلے آرہے ہیں۔ تو اب ایک مرعوبیت یہ دیکھیں کہ حج کے موقع پر جو معلم آتے ہیں تو ہم تو
بالکل یہ سمجھتے ہیں کہ دیارِ محبوب سے آیا ہے تو سر آنکھوں کے اوپر بٹھاتے ہیں۔ وہ اللہ جانے ہمیں
بیوقوف سمجھتے ہیں۔ یا کیا سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک مرعوبیت جو ہے تو یہ ہمارے ذہن کے اندر موجود رہی
معلوم نہیں اگر ہم اپنے دماغ کو ٹٹولیں تو اب بھی کچھ آثار ملتے ہیں یا نہیں ملتے لیکن ہیں موجود اس کے
آثار اب بھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میرا اندازہ یہ ہے اب بھی ہمارے اندر رواداری جو ہے تو وہ بہت
کافی ہے یعنی مسلمانوں کے اندر جو SECTS ہیں سنّیوں کے اور شیعوں کے تو ان کے اندر آپس میں
بڑے اچھے تعلقات رہے۔ رقابت سے بھی رہے، فقرے چست کرنے کے بھی رہے۔ بیاہ
شادیوں کے بھی رہے اور سماج کے بھی رہے۔ یہ بات اور جگہ تو نہیں۔ دیکھو کہ ترکی کے اندر
اور ایران کے اندر کیا تماشہ ہوا۔ اور ترکی کے اندر شیعوں کے اوپر کیا گذری اور ایران میں
سنّیوں کے اوپر کیا گذری۔ بہت ممکن ہے کہ اگر یہ خارجی اثرات ہمارے اوپر نہ ہوتے تو ہم بھی
کوئی مذہب کے اظہار کی صورت EVOLVE کر لیتے اور پھر یہ ممکن ہے کہ شاید کچھ مذہب کی
صورت جو ہم EVOLVE کرتے، اگر آزادانہ ہوتی تو وہ کچھ ایسی ہوتی کہ جیسے خواجگان چشت
کے سلسلے کی خصوصیت ہے، یعنی اس میں کچھ فائن آرٹ بھی ہوتے۔ کچھ قوالیاں بھی ہوتیں۔
کچھ گانا بھی ہوتا کچھ اور باتیں بھی ہوتیں تو کچھ اس قسم کی ہمارے مذہب کی صورت ہوتی۔ یعنی
پیورٹن ازم کی تحریکیں جو باہر چل رہی ہیں وہ ہمارے مزاج کے مطابق نہیں ہیں اس لئے وہ یہاں
نہیں پنپتی۔ دوسرے ملکوں کے اندر تو سلطنتیں قائم کر لیتے ہیں۔ ہمارے ملک کے اندر
یہاں نہیں پنپتی۔ لیکن یہ ہیں باہر کے اثرات۔ تو ایک تو یہ بات آگئی۔ دوسری بات جو ہے ہمارے
دماغ کے اندر جہاں تک کہ ہندوؤں کا تعلق تھا۔ خاص طور پر ان علاقوں میں کہ جہاں مسلمانوں
کی زمینداریاں تھیں تو ایک برتری کا سا احساس تھا۔ ایک SNOBBISHNESS۔ ایک
حقارت اُن سے پیدا ہو گئی۔ اب یہ معاشرے جو کہ ساتھ رہے ہندوؤں کے یا مسلمانوں کے
تو ان میں آپس میں تعلقات بھی ہوئے، محبتیں بھی قائم ہوئیں اور ایک کھنچاؤ بھی رہا، ایک کشمکش
بھی رہی اور بہت کچھ اثر ان کا ہمارے اوپر پڑا اور بہت کچھ ہمارا اثر ان کے اوپر پڑا۔ پہلے پہل

نگاہ پڑتی ہے تو وہ اتنی بڑی ہستی پر پڑتی ہے۔ امیر خسرو کے اوپر۔ کہ جس کو دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے
یہ ترک بچہ دوسری نسل کے اندر ہندو کلچر کے کتنے نزدیک آگیا اور کس طریقہ سے اسے
ASSIMILAT کر رہا ہے۔ بغیر اپنی بات کو بدلے ہوئے کس طرح مختلف عناصر کو جذب
رہا ہے، لیکن جیسے ایک زندہ چیز ہوتی ہے کہ وہ اثرات کو جذب کرتی ہے اپنے اندر اور
بنا ہی ایک حصہ بنا لیتی ہے تو گانے کے اندر دیکھیں، موسیقی کے اندر دیکھیں۔ یہاں سے وہاں
۔ ایک روایت جو ہے قائم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ فن تعمیر کے اندر دیکھو۔ PAINTINGS
ے اندر دیکھو کہ ایک مغل پینٹنگ کا جو اسکول پیدا ہوا تو وہ اس طریقہ سے پیدا ہو رہا ہے
اس طریقے سے ہماری شاعری کے اندر بُت کافر کو جو معنی دیئے یعنی پیار کا لفظ بھی ہے
ور ایک کھنچاؤ کو بھی ظاہر کرتا ہے تو ہمارے تعلقات کچھ ایسے رہے ہیں۔ اس کے اندر
جیسا میں نے عرض کیا ایک کھنچاؤ کا ایک اختلاف کا ایک علیحدگی کا احساس بھی ہے
ور ایک دوسرے کو سمجھنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں اس طریقے سے۔ یہ میں خاص طور پہ
س وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے یہ بات دیکھی ہے، لیکن آج کل کی درانصاب کی کتابیں
تو دیکھو تو وہ یہ کہتی ہیں کہ ہندو مسلم ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ لیکن یہ ایک نیم
حقیقت ہے ۔۔۔ بہر حال اب جب کہ کلچر دو حصوں میں تقسیم ہو کر اپنی تقدیر کو پورا کر رہا
ہے، باوجود ایک HERITAGE ہونے کے تو اب ہمیں اپنے تشخص کی تلاش ہوئی کہ کچھ
کچھ نہ کچھ تو بات معلوم ہونی چاہیئے۔ اب اپنے جغرافیائی ماحول کا عرفان حاصل کرنے کی
کوششیں شروع ہوئیں تو اس کے اندر مثلاً اس قسم کی کوشش ہوئی کہ جب بنگال بھی تھا
ہمارے پاس مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان بھی تھا تو اس وقت یہ ہوا کہ یہاں پر ایک
ہاسٹ لائن تھی۔ ایک قلب کی زمین تھی۔ جو تھے وہ . . . . . .

اب مشرقی پاکستان ایک پلین جو تھا وہ بھی غائب ہو گیا تو اب اس قسم کی کوشش کر لیجیے
نہ ایک دریائے آموں کی تہذیب ہے اور دوسری دریائے گنگا کی تہذیب ہے اس کے بیچ
میں دریائے انڈس کی تہذیب آگئی۔ بہر حال ہم ان باتوں کو نہ اچھا کہتے ہیں نہ برا کہتے ہیں۔ دلچسپ
ضرور ہیں یہ باتیں اور پھر اب چونکہ ہمارے رقیب نہیں رہے پرانے ماضی کے اندر حصہ بٹانے کے

لئے تو ہم لوگ کہ جنھوں نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اجنتا کے CAVE جو ہیں تو وہ ہماری HERITAGE ہے۔ اور بدھشتر اور بھیم اور وید اور گیتا یہ سب کا سب ہمارا HERITAGE ہے۔ اب ہم نے یہ کرنا شروع کیا کہ اپنا ہیریٹیج بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ موہنجوڈارو ہمارا HERITAGE ہے اور گندھارا کا کلچر جو ہے وہ ہمارا HERITAGE ہے۔ تو میں اس کے متعلق ایک بات عرض کروں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ ہمارا HERITAGE ہے یا نہیں ہے۔ رہی اس کے دریافت کرنے کی کوششیں تو وہ بہت مستحسن ہیں۔ اس سے اپنے اوپر بھی نظر پڑتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سرزمین میں جس میں ہم رہ رہے ہیں اس کے اندر بڑی بڑی تہذیبیں پنپ چکی ہیں۔ لیکن وہ تاریخی تسلسل کہ جو کلچرل روایت کو قائم کرتا ہے تو وہ ان تہذیبوں سے قائم کرنا ذرا مشکل ہی ہے کہ جن کو ہم کھود کھود کے دریافت کرتے ہیں۔

دوسری طرف وہ حضرات ہیں جو یہاں آئے دلی اور لکھنؤ کی طرف سے۔ وہ اپنے بچوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو تمہاری زبان نہ بگڑ جائے تمہارا لہجہ نہ بدل جائے۔ تو جس طرح وہ دلی اور لکھنؤ کے روزمرہ اور محاورے کو تکلف اور تکلیف سے قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح جو تہذیبیں کھود کھود کر نکالی جاتی ہیں اور انھیں تکلف اور تکلیف سے قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ بھی میوزیم کی چیزیں تو ہو سکتی ہیں، زندہ کلچر کا حصہ نہیں ہو سکتیں۔

• تو اب یہاں کے کلچر کو لو۔ اس کی ایک عمودی جہت ہے اور ایک افقی جہت اب عمودی جہت کے اندر تو مختلف طبقات کے کلچر آتے ہیں۔ اب یہ کہ MASS CULTURE کوئی ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا ان معنوں میں کہ سب کا کلچر ایک ہو۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی طبقہ کا ایک کلچر ہو۔ بلکہ سب کا کلچر ایک ہو تو میں بس اتنی بات کہتا ہوں کہ ہمارا معاشرہ ایک طبقاتی معاشرہ ہے۔ یہ کوئی اچھی بات ہے یا بری بات ہے یہ ایک الگ بحث ہے۔ اور طبقات جو ہیں وہ کچھ تو زندگی کی تقسیم کار کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں اور کچھ اقتدار کی مرکزیت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد بدل بھی سکتی ہے۔ لیکن اگر ایک غیر طبقاتی سوسائٹی کوئی بن جائے، تب ٹھیک تو ہے۔ لیکن ابھی جو کچھ بھی ہمارے سامنے ہے وہ تو بس کچھ تجربات

ہیں اور اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم کوئی بات کہہ سکیں۔ مستقبل میں کیا ہوگا ہم ابھی اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔ لیکن ایک خیال یہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر عوامی کلچر اور MASS CULTURE کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب ایک درجہ پر ہو جائیں، ایک UNIFORMITY ہو جائے تو یہ کچھ کلچر کے لئے زیادہ صحت مند بات نہیں ہوگی۔

ہم اس بات کو نوٹ کرتے ہیں کہ ہماری سوسائٹی طبقاتی سوسائٹی ہے اور کلچر کا خالق جو ہے وہ کس سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ کلچر کے خالق سے میری مراد کوئی شاعر، کوئی ادیب، کوئی فلسفی، کوئی سائنٹسٹ، کوئی گیت گانے والا، کوئی رقص کا ماہر، موسیقی کا ماہر۔ زندگی کے مختلف شعبوں کو پیدا کرنے والے ان کو آگے بڑھانے والے، تو ان سے میری مراد ہے۔ اچھا، کلچر کے بارے میں ایک بات ہمیں یہ بھی دیکھنی ہے کہ کلچر کے خالق کا سوسائٹی میں کیا مقام ہے اور اس کے کلچرل پروڈکٹس اور اس کی تخلیقات کا اثر و نفوذ کس حد تک اور کس طرح سے اور کن لوگوں کے اندر ہو رہا ہے . . . . کیوں کہ کلچر جو ہے وہ اجتماعی زندگی کی نشانی ہوتا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ مثلاً قدیم یونان کے کلچر کی ایک یہی بات نہیں تھی کہ اس میں سقراط پیدا ہو گیا بلکہ کلچر کی بات یہ بھی ہے کہ ان مباحث کو لوگ کتنی توجہ اور شوق سے مارکٹ پلیس کے اندر کھڑے ہوئے سن رہے ہوں جیسے ہمارے یہاں کوئی مداری کا تماشہ دیکھتا ہے۔ تو یہ بھی ایک بڑی بات ہے — یہ بھی ایک بڑی بات ہے کہ ڈرامہ جو ہے تو وہ اسٹیج ہو رہا ہے، اونچے درجہ کی ٹریجیڈیز اور کامیڈیز ہو رہی ہیں اور لوگ اس بات کا فیصلہ کر رہے ہیں اور ان کا فیصلہ غلط نہیں ہو رہا ہے کہ ان میں سے بہترین کون ہے اور کس کے سر پر لارل (LAUREL) کا تاج رکھا جائے۔ چیز وہی رہتی ہے لیکن اس کی CONTEXT بدلنے سے اس کی کلچرل اہمیت جو ہے تو وہ بدل جاتی ہے اب مثلاً قوالی ہوتی ہے۔ قوالی کا ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔ خاص فضا ہوتی ہے اب اس بات کو تم سوچو اور تصور کر کے دیکھو کہ جیسے حضرت نظام الدین کے سامنے امیر خسرو بیٹھے ہوئے کوئی غزل جو ہے تو وہ گا رہے ہیں۔ ایک اس بات کو سوچو کہ کوئی شادی بیاہ کا موقع ہے تو تم نے سوچا کہ بھئی گانا نہیں کرتے کچھ اعتراض کریں گے چلو قوالوں کو بلا لیتے ہیں۔ یا سینما میں یا ریڈیو اور ٹی وی پر گانے ہوتے

ہیں تو ممکن ہے کہ چیز وہی گائی جا رہی ہو جو امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد نظام الدین اولیا کو سنائی ہو۔ لیکن اس کی کلچرل اہمیت تو بہت مختلف ہو گئی اور بہت بدل گئی۔ یا مثلاً مولانا جلال الدین رومی کے مرید جو ہیں تو وہ اپنے وجد کے اندر آ کے رقص کرتے ہیں اور اب یہ صورت ہو جائے کہ کوئی باہر کا سیاح، انگریز یا امریکن جو ہے تو وہ آئے اور کچھ روپے دے اور وہ اسے DANCING DERVESH کی طرح رقص دکھانا شروع کر دیں۔ تو اس کے اندر تو بہت بڑا کلچرل فرق پیدا ہو گیا۔ یا مثلاً پنے لوک رقص ہیں۔ تو وہ ان لوگوں کی زندگی میں جو اپج پیدا ہوتی ہے۔ ان کے غم اور خوشی کے موقعے اور شادی بیاہ کے موقع پر جو زندگی کا اظہار ہوتا ہے' وہی رقص کی صورت میں ڈھل جاتا ہے میں یہ بات نہیں کہتا کہ ان چیزوں کو اسکرین پر مت دکھاؤ۔ یہ بہت اچھی بات ہے بھولتے جاتے ہیں لوگ ــ مگر یہ بات کہ ان کی کلچرل اہمیت جو ہے تو وہ بالکل مختلف ہو جاتی ہے ــــ اب جو یہ کلاسیک ہے تو اس میں مختلف قسم کا ادب اور سائنس پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا کلام فدا ادق اور مشکل ہوتا ہے جس کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ جیسے غالب یا ملٹن یا سائنس دان مثلاً آئن اسٹائن، جس کے نظریۂ اضافت کو کہتے ہیں کہ سمجھنے والے بہت ہی کم لوگ ہوئے ہیں تو اگر کلچر کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سب کے سب PARTICIPATE کر سکیں ایک ہی سطح کے اوپر ــــ تو میں پھر عرض کروں کہ کلچر کے اندر PARTICIPATE، شریک تو سب کو ہونا ہے۔ لیکن ایک ہی سطح کے اوپر اور کلچر کے ہر شعبہ میں اگر سب کو شریک کرنا ہے تو غالب اور ملٹن اور آئن اسٹائن تو سب کے سب رد ہو گئے اور وہ کلچر یقیناً بہت POOR ہو گا، بہت مفلس اور قلاش ہو گا کہ جس کے اندر یہ لوگ جو ہیں تو ختم ہو جائیں۔ ان کا اثر اپنی کلاس کے اوپر پڑتا ہے اپنے جو ہم پیشہ لوگ ہیں' اپنے میدان کے جو لوگ ہیں ان پر پڑتا ہے۔ ان کا اثر اور زیادہ پھیلتا ہے یہاں تک کہ اکثر وہ لوگ معاشرہ کے اندر ایک بڑی زبردست اور اہم تبدیلی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ جن کی ORIGINAL THINKING، صحیح فکر کو زیادہ لوگ نہیں سمجھتے۔ اب کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا کلام مختلف درجات پر مختلف لوگ سمجھتے ہیں مثلاً شیکسپیئر کو دیکھیں ــــ وہ ایک متوسط طبقے کا آدمی تھا اور سرپرستی اس کو مل رہی ہے طبقۂ امراء سے

اور دربار سے اور اس کا ڈرامہ جو اسٹیج ہو رہا ہے تو اس کے اندر لندن کے بڑے سے بڑے آدمی، نوبلز اور امرا جو ہیں تو وہ بھی ہیں اور لندن کے جو کرخندار ہیں تو وہ بھی۔ اس طریقہ سے اپنی اپنی سطح پر اس کے اندر شریک ہو رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فیض حاصل کر رہے ہیں۔ اور اب ہمارے جو وارث شاہ تھے، رحمن بابا تھے، شاہ لطیف تھے۔ تو یہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں تھے۔ یا کوئی جاہل آدمی تو نہیں تھے کہ یہ سب باتیں یونہی شروع کر دیں۔ یہ اپنے زمانے کا جو نالندہ، دین اور علوم تھے ان کے ماہر تھے۔ ان کی آتما کتنی بڑی تھی اور ان کے دماغ کتنے بڑے تھے۔ اس کا اندازہ کرنا ہو تو ان کا کلام دیکھو۔ صحیح معنوں میں یہ اتنے بڑے مہا آتما تھے کہ ان کے ڈانڈے سماج کے تمام طبقوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور ان کا کلام جو ہے تو وہ ایسا ہو گیا کہ ہر آدمی اپنی سطح پر ان سے متاثر ہوتا ہے۔ کوئی قصے کے طور پر پڑھ رہا ہے اور گا رہا ہے کوئی شادی اور غمی کے موقع پر زندگی کی مختلف SITUATIONS پر ان سے، کچھ لائن ان کی یاد آتی ہیں اور انھیں دہراتا ہے۔ کوئی بیٹھا ہوا سوچ رہا ہے اور ان کے ایلیگوریکل (ALLEGORICAL) معنوں پر غور کر رہا ہے اور کہیں پہونچ رہا ہے اور اسی طریقہ سے لوک رقص اور گیت ہیں، لوک کہانیاں ہیں جو آگے چل کر اساطیر بن جاتے ہیں کہ ان کے اندر وہ احساسات کہ جو منطقی زبان کے اندر ظاہر نہیں کئے جاتے وہ ان کہانیوں کے ذریعہ ظاہر کئے جاتے ہیں تو ان سب کا بیج بونے والا (اور یہ وہ زمانہ تھا کہ آرٹسٹ جس کے اندر گمنام رہتا تھا)۔ تو یہ بیج بونے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتا تھا۔ وہ جو پورے کے پورے معاشرے کے غم، خوشیوں، اس کے معتقدات کا اس کی امیدوں کا اس کے خوف کا نباض ہو اور اس کی تقدیر جو ہے تو اس کے اندر شریک ہو سکے اور اس کے اندر گہرا اتر سکے تو وہ آدمی معمولی نہیں ہوا کرتا۔ پھر جو اپنی زندگی اور ان کے اندر ADDITION کرتا ہے، اس کی ترجمانی کرتا ہے مختلف طریقے سے تو وہ بھی بڑا سمجھدار اور نظر رکھنے والا آدمی ہوتا ہے۔ مگر خرابی کی بات اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب کوئی طبقہ ذات پات میں بند ہو جائے، ایک CASTE بنا جائے اور کوئی تعلق ان کا آپس میں نہ رہے۔ اعلیٰ ادب چاہے وہ کتنا ہی اعلیٰ ادب کیوں نہ ہو لیکن اگر ان کی تشخیص کرنے کے لئے اعلیٰ ادب، اعلیٰ کلچر اعلیٰ فن کو ایک طرف رکھ دیں اور عوامی

ادب اور عوامی فن اور کلچر کو الگ کر لیں۔ اگر ان کے اندر بہت زیادہ بعد پیدا ہو جائے تو یہ ان دونوں کے لیے بلکہ تمام کلچر کے لئے نقصان کا باعث ہوگا۔ اعلیٰ ادب وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو اس کی جڑیں تو عام زندگی کے اندر بڑی گہری اتری ہوئی ہوتی ہیں۔ اب اگر کوئی ادب بالکل اپنی ہی روایت کے اندر بند ہو جائے اور اپنی ہی روایت کے اندر محصور ہو جائے اور زندگی کے مقابلہ میں اس کے چاروں طرف اپنی روایت کا ایک حصار کھنچ جائے تو اس ادب میں جان نہیں رہتی۔

اور کوئی وجہ نہیں کہ عام لوگ میرؔ کے کلام کو نہ سمجھیں۔ اور یوں تو جہاں تک نہ سمجھنے کا تعلق ہے تو کتنے پڑھے لکھے لوگ ہیں جو واقعی میر محمد تقی میرؔ کو سمجھتے ہیں۔ مگر سمجھنے سمجھنے کا بھی ایک درجہ ہوتا ہے۔ آخر کچھ نہ کچھ شدبد تو ہو ہی جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ غالبؔ کے کلام کو نہ سمجھیں مگر اتنا احترام تو دل کے اندر ہو جاتا ہے کہ بھئی یہ شعر ہے اور شعر اگر غالبؔ کا ہے تو بہت اچھا ہے۔ تو اتنا احترام جو ہے تو یہ بھی ایک بات ہے ——

یہ بات ٹھیک ہے کہ لوک گیت اور لوک کلچر اب ہم پیدا نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ حالات اور وہ ماحول جو تھا وہ اب باقی نہیں رہا۔ ہاں البتہ اتنی بات ہو سکتی ہے کہ جب ہم دریافت کرتے ہیں تو اس سے ہمارے ادب کی جو موجودہ روایت ہے اس پر ایک اثر پڑے۔ جس طرح سے کہ انگلستان کے اندر رومانٹک موومنٹ کے چلنے کی ایک محرک یہ بھی تھا کہ وہاں BALLADS جو تھے MEDIEVAL AGES کے وہ جمع کر لئے گئے تھے۔ لیکن یہ بات کہ وہ BALLADS جو تھے وہ پیدا ہو جائیں اس زمانے میں تو وہ بات نہیں ہو سکتی۔ تو یہ تمام کے تمام طبقات جو ہیں تو ان کے اندر جتنی ہم آہنگی ہوتی ہے اور ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ جتنا تنوع ہوتا ہے تو اتنا ہی زیادہ وہ کلچر RICH ہوتا ہے اور کلچر کے خالق جو ہوتے ہیں تو اُن کے اندر بھی ایک بات ہوتی ہے —— اگر اُن کے اندر سماجی رشتے ہوں —— آپس میں تعلقات ہوں تو کلچر کے لئے یہ بھی ایک صحت مند علامت ہوتی ہے —— اس لئے کہ جب مہارت کا اور اسپیشلزائیشن (SPECIALISATION) کا دائرہ بہت تنگ ہوتا چلا جاتا ہے تو ویسے یہ کتنی ہی اچھی بات ہو لیکن کلچر کے لئے یقیناً کوئی اچھی بات نہیں —— تو مختلف طبقات کے کلچر کی ایک VERTICAL

جہت جو ہے تو وہ یہ ہوئی۔ اب اس کی افقی جہت ہے جس میں کہ علاقائی کلچر آ جاتے ہیں اور قومی کلچر کا سوال آجاتا ہے۔ تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ جس طرح سے کہ کچھ محرکات ایسے تھے۔ جن کی وجہ سے کلچر کا شدید احساس پیدا ہو گیا تو اسی طریقے سے کچھ محرکات ایسے بھی تھے کہ جن کی وجہ سے کلچر آ علاقائی کلچر کا احساس جو ہے تو وہ زیادہ شدید ہو گیا۔

اب علاقائی کلچر کی وکالت کے اندر ایک سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ بھئی ہر زندہ چیز زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہے اور اگر اس کی زندگی کو کسی طرح کا چیلنج ہے یا یہ خوف ہے کہ وہ کسی دوسرے وجود کے اندر مدغم ہو جائے گی تو اور بھی زیادہ یہ کوشش جو ہے تو وہ زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ یہ زمانہ خود ارادیت کا SELF DETERMINATION کا ہے۔ ایک آگاہی پیدا ہوتی ہے۔ ایک خودی پیدا ہوتی ہے۔ تو اب یہ بات جو ہے تو وہ ان علاقوں کے اندر بھی پیدا ہو گئی اور زیادہ جاگ گئی ہے — جس طرح سے کہ تمہارے اندر — کہتے ہیں کہ پہلے تو یہ باتیں نہیں ہوتی تھیں پہلے تو یہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ تو ایک بات تو یہ ہے کہ پہلے تمہارے اندر بھی تو یہ باتیں نہیں تھیں — تمہارے اندر بھی یہ قومیت کا احساس اتنا زیادہ موجود نہیں تھا۔ اس طریقے سے اب وہ بات جو پیدا ہوئی ہے وہ آگہی، وہ علاقوں تک میں پیدا ہو گئی ہے۔ تو اب ایسا ہے کہ ہمارے جو سماجی مسائل تھے، معاشرتی مسائل تھے اور معاشی اور سیاسی مسائل تھے ان کے متعلق غلط حل کرنے کی وجہ سے یہ باتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ کچھ لحاظ سے اگر کوئی ترقی یافتہ معاشرہ پاس رہتا ہے اُن کے جو کچھ لحاظ سے پست ہوں یا پسماندہ ہوں تو اس سے بھی بہت سارے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ (تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے) اور شعوری اور غیر شعوری طور پر بہت کچھ استحصال کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر جس وقت کہ ان کے اندر تھوڑی بہت تعلیم اور آگہی بھی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر مفاد کا ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بات ہو جاتی ہے کہ وہ جب آپس میں ملتے ہیں تو اس اجتماعی زندگی کی جو اعلیٰ صورتیں ہیں مثلاً ادیب یا مفکر نیک لوگ یا درویش تو اُن سے تو ملاقات ہوتی نہیں۔ یہ اپنے مفاد کا بندہ دوسرے مفاد کے بندے سے

ٹکراتا ہے تو اس کے اندر سب سے بڑا پہلو جو ہے اجتماعی زندگی کا تو وہ اُن کے سامنے آتا ہے، اس سے واسطہ ہوتا ہے تو اس سے ذہنی تعصبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو یہ تو ایک فطری بات تھی اور کچھ محرکات اس علاقائی کلچر کے اتنے معصوم نہیں ہیں جتنے کہ میں نے آپ سے عرض کئے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جو کہ اقتدار کے اوپر قابض ہوں وہ یہ بات جب دیکھیں کہ اقتدار اُن کے ہاتھوں سے نکل رہا ہے تو وہ اپنے بندوں کو اور جو ان کے نیچے رہے ہوں تو ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اس کلچر کا راگ وہ بھی شروع کر سکتے ہیں ـــ تو یہ اتنا معصوم محرک نہیں ہے۔ یہ بھی ایک سیاسی محرک ہے ـــ

اب کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ علاقائی کلچر کی جو زبان ہے تو اُسے کیوں نہ ترقی دی جائے اور کیوں نہ اس کے اندر ادب پیدا کیا جائے اور یہ بات حکومت سے زیادہ تر تو خود اُن لوگوں پر منحصر ہے۔ اس لئے کہ ادب جو بڑھتا اور پھیلتا ہے تو وہ اتنا کسی سرپرستی اور PATRONAGE سے نہیں بڑھتا اور پھیلتا جتنا کہ خود اُس قوم کے اندر سے وہ نکلتا ہے اور جہاں تک کہ ایک قومی کلچر کا سوال ہے کہ ہمارا قومی کلچر کیا ہے؟ ہے یا نہیں ہے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم ایک قوم ہیں یا نہیں ہیں۔ اس قومی کلچر کے اندر وہ عناصر جو میں نے پہلے بیان کئے تو ان کے اندر سے آپ مثلاً دو باتوں کو لے لیں۔ ایک مذہب کو لے لیں اور ایک زبان کو لے لیں ـــ اگر پہلے آپ دیکھیں اپنے اس معاشرے کو جو مسلمانوں کا معاشرہ تھا۔ تو اس کے اندر کیفیت یہ تھی کہ مسلمان اُس زمانے میں بھی مختلف علاقوں میں رہ رہے تھے ـــ ان علاقوں کے اندر رہنے والوں میں کچھ رابطے اور اتحاد کی باتیں بھی تھیں اور وہ رابطے اور اتحاد کی باتیں ایک تو ان کا دین تھا پھر علما اور درویش ہر جگہ پہونچے ہوئے تھے۔ ہم اُدھر سوات اور کاغان کی طرف گئے تو وہاں بھی دیوبند کے پڑھے ہوئے کچھ لوگ جو وہیں کے رہنے والے تھے وہ موجود تھے اور بالکل اُسی قسم کا مدرسہ جو تھا جیسا کہ ہم نے یوپی کے اندر دیکھا وہ موجود تھا تو عالم اور درویش ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے ـــ پھر مذہب میں اعلیٰ سطح کی کتابیں جو تھیں تو وہ عربی کے اندر تھیں مثلاً فلسفہ کی

یا ایسے ہی دوسرے مضامین کی جن میں خطاب جو تھا تو وہ دوسرے عالموں سے ہوتا تھا اور مسئلے مسائل کی کتابیں علاقائی زبانوں کے اندر تھیں۔ جو ادبی اور کلچرل بات تھی تو اس کا پس منظر جو تھا وہ فارسی کے اندر تھا، چنانچہ آپ اس جنوبی ایشیا کے اندر کسی بھی علاقے میں پہونچ جائیں، مدراس کے اندر دیکھیں، بنگال میں دیکھیں بلوچستان کے اندر کشمیر میں سرحد میں جاکر دیکھیں تو کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی کہ جہاں اُس زمانہ کے فارسی میں شعر لکھنے والے آپ کو نہ مل جائیں۔ وہ ایک پس منظر تھا ایک BACK GROUND تھا، جو علاقائی زبانوں کے پیچھے کام کرتا تھا۔ پھر باہم مربوط کرنے والی ایک چیز جو تھی وہ دربار کے اثرات بھی تھے۔ دیکھو۔ وہ دربار جو تھا وہ محض ایک سیاسی مشینری ہی نہیں تھا، وہ محض حکومت کی مشینری نہیں تھی، وہ کلچر کا بھی ایک بہت بڑا مرکز تھا اور اس سے کلچر کے جو اثرات تھے وہ پرکلیٹ کرتے تھے، پھیلتے تھے بلکہ ہم اپنے اُس معاشرے کی تعریف اس طریقے سے کرسکتے ہیں کہ اس کے اندر دو قطب تھے ایک دربار اور دوسری خانقاہ۔ ایک طرف درویش اور ایک طرف بادشاہ۔ اور ان قطبین کے ٹینشن (TENSION) سے ہمارا کلچر جو تھا وہ پیدا ہوتا تھا اور دونوں کا مقابلہ برابر کا تھا یہ نہیں تھا کہ اس میں ایک کی پستی اور دوسرے کی بلندی کا سوال ہو۔ تو یہ دربار کے جو اثرات تھے تو وہ تمام معاشرہ پر اثر انداز ہوتے تھے۔ آپ دیکھیں کہ صوبوں کے اندر جو حکومتیں قائم کی جاتی تھیں یا رجواڑوں کے اندر جو حکومتیں تھیں تو اُن میں بھی REPLICA جو تھی نقل جو تھی وہ وہی مغل کورٹ کی تھی کہ جس کے اندر آداب اور اخلاق کا اثر پڑتا تو اس طریقے سے فارسی کے کلاسیکی زبان ہونے کی وجہ سے۔ دین کی وجہ سے، علماء کی اور درویشوں کی وجہ سے، دربار کے اثرات کی وجہ سے، اکثر باتوں کے اندر آدمی اپنے پڑوسی سے جو ہندو تھا اتنا نزدیک نہیں تھا۔ جتنا دوسرے علاقوں کے رہنے والے مسلمان سے تھا۔ اس لئے ایک NEGATIVE باتوں کو جمع کرنے والا یہ ہندوؤں سے اختلاف بھی تھا تو اب یہ مذہب کہ جو ہمارا ایک بانڈ رہ چکا ہے اتحاد کا اور ہونا چاہیئے اس کو ایک بانڈ تو ہم اس کے متعلق کیا عرض کریں سوائے اس کے کہ اس مفروضے کے اوپر کہ سیاست اور مذہب ایک چیز ہیں اسلام میں، مسلمانوں کی تاریخ میں مذہب کو اکثر سیاسی عقیدے کے طرز پر استعمال کیا گیا۔

اس کے متعلق بہت محتاط طریقہ سے میں ایک بات عرض کروں کہ وہ شعور کی سطح کہ جس کے اوپر مذہب عمل کرتا ہے اور وہ شعور کی سطح کہ جس کے اوپر سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل طے کئے جاتے ہیں وہ ایک ہی سطح نہیں ہے۔ بلکہ مذہب کے شعور کی سطح جو ہے وہ بلند تر ہے۔ مذہب کا شعور نظر کو بدلتا ہے۔ نظر کے اندر ایک وسعت پیدا کرتا ہے اور جس وقت کہ وہ نظر پیدا ہو جاتی ہے تو پھر دوسرے لوگوں پر بھی اس کا اثر چلتا ہے۔ پھر آپ کے جو سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل ہیں تو ان کو حل کرنے میں بھی زیادہ آسان ہو جاتی ہے اس نظر کی وجہ سے۔ اب مثلاً وہ صورت جو پیدا ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یعنی خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ یا یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ غیر قومیں جو مسلمان ہو رہی ہیں تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ تو بھی وہ لوگ ایک مذہبی شعور رکھتے تھے اور تمام باتیں رکھتے تھے تو انہوں نے فتوے وغیرہ کوئی تلاش نہیں کئے۔ انھوں نے بہترین حل جو سمجھتے تھے اس بات کا تو وہ کر لیا۔ لیکن یہ سیاسی اور معاشی BASICALLY رہیں گے سیکولر (SECULAR) تو ان کے اندر مذہب جو ہے تو وہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ بلکہ جس وقت شعور کے اندر اس طرح سے اثر انداز ہو جاتا ہے۔ تو پھر زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا اثر پڑتا ہے اور صرف انفرادی ہی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی بھی پڑتا ہے۔ وہ آگے بڑھتا بھی ہے اس طریقے سے اور مذہب کو سیاست کے درجہ پر لانا تو یہ مذہب کو اپنے منصب سے گرانا ہوتا ہے اور جس وقت کہ مذہب کو سیاست کے درجہ پر لے آئے تو ایک بات دماغ میں ویسے ہی پیدا ہو جاتی ہے کہ دین اسلام برابر ہے یا مذہب اسلام برابر ہے اسلام کا مذہبی نظام۔ اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا اقتصادی نظام، اسلام کا اخلاقی نظام، اسلام کا سماجی نظام۔ اچھا ان تمام چیزوں کو جمع کر لو۔ تو وہ دین اسلام بن گیا۔ تو اب خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بھئی نظام کو ہی قائم کر دو یہ کیا آفت ہے کہ اس کے اندر نماز کو ایک مرکزی حیثیت دے رکھی ہے۔ اس کی آخر کیا ضرورت ہے یہ تو بالکل ایک APPENDIX بن گئی۔ اور دین اسلام کا اپیروچ یہ ہے کہ اس کی ایک مرکزی حیثیت ہے اور وہ اس طریقے سے ہے جیسے کہ بیج کے اندر سے درخت پیدا ہوتا ہے اور اس میں برگ و بار پیدا ہوتے ہیں اور روح جو ہے تو وہ اس میں سرایت کر گئی ہو اور تم کچھ اعضا کو لو اور ان

جوڑکر یہ سمجھو کہ تم نے ایک آدمی بنالیا۔ زندہ آدمی بنالیا تو اس کے اندر تو بڑا فرق پڑجاتا ہے تو جس وقت دین کو، دینِ اسلام کو اس سطح کے اوپر لے آتے ہیں اور سیاست کی سطح کے اوپر لے آتے ہیں تو اس میں بھی بڑا فرق پڑجاتا ہے۔ سیاسی سطح پر لانے سے مذہب کی حقیقت بدل جاتی ہے۔ اب اس کی جگہ نظریہ آجاتا ہے۔ عقیدہ نعرہ بن جاتا ہے۔ اور نعرہ عقیدہ کی جگہ لے لیتا ہے تو اب مذہب ہمارے اندر اختلاف پیدا کرتا ہے یا اتحاد، یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔

اچھا اب ایک بات یہ دیکھو کہ جنوبی ایشیا میں اُردو کا فروغ بھی بہت بڑی علامتی حیثیت رکھتا ہے اور ہم اس بات پر فخر نہیں کرتے کہ ہماری زبان ایک ہزار سال یا پانچ ہزار سال پرانی ہے، نہیں۔ ہم تو سب سے نئے پیغمبر کے ماننے والے اور سب سے نئی زبان کے بولنے والے ہیں تو اُردو زبان کا فروغ جو ہے تو وہ ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے یہاں کے مسلمانوں کی خودی بیدار ہوتی ہے۔ اس زبان کی ایک بہت بڑی معنویت یہ ہے کہ اس کے بڑھنے اور پھیلنے کے ساتھ ساتھ مسلمان معاشرے کے افراد بجائے باہر دیکھنے کے اپنے اندر دیکھنے لگے۔ فارسی کے اثرات تو کچھ نہ کچھ بے شک رہے مگر اب ان کی بھی اپنی ایک زبان ہوگئی اور یہ زبان ایک بڑے زبردست LIBERATING INFLUENCE کو اپنے ساتھ لے کر آئی۔ اس سے پہلے ہمارے بڑے بڑے GENIUS جو تھے تو وہ فارسی میں لکھتے تھے مگر وہ رہتے دوسری ہی صف میں تھے سوائے خسرو کے اور سند بھی ہمیشہ باہر ہی سے آتی تھی۔ لیکن جب یہ LIBERATING INFLUENCE آیا تو میر جیسے سودا جیسے اور غالب جیسے شاعر پیدا ہوئے، جو صفِ اول کے شاعر تھے۔ غالب کو اپنی فارسی پر بڑا ناز تھا مگر اس کا اُردو کلام بلند تر ہے اس کی فارسی سے جس میں عرفی، کلیم اور نظیری کی ECHOES آتی ہیں تو اب ہمارے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اُردو کا فروغ کس طرح سے ہماری بیداری کی اور ہماری خودی کی بیداری کی علامت بنا۔

لیکن اس میں بھی ایک بات یہ ہے کہ جب تک اُردو کو ہم نے اس کے اپنے حال پر چھوڑے رکھا، اسے فطری نشوونما کا موقع دیا، اس وقت تک یہ برابر ابھرتی چلی گئی۔ پھیلتی چلی

گئی اور ہر خطہ اور ہر علاقہ اسے اپنے آپ سے منسوب کرنا فخر کی بات سمجھنے لگا۔ آپ دیکھیں کہ اس وقت اس کے حق میں کہاں کہاں سے آواز نہیں اٹھی۔ بنگال میں اُردو، سندھ میں اُردو، پنجاب میں اُردو تو یہ زمانہ اُردو کے پھیلنے اور بڑھنے کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اُردو فطری طور پر اپنے نشو و نما کے مراحل طے کر رہی تھی۔ اور اطراف عالم میں مقبول ہو رہی تھی۔ لیکن جب اسے سیاست میں کھینچا گیا تو اس زبان کو دھکا لگنا شروع ہوا۔ پہلے یہ ہندو مسلمانوں کی باہمی اور قومی زبان تھی۔ سیاست میں آکر ہندوؤں کی زبان الگ اور مسلمانوں کی الگ ہو گئی۔ پھر اب یہاں آکر یہ مسئلہ پیدا ہوا، اسی سیاست میں کہ اُردو کا علاقائی زبانوں سے کیا تعلق ہے اور اس کی کیا پوزیشن ہے۔ یہ ایک اور دھکا تھا جو اس زبان کو لگا۔

اب معلوم ہوا کہ زبان بھی سیاست میں آکر اختلافات پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے خیر اب آپ اسے رابطے کی زبان کہیں تو یہ بھی ایک بات ہے۔ رابطے کی زبان تو یہ رہے گی لیکن ایک بات ہے۔ میں نہیں کہتا کہ غالب اور میر سے آپ اپنا رُخ موڑ لیں اور یہ کہیں کہ یہ ہندوستان کے شاعر ہیں۔ نہیں۔ ہم اپنی زبان اور اپنے ادب سے ان شعرا کو خارج نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہ ہمارے تہذیبی ورثہ کا حصّہ ہیں۔ تعجب ہے ہم اپنے تہذیبی حصّہ کو تو DENY کر رہے ہیں اور نیا تہذیبی GROUND پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، تہذیبوں کو کھود کھود کے۔ یہ بالکل غلط ہے۔

اور یہ بھی غلط ہے کہ ہماری تہذیب اور ہماری روایت بس رہی ہے، جو ورثہ کے طور پر ہمیں ملی ہے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ اُردو کو پوری طرح قومی زبان بننے کے لئے یہاں کی زندگی، یہاں کے جغرافیائی ماحول، اور یہاں کے رنگ ڈھنگ کو اپنے اندر سمونا پڑے گا۔ اس لئے کہ ایک زبان اور ادب جو ہے تو اس کا اثر دوسرے پر پڑنا لازمی ہے اور علاقائی زبانوں کا بڑھنا جو ہے تو وہ بھی قومی زبان کے لئے ضروری ہے اور قومی زبان کا ان سے قریب آنا بھی ضروری ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ادب جو ہے تو اس پر بھی ایک زبردست موڑ آئے گا۔ زبان اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ ایک زبان اور ادب کی HERITAGE والے جب انہوں نے بدلے ہوئے حالات میں زندگی گزارنی شروع

کی نو ادب کی روایت پر اس کا اثر ضرور پڑا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ امریکی لٹریچر کے پیچھے شیکسپیر نہیں رہا، یہ نہیں کہ وہ HERITAGE ختم ہو گیا، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اُردو کے وہ ادیب جو علاقائی کلچر میں بھی رچے ہوئے ہیں، انہیں اس معاملے میں ایک خاص رول ادا کرنا ہے تاکہ اُردو کو پوری طرح ایک قومی زبان بنایا جائے . . . .

. . . . . دراصل یہ اجتماعی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ علاقائی کلچر، قومی کلچر میں گہرائی پیدا کرتا ہے اور قومی کلچر، علاقائی کلچر کو وسعتِ نظر دیتا ہے . . . .

. . . . لیکن کلچر کی منصوبہ بندی بھی کلچر ہی کا حصہ ہے۔ کلچر کا تعلق کیفیت سے ہے۔ کمیت سے نہیں۔ اس لئے اس میں منصوبہ بندی نہیں ہو سکتی۔

ذکاء صدیقی

مولانا عرشی[1]

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

(۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء ۲۵ر فروری ۱۹۸۱ء)

جن لوگوں نے رامپور کی حامد منزل دیکھی ہے، وہ اس کی صلابت و عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہوں گے؛ لیکن اگر انہوں نے اس حامد منزل کے ایک کمرے میں پرانے اسپرنگوں دار صوفے پر نیم دراز مولانا عرشی کو نہیں دیکھا تو انہوں نے انسانی شرافت و مکرمت کا مجسمہ نہیں دیکھا!

اپنی ملازمتوں اور تفریحوں کے دوران جہاں کہیں جانے کا اتفاق ہوا، اُستاد کا شعر ہمیشہ یاد رہا:

گفت حق: اندر سفر ہر جا روی
باید، اوّل طالبِ مردے شوی

لیکن اس طلب کے باوجود ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ جس ہستی سے ملاقات کرنی چاہتا ہوں اس کے متعلق یہ پہلے معلوم ہو جائے کہ وہ آدمی بھی ہے؛ شروع ہی سے میرے مزاج کی ایک خامی یا قوت رہی ہے کہ پہلی نظر میں کسی کے متعلق بھی جو رائے قایم کرلی، خواہ اچھی یا بُری، اس میں شاذ ہی کوئی تغیر یا تبدّل ہوا، گو پھر اُس شخص سے بارہا ملاقاتیں کیوں نہ رہی ہوں۔ اہلِ سیاست اور شاعروں ادیبوں سے ملنے کا شوق تو کبھی نہیں رہا، لیکن اہل اللہ، علماء اور ماہرینِ موسیقی سے خصوصی طور پر

---

[1] یہ مضمون حضرت مولانا مرحوم کی حیات میں لکھا گیا تھا۔

ملنے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں اور اپنی کم علمی و کوتاہ حوصلگی کے باوصف متمتع ہوتا ہوں۔

۱۹۶۱ء میں جب بریلی کالج کی ملازمت میں آنا ہوا تو اباجی[۵] مرحوم نے لکھا: "رامپور وہاں سے قریب ہے کسی دن جاؤ اور مولانا عرشیؔ سے نیاز حاصل کرو۔" مولانا کا نام نیا نہیں تھا ان کی جائے قیام بھی غیر معلوم نہیں تھی۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ مجھے اباجی مرحوم کی تاکید سے پہلے ہی مولانا عرشیؔ کی خدمت میں حاضر ہونے کا خیال کیوں نہیں آیا، اگر ایسا ہوتا اور میں نے مولانا سے نیاز حاصل کر کے ملاقات کی تفصیل اباجی کو لکھ دی ہوتی تو وہ کس قدر خوش ہوتے!

بریلی کالج میں شعبۂ انگریزی کے استاد، پروفیسر محمد حسن صاحب کے پاس کار تھی، ان سے رامپور کا ذکر آیا تو بولے: چلو، اسی اتوار کو ہو آئیں۔ چنانچہ وہ، میں اور میرے ایک شاگرد رفیق حسن صاحب رامپوری، جو اب میرے کالج کے ساتھی بھی ہیں، ایک اتوار کو رامپور پہنچ گئے۔

جیسا کہ باہر سے آنے والے ہر شخص کا عالم ہوتا ہے، حامد منزل نے مجھے بھی مبہوت کر دیا ___ بے ساختہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا وہ شعر یاد آ گیا جو انہوں نے قلعۂ اکبرآباد پر لکھا ہے:

یارب! یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے
یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے

ہال میں داخل ہوئے تو ایک آن جانے رعب سے آوازیں اپنے آپ پست ہو گئیں اور قدم خود بخود ہلکے ہو گئے۔ مولانا کے کمرے کے باہر چوبدار، نذیر بھائی، بیٹھے تھے۔ رفیق صاحب نے ان سے کہا، "بریلی کالج کے پروفیسر صاحبان مولانا سے ملنے تشریف لائے ہیں، اطلاع کر دیجئے۔" ابھی اُن کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ اندر سے ایک بلند لیکن شائستہ آواز آئی: "تشریف لائیے!"

مجھے زندگی میں بہت سے خوبصورت لوگوں کو دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی ہے، لیکن اگر زمین پر زندہ رہنے والے بہترین میں سے دو کے نام بتانے ہوں تو ایک نام مولانا عرشیؔ کا لوں گا اور دوسرا حضرت شاہ فضل حسن صابری رامپوری کا۔ خواجہ حافظ نے حُسن کا کیسا مکمل معیار بتایا ہے!

---

[۵] حبیب الرحمٰن صدیقی طاب ثراہ، میرے والد۔

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

مولانا عرشی کے دیکھنے والے کو جو چیز سب سے پہلے متاثر کرے ان کا بندۂ طلعت بناتی ہے اور پھر آخر تک جذب رکھتی ہے وہ ان کی آنکھیں ہیں، علم و بصیرت کے نور سے چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھیں پھر دوسرا شیوہ وہ ہے جس کا کوئی نام نہ ہونے کی وجہ سے میں کہوں گا کہ چہرے کی طمانیت ہے اور جو صرف قلب مطمئنہ رکھنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ مولانا از راہِ عزت افزائی سرو قد کھڑے ہوئے تھے۔ شروع جاڑوں کا زمانہ تھا، ہلکے رنگ کی سرج کی شیروانی زیب تن تھی، سفید براق تنگ مُہری کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے، سلیم شاہی جوتی پاؤں میں تھی،

پیری سے کمر میں اک ذرا خم
توقیر کی صورت مجسم

دوبارہ یادداشت پر زور دیتا ہوں تو خیال آتا ہے کمر میں پیری سے خم نہیں تھا، SCHOLAR'S STOOP تھا۔ گندمی رنگ، بھری ہوئی مسنون داڑھی، گنجان بھنووں کے نیچے بڑی بڑی، روشن، دل میں اُتر جانے والی آنکھیں، موزوں و مضبوط بینی، متناسب ہونٹ، خشخشی بال، ٹوپی سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں دو آفس ٹیبل کتابوں کے بوجھ سے دبے ہوئے، ایک وسیع و عریض تخت پر کتابیں کچھ قرینے سے چنی ہوئی اور کچھ کھلی، آدھ کھلی ایک گاؤ تکیے کے اطراف رکھی یا بکھری ہوئی تھیں۔

تعارف کے بعد بڑی شفقت سے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا حکم دیا اور آپ تخت پر بیٹھ گئے تخت کی اونچائی کرسیوں کی اونچائی سے کم ہے اس لیے مجھے کرسی پر بیٹھنے میں تامل ہوا۔ مولانا نے فوراً میری کش مکش کو دریافت کیا اور مسکرا کر فرمایا: "میاں، کرسی نشیں سے تخت نشین بہر حال بہتر ہوتا ہے۔"

بات چیت شروع ہوئی، کیسا دل نشیں اندازِ گفتگو تھا! محمد حسن صاحب انگریزی کے استاد تھے اور میں فارسی کا۔ لیکن کیا میں اور کیا میری فارسی دانی! تاہم چند جملوں ہی کے بعد سے نہ صرف میں، بلکہ پروفیسر محمد حسن بھی، جو نہایت کم سخن و کم آمیز ہیں، اس طرح مولانا سے محوِ کلام

تھے جیسے ہیں برسوں سے ان کی ملازمت حاصل رہی ہو۔

جب گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج میں میرا تقرر ہوا اور رامپور آنا ہوا تو مولانا کے بڑے صاحب زادے اکبر علی خاں عرشی زادہ سے تعارف ہوا، جو بہت جلد دوستی میں، اور ان پچھلے پندرہ سولہ برسوں کے دوران، مؤانست و محبت میں تبدیل ہو گیا۔ اکبر صاحب کے تعلق سے مولانا کی شفقت و عنایت مجھ پر اور بڑھ گئی۔ اس مدت میں جتنا قرب بڑھا میری مبہوت عقیدت نے مجھے مولانا کی جناب میں باریابی سے اتنا ہی دور کر دیا۔ مولانا سے ہزاروں ہی لوگ ملے ہوں گے مجھے یقین ہے کہ ان کے برتاؤ کے بارے سب ہر ایک رطب اللسان ہوگا ـــ میرے ساتھ تو خصوصیت سے وہ شفقت کا برتاؤ کرتے ہیں لیکن میں ان کی شخصیت سے اس قدر مرعوب ہوں کہ ان کے سامنے جاتے ہوئے جھجکتا ہوں ـــ لیکن جب جاتا ہوں، جی چاہتا ہوں بیٹھا ہی رہوں۔ لوگوں سے علیٰ قدر عقول بات کرنے کا ملکہ جیسا مولانا کو ہے کم کسی کو ہوگا۔ لطائف و ظرائف اشعار، ادبی نکتے اور دلچسپ قصے اس بے ساختگی سے گفتگو کے دوران سناتے ہیں کہ

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی

مولانا بنیادی طور پر عالمِ دین ہیں، ادب و تحقیق کو تو محض تفننِ طبع کے طور پر اختیار فرمایا تھا، لیکن نہ تو انہوں نے علمِ دین کو تکبر و نخوت کے لیے وجہ جواز بنایا، نہ تحقیق کے میدان میں یکتائی و بے ہمتائی نے اُن سے کوس لمن الملک بجوایا۔ زندگی کے تئیں اُن کا رویّہ اس قدر صحت مندانہ ہے کہ رشک آتا ہے۔ ان کے پاس آنے والے لوگ بھی ایسے ایسے عجیب شعبہ ہائے حیات سے آتے ہیں کہ اوّل تو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ کس کس قماش کے لوگ کس بے فکری سے ان کے پاس پہنچ جاتے ہیں، مگر پھر اصل حیرت اس وقت ہوتی ہے جب مولانا اپنے نہایت ضروری کام چھوڑ کر ان سے محوِ گفتگو ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے مولانا عرشی کو اس قسم کے لوگوں سے گفتگو کرتے نہیں دیکھا انہوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ صحیح معنوں میں :

گیرو نازِ حاجب و درباں دریں درگاہ نیست!

ایک صاحب ہیں جو مولانا سے کم از کم تیس سال چھوٹے ہوں گے۔ وہ کچھ دن بمبئی بھی رہ چکے ہیں، ایک دن میں پہنچا تو یہ صاحب بیٹھے ہوئے مولانا کو بتا رہے تھے کہ فلم کی اسٹوری اور اسکرین پلے کس طرح لکھنا

چاہیے ۔۔ اور مولانا بڑی توجہ اور دلچسپی سے فلم انڈسٹری کے حالات د کو ایف سُن کر "سلیم۔ جاوید: حیات اور کارنامے" کے عنوان سے ان صاحب کی تقریر پر ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے ۔ اسی انہماک سے وہ شہر کے معمولی سے معمولی شاعر کی پانچ پانچ غزلیں ایک ہی نشست میں سُن لیتے ہیں اور اسی دلجمعی سے فلسطین کے مسئلے پر مقامی سیاسیوں کے ارشاداتِ عالیہ بھی سماعت فرما لیتے ہیں ۔۔۔ کوئی اللہ کا بندہ یہ احساس نہیں کرتا کہ ان کا وقت کس قدر قیمتی ہے!

زندگی پر اعتماد و ایمان اور اس کی گوناگونی سے دلچسپی مولانا عرشیؔ کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ نہ تو ماضی سے شرمسار ہیں نہ حال سے بیزار اور نہ مستقبل کی فکرِ بیجا میں گرفتار۔ ان کی زندگی کا کوئی پل بے کار نہیں گزرتا۔ بفضلہٖ تعالیٰ اس عمر میں بھی جس قدر محنت وہ کرتے ہیں وہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں۔ کتابوں سے مسلسل ربط و تعلق نے ذہن کو غیر معمولی قوتِ حافظہ بخش رکھی ہے لیکن احتیاط کا یہ عالم ہے کہ جب تک کتاب دیکھ کر تشفی نہیں کر لیتے کسی مسئلے میں رائے نہیں دیتے۔ یہ کم علم اور نفس فروش لوگوں کا طریقہ ہے۔ غالبؔ کا ایک مشہور اور زبان زدِ خاص و عام شعر ہے جس کے قافیے کی بابت اکثر لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ ایک دن میں نے اس سلسلے میں استفسار کیا کہ صحیح لفظ کیا ہے۔ وہ شعر میں نے یوں پڑھا:

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

بلا تامل فرمایا: "قافیے میں 'دعا' کا لفظ ہے لیکن دیکھے لیتے ہیں۔" چنانچہ نسخۂ عرشی ملاحظہ کرکے فرمایا: "'دعا' ہی ہے، اور کوئی قرأت نہیں۔"

غالبؔ پر مولانا کو زندہ انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ دیوانِ غالبؔ کا نسخۂ عرشی تحقیق و تدوین کی دیانت دارانہ محنت کا مثالی نمونہ ہے لیکن غالبؔ پر اس درجہ تحکم کے باوجود اپنے چھوٹوں تک سے بے جھجک "مشورہ" طلب فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار رشید حسن خاں صاحب مولانا کے پاس تشریف رکھتے تھے۔ میں بھی حاضر تھا۔ غالبؔ کے اشعار کی تحریر میں رموزِ اوقاف زیرِ گفتگو تھے۔ مولانا نے نہایت بے تکلفی سے رشید حسن خاں صاحب سے کہا کہ: "صاحب میں ابھی تک طے نہیں کر سکا ہوں کہ غالبؔ کا یہ مصرع کس طرح پڑھوں:

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا

آپ بتایئے اسے کس طرح پڑھنا چاہیئے۔" ــــ پھر میری قدر افزائی کے لئے مجھ سے بھی یہی پوچھا:

ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان سے مولانا کے پاس برابر طالب علموں، ریسرچ اسکالرز اور عالموں کے مستفسرانہ خطوط آتے رہتے ہیں۔ کوئی فقہ کا مسئلہ پوچھتا ہے تو کوئی شعر کا۔ کسی کو کسی کتاب کے بارے میں معلومات درکار ہوتی ہے تو کسی کو کسی لفظ کی تحقیق ــ مولانا جس شرح و بسط کے ساتھ ان خطوں کا جواب دیتے ہیں اسے دیکھ کر ان کے علم کا تو قایل ہونا ہی پڑتا ہے ان کے ضبط و تحمل پر بھی حیرت ہوتی ہے۔ ہر جواب سند کے ساتھ سند کی کتابوں اور ان کے مصنفوں کے نام، ایڈیشن اور صفحات کے نمبروں تک کا حوالہ دیتے جاتے ہیں۔ یہ تمام کام اُسی دلجمعی، انہماک اور احتیاط سے کرتے ہیں جو خود اپنی کسی تصنیف یا تالیف میں صرف فرماتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دو واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

رشید حسن خاں صاحب کو قصایدِ سودا کی متنی تحقیق کے دوران ایک مصرع میں اشکال پیدا ہوا۔ مصرع تھا:

ہے چکا بو کا حوض گھن چکر

لفظ "چکا بو" کی تحقیق کے لیے انہوں نے، دہلی میں ہر ممکن تلاش و تفحص کے بعد ناکام ہوکر، مولانا سے استفسار کیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا دِنوں اس لفظ کی تحقیق میں اتنے محو رہے جتنے شاید خود رشید حسن خاں صاحب بھی نہیں رہے ہوں گے۔

ابھی چند ماہ قبل خود مولانا کو کرناٹک کے نواب والاجاہ کے خطوط کی تدوین کے سلسلے میں ایک جگہ اِشکال واقع ہوا۔ یہ خطوط کئی زبانوں میں ہیں اور تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانے ہیں۔ ان خطوط میں بار بار آتا تھا کہ مثلاً: "صبارو زہم فلاں سے ملے" "صباروز" کے معنی کی تلاش میں مولانا کئی دن سرگرداں رہے۔ عرض کرچکا ہوں کہ مولانا عرق ریزی میں عالمانہ تبختر نام کو نہیں۔ اور لوگوں کے علاوہ مجھ کم علم سے بھی پوچھا کہ "میاں، تمہارا تعلق برار سے رہا ہے، تم نے امراؤتی میں کبھی یہ لفظ بھی سُنا؟" آخر ایک دن "صباروز" کے معنی دریافت ہوگئے، یعنی "دوسرے دن" ــــ مولانا کی مسرت دیکھنے کے قابل تھی ــــ جن جن لوگوں سے اس ترکیب کے معنی دریافت کیے تھے فرداً فرداً انھیں بتایا کہ "بھئی

اس کے معنی معلوم ہو گئے، یہ ہیں . . . ."

اس حزم و احتیاط کے باوصف، تقاضائے بشریت اور وسائلِ تحقیق کی ناسازگاری کی وجہ سے کوئی فروگذاشت رہ جائے اور اس پر کوئی اہلِ علم تنقید کرے تو مولانا نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے کو ڈاکٹر آمنہ خاتون کے وہ اعتراضات و ایرادات یاد ہوں گے، جو انھوں نے مولانا کی مرتبہ " دستور الفصاحت " پر کیے تھے ــــ اور انھیں یہ بھی یاد ہوگا کہ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے یہ اعتراضات و ایرادات چھاپنے کے لیے نہیں بھیجے تھے بلکہ مولانا کے نام ایک طویل نجی مکتوب میں لکھے تھے ــــ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے جس محنت اور توجہ سے " دستور الفصاحت " پڑھ کر جس قابلیت سے یہ اعتراضات و ایرادات کیے تھے انھیں مولانا نے بیحد پسند فرمایا اور مولانا کی بڑائی اور وسیع القلبی ملاحظہ ہو کہ خود ہی چھاپنے کے لیے بھیج دیے تاکہ ایک مخلص اسکالر کی محنت۔ مولانا کے نام نجی مکتوب کی صورت میں داخلِ دفتر ہو کر ضایع نہ ہو جائے!

رامپور سے محبت مولانا کی غالباً واحد کمزوری ہے۔ وہ اگر رضا لائبریری کے ناظم نہ ہوتے تب بھی ان کے علمی کاموں میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا یا ان کی نوعیت کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتی ــــ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے ٹھوس علمی کاموں کے لیے انھیں جس سکون کی ضرورت تھی وہ صرف رامپور ہی میں اور وہ بھی رضا لائبریری ہی میں میسر آسکتا تھا۔ ان باتوں پر مستزاد اپنے والد مرحوم سے ان کی بے پناہ محبت تھی۔ ۱۹۴۷ء میں انھیں ایران، افغانستان اور عرب کی ثقافتی سفارت پیش کی گئی، تنخواہ ڈھائی ہزار روپے ماہانہ تجویز ہوئی۔ اس پیش کش کے وقت مولانا کی تنخواہ رامپور میں صرف ۲۵۰ روپے تھی۔ انھوں نے اپنے والد مرحوم سے مشورہ کیا تو انھوں نے فرمایا! "اب ہمارا آخری وقت ہے، رہنے دو، کہاں جاؤ گے!" سعادت مند بیٹے نے بلا تردد اس شاندار ملازمت سے انکار لکھ کر بھیج دیا۔ ایسا ہی ایک اور موقع اس وقت آیا جب ڈاکٹر سید عابد حسین کے توسط سے شیخ عبداللہ نے سری نگر میں کشمیر میوزیم کی ڈائرکٹرشپ انھیں پیش کی تھی۔ لیکن مولانا جو ایک بار پاؤں توڑ کر رضا لائبریری میں بیٹھے تو پھر کوئی پیش کش ان کے پائے استغناء کو جنبش نہ دے سکی۔

قناعت و استغنا کے ساتھ ساتھ وسیع القلبی اور لائبریری سے محبت کا یہ عالم ہے کہ

جب مسلسل کئی برس کی دیدہ ریزی کے بعد رضا لائبریری کے عربی مخطوطات کا کیٹیلاگ تیار کیا تو حکومت نے بارہ ہزار روپیہ اس کا حق المحنت دیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے سب بچے علیٰ قدر عمر یونی ورسٹی اور اسکولوں کالجوں میں پڑھ رہے تھے اور روپے کی ضرورت کے دن تھے ، لیکن جیسے ہی یہ بارہ ہزار روپیہ ملا ، مولانا نے رضا لائبریری کو بطور عطیہ دے دیا ، کیوں کہ لائبریری ان دنوں مالی بحران سے گذر رہی تھی ۔ یہ ایثار اس قدر خاموشی سے کیا گیا کہ لائبریری کے چند قریبی لوگوں کے ماسوا ، عام آدمیوں کا تو کیا ذکر خاص لوگوں کو بھی اس کا علم نہیں ہوا ۔

غیرت علم نے مولانا کو دنیا سازی کا تصور ہی نہیں دیا ۔ ان کو کبھی وصفِ کل و یاسمن کا دماغ رہا نہ فی سبیل اللہ فساد کا ۔ غالباً انھیں کے لیے عرفی نے یہ شعر کہا تھا :

از رغبتِ دنیا الم آشوب نگردم
زیں باد پریشاں نکنم زلفِ الم را

ان کی زبان سے صاحبانِ علم اور اہلِ فن کی تعریف تو بارہا سنی لیکن قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ کسی کی برائی کبھی نہیں سنی ، حالانکہ مولانا عالم بھی ہیں ، شاعر بھی اور ادیب بھی ۔ اور بدقسمتی سے یہ حضرات ایک وصف میں خاص طور پر بدنام ہیں ؛ وہ ہے حسد ۔ خصوصاً اپنے ہم پیشہ و ہم عصر لوگوں سے ۔ مولانا عرشی اپنے ہم عصر محققوں ، عالموں ، شاعروں اور ادیبوں کا ذکر جس محبت اور احترام سے کرتے ہیں اس کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جو مولانا سے واقف ہے ۔

میں نے البتہ مولانا کو صرف ایک بار کبیدہ خاطر دیکھا ہے ، لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بات صرف کبیدگی تک محدود نہ رہتی ۔ واقعہ یہ ہوا کہ دیوان غالب بخطِ غالب کے بھوپال میں دریافت شدہ نسخے کے متعلق (جسے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے شایع کر دیا ہے) ۶۹ء اور ۷۰ء میں جو بحثیں چھڑیں ، ان میں ایک شہرت طلب تازہ وارد بساطِ تحقیق نے (جن کا نام لے کر میں انھیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا) مولانا کے ادبی خلوص و نیت پر شبہ ظاہر کیا اور مولانا کے لیے ایک جگہ "واضع" کا لفظ لکھ دیا ۔ مولانا کو اس پر سخت رنج ہوا ۔ انھوں نے ایک طویل مراسلہ ان صاحب کے جواب میں لکھا ، ان کے اعتراضات کی تردید کی اور آخر میں جو لکھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ : آپ اہلِ علم کی طرزِ گفتگو سے ناآشنا ہیں اس لیے آپ کو معلوم نہیں کہ ان کے یہاں

"واضع" کا لفظ گالی کے مترادف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے یہ لفظ اہلِ علم کی اصطلاح میں استعمال نہیں کیا ہوگا، کیوں کہ آپ اس سے واقف ہی نہیں ہیں۔ آپ کی اسی ناواقفیت کی بنا پر میں تو آپ کو معاف کیے دیتا ہوں، لیکن جن اہلِ علم نے آپ کا مضمون پڑھا ہوگا انھوں نے میرے متعلق تو جو بھی رائے قائم کی ہو، آپ کے متعلق کیا سوچا ہوگا کہ آپ اپنے بڑوں کی — جن کی زندگی کا تین چوتھائی حصہ حتی الامکان دیانت دارانہ تحقیق و تدقیق کی "سعی نامشکور" میں گزرا ہے۔ ایک غلطی کو بھی معاف نہیں کر سکتے (جب کہ وہ غلطی تھی بھی نہیں) اور گالیوں پر اتر آتے ہیں!؟

مراسلہ لکھ کر مولانا نے از راہ قدر افزائی مجھے دیا اور فرمایا کہ، "میاں قلم برداشتہ اور فوری جذبے کے تحت لکھا ہے، ذرا دیکھ لینا کہیں میں نے انہیں صاحب کا لہجہ اور طرزِ گفتگو تو نہیں اختیار کر لیا؟" مراسلہ کیا تھا، نہایت لطیف اور بلیغ اشارات کا شاہکار تھا۔ لیکن اس وقت میں بھی غصے کے مارے بے قابو تھا اور ان صاحب کے خلاف تیلی رسے تیلی تبرے سر ریکو ہو ٹائپ کا مضمون لکھنے میں مصروف تھا۔ مجھے مولانا کا مضمون بالکل پسند نہیں آیا اور مجھ گستاخ نے کمال بیباکی سے مولانا کی جناب میں یہ کہہ بھی دیا، میری ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ جو شخص زہر سے بھی نہیں مر سکتا تھا مولانا اس کو گڑ دینا چاہ رہے تھے، بھلا وہ جاہل اس لطیف عبارت سے کیا متاثر مسار ہوتا؟ یہ وجہ سن کر مولانا ہنسے اور اپنا مراسلہ واپس لیتے ہوئے فرمایا: "بھائی! اس سے زیادہ میں نہیں لکھ سکتا۔" یہ کہہ کر مراسلہ رکھ لیا۔ پھر بہتیرا کہا لیکن انھوں نے اسے چھپوایا ہی نہیں۔ مولانا نے تو اپنا مضمون خود نہیں چھپوایا، لیکن میرا مضمون "ہماری زبان" علی گڑھ نے نہیں چھاپا، جبکہ اس نے ان صاحب کا مضمون چھاپنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کیا تھا۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ان صاحب کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو کہ صرف چند ہی ماہ بعد انھیں اپنی کسی کتاب کی تالیف کے دوران چند مسائل میں مولانا سے استفسار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مولانا نے اپنی حسبِ عادت شرح و بسط کے ساتھ ایک ایک مسئلے کو ایسا منقح کیا کہ باید و شاید۔ میرے اس بیان کو کوئی صاحب پیر و پرستی پر محمول نہ کریں۔ رضا لائبریری کے دفتر انشاء میں یہ خط و کتابت دیکھی جا سکتی ہے — الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس کی تعریف میں مولانا جیسے ہی لوگ تو آتے ہیں!

مولانا کا خط بہت پاکیزہ ہے۔ جب وہ لکھتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے سجل اور خوبصورت حروف صفحۂ قرطاس پر موتیوں کی طرح بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے مکاتیب حسن عبارت اور حسن تحریر کے نمونے ہوتے ہیں۔ عربی کے عالم فارسی کے مزاج داں لیکن لکھتے ٹھیٹ اردو ہیں۔ بے ساختگی اور بے تکلفی ان کے مکاتیب کا خاصہ ہے۔ علمی مضامین میں بے ساختگی و بے تکلفی کی یہ روش تو قائم نہیں رہ سکتی تاہم سنجیدہ موضوع کو بھی سادہ زبان میں ادا کر دینے کا نادر الوجود ملکہ مولانا عرشی کو حاصل ہے۔ ان کے علمی مضامین کی سادگیٔ عبارت کس قدر سخت قلمی ریاضت اور زبردست ذہنی وضبط کا نتیجہ ہے اسے کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو علمی مضامین کو سادہ نثر میں لکھنے کا تجربہ کر چکے ہیں۔ مولانا کو اظہار پر وہ قدرت حاصل ہے کہ انھیں بھاری بھرکم اور پرتصنع عبارت آرائی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ان کے یہاں ترسیل کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ سادہ نگاری کا یہی کمال ان کی فارسی تحریروں میں بھی نمایاں ہے اور عربی میں بھی ان کی سادہ نگاری کو خود اہلِ زبان عرب رشک کی نظروں سے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر امام سفیان ثوری کے مقدمے اور حواشی پر تبصرہ کرتے ہوئے عالم عرب کے ممتاز ترین ادیب اور استاد علامہ بہجۃ البیطار نے مجلۂ مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق میں لکھا ہے کہ:

"ان کی سادہ زبان افصح و ابلغ عربی کا بہترین نمونہ ہے"۔

اس سلسلے میں یہ لطیفہ سننے کے قابل ہے کہ جب مولانا نے یہ تبصرہ پڑھا تو ہنس کر فرمایا: "بھائی حقیقت یہ ہے کہ مجھے پر تکلف نثر لکھنی ہی نہیں آتی اس لیے مجبوراً سادہ نگاری اختیار کرنی پڑی ہے۔"

ویسے واقعہ یہ ہے کہ مولانا عرشی کی تمام زندگی سادگی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان کی فطرت سادہ، مزاج سادہ، رکھ رکھاؤ سادہ، رہن سہن سادہ ہے۔ فطرت و معاشرت کی اسی سادگی نے ان سے ظہور میں آنے والی ہر تحریر و تقریر کو وہ باوقار سادگی عطا کر دی ہے جس پر ہزاروں تکلف اور بناؤ قربان!

نثر تو نثر، شعر بھی مولانا اسی بے تکلفانہ سادگی سے کہتے ہیں۔ ہر چند وہ شعر صرف بطور تفریحِ طبع کہتے ہیں لیکن دو ضخیم ڈائریاں ان کی غزلیات و منظومات سے بھری ہوئی ہیں۔ شعر گوئی کا زمانہ اور طریقہ یہ ہے کہ جب نصیب دشمناں طبیعت ناساز ہوتی ہے اور سنجیدہ علمی کام کرنے کی طاقت نہیں رہ جاتی

تو ایک اکسرسائز بک سرہانے رکھ لیتے ہیں۔ کوئی مصرع ذہن میں آیا اور انھوں نے لیٹے
ہی لیٹے بیک وقت شعر کہنے اور لکھنے شروع کر دیے۔ اسی روانیٔ طبع کے عالم میں ایک
ایک ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے میں ۱۲-۱۳ اشعار کی تین تین غزلیں کہی ہیں۔ جہاں کوئی عیادت کے
لیے آیا، انھوں نے بیاض بند کی اور شعر گوئی موقوف۔ مجھے فخر ہے کہ مولانا نے مجھ ناچیز کو
مامور فرمایا کہ ان کی کلیات نظم میں سے سو غزلیں منتخب کر دوں۔ بموجب الامر فوق الادب
میں نے یہ جسارت کی۔ مولانا نے انتخاب ملاحظہ فرمایا، پھر بولے: "میاں تمہارا انتخاب پسند نہیں
آیا، تم نے رعایت سے کام لیا ہے۔" اکبر علی خاں صاحب کبھی کبھار مولانا کے مکاتیب و غزلیات بھی
چھپوا دیتے ہیں اور اہل ذوق ان تبرکات کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

رضا لائبریری میں ہزارہا خطی نسخے اور ہزارہا ہی مطبوعات ہیں۔ اگر کسی کو مولانا عرشی کے
استحضارِ کتب کا محیر العقول حال دیکھنا ہے تو ان سے کسی بھی کتاب کے متعلق پوچھ کر دیکھیے۔ بلکہ اگر
کتاب کا نام نہ بھی معلوم ہو، صرف مصنف کا نام معلوم ہو تب بھی مولانا سے تفصیل دریافت کرے۔
پانچ دس منٹ کے بعد اس کے علم و معلومات میں وہ باتیں آجائیں گی جن کا اُسے تصور بھی نہ رہا ہوگا۔
اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ لائبریری میں موجود ایک ایک کتاب مولانا نے نہ صرف پڑھی ہے بلکہ
گنی ہے۔ ضخیم سے ضخیم اور غیر متداول سے غیر متداول کتاب میں سے مطلوبہ چیز اس طرح سیکنڈوں
میں نکال لیتے ہیں جیسے ان کی انگلیوں کے آنکھیں ہوں۔ مولانا کو میں نے بارہا اسی طرح کتابوں
میں سے مطالب تلاش کرتے دیکھا ہے اور ہر بار OVER-AWED رہ گیا ہوں — مبادا
کوئی یہ سمجھے کہ مولانا مرعوب کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں، اگر کوئی یہ سمجھے تو اس کی نادانی ہے۔
جس مقام علم پر مولانا فائز ہیں، وہاں نمود و نمائش کے لیے نہ وقت رہ جاتا ہے نہ خواہش —
اور پھر ہم ہیں کیا جو مولانا ہم کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں؟

جس طرح مولانا کسی کو مرعوب نہیں کرتے اسی طرح کسی سے مرعوب بھی نہیں ہوتے۔
رضا لائبریری میں آئے دن علماء و فضلاء کے علاوہ دُنیا بھر کے ممالک، خصوصاً اسلامی ممالک، کے
سفراء و وزراء آتے رہتے ہیں، نیز خود اپنے ملک کے صوبوں کے گورنر اور مرکز کے وزراء بھی کبھی
کبھار چلے آتے ہیں۔ بارہا ان سے مولانا کو اور مولانا سے ان کو باتیں کرتے دیکھا ہے اور ہر بار یہ

بھی دیکھا ہے کہ مولانا کے وقارِ علمی اور وجاہتِ ذاتی نے اِن لوگوں کو متاثر و مرعوب کیا ہے جن کی زندگی ۔۔۔ کم از کم عملی و سیاسی زندگی ۔۔۔ کا مقصود و منتہا ہی دوسروں کو متاثر و مرعوب کرنا ہے ۔۔۔ اور جب ان کو مولانا کی عزت اور احترام کرتے دیکھتا ہوں تو خود ان لوگوں کے لیے میرے دل میں عزت و احترام پیدا ہو جاتا ہے ۔ اہلِ دل اس لطیف نفسیاتی نکتے کو سمجھتے ہیں کہ جس ہستی سے ہم محبت کرتے ہیں اگر کوئی غیر شخص بھی اس کے لیے ہمارے جیسے ہی جذبات رکھتا ہو تو ہمیں اس شخص سے بھی محبت ہو جاتی ہے !

میرا وطن مہاراشٹر کا ایک شہر امراوتی ہے ۔ وہاں جاتا ہوں تو ہر ناگپور اور بمبئی بھی جاتا ہوں ۔ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے جب ان تمام علاقوں اور شہروں میں کوئی شخص مجھ سے مولانا کی خیریت دریافت کرتا ہے ۔۔۔ اپنے آپ پر فخر بھی ہوتا ہے کہ یہ شخص مجھے مولانا کی جناب میں اتنا باریاب سمجھتا ہے کہ مجھ سے ان کے بارے میں پوچھ رہا ہے !

اپنے وابستگانِ دولت پر مولانا بیحد شفقت فرماتے ہیں ان کی خیریت ، ان کے عزیزوں کی خیریت جنھیں مولانا نے نہ کبھی دیکھا نہ خط کتابت کی ، ان کے بال بچوں کی خیریت اس دلسوزی و محبت سے دریافت کرتے ہیں جیسے وہ سب ان کے نہایت قریبی عزیز ہوں ۔۔۔ ان کے کاموں میں حقیقی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں ۔ ان کی خوشیوں پر خوش اور غموں پر مغموم ہوتے ہیں ۔۔۔ میری خورد سال بچی اور اباجی مرحوم کے انتقال پر جو تعزیتی خطوط انھوں نے مجھے تحریر فرمائے وہ آج بھی میرے لیے تسکینِ قلب اور تطہیرِ جذبات کا باعث ہیں ۔ میری بچی کے انتقال کی وجہ سے میری بیوی کو اختلاج کا عارضہ ہو گیا تھا ۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انھوں نے تعزیت کی ، ان کے محبت بھرے کلمات سن کر بیوی رونے لگیں تو مولانا کی بھی آنکھیں بھر آئیں ۔ بہت کچھ دلاسا دیا اور ایک دعا بتائی کہ یہ پڑھا کرو ، ان شاء اللہ دل کو سکون حاصل ہوگا ۔ الحمدللہ ایسا ہی ہوا اور اختلاج کا مرض رفع ہو گیا ۔

رضا لائبریری کے ملازمین کے ساتھ بھی مولانا کا رویہ افسرانہ نہیں ، خاندان کے کسی بزرگ کا سا ہے ۔ چھوٹے بڑے تمام ملازمین بھی ان کا کس قدر پُر محبت احترام کرتے ہیں ۔ اس کا اندازہ جب ہوتا ہے جب لائبریری کے بند ہونے کا وقت آتا ہے ، عہدے داروں سے فراش تک ادب و

احترام کے وہ تمام لوازم ملحوظ رکھتے ہیں جو صرف محبت سکھاتی ہے، ملازمت نہیں۔ میر کا ایک شعر پڑھوں تو شاید اس محبت کا مفہوم زیادہ واضح ہو جائے:

دور بیٹھا غبارِ میر اُس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مجھے اکثر لائبریری کے وقت کے بعد گھر تک مولانا کی مشایعت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اکبر صاحب اور میں از راہِ ادب ایک قدم پیچھے، دائیں بائیں چلتے ہیں۔ مولانا پُر وقار انداز میں چھڑی ٹیکتے، آہستہ قدم چلتے ہیں۔ نگاہیں زیادہ تر جھکی رہتی ہیں۔ دائیں بائیں سے لوگ از راہِ احترام راستہ چھوڑتے، سلام لیتے، سلام کرتے گزرتے رہتے ہیں — جس دن بھی اس طرح مولانا کی مشایعت کی ہے، دل ایک بے نام مسرت سے دیر تک شاد کام رہا ہے۔

مولانا کے دسترخوان پر زلّہ ربائی کا بھی مجھے شرف حاصل رہا ہے۔ کھانا نہایت نفاست سے کھاتے ہیں اور کھانے کے دوران دل خوش کُن باتیں کرتے جاتے ہیں۔ ایک دن دسترخوان پر دہی تھی، مجھے زکام ہو رہا تھا اس لیے میں دہی کھا نہیں رہا تھا۔ مولانا نے میری طرف پیالہ بڑھایا میں نے معذرت کی تو مُسکرا کر فرمایا: "رامپور میں ایک مثل بولتے ہیں: " جس نے نہ پی گانجے کی کلی، اُس لونڈے سے لونڈیا بھلی" یہ تو گانجے کی کلی بھی نہیں ہے!"

آج سے چند سال قبل تک مولانا کا معمول تھا کہ مغرب کے بعد گھر سے چل کر رامپور کے بازار صفدر گنج میں یوسف خاں صاحب کی کپڑے کی دوکان پر تشریف لاتے تھے اور وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھتے تھے۔ اس وقت یہ دوکان رامپور کے جیّد علماء و فضلاء کا مرکز ہو جاتی تھی۔ مولوی عبدالسلام خاں صاحب اور مولوی اسحٰق النبی خاں علوی بھی یہیں آجاتے تھے۔ یہاں سے اٹھ کر جامع مسجد میں مولانا عشاء کی نماز پڑھتے ہوئے اپنے بال بچوں میں لوٹ جاتے تھے۔

مولانا کو خدا نے ہر نعمت سے نوازا ہے۔ تدیّن، علم، عزت، شہرت اور استغناء کے ساتھ ساتھ اولادِ صالح بھی عطا فرمائی ہے۔ ان میں سے برادرم اکبر علی خاں عرشی زادہ کا نام علمی و ادبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ کم ظرف آدمی ان نعمتوں کی موجودگی میں تکبّر کا شکار ہو جاتا ہے — مولانا کو ان نعمتوں نے اور زیادہ مُنکسر المزاج بنا دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے ایک مدّت سے انھیں کوئی ضرورت نہیں

تو وہ لائبریری کی ملازمت کو جاری رکھیں۔ لیکن کام ہی ان کی زندگی ہے۔ بیماری آزاری میں بھی جب تک جسم میں طاقت رہتی ہے، وہ لائبریری جانے سے باز نہیں رہتے۔ قلب کے عارضے میں دو بار گرفتار ہو چکے ہیں، اس زمانے میں بھی ذرا صحت ہوئی تھی کہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے برخلاف لائبریری جانے لگے۔ اکثر غالب کا یہ شعر پڑھتے ہیں:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ
رہنے دے ابھی یاں، کہ مجھے کام بہت ہے

مولانا تو اس وقت بھی مغتنم روزگار تھے جب مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری جیسے زعماء زندہ تھے اور جب ان کی جوانی ہی کے دن تھے۔ لیکن آج، اس قحط الرجال کے زمانے میں تو یہاں سات کے علاوہ دُور دُور کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس پر ہماری تشنۂ علم نظریں ٹھہریں۔ مرگ و زیست کے دینے والے کی بارگاہ میں التماس کرتا رہتا ہوں کہ غالب کے اس شعر کے دوسرے مصرع کو بطورِ دعا قبول فرمالے، آمین۔

ڈاکٹر سلیم اختر

گیسٹالٹ نفسیات اور تخلیق

نفسیات کے متعدد شعبے ہیں مگر ہر شعبہ یا دبستان ایسا نہیں کہ اس کے تصورات سے ادب و نقد کے مطالعے میں باندازِ نو امداد لینی ممکن ہو۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ادب و نقد سے وابستہ نفسیاتی مباحث کی اساس زیادہ تر تو فرائڈ اور ژونگ اور ان کے بعد کسی حد تک ایڈلر کے نظریات پر استوار نظر آتی ہے۔ البتہ گیسٹالٹ (GESTALT) نفسیات کی صورت میں ایک ایسا دبستان موجود ہے جس کے بعض تصورات ادبی اور تنقیدی مباحث میں بھی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ گیسٹالٹ جرمن لفظ ہے جس کا مطلب صورت یا ہیئت ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح ایک جرمن نفسیات دان کرسچین وان اہرن فلیس (CHRISTIAN V'ON EHERNFELS) کی ساختہ ہے[1] سب سے پہلا گیسٹالٹ نفسیات دان میکس ورد مر (MAX WERTHERIMER) کو سمجھا جاتا ہے[2]۔ لیکن اس کے فروغ میں کوہلر نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اور اس کی کتاب "GESTALT PSYCHOLOGY" (1920) اس دبستان کی اہم ترین اور اساس فکر والی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس کی دیگر تصانیف میں یہ قابلِ ذکر ہیں۔

1. "THE PLACE OF VALUE"
2. "THE MENTALITY OF APES"

1- KOHLER, WOLFGANG, "THE TEST OF GESTALT PSYCHOLOGY" PRINCETON, PRINCETON UNIVERSITY PRESS, 1969, P. 46

۲ؔ ایضاً ص، ۳۵

گیشالٹ نفسیات میں ادراک ــــ یاد ــــ بازیافت ــــ سوچ اور محرکات وغیرہ سے بطور خاص دلچسپی لی جاتی ہے۔ اگر ایک فقرہ میں گیسٹالٹ کا نچوڑ بیان کرنا ہو تو اسے کیرول سی۔ پریٹ (CARROL C. PRATT) کے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

"THE WHOLE IS MORE THAN THE SUM OF ITS PARTS"

(اپنے اجزاء کے مجموعے کے مقابلے میں کل زیادہ ہوتا ہے)[۵]

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہر تجربہ اپنی انفرادی صورت میں ایک وحدت ہوتا ہے ہم اس کے تشکیلی اجزا اور عناصر کا شعوری طور پر تجزیہ تو کرسکتے ہیں لیکن اس کا تاثر اس کے اجزاء کا نہیں بلکہ ان سے تشکیل پانے والے کل کا مرہونِ منت ہے۔ کُل اپنے اجزاء کے مجموعے کے مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک تصویر مختلف خطوط، رنگوں اور ان سے جنم لینے والے پیش منظر اور پس منظر ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ ان سے جنم لینے والے تصورات کا مجموعہ ہے اور اسی میں دیگر تصاویر کے مقابلے میں اس کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔ ہم جب تصویر دیکھتے ہیں تو ہم رنگوں خطوط اور شبیہ کا جزوی طور پر الگ سے ادراک نہیں کرتے بلکہ ان سے جنم لینے والے متعدد تاثرات کو ایک وحدت کی صورت میں موجود دیکھتے ہیں۔ اس مثال کو شعر و نغمہ ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ پر منطبق کرکے دیکھیں تو ادبیات کی پرکھ کے لیے ایک نیا اور منفرد پیمانہ ہاتھ آتا ہے۔

جہاں تک گیسٹالٹ سے ادب و نقد کے مسائل کا حل کرنے کا تعلق ہے تو کیرول سی پریٹ نے زیرِ حوالہ کتاب کے تعارف میں اس پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں اس نے ۱۹۴۰ء میں لکھے گئے اس دبستان کے ایک اور اہم ترین نفسیات دان (KOFFKA) کے ایک مقالے "SYMPOSTUM OF ART" کا بطور خاص ذکر کیا ہے جس میں کافکا نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "اس نفسیات میں ایسے تصورات بھی موجود ہیں جن کے بارے میں زور دے کر اس اَمر کا اظہار کیا جاسکتا ہے کہ یہ معمولی سی تبدیلی اور مثالوں کے ساتھ جمالیاتی

---

۵ تعارف کتاب ہٰذا ص۔۹

نیا مدہ

نظریات کے اہم اور مرکزی مسائل کی گرہیں کھولنے میں بلا واسطہ طور پر ممد ثابت ہو سکتے ہیں[1]

کیبرڈل مزید رقم طراز ہے:

"کوہلر اور کافکا کی تحریروں میں آرٹ کی ماہیت کے بارے میں بے شمار حوالے ملتے ہیں چنانچہ فلاسفروں اور نفسیات دانوں کے لیے گیسٹالٹ نفسیات کی روشنی میں جمالیاتی نظریے کی نئی راہیں متعین کرنا مشکل نہ رہا۔ یہ درست ہے کہ عمومی تجرباتی نفسیات کے طلبا بالعموم اس امر سے آگاہ نہیں ہیں لیکن کوہلر کی تحریروں کے وسیع اثرات کے تعین میں یہ امر ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ اس کے خیالات نے اس وقت اثر اندازی کی جب اس ملک میں جمالیات آرٹ موسیقی انتقاد وغیرہ کے بارے میں پرجوش دلچسپی ظاہر کی جا رہی تھی۔"[2]

اس سلسلے میں جولینڈی جیکوبی نے ژونگ کے نظریات سے بحث کرتے ہوئے ان میں اور گیسٹالٹ نفسیات کے بعض تصورات میں مماثلت دیکھتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ:

"نخستمثال (ARCHETYPE) موروثی ہیئت ہے جس میں شروع میں کوئی مخصوص مواد نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کا گیسٹالٹ نظریہ سے رابطہ استوار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی موجود ہے وہی گیسٹالٹ ہے۔ یہ کہہ کر اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ سائیکی میں گیسٹالٹ تجربہ کی صلاحیت ہی نہیں بلکہ وہ گیسٹالٹ کی تخلیق پر بھی قادر ہے۔ یہ اس اصطلاح

---

[1] تعارف کتاب ہذا ص: ۹

[2] "THE TEST OF GESTALT PSYCHOLOGY" P. 20

کے لغوی معنی کے لحاظ سے بھی درست ہے"۔[1]

جیکوبی کے بموجب "تختمثال" اور گیسٹالٹ افلاطون کے اعیان کے برعکس متعین اور مقرر نہیں ہیں بلکہ یہ ان عملی قوتوں کے مرہونِ منت ہیں جو سائیکی میں موجود قانونِ ترتیب کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں"۔[2]

گیسٹالٹ کی کارفرمائی کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ :

"کسی شخص کے اعضا کے مقابلے میں اس کے چہرے کی شفقت محبت یا خشونت زیادہ یاد رہتی ہے . . . . ان خصوصیات کی وضاحت اور تفصیل سے گیسٹالٹ نفسیات نے جمالیات کو بہت متاثر کیا ہے واضح رہے کہ یہ خصوصیات زندگی کے دیگر امور کے مقابلے میں آرٹ میں زیادہ نمایاں اور موثر کردار ادا کرتی ہیں ۔ بلکہ بعض ماہرین کے بموجب تو فن جو زمان و مکان سے ماورا ایک کشش اور مسحور کن کیفیات کا حامل ثابت ہوتا ہے تو وہ بھی ان ہی خصوصیات کے باعث ہوتا ہے"۔[3]

ہیئت اور اظہار کے مختلف ۔ سانچوں سے وابستہ فنی مباحث اردو تنقید میں ایک مستقل شعبے کی حیثیت رکھتے ہیں اس ضمن میں نفسیاتی کے ساتھ ساتھ غیر نفسیاتی ناقدین بھی گیسٹالٹ سے استفادہ کرسکتے ہیں ۔ چنانچہ محمود ہاشمی کے بموجب :

"تخلیق کی ہیئت کا مسئلہ بھی شعوری ادراک کے نفسیاتی مطالعے کا موضوع ہے ۔ جدید نفسیات میں گیسٹالٹ سائیکالوجی فن کے صوری پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے ۔ اس مکتبۂ فکر کے مطابق نفسی گہرائیوں سے طلوع ہونے والی تخلیق کی نامیاتی ہیئت غیر موجود اور تجریدی ہوتی ہے ۔ ذہن کی

---

1. "COMPLEX/ARCHETYPES/ SYMBOL": P. 35, 54

2. IBID. P. 55

3. "THE TEST OF GESTALT PSYCHOLOGY"; P. 22

خارجی یا بالائی سطح جو تخلیقی عمل کے دوران میں بے عمل رہتی ہے اس پر
یہ نامیاتی ہیئت منعکس ہوتی رہتی ہے۔ پھر جب تخلیقی عمل کے بنیادی عوامل
اپنا کام کر لیتے ہیں تب یہ غیر مربوط نامیاتی صورتیں جمالیات اور فنی اظہار
کے تقاضوں کے مطابق تعبیری علامتوں کے ذریعے لچک دار بن جاتی
ہیں اور غیر فن کار کا ذہن جس چیز سے محظوظ ہوتا ہے وہ دراصل یہی
لچک ہوتی ہے۔"[۱]

گو معاصر اہل قلم نے گیسٹالٹ نفسیات سے کسی خاص شغف کا اظہار نہیں کیا لیکن اس کی اہمیت کے لیے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ علامہ اقبال نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ بحیثیت مجموعی اس سے نفسیات کے لئے بہت سی توقعات بھی وابستہ کیں۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے "حکمت اقبال" میں گیسٹالٹ پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال کی ایک تحریر کا ایک اقتباس درج کیا ہے۔ یہاں متعلقہ اقتباسات پیش ہیں:

"جرمن ماہرین نفسیات کا ایک مکتب جسے وحدتوں کی نفسیات
(GESTALT PSYCHOLOGY) یا نفسیاتی متشا کلی
(CONFIGURATION PSYCHOLOGY) کہا جاتا ہے اس حقیقت
کے ثبوت میں نہایت ہی زور دار اور یقین افروز تجرباتی شواہد بہم پہنچاتا
ہے کہ خارجی دنیا کے متعلق انسان کا علم وحدت کی شکل اختیار کرتا ہے
اس مکتب نفسیات کا کہنا یہ ہے کہ ذی شعور کردار کے گہرے مطالعے سے
یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ اس میں معرفت یا پہچان حسیات کے سلسلہ
سے بلند اور بالا ہو کر کام کرتی ہے۔ یہ معرفت یا پہچان اشیاء کے مادی
مکانی یا فنی تعلق کے بارے میں شعور کا علم یا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی
انسانی شعور مختلف اشیاء کے ایک بے ترتیب مجموعے سے بعض اشیاء

---

[۱] ۔ "تخلیقی عمل" ۔ مطبوعہ ماہنامہ "کامران" سرگودھا نومبر ۱۹۶۵ء

کو جو اس کے مقصد کے پیشِ نظر ایک وحدت بناتی ہیں چن لیتا ہے۔ اس مکتبہ لنفسیات کے متعلق اقبال لکھتا ہے:

"تاہم اس خیال سے کچھ اطمینان ہوتا ہے کہ شاید جرمنی کا نیا مکتبہ نفسیات جسے نفسیات تشاکلی کہا جاتا ہے نفسیات کو ایک آزاد اور مستقل علم کی شکل دینے میں کامیاب ہو جائے"[۱]

گیسٹالٹ نفسیات نے جمالیات پر جو گہرے اثرات ڈالے ہیں ان کا ہر سطح پر اعتراف کیا جا رہا ہے اور سعید احمد رفیق کے الفاظ میں:

"گیسٹالٹ نفسیات کی بنا پر جمالیات میں ایک نئے نظریے کا اضافہ ہوا ہے ...... اس مدرسۂ فکر میں جمالیات کے جس مسئلے پر سب سے زیادہ زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حسین معروض کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں اور انسان اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے انسان جس شکل کو پسند کرتا ہے اور اس کی وجہ فطرت کا موزوں شکل کو پسند کرنا ہے اس ضمن میں انسان فطرت کا پیروکار ہے اور اس نے فطرت سے ایسی مربوط شکلوں کو پسند کرنا سیکھا ہے جن میں موزونیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ موزونیت کا انحصار توازن، تناسب، ساخت، ترتیب اور تنظیم میں ہے اور فطرت اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ یعنی معروض کی بنیادی خصوصیات یہی ہیں اور ان ہی خصوصیات کی بنا پر انسان ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اثر پذیری ترتیب اور تنظیم میں مضمر ہے اور ترتیب و تنظیم کا نتیجہ جلال ہوتا ہے جلال ہمیشہ حظ آفرین ہوتا ہے۔ ایک فن کار اپنے مواد کو خاص شکل دیتا ہے تو وہ اپنے مواد کو فطرت کے متعدد اجزا میں سے منتخب نہیں کرتا اور وہ بھی اپنے فن کے ذریعے وہ فطرت کے انتشار اور بکھرے ہوئے اور درہم برہم اجزا

---

[۱] "حکمتِ اقبال" ص ۱۳

میں نظم و ترتیب پیدا کرتا ہے کیوں کہ فطرت تو پہلے ہی سے منظم اور مرتب ہے۔ بلکہ فن کار تو خود فطرت سے بہت کچھ حاصل کرتا ہے اور موزوں شکل کو پیش کرنا فطرت سے سیکھتا ہے۔"[1]

(۲)

یہ سب کچھ کہہ سن کر ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان آرا سے جو تناظر ترتیب پاتا ہے وہ اُردو ادبیات کے مطالعہ میں کس حد تک ممد ثابت ہوتا ہے۔ یہ سوال اس لیے بھی ضروری ہے کہ گیسٹالٹ نفسیات ہو یا علم و فن کا اور کوئی شعبہ ——— اگر وہ ہماری تخلیقات کی تفہیم و تشریح میں کار آمد ثابت نہیں تو پھر اس کی تمام خوبیاں یک طرفہ ثابت ہوں گی اور اس پر مستزاد یہ نکتہ بھی کہ گیسٹالٹ نفسیات یا علم و فن کے کسی اور شعبہ سے حاصل ہونے والے نتائج میں محض نئے پن کی سنسنی یا چونکا دینے والی بات نہ ہو بلکہ اس کے برعکس یہ ہماری عمومی تخلیقی فضا، ہمارے مخصوص تخلیقی رویوں اور ہماری انفرادی تخلیقات سے مطابقت بھی رکھتے ہوں ایسی مطابقت کہ اگر انھیں پرکھ کا "معیار" بنالیا جائے تو وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں "کم عیار" نہ ثابت ہو۔

قدامت پسند اور بنیاد پرست نقادوں کی شدید مخالفتوں کے باوجود بھی اردو تنقید میں تخلیقی شخصیات اور تخلیقات کے مطالعہ میں فرائڈ کی تحلیل نفسی اور ژونگ کی نختثالی (AQCHETYPAL) تنقید سے استفادہ کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جارہا ہے لیکن ہمارے تنقیدی مباحث میں گیسٹالٹ ابھی سبزۂ بیگانہ جیسی حیثیت رکھتی ہے اسی لیے اس امر کا تعین ضروری ہو جاتا ہے کہ موجودہ نفسیاتی مباحث کی موجودگی میں کیا گیسٹالٹ نفسیات کی امداد سے انفرادی تخلیقات کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے؟ یا یہ تخلیق کاروں کے مطالعات میں نیا اور بہتر زاویہ نگاہ مہیا کر سکتی ہے؟ مزید برآں کیا یہ اصناف کے تجزیہ و تحلیل میں بھی کار آمد ثابت ہو سکتی ہے؟ یہ جاننا اسی لئے ضروری ہے کہ اگر گیسٹالٹ

---

[1] "تاریخ جمالیات" ص ۔ ۱۹ ۔ ۳۱۸

اُردو تخلیقات کے مطالعہ، تفہیم اور تشریح میں موثر تنقیدی کردار نہیں ادا کر سکتی تو پھر نفسیات کے ایک دبستان کی حد تک تو اس کا مطالعہ درست مگر نفسیات کے بعض اور دبستانوں یا تصورات کی مانند مطالعۂ ادب اور مسائلِ نقد کی تفہیم کے لئے ناکافی ہے۔

مضمون کے آغاز میں گیشٹالٹ کا اساسی تصور ان الفاظ میں بیان ہوا تھا:

"اپنے اجزا کے مجموعہ کے مقابلہ میں کُل زیادہ ہوتا ہے"۔۔۔ تو آیئے اس کی روشنی میں تخلیقی عمل کا مطالعہ کریں۔

تخلیقی عمل کی صورت یہ ہے کہ اپنی اصل میں اس کا مطالعہ یا تجربہ ممکن نہیں یعنی یہ ناممکن ہے کہ زنجیر کھینچ کر جس طرح تیز رفتار ٹرین کو روکا جا سکتا ہے اسی طرح تخلیقی عمل کو بھی معطل کر کے "باہر" سے اس کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "باطن بینی"۔

(INTEROS PECTION) کے ذریعے سے کچھ امور کے بارے میں (کُلی نہیں) جزوی آگہی حاصل کر لی جائے اور بس! مشرق میں "آمد" کا تصور یا پھر:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

جیسے تصورات جہاں ایک طرف تخلیقی عمل کی اگر مافوق الفطرت حیثیت نہ سہی تو کم از کم اس کی پراسراریت پر تو یقیناً زور دیتے ہیں وہاں دوسری طرف یہ بھی یقینی ہے کہ ایسے تصورات تخلیقی عمل کے مختلف، منتشر اور بعض اوقات تو اس کے متضاد اجزا کے انفرادی مطالعہ کا ثمر نہیں بلکہ یہ تو اس کی "کُلیت" کا اظہار کرتے ہیں۔

شاعر ہو یا اور کوئی تخلیقی فن کار وہ سب تخلیقی عمل کی شدت سے پوری طرح سے آگاہ ہوتے ہیں کہ صورتِ حال بقول ژونگ یوں ہوتی ہے:

"تخلیقی عمل کی کیفیت تو کچھ یوں ہوتی ہے کہ شاعر اس میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے لہٰذا اس امر کا تعین مشکل ہے کہ کیا شاعر اپنی رضا سے اس تخلیقی فعلیت میں ایک مرکزی کردار ادا کرتا ہے یا تخلیقی عمل کی شدت اس پر یوں حاوی ہو جاتی ہے کہ

وہ شعوری آگہی گنوا کر محض ایک آلہ یا آلہ کار بن کر رہ جاتا ہے یوں کہ وہ بذات خود ہی تخلیقی عمل بن جاتا ہے۔"[1]

کوئی بھی شاعر (یا تخلیق کار) مائل تخلیق ہوتے وقت شعوری طور پر کبھی بھی اس امر کا تجربہ نہ کرتا ہوگا کہ ذہن میں خیال پہلے آتا ہے کہ الفاظ قافیہ کے ساتھ ردیف کیسے پیوست ہوگئی، شعر میں سے جو موسیقیت پھوٹی پڑ رہی ہے تو اس کا باعث بحر ہے یا ترتیبِ الفاظ! شاعر کو شعوری طور پر ان سب باتوں کے بارے میں تردد کی یوں ضرورت نہیں ہوتی کہ یہ سب تو اسے ایک پیکٹ میں بند تحفہ کی طرح مل جاتا ہے اسی لیے شاعر ــــ کم از کم تخلیقی شاعر ــــ کبھی بھی لفظ و معنی/تصور و اسلوب کے بارے میں متردد نہیں ہوتا۔ اس عمل کو "آمد" کا نام دیں یا "نوائے سروش" قرار دیں اور یہ کام کر دکھانے پر شاعر کو ساحر کہیں یا تلمیذ الرحمٰن ــــ ان اصطلاحات کے استعمال یا عدم استعمال سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیوں کہ ژونگ کے بموجب اسی عمل سے وابستہ نفسی کیفیات کا تو یہ عالم ہوتا ہے "کہ وہ (یعنی شاعر) اس حقیقت بینی پر مجبور کر دیا جاتا ہے کہ اس عمل کے دوران میں اس کی ذات مخاطب ہوتی ہے اور شخصیت کے نہاں خانوں میں جو بھی مستور تھا وہ معرضِ وجود میں آرہا ہے اس ضمن میں وہ بظاہر اس نامانوس کیفیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے اس کے حکم کی بجا آوری کے علاوہ اور کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تاہم اسے یہ احساس تو ہو جاتا ہے کہ تخلیق اس سے زیادہ افضل ہے، یہی نہیں بلکہ خود اس عمل کا ابلاغ بھی ممکن نہیں رہتا۔"[2]

الغرض، تخلیقی عمل اپنی کلیت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور شاعر پر حاوی ہو کر اسے اس وقت تک بے بس رکھتا ہے جب تک کہ تخلیق کی تکمیل نہیں ہو جاتی۔ شعر میر کا ہو یا علامہ اقبال کی "مسجد قرطبہ" ہو، اپنی اساسی صورت میں تخلیقی عمل کی کلیت برقرار رہتی ہے، یوں دیکھیں تو تخلیقی عمل کی صورت میں تو ذہن گیسٹالٹ کے اصول پر کام کرتا ہے یعنی ہر جز اپنی انفرادیت برقرار رکھتے

---

1. JUNG, C.G. "CONTRIBUTIONS TO ANALYTICAL PSYCHOLOGY P.235

۲۔ حوالہ سابق، ص۔ ۲۳۸

ہوئے کل میں مدغم ہو جاتا ہے یوں کہ وہ خود سے بڑے وجود کا حصہ بن جاتا ہے اور اس کی تشکیل میں اپنا جزوی کردار بھرپور طریقہ سے ادا کرتا ہے۔ اجزا کے اسی تشکیلی کردار کی ادائیگی ہی میں کل کے وجود اور بقا کا راز مضمر ہے۔ اگر ہر جز باغی ہو کر اپنا انفرادی کردار کرنے سے منکر ہو جائے تو کل کل نہ رہے گا بلکہ منتشر ہو کر وہ خود مختلف متضاد اور متناقص اجزا میں منقسم ہو جائے گا اور اس سے گیسٹالٹ نفسیات کا یہ نکتہ ذہن نشین ہوتا ہے کہ اپنے اجزا کے مجموعہ کے مقابلہ میں کل زیادہ ہوتا ہے :

پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے !

اجزا کے مجموعہ کی صورت میں مندرجہ بالا شعر — محض الفاظ، تشبیہ، استعارہ، قافیہ، ردیف اور بحر کا مجموعہ ہے اپنی انفرادی حیثیت میں ان میں کوئی خصوصیت نظر نہ آئے گی لیکن جب یہ سب مل کر تخلیقی عمل کے ذریعہ سے ایک نامیاتی وحدت کا جزو بن گئے تو پھر ہی شعر کی "تاثیر"، "لطف"، "مزا"، شعریت (یا اس نوع کے الفاظ استعمال کر لیں) جنم لیتی ہے بالفاظ دیگر گیسٹالٹ کے بموجب شعر اپنے الفاظ کے مجموعہ کے کل کے مقابلہ میں "تاثیر" وغیرہ کی صورت میں "زیادہ" ثابت ہوتا ہے۔ شاعری یا عمومی صورت میں دیگر تخلیقات کے ضمن میں یہ اساسی نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ تشبیہ، استعارہ، قافیہ، ردیف یا صنائع شعری انفرادی نام اور جداگانہ تشخص کے باوجود بنیادی طور پر لفظ ہی تو ہیں اور لفظ زندہ شے ہے انسانی خلیہ کی مانند، اپنے وجود اور دھڑکن کا حامل، اسی لئے جب شعر کے کل میں لفظ جزو بن کر شامل ہوتا ہے تو نہ صرف یہ کہ — زندہ وجود کی مانند — وہ اپنی انفرادیت کو مجروح نہیں ہونے دیتا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ دیگر اجزا سے جو رشتہ استوار کرتا ہے وہ بھی زندگی سے بھرپور ہوتا ہے اس لئے جہاں وہ اپنے انفرادی تشخص کو مجروح نہیں ہونے دیتا وہاں وہ حیات بخش رابطے سے دوسرے اجزا کی انفرادیت کو بھی سہارا دیتا ہے اور اجاگر بھی کرتا ہے۔ میر کے مندرجہ بالا شعر ہی کی مثال کو سامنے رکھیں تو "پتہ پتہ" انفرادی حیثیت میں محض نباتاتی وقوعہ ہے لیکن جیسے ہی وہ "بوٹا بوٹا" کے ساتھ پیوست ہوا تو ذہن میں گویا ایک منظر کا دریچہ وا ہو جاتا ہے اور یوں "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" مل کر جس وحدت کو جنم دیتے ہیں اسی میں اب یہ نباتاتی وقوعہ سے بڑھ کر اور کچھ بن گیا ہے کہ یہ اب باغ کی کلیت میں تبدیل ہو گئی ہے

اس لئے اس کے ساتھ جب " حال ہمارا جانے ہے" شامل ہوا تو یہ پہلی کیفیت میں اضافہ کا موجب بنتا ہے۔ اگرچہ اپنی ابتدائی صورت میں " پتہ پتہ" بے معنی نہ تھا اور نہ ہی " بوٹا بوٹا"۔ جب یہ دونوں مل کر ایک وحدت بنے تو وہ بھی بامعنی ہی تھی لیکن جب یہ سب ایک مصرع کی وحدت میں شامل ہو گئے تو اس سے معانی کی بھی تکمیل ہوئی اور اسی تکمیل کا قاری کو ابلاغ بھی ہو گیا ہرچند کہ " پتہ پتہ/ بوٹا بوٹا/ حال ہمارا جانے ہے"۔ اجزا کی صورت میں بھی اپنا تشخص برقرار رکھتے ہیں لیکن انھوں نے مل کر جو معانی دیئے وہ انفرادی اجزا کے معانی سے زیادہ مکمل اور اس سے زیادہ بہتر ہیں یعنی وہی بات کہ اجزا سے مجموعہ کے مقابلہ میں کُل زیادہ ہوتا ہے۔ میر کا یہ شعر بطورِ خاص نہیں چنا گیا بلکہ اس انداز پر کسی بھی اچھے شاعر کے انفرادی اشعار یا نظموں (جیسے علامہ اقبال کی "مسجدِ قرطبہ" کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے مختلف اجزا کی باہم پیوستگی سے کُل کی تشکیل کے عمل کو سمجھا جا سکتا ہے:

غالب کا یہ مشہور شعر دیکھئے:

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

گیسٹالٹ کے نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنے پر " دیر نہیں/ حرم نہیں/ در نہیں/ آستاں نہیں"۔۔۔ سب انفرادی مفہوم کے حامل ہیں لیکن دیر نہیں، حرم نہیں کی صورت میں معانی کی نئی وحدت تشکیل پاتی ہے مگر میر کے محولا بالا شعر کے برعکس غالب کے پہلے مصرع کے یہ چاروں جزو "نہیں" کی بنا پر منفی قدر کے حامل ہیں مگر منفی اقدار کی پیوستگی سے جنم لینے والی وحدت الفاظ سے منفی کا احساس دینے کے باوجود بلحاظِ معنی بھی منفی کی حامل نظر آتی ہے یعنی انفرادی اجزا کی منفیت برقرار رہتی ہے اور یہ منفی + منفی = مثبت کے عام فارمولہ کے برعکس ہے۔ چنانچہ اسی مصرع کے چاروں اجزا چار منفی اقدار کے حامل ہیں اور ایک وحدت میں بطور اجزا شمولیت کے باوجود بھی اجزا اور کُل میں منفی قدر برقرار رہتی ہے۔

" دیر نہیں/ حرم نہیں/ در نہیں/ آستاں نہیں/" اس میں جب دوسرے مصرع کا یہ جزو یعنی " بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم"۔۔۔ شامل ہو جائے تو یہ سب مل کر ایک اکائی میں تبدیل ہو جاتے

ہیں اس اکائی نے جس منظر کو جنم دیا یہ تمام اجزا اسی منظر کی جزئیات میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور یوں یہ تمام بظاہر منتشر اجزا معنی کی ایک وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب غالب یہ کہتا ہے۔ "غیر ہمیں اٹھائے کیوں" تو ترسیل و ابلاغ کی مساوات مکمل ہو جاتی ہے۔ پانچ اجزا نے مل کر جو صورت اختیار کی تھی وہ اپنے طور پر مکمل تھی لیکن جب ان پانچ کے ساتھ چھٹا جزو۔ "غیر ہمیں اٹھائے کیوں ؟" پیوست ہوا تو شعر کا گیسٹالٹ مکمل ہو جاتا ہے اور ترسیل و ابلاغ میں کسی طرح کا بُعد باقی نہیں رہتا اور یوں لفظ و معنی کی مساوات تکمیل پا جاتی ہے اور لفظ و معنی کی مساوات کی تکمیل سے یہ معجزہ بھی رونما ہوتا ہے کہ پہلے مصرع کی منفیت اب ("غیر ہمیں اٹھائے کیوں ؟" کے باعث) مثبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لفظ "غیر" سے شعر میں پرسنل ٹچ پیدا ہو جاتا ہے جس کے باعث پہلے مصرع کی تمام "نہیں" زائل ہو جاتی ہیں۔ وہ جو یہ کہا جاتا ہے کہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے تو یہ اس وقت ہوتا ہے جب اجزا کُل میں تبدیل ہو کر بھی اپنی انفرادیت کا اظہار کرتے رہیں اور پورے کُل سے ربط نہ رکھیں۔

ان دو اشعار کا مطالعہ گیسٹالٹ کے عمل کی بہت واضح قسم کی مثال ہے اور اسی انداز پر قدیم اصناف میں سے غزل کے ساتھ ساتھ قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے بالخصوص قصیدہ اور مرثیہ — جو کہ واضح طور پر مختلف اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں قصیدہ، تشبیب، گریز، مدح، دعا اور حسنِ طلب اور مرثیہ، صبح کا منظر، سراپا، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، میدانِ جنگ، شہادت، شامِ غریباں، بین وغیرہ میں منقسم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں میں مختلف اجزا کی انفرادی حیثیت، پھر ایک دوسرے سے پیوستگی اور پھر ان سب کا مل کر ایک کُل کی تشکیل — اس عمل پذیری کو گیسٹالٹ کے ذریعہ سے سمجھنے کے لئے ایک نیا تناظر مل سکتا ہے۔

اسی طرح مثنوی، کہانی کے واقعات اور کرداروں کی صورت میں مختلف اجزا میں بٹی ہوتی ہے جب اس کا گیسٹالٹ مطالعہ ممکن ہے تو پھر اس کی نثری بہنوں یعنی داستان، ناول اور افسانہ کا مطالعہ کیوں ممکن نہ ہوگا اور اسی اصول پر ڈرامہ کا بھی تجزیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن میں ذاتی طور سے سمجھتا ہوں کہ گیسٹالٹ کی روشنی میں اگر غزل کا مطالعہ کیا جائے تو یہ غزل

کی تفہیم وتشریح میں نیا زاویہ ہوگا غزل میں ہر شعر اپنی انفرادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور پھر ایک شعر بذات خود کتنے اجزا سے جنم لینے والی معنوی اور لفظی اکائیوں پر مشتمل ہوتا ہے اسے میرا ور غالب کے اشعار کے تجزیاتی مطالعہ سے واضح کیا جا چکا ہے) اس لئے اگر گیسٹالٹ کے حوالہ سے غزل میں ہئیت کی کارفرمائی کے عمل کو سمجھا جائے اور یہ کہ کیسے اس میں لفظ اور معنی کی مساوات جنم لیتی ہے، قافیہ، ردیف اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے شعر کی کلیت میں کیا اساسی کردار ادا کرتے ہیں (یا اس میں ناکام رہتے ہیں) صنائع لفظی ومعنوی اور مجاز مرسل شعر کی "قبائے گل" میں کس حد تک "گل بوٹا" بنتے ہوئے رنگ آمیزی کرتے ہیں الغرض مطالعۂ غزل میں گیسٹالٹ نیا مزا پیدا کرسکتا ہے۔

کنول ڈبائیوی

غیرادبی ڈرامے: سوانگ / نوٹنکی

غیرادبی ڈرامے (سوانگ یا نوٹنکی) اور اردو "ہندوستانی ڈرامے کی ایسی صنف ہے جسے اہلِ قلم اور اہلِ ادب نے ہمیشہ نظرانداز کیا اور حقارت کی نظر سے دیکھا"

ارباب ادب نے زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک خواص کی زبان یعنی ادبی اور دوسری عوام کی زبان یعنی غیرادبی۔ خواص یعنی ادبی لوگوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ غیرادبی یعنی عوام کی زبان کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ہندوستان کی لسانی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ آریہ ابتدا میں انڈو ہائٹ زبان بولتے تھے جو قدیم فارسی، یونانی، جرمن، قدیم لاطینی اور قدیم ویدک زبان کی ماں تھی بعد میں مقامی ماحول کے اثرات سے زبان میں تبدیلی ہونی شروع ہوئی۔ قدیم فارسی ژند اوستا، رگوید کی ابتدائی اشلوکوں کی زبان اور بعد کے اشلوکوں کی زبان شاہد ہیں۔ ابتدا میں آریہ ویدک زبان بولتے تھے اور ہندوستان کی دوسری مقامی محکوم قومیں مختلف زبانیں بولتی تھیں ان کے اثرات سے ویدک زبان بگڑنے لگی اس کو آریہ علما برداشت نہ کر سکے تھے اس لئے انہوں نے ایک نکھری ہوئی زبان ترتیب دی اور پانینی نے اس کی قواعد لکھی۔ اس طرح ایک نئی شستہ ادبی زبان وجود میں آئی اور وہ سنسکرت کہلائی اور اپنی ابتدا سے قریب دو ہزار سال تک سنسکرت نے ہندوستانی ادب اور کلچر پر قبضہ رکھا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ انڈونیشیا، جاپان، سیام، برما تک کی زبانوں کو متاثر کیا۔

ہندوستان کی مقامی زبانیں جو پراکرتوں کی شکلوں میں ترقی کرتی رہی تھیں سنسکرت سے فیض حاصل کرتی رہیں۔ آہستہ آہستہ سنسکرت کی قواعد کی بندشوں نے اس کو عوام سے دور

ہر دیا تو خواص کو بھی پراکرتوں کو ادبی مقام دینا پڑا پھر بیرونی اثر یعنی گوجر ترک ایرانی مغلوں کے اثرات ہندوستان کے مغربی سرحدی پڑوسی ملک ایران ترکستان سے قدیمی تعلق اور بدھ مذہب کی ترویج کے تحت ترکی منگولی چینی عربی اور فارسی کے اثرات ان پراکرتوں پر پڑنے لگے اور آہستہ آہستہ ان میں تبدیلیاں شروع ہوئیں اور اس کا نتیجہ موجودہ پنجابی، گجراتی مہاراشٹری بنگالی ہندی اور ہندوستانی ہے مغلیہ حکومت کے زوال اور انگریزی سلطنت کی ابتدا کے وقت ہندوستانی زبان پورے ہندوستان کی پوری رابطہ کی زبان بن چکی تھی ایک انگریز گورنر جنرل سر مٹکاف نے کہا تھا کہ پشاور سے کلکتہ تک اور کشمیر سے راس کماری تک جانے والے کو اگر وہ ہندوستانی جانتا ہے، تو اسے کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوگی۔ اس وقت ہندوستان کا خط بھی پورے ہندوستان میں فارسی رسم الخط جسے اب اردو رسم الخط کہا جاتا ہے رائج تھا اور اس وقت پچانوے فی صدی ٪95 ادبی لوگوں کا رسم الخط یہی تھا اور صرف چند پنڈت لوگ اپنی نجی ضروریات کے لئے دیو ناگری رسم الخط کا استعمال کرتے تھے۔ بیسویں صدی سے قبل فارسی عربی آمیز اردو ہی ادبی حلقوں کی خاص زبان تھی فورٹ ولیم کالج کے خاص استاد جان گلکرسٹ نے اس وقت کی ہندوستانی یعنی اردو کو اپنی کتاب ہندوستانی ڈکشنری میں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

In the Hindustanee, as in other tongues, we might enumerate a great diversity of styles, but for brevitys sake I shall only notice three here, leaving their sub divisions to be discussed along with the history of the language, which has been reserved for the second volume. The High Court of persian styles; 2nd the middle or genuine Hindustanee style; 3rd the Vulgar Hinduvee Appendix of Gilchirst Dictionary.

مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اٹھارویں انیسویں صدی کی ابتدا میں اردو یا ہندوستانی تین حصوں میں منقسم تھی ایک دہلی اردوئے معلیٰ کی درباری زبان تھی کیونکہ اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی اس لئے اردوئے معلیٰ کے فارسی داں افراد کی زبان زیادہ فارسی آمیز تھی اور

زیادہ فارسی آمیز اردو لکھنے اور بولنے والا ہی قابل سمجھا جاتا تھا۔ اور اس زبان کو ہی مستند بھی سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے درمیانی لوگوں کی زبان تھی جسے منشیوں کی زبان کہا جاتا تھا جس کے سمجھنے اور لکھنے والے زیادہ تھے جس میں فورٹ ولیم کالج میں زیادہ تر کتب لکھی گئیں اور ہندوستان کی تیسری شاخ جس کو ڈاکٹر گلکرسٹ نے ولگر ہندی کہا ہے اور جسے مولانا عبدالحق نے بھی دیہاتی بتایا ہے در اصل وہ ہندوستانی آمیز پراکرت تھی۔ اس میں پراکرت اور اردو دونوں کے الفاظ ملے جلے ہوتے تھے۔ نظم میں عروض اور پنگل کا کوئی دھیان نہ رکھا جاتا تھا اس بولی کو غیر ادبی تو کیا قابل اعتنا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح ہندوستانی ڈراموں کا حال تھا سانگ۔ یا نوٹنکی سنسکرت ڈراموں کی عوامی غیر ادبی صنف ہیں۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے ہندوستانی ڈراموں کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ قدیم سنسکرت ڈرامہ

۲۔ ادبی درجہ کے لوگوں میں رائج سوانگ یا نوٹنکی ڈرامہ

۳۔ موجودہ انگریزی ڈرامہ کے اثرات سے بنے ہوئے ہندوستانی ڈرامہ

ص۴۶ اردو میں ڈرامہ نگاری سید بادشاہ حسین۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں ہندوستانی کلچر اور زبان کی عکاسی ملتی ہے اور انہیں ایک زمانے تک غیر ادبی سمجھا گیا اسی طرح سوانگ اور نوٹنکی ڈراموں میں صحیح ہندوستانی کلچر اور زبان کی تصویر ملتی ہے۔

سنسکرت ڈراموں کی موت کے بعد جو اسلامی دور حکومت کی وجہ سے ہوئی یعنی سوانگ تماشے سنسکرت ڈراموں کی نمائندگی کرتے رہے ہیں لیکن آج تک ہندوستانی ڈراموں کی اس صنف سوانگ یا نوٹنکی پر کسی ادیب نے بھی لکھنے کی تکلیف گوارہ نہیں کی حالانکہ اردو کو عوام تک پہنچانے میں جتنا حصہ سوانگ یا نوٹنکی نے لیا ہے اتنا کسی صنف نے نہیں لیا۔ دیہاتی علاقوں میں چونکہ اردو کا رواج عام نہیں تھا اور تعلیم بھی بے حد کم تھی وہاں تک اردو کو پہنچانے کا خاموش کام ان عوامی ڈراموں اور سوانگ نے انجام دیا۔ اسی طرح اس دور میں جدید تفریحات سینما اور تھیٹر تو نہیں تھے اگر تھیٹر یا اسٹیج تھے تو شہروں تک محدود تھے اور پھر ان سے ٹکٹ لئے بغیر لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا تھا جبکہ نوٹنکی یا سوانگ ہمیشہ بغیر ٹکٹ ہوتے تھے۔ ہندوستانی ڈرامہ یا ناٹک ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ ہندوستانی شاعری کی طرح اتنی ہی پرانی چیز ہے جتنی کہ

خود ہندوستانی زندگی۔ ناٹک کا لفظ بھی اتنا پرانا ہے کہ آج صحیح طور پر یہ بتانا بھی دشوار ہے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہلے یہ کب بنا اور اس کا رواج کیسے ہوا۔ اتنا معلوم ہے کہ ناٹک لفظ ناٹ سے نکلا ہے جس کے معنی ناچ کے ہیں آج بھی دیہات میں نٹنی اور نٹ ناچنے گانے والوں کو کہتے ہیں اس طرح ڈرامہ کے لئے روپک کا لفظ بہت پرانے زمانے سے استعمال ہوتا چلا آیا ہے اور اس کی صحیح تاریخ بھی نہیں معلوم۔ روپک کے لفظی معنی بھیس بدلنے کے ہیں اور سنسکرت زبان میں یہ ناٹک کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ غیر ادبی ڈرامے نہیں زمانہ قدیم سے ہوتے رہی ہے اس کے مذہبی جیسے راس لیلا جس میں شری کرشن کی زندگی کے کارناموں کی جھلک ہوتی ہے اور رام لیلا جس میں رام چندر کی زندگی اور سچائی کے لئے جدوجہد کی طویل داستان پیش کی جاتی ہے اسی طرح بارہ لیلا کافی زمانے سے غیر ادبی اسٹیج پر کھیلے جاتے رہے ہیں۔ مذہبی موضوعات سے ہٹ کر جو عوامی زبان کے منظوم ڈرامے ہیں انھیں سوانگ کا نام دیا گیا۔ سوانگ کے معنی بھی بھیس بدلنا ہے یا کوئی ناٹک رچنے کے لئے جاتے ہیں۔ اب اس کے مذہبی حصوں کو کرشن لیلا یا راس لیلا رام لیلا کے نام دیدئے گئے تو سوانگ کا نام بھی نوٹنکی پڑ گیا۔ اس میں دراصل ایک مشہور داستان کے کرداروں یعنی پھول سنگھ پنجابی کے نوٹنکی شہزادی کو بیاہ لانے کو دکھایا گیا ہے اور اسی بنا پر اسے نوٹنکی کہنے لگے۔ ابتدائی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت میں ناٹک کی بنیاد مذہبی نوعیت کی تھی۔ مشہور روایات ہے کہ ایک مرتبہ بہت سے دیوتا ایک رائے ہو کر برہما کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ ہمارے جی بہلانے کے لئے کچھ سامان مہیا کیا جائے۔ برہما نے ان کی درخواست منظور کی اور ان کے لئے ناٹ وید ایجاد کیا۔ ناٹ وید کو پانچواں وید بھی کہتے ہیں۔ ناٹک کے فن پر ہندوستان میں یہ پہلی کتاب نٹ شاستر ہے جسے بھرت نامی رشی کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یونان سے بہت قبل ڈراموں کی ابتدا اور ارتقا کے مراحل طے ہو چکے تھے۔ حضرت عیسیٰ سے چار سو سال قبل یہاں بھاس جیسے ماہر فن اداکار کے ڈرامے منظر عام پر آچکے تھے بھاس کے ہم عصر یونانی ڈرامہ نویس اتنے خوبصورت ترقی پسند نفسیاتی ڈرامے نہیں لکھ سکے تھے۔ یورپ اور ہندوستان دونوں جگہ مذہب کا ڈراموں پر اثر رہا ہے۔ بھاس کے تیرہ ڈراموں میں سات مہابھارت دو رامائن دو تاریخ اور دو معاشرے کی داستانوں پر لکھے گئے۔

کالیداس کے دو ڈرامے ترم سور، شکنتلا پر بھی مذہبی رنگ ہے اشو گھوش کا سارلی پتر اندر درد ہرے دونوں ڈرامے بدھ مذہب سے متاثر ہیں۔ بھاوبھوتی کا اتر رام چرتر اور مہاویر چرتر راماین کی داستان سے لئے گئے ہیں لیکن ان ڈراموں میں مذہب کا اثر ہوتے ہوتے بھی ان میں ہندوستان کی معاشرتی زندگی کی عکاسی کی ابتدا کی گئی ہے۔ بھاس کا چار درت اس کی مثال ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی ڈرامہ کو مذہبی حساسات نے ترقی دی۔

(ص۱۵ ہندی ناٹک کا راز از پروفیسر جے ناتھ ماسن)

سنسکرت ڈراموں کے بارہ میں پروفیسر محمد مجیب اپنی تاریخ تمدن ہند میں لکھتے ہیں:

"سنسکرت ڈراموں میں اعلیٰ طبقہ کے مرد سنسکرت میں، اور عورتیں اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ پراکرت بولیوں میں گفتگو کرتے ہیں۔ گفتگو کبھی نظم میں ہوتی ہے کبھی نثر میں یعنی طبقوں کی اصولی تقسیم یہاں بھی قایم رکھی گئی اور ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامہ کے فن کی ترقی شعرا میں ہوتی ہوگی۔ اس کا خاص تعلق شری کرشن کی پوجا سے ہوگا اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ پنڈتوں کے قبضہ میں آنے سے قبل ڈرامہ کی جو شکل تھی اس میں ایک حصہ نظم کا ہوتا تھا اس لئے کہ منظوم عبارت یاد رکھنا زیادہ آسان ہوتا ہے دوسرا حصہ وہ ہوتا ہے جو اداکار برجستہ موقعہ پر اپنی قابلیت کے لحاظ سے اس میں اضافہ کرے۔"

(ص۱۹۲ تاریخ تمدن ہند)

"یہ حقیقت ہے کہ ابتدا میں ہندوستانی ڈرامے منظوم ہوتے تھے اور کہیں کہیں کہیں نثر بھی ہوتی تھی بقول مجنوں گورکھپوری منشی ناٹک پرشاد پہلے مصنف ہیں جنہوں نے ہندوستانی ڈراموں میں نثر بھی داخل کی ورنہ آپیرا اندر سبھا کی تقلید میں اُس وقت تک اور اس کے بعد بھی ناٹک صرف منظوم ہوتے تھے اور اسٹیج پر جو گفتگو ہوتی تھی وہ منظوم ہوتی تھی۔"

(ص۵ ادب اور زندگی مضمون ہندوستانی ناٹک)

کسی ہندوستانی نقاد نے کہا ہے کہ ڈرامہ ایک نظم ہے جو دیکھی بھی جا سکے اور سنی بھی جا سکے

H.H.Wilson, Selected Specimen of the Theatre of Hindus, Vol.I (Appendix).

یہ سنسکرت ڈرامہ کی بہت جامع تعریف ہے اور یہی تعریف راس لیلا رام لیلا بھان پرہسن اور سوانگ پر پوری اترتی ہے کیوں کہ یہ سنسکرت ڈراموں کی غیر ادبی شکل ہیں رام لیلا میں منظوم رامائن پنڈت پڑھتا جاتا ہے اور اداکار اپنے اپنے الفاظ میں اس کو نثر میں ڈھالتے جاتے ہیں اور تشریح کرتے جاتے ہیں لیکن سوانگ یا نوٹنکی موسیقی کے فن، عروض یا پنگل کی بگڑی ہوئی شکل میں منظوم ڈرامہ ہوتا ہے اور اُسے نظم کی شکل میں اداکار گاکر ادا کرتے ہیں۔ یہ ڈرامے بحر طویل۔ چھند، دوہوں، چوبولے، لاونی، راگنی، ابکت ٹیک میں ہوتے ہیں اور کبھی کبھی نثر میں بھی۔

بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں سنسکرت ڈرامے لکھنے بند ہو گئے تھے اس کے بعد سنسکرت ڈرامے کا ارتقا یا پنر جنم نہیں ہوا۔ تقریباً اسی زمانے میں یورپ میں ناٹک کا ارتقا ہوتا گیا۔ ہندوستان میں ڈرامہ کی طرف سے بے توجہی کی ایک وجہ اسلامی دورِ حکومت تھا۔ سرکاری زبان فارسی تھی۔ سنسکرت خواص کی زبان بھی نہیں رہی۔ لیکن عوامی ڈرامے سانگ بھان پرہسن کا ارتقا نہیں رکا مذہبی تیوہاروں اور موسمی جشنوں کے موقع پر ناچ اور گانوں سے ڈرامہ نے ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ مہاراشٹر میں آج بھی پورانک مذہبی ڈراموں کی شکل دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ سب اس کو للت کہتے ہیں۔ عشقیہ، مزاحیہ عوامی ناٹک بھی وہاں رائج ہیں جو تماشہ کہلاتے ہیں اور وہ دریچہ میں بھی عشقیہ اور مزاحیہ یا عوامی ناٹک ڈھنڈورہ کہلاتے ہیں۔ تامل ناڈ میں کامن پنڈگے ڈرامہ کی قدیم شکل ہیں اس کا موضوع کام دہن منظوم ڈرامہ ہے۔ کسانوں کے ذریعہ موسم بہار میں کھیلا جاتا ہے آٹھ آٹھ رات چلتا ہے۔ اس طرح سارے ملک میں ناٹک کا ارتقا ہوا اور ہندوستانی ڈرامہ کے ارتقا میں غیر ادبی عناصر نے امداد کی۔

(صد ۱۳۔۱۴ ہندی ناٹک کار۔ پروفیسر جے ناتھ ماسن)

غیر ادبی ڈرامہ رام لیلا راس لیلا جو ہر برسات کے اختتام پر شروع ہوتے ہیں اور دس دن تک چلتے ہیں ان لیلاؤں نے ہندو کلچر اور مذہب کی اس زمانے میں حفاظت کی ہے جب کہ اس کے مٹ جانے کا خطرہ تھا۔ سوانگ یا نوٹنکی جیسا کہ میں اوپر تحریر کر چکا سنسکرت ڈرامہ کی پراکرت

یا رائج زبان میں نقل ہے۔ جس کی زبان میں وقت کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ دسویں صدی کے بعد جبکہ سنسکرت ڈرامے تحریر ہونا بند ہو چکے تھے عوام کی دلچسپی کا مرکز شمالی ہندوستان میں صرف یہی سانگ رہ گئے تھے۔ گاؤں میں چند تخت ڈال دئے جاتے تھے اور ایکٹر لوگ اپنا زبانی یاد کیے ہوئے منظوم مکالموں کے ساتھ اسٹیج پر اپنا اپنا پارٹ ادا کرتے تھے راجہ، رانی، راکشش، دربان سپاہی وغیرہ سب کے لئے مختلف لباس اور چہرے استعمال کئے جاتے تھے۔ ساز کے طور پہ سارنگی نقارے کا استعمال ہوتا تھا۔ نقارہ سوانگ کی جان تھی۔ اداکار منظوم سوال و جواب جو مختلف بحروں، دوہوں، چھندوں اور راگوں میں ہوتے تھے کبھی گیت، غزل یا بیت وغیرہ بھی عوام کے رجھانے کے لئے مترنم آواز رکھنے والا اداکار پیش کرتا تھا اور انعام حاصل کرتا تھا۔ راس لیلا یا رام لیلا تو ایک مذہبی فریضہ بن گیا تھا۔ لیکن سانگ کسانوں کے لئے فصل کٹنے کے بعد خالی ایام کو پر لطف گذارنے کا ایک ذریعہ بھی ہوتے تھے اور شادی اور میلوں کے موقعوں پر ان کی قدر بیحد بڑھ جاتی تھی سوانگ منڈلی والی بارات کی زیادہ عزت افزائی کی جاتی تھی اب بھی کی جاتی ہے۔

رؤسا میں نقالوں کی پذیرائی کی جاتی تھی۔ لیکن عوام میں خاص کر غیر ادبی طبقوں میں سوانگ کی اہمیت تھی اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ سینما کے عام رواج نے تھیٹر اور ڈراموں کی اہمیت کو ختم کر دیا ہے لیکن سوانگ یا نوٹنکی کی اہمیت اب بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ نمائش اور میلوں میں جہاں ”ٹورنگ سینما“ بھی جلتے ہیں وہاں نوٹنکی کمپنی کو بھی سراہا جاتا ہے چودھری کی کمپنی، شری کرشن کانپور والے کی کمپنی، نتھا رام ہاتھرس والوں کی کمپنیوں میں تو پنڈال اب بھی بھرے ملتے ہیں یہ سوانگ یا نوٹنکی کی مقبولیت کی زندہ مثال ہے۔

اسلامی ادبیات میں چونکہ ڈرامہ کا فقدان تھا اس لئے ہندی ڈرامہ مسلمانوں کی نظروں میں خاص چیز نظر آنے لگا۔ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ موجودہ سوانگ ہی کی سرپرستی کی گئی اور رفتہ رفتہ فارسی کے زیر اثر چند تماشے مخلوط فارسی اور رائج پراکرات میں تیار ہوتے جو خاص محفلوں اور درباروں میں دکھائے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کا ایک سوانگ یا تماشہ نواز نامی ایک شخص نے (۱۱۲۴ھ سے ۱۱۳۱ھ) مغل شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے تیار کیا تھا نواز کا مرتبہ نسخہ منظوم کبت اور دوہروں میں تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں کاظم علی جوان نے اس کا ترجمہ کیا اس نے

دوہروں کبت کے بجائے اپنے اشعار لکھے تھے۔ یہ کتاب دراصل سانگ کی صنف کو اردو کی ادبی اسٹیج پر لانے کی پہلی کوشش تھی جس کو بعد میں امانت اور مداری نے رہس اور اندر سبھا کا روپ دیا دراصل یہ سب عوامی پراکرت ملی ہوئی اردو یعنی دلگر ہندی کے سانگوں کو اردو میں ادبی مقام دلانے کی کوشش تھی۔ کیونکہ اسلامی ادب ڈراموں سے خالی تھا۔ اس لئے اردو شعرا نے سوانگوں کو اندر سبھا اور رہس کی شکلوں میں ڈھالا اور ان کی قدیم زبان کو اردو میں بدل کر خواص میں پیش کرنے کے لئے لکھا اس لئے ہم اندر سبھا اور رہس کے ڈراموں کو سوانگ کی ادبی شکل کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کوشش کو مغربی اسٹیج کے اثرات نے ختم کر دیا اور مغربی تھیٹر کی نقل سے ہندوستانی تھیٹر کی بنیاد پڑی۔ ہندوستانی ادیبوں کا بھی عجیب ادبی مزاج ہے کہیں تو وہ ہندوستانی ادبی ڈراموں، ناولوں، افسانوں اور نظموں میں ان کے ہندوستانی پن، فطری پن اور عوامی پن کو سراہتے ہیں بناوٹ، غیر فطری عناصر اور بیرونی تقلید کو برا بتلاتے ہیں جیسا کہ نظیر اکبر آبادی کے کلام کے بارے میں اُن کے کلام کے فطری پن ہندوستانیت اور عمومیت کو سراہا گیا اور اس دور کے دوسرے شعرا، جو فارسی اور عربی شاعری کے مقلد تھے انہیں ان سے بہتر اور بدتر سمجھا گیا دوسری جانب انگریزی ڈراموں کے غیر فطری غیر مشرقی غیر ہندوستانی طرز کو ہی ہندوستانیوں کے لئے باعث افتخار سمجھا گیا اور عمومیت فطری پن اور ہندوستانیت سے قریب تر ڈراموں یعنی سوانگ یا نوٹنکی کو غیر ادبی حقیر اور نیچے درجہ کا خیال کیا گیا اس کورانہ مغرب پرستی نے ہمارے کلچر ہمارے ادبی، مذہبی اور تہذیبی و تاریخی ورثہ کو بیحد نقصان پہنچایا ہے۔ موجودہ ہندوستانی فلموں کو ہی لے لیجئے انگریزی فلموں کی ترقی پسندی کے نام پر کی جانے والی کورانہ تقلید نے انہیں عریاں اور فحش بنا کر رکھ دیا ہے جن کے جو اثرات نئی نسل پر پڑ رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد چھاپہ خانے قایم ہوئے اور ادب کے ہر شعبہ میں ترقی ہونے لگی۔ نئی نئی تصنیفات منظر عام پر آنے لگیں۔ اس زمانے میں یورپین طرز کی تھیٹر کمپنیاں اس وقت تک ملک میں قایم نہیں ہوئی تھیں۔ عوام کی دلچسپی کا مرکز یہی سوانگ تھے۔ اس لئے ڈراموں کی شکل میں یورپین تقلیدی ڈراموں سے پہلے سوانگ کی کتابیں ہی چھاپی گئیں جس میں اس وقت کی قدیم اردو یا ہندوی یا اکثریتی غیر تعلیم یافتہ دیہاتی طبقہ کی زبان کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ سوانگ یا منظوم ڈرامے عہد قدیم سے زبانی یاد کئے جاتے تھے اور اداکار ڈرامہ کھیلتے

وقت اس کو دہراتے تھے حالانکہ اس زمانے کی بیشتر سانگ کی کتب ضائع ہو چکی ہیں لیکن دو ایک کتب میرے ہاتھ لگی ہیں جن میں ایک سانگ ہے" رکمنی منگل" جو ۱۸۷۵ء کا طبع شدہ ہے۔ مطبع ماہتاب ہند میرٹھ سے لالہ گنگا سہائے نے طبع کرایا ہے اختتام پر سمبت ۱۹۳۲ء لکھی ہے سن عیسوی ۱۸۷۵ء ہوتا ہے۔ زبان خالص کھڑی بولی لئے ہوئے ملی جلی پراکرت ہے۔ اردو الفاظ، لایق۔ خیر۔ جواہر، ترکی، تازی، محل۔ ہاتھی، نیک، خبر، اردلی، بیموں، حور، مخمل، فرش، دردشام، داغ وغیرہ کا کثرت سے استعمال ہے اس کے مصنف بشن داس متھرا کے رہنے والے ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں ؎

بشن داس متھرا کے باشی   مت کر دیہ مجھے لے جانے کی

کہانی مذہبی شری کرشن جی کے بیاہ کی ہے۔ شری کرشن نے ششپال سے لڑکر رکمنی کو جیتا تھا کھڑی بولی اردو کی مثالیں

چلانگن جب جامی جو پونچا بولی بھید چھپایا   دار پار سب پوچھن لگی یہ کہانسی آیا
بدرم دیس کند پنور نگری رکمیا بیٹا پایا   خوشی ہوا شش پال جی پھولا انگ نہ سمایا
خاصا ترنگ دیا چڑھی کو پھر کند پور ڈہایا   بشنداس درخ رکمیا کو منتر آن سنایا صہ
ہاتھی گھوڑی ارتھ پالکی نہیں ساتھ لایا   بشنداس پر بھو! جیو آمی بکیم نہیں دھنسایا

تحریر میں ہائے معروف اور ہائے مجہول کا فرق نہیں ہے۔ رکمنی منگل میں راگ سندھی۔ راگ کلیان راگ ایمن، راگ سندھو۔ راگ کانہیا، راگ سیہر، راگ سدھ، راگ کامنی راگ کدار استعمال کیے گئے ہیں۔

دوسرے اردو کے طبع شدہ سانگ جو مجھ تک پہونچے ہیں وہ گوپی چند بھرتہری اور بھگت پرہلاد ہے جن کے مصنف لچھمن ہیں۔ گوپی چند ۱۸۸۵ء اور پرہلاد ۱۸۸۶ء کی طبع شدہ مطبع محمود المطابع دہلی میں مرزا عالم بیگ خان کے اہتمام سے چھپے ہیں۔ بھاگ راگنی، ہولی سورٹھ استعمال کیے گئے ہیں اس میں یائے مجہول اور معروف کا فرق نہیں ہے۔ سانگ میں دوہے چوبولے۔ راگ زبان پراکرت برج بھاشا ملی ہوئی کھڑی بولی اردو مثال

کان بھنک گرو کے پڑی تو کنور کرے ارداس   چھوڑ گوفا جوگی جاتے تو آن کھڑی ہیں پاس

گوپی چند کا راگنی ہولی

فار اب خیال پڑے مت بھیرے ۔ تو ہے جانا گرو کے ڈیرے
بیٹی راج کر و محلن میں مال خزانے تیرے ۔ میرے کرم میں لکھی ہے فقیری پیا کو کون ٹرے
فوجن کی گھیرے میں رسالے توی راج نیو چو بھیرے
نوکر چاکر سب تیرے ہیں وہ کیا حکم تیرا گیرے
بار بار سمجھاوتی تریا تیرا ہمکو بھوا د برے ۔ ماتا کے بچن سے لٹی ہی فقیری تو کریو داں سبورے
لچھمن رام ستھر گن گا وے آ وے گے رن تیبرے ص ۱۹

اس سوانگ میں نثر بھی ہے جو گلکرسٹ کی "ولگر ہندی" کا نمونہ ہے

بارتا = یہ بات کہی گوپی چند نے پھر یار کو چھاتی سے لگالیا تب بھرتری نے کہا تم پہلے ٹھہرو۔ میں گرو کی آگیا لے آؤں تب تین دفعہ گئی گرو جی کے پاس کٹ پتلی لے کر چوتھی دفعہ گوپی چند کو لے گئے آواز دینے کو پھایس تب گرو جی بولے ۔ بچا کون ہے تب بھرتری نے کہا

میں چیلا ہوں اور گوپی چند آپ کی سیوا کرنے کو چرن سے آیا ہے تب تو گرو جی بولے کہ گوپی چند تو امر ہے تب بھرتری بولے کہ گرو جی امر کردگے تو امر ہے پھر گرو جی نے گوپی چند کو بردان دیا کہ بجا ئیگی لائے جیو گوپی چند بھرتری ۔

اس نثر کے قریب پچاس سال بعد اسی ہندو مذہبی ڈرامہ پرہلاد کی نثر جو نتھا رام گوڑ ہاتھرس کے یا ان کے استاد اندرمن جہانگیر آبادی نے لکھی ہے اُسے اندازہ ہو جاتا ہے ۔

جب پرہلاد کو اس کی پاٹ شالہ کا گرو سمجھانے بجھانے ہار جاتا ہے تو پرہلاد سے کہتا ہے

"ارے تو بڑا سرکش ہے ہمارے مقابلہ میں ۔ دھڑا دھڑ جواب کرتا ہے بالکل بھی نہیں ڈرتا ہے بے وقوف کیا اور لڑکوں کو بھی بگاڑنا چاہتا ہے ۔ آسمان کو پھاڑنا چاہتا ہے ۔"

یہ نثر آغا حشر کے ڈرامے کے ڈائیلاگ کی نثر معلوم ہوتی ہے ۔

پرہلاد سوانگ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اس کے مصنف بھی لچھمن ہیں ۱۸۸۶ء میں دہلی میں شائع ہوا ہے ۔ دہلی کی اردو تے معلیٰ ہی مستند زبان سمجھی جاتی تھی یہ سوانگ یہاں طبع ہوئے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عوام میں کافی مقبولیت تھی اور اسی وجہ سے ابتدائی دور کے باوجود

پریس اور کتب فروش انھیں شائع کرتے تھے۔ پرہلاد کی زبان پراکرت ملی ہوئی ہندوی ہے کتاب کا سرورق اس وقت کی کتابوں کی طرح شائع ہوا ہے جس کی پیشانی پر بعون صناع کون و مکان خالق دو جہاں تحریر ہے، جبکہ رکمنی منگل کے سرورق کی پیشانی پر ٹھیٹ ہندی کا یہ شعر ہے۔

سرن تمہاری جن ہی پترا اگیہ کرناتھ — تم استاپورن کرو میرے ہیئے رگھناتھ

(سرورق رکمنی منگل مصنف بشن داس ۱۸۷۵ء)

سوانگ کی ابتدا میں منگلا چرن ہوتا ہے جس میں خدا کی حمد و ثنا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہندوستانی ڈرامے مذہبی روایت کے زیر اثر ہیں اس لئے ہر ڈرامہ میں حمد باری یا منگلا چرن کا ہونا ضروری ہے جس کی تقلید اردو کے ہندی کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈراموں میں بھی ہوتی رہی ہے یہ کورس یا منگلا چرن ٹھیٹ پراکرت ملی ہوئی ہندی میں ہوتا تھا، جسے ہم ہندوی بھی کہہ سکتے ہیں ۱۸۸۶ء کے طبع شدہ سوانگ پرہلاد کی منظوم ڈرامائی زبان دیکھئے ہرناکشیپ خود کو خدا کہلواتا تھا ایک دن اس کا لڑکا پرہلاد جو ابھی بچہ تھا کھیلتا ہوا ایک کمہار کے گھر کی طرف نکل گیا وہاں اس کمہار کا آوا دہک رہا تھا اور کمہاری افسوس کے ساتھ خدا سے دعا کر رہی تھی کیونکہ بلی کے بچے غلطی سے آوے کے ایک پکنے والے برتن میں رکھے گئے تھے۔ پرہلاد اس سے حال پوچھتا ہے تو کمہاری کہتی ہے

ہاتھ جوڑ عرضی کروں بولی بچن کمہار — یا کے ست اگنی چڑھے رام بچاون ہار

(صہ سانگ پرہلاد اردو ۱۸۸۶ء)

لجا تیرے ہاتھ ہے سنو غریب نواز — بہت بڈارن دکھ ہرن سارن بہیے کارج

(صہ سانگ پرہلاد اردو ۱۸۸۶ء)

یہ کھڑی بولی دیہاتی اردو یا ہندوی کا نمونہ ہے جو دہلی اور میرٹھ کے غیر تعلیم یافتہ دیہاتی حلقوں میں بولی جاتی تھی۔ دوسرا نمونہ دیکھئے راجہ ہرناکشیپ پرہلاد کو استاد کے سپرد پڑھنے کے لئے کرتا ہے اور استاد جو اس زمانے میں اس علاقہ میں پانڈے جی کہلاتے تھے، اسے کہتا ہے

جواب راجہ جی کا پانڈے جی سے

جاوں کنور پڑھ ہاٹ کے لاؤ گے دربار — رتھ گھوڑا اور پالکی دونگا ادھک سنگار

پانڈے جی دو نکا او کہ سنگار کرے مت سوچ بچاری | لے جاؤ چنسال کنور ہے سرن تمہاری
پانڈے جی ہم تیرے جہان تیج میرا بیگا بہاری | ہیرا موتی لال درب کے بھرے بخاری

(صدا بھگت پرہلاد مصنف لچھمن طباع ۱۸۸۶ء)

اس کے بعد پچاس سال بعد لکھے ہوئے مذہبی سانگ پرہلاد کی زبان نتھا رام گوڑ ہاتھرس والے کی زبان سے سنئے

پرہلاد کمہاری سے خدا کا نام اپنے باپ کی جگہ لینے پر کمہاری کو ڈانٹتا ہے تو کمہاری کہتی ہے ـــ

میں رام کو کنور جی من میں منا رہی ہوں | سرکار سے نہ کہنا ہا ہا میں کھا رہی ہوں
بلی کے چار بچے دب گئے اجی ابا میں | بچ جائیں رام کو میں عرضی سنا رہی ہوں

پرہلاد کمہاری سے ڈانٹ کر کہتا ہے

خاموش! کیوں جھوٹی باتیں بنا رہی ہے | سر اپنا مفت میں یاں بیٹھی پچا رہی ہے
اب آگ سے یہ بچے زندہ نہ نکل سکتے | تو بے وقوف بالکل مجھ کو دکھا رہی ہے

(صد ۳ سانگ پرہلاد از نتھا رام گوڑ ۱۹۲۵ء)

جب استاد پرہلاد کو مدرسہ لے جاتا ہے اور سمجھاتا ہے۔ سمجھانے پر نہیں مانتا تو ماسٹر سزا دینے کی دھمکی دیتا ہے تو بحر طویل میں پرہلاد کہتا ہے

اجی پرہلاد اب تو رام کو ہی ہا ہا کھاوے گا | تمہاری دھمکیوں سے باز نہیں زنہار آوے گا
دکھاتے بنیت کو کیا ہو اڑ دو سر کو خنجر سے | مزا اس موت سے بیکنٹھ امر ہونیکا پاوے گا

کیوں یہ دھمکی دکھاتے ہو مجھ کو عبث دیجیے بے شک سزا دیجیے بیشک سزا
رام کا نام لینے میں پاؤں سزا تو مزا ہے مزا تو مزا ہے مزا

پچاس سال کے بعد خالص مذہبی ڈرامہ کی زبان خالص اردو ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کس طرح دیہات تک پہونچ گئی تھی اور سب طبقے اس کو سمجھتے تھے۔

اب میں اس عوامی ڈرامہ یا سوانگ کے کچھ اقتباس پیش کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں جس کی انتہی

شہرت پائی کہ اس صنف یعنی سوانگ کا نام ہی نوٹنکی پڑ گیا۔ نوٹنکی کا سانگ جو میں نے اپنے بچپن میں لگ بھگ ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۳ء میں دیکھا تھا اس کے مصنف کی کتابیں مجھے نہیں مل سکیں۔ کیوں کہ اس کی زبان بہت صاف تھی مجھے زبانی دو چار مصرعے یاد رہ گئے ہیں

نوٹنکی ایک دن شکار سے پھول سنگھ پنجابی

یہ پنجاب کے ایک نوجوان کی کہانی ہے جس نے شکار سے واپس آکر اپنی بھاوج سے پانی مانگا تو اس نے خدمت کو نوٹنکی شہزادی لانے کا طعنہ دیا اور اس طعنہ کی بنا پر سخت محنت کے بعد پھول نوٹنکی شہزادی لایا۔

پھول سنگھ شکار سے واپس آکر اپنی بھاوج سے اس طرح کہتا ہے

ٹھنڈا پانی ذرا تم لاکے پلا دو بھاوج دال چاول بھی مجھے لاکے کھلا دو بھاوج

ایک دوسرے مصنف کے الفاظ میں سنئے:

بھابی سن میرا سخن نہ کر تو اب تاخیر لاکر کے جلدی پلا مجھ کو ٹھنڈا نیر

بھابی جواب دیتی ہے

ایسا تم حکم نہ تم مجھ پہ چلاؤ دیور اپنی خدمت کے لئے نوٹنکی کو لاؤ دیور

پچھلے پچاس ساٹھ سال سے شمالی ہند کے علاقے جب دو مصنفوں کے سانگ کے ڈراموں نے زیادہ شہرت پائی دونوں نے دوسو ڈھائی سو ڈرامے لکھے ہیں جن میں شری کشن پہلوان زیادہ مشہور ہے ان کی شری کشن سنگیت کمپنی ہندوستان کی مشہور کمپنیوں میں رہی ہے اور متھرا کے قریب کے ہاتھرس ضلع علی گڑھ کے نتھارام گوڑ نے بھی اپنی اور اپنے استاد اندرمن کی سوانگ کی کتابیں شائع کرائیں۔ دونوں نے اردو کی بے حد خدمت کی ہے سوانگ نوٹنکی کی ابتدا شری کرشن پہلوان کی زبان سے سنئے:

ٹھنڈا پانی جلدی مجھے بھابی دیجو پلائے بھابی دیجو پلائے مجھ کو مت دیر لگانا

کر حقہ تازہ فرتی سے اوپر چلم جمانا ہوتے فجر شکار کھیلنے گیا ہو اب آنا

ترنت انگیٹھی پر کر پانی گرم مجھے نہلانا

(ص۳ سوانگ شری کرشن پہلوان کانپور والے)

اسی مضمون کو نتھارام گوڑ کہتے ہیں۔

مت کر بلمپ کر جلد جل ٹھنڈا پلا تو   لگ رہی بھاری طلب شتابی حقہ بھر کر لا تو

بھاوج پھول سنگھ کو جواب دیتی ہے

سخن کڑے دیور کہو کیا ہوا ہو ان   کس برتے پر کر رہے اتنا غصہ آن

اتنا غصہ آن چلانے کا حکم یہاں آئے ہو   ایسے بولو بول آپ کس دماغ میں چھائے ہو

یہ دونوں مصنف جن دو سو ڈھائی سو ڈراموں کے خالق ہیں، وہ سب اردو زبان کی کتابیں کہی جا سکتی ہیں۔ مذہبی ڈراموں میں پچاس فی صدی اور غیر مذہبی ڈراموں میں ستر فی صدی اور سلمانی ڈراموں میں اسی نوے فی صدی الفاظ اردو کے ہیں۔

جبکہ زیادہ تر سوانگوں کا منگلا چرن یا حمد ہندی میں ہوتی تھی شری کرشن پہلوان کے نوٹنکی ڈرامہ کی حمد دیکھئے۔

رقم قلم حمد خدا کر اول آخیر   کن سے عالم کو کیا جس نے باتوقیر

جس نے باتوقیر تیز تحریر شان سے کم ہے   لامثال جاہ و جلال رزاق شاہ عالم ہے

شری کرشن امداد کنندہ وہ قایم دایم ہے

رب اعلیٰ لامکان کا

درخشاں نور اعلیٰ بیان کا

مدد دے گا حق تعالےٰ

دوسرے اس وقت استاد گنگی مل کمتر جو ڈبائی کے رہنے والے تھے قوم کے حجام تھے۔ لیکن ادبا کی صحبت نے انھیں بہت کافی علم داں اور اچھا شاعر بنا دیا تھا آپ شعر بھی کہتے تھے فن سے بھی واقف تھے۔ ان کا کلام ضائع ہو چکا ہے۔ ایک سوانگ میں انہوں نے بدر منیر اور بے نظیر میر حسن کی مثنوی کا ترجمہ کیا ہے اس کا مخطوطہ ہندی زبان میں حکیم رام چرن محلہ قاضی خیل کے پاس ہے۔ اس میں سے سوانگ کی ابتدا میں منگلا چرن یا حمد کے چند الفاظ لکھتا ہوں یہ خالص ادبی اردو میں ہیں اور سوانگ کی بہت سی غیر ادبی خامیوں سے دور ہیں

دوہا

خالق نے پیدا کئے بشر ملائک حور ایک مضمون نو طرز اب لکھنا مجھے ضرور

لکھنا مجھے ضرور اگر طاقت دے لوح قلم میں بے نظیر بدر منیر کا قصہ کروں رقم میں

داستان دلچسپ سنی کیا اس کو میں نے نظم میں مہا نند گرو بنارسی اب رہیں نہ کوئی غم میں

قصہ کی ابتدا

اتر میں میں نے سنا نور ان باد مقام شہنشاہ اس شہر کا شاہ عالم تھا نام

شاہ عالم تھا نام نہ اس کے مال خزانہ کم تھا کل جہاں کے شاہوں میں زیادہ جاہ و حشم تھا

سخاوتی کے رتبہ میں حاتم کا بھی سر خم تھا مگر ایک لاولدی کا اس شہنشاہ کو غم تھا

سوانگ کے چند اشعار سے ہی ظاہر ہے کہ اس وقت اردو عوام کی زبان بن چکی تھی شعرا عوامی زبان میں سوانگ تک لکھنے پر مجبور رہتے بلکہ انگریزی کے اثر سے ڈراموں میں انگریزی تک استعمال کرتے تھے۔ شری کرشن پہلوان نے سلطانہ ڈاکو میں حمد یا منگلا چرن میں انگریزی الفاظ کی نظم لکھی ہے۔

روبائی فادر گاڈ پلیز۔ آر ہیلپر مائی ڈیر بائی یو کائنڈ ایکشن آر۔ آن اسکائی رکی ہے بی پر

بہر حال سوانگ یا نوٹنکی ہمارے ہندوستانی ڈراموں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں علامہ عبداللہ یوسف نے ہندوستانی ڈراموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے مطابق سوانگ ہندوستانی ڈراموں کی دنیا میں ایک بنیادی کلیدی سی حیثیت رکھتا ہے اور اس نے ہندوستانی کلچر اور تہذیب کو بیرونی تہذیبوں سے بچانے میں اہم رول ادا کیا ہے، کیونکہ سوانگ راس لیلا، رام لیلا یا بارہ لیلاؤں نے عوامی مذہبی احساسات کو مردہ ہونے سے بچائے رکھا اور زندہ رکھا۔ کرشن جنم اسٹمی اور کنوار کے دسہرے کی موقع کی لیلائیں جو غیر ادبی ڈراموں کی ایک قسم ہیں ہندو مذہب کی ایک بنیادی رسم بن گئے ہیں۔ قریب قریب پورے ہندوستان میں کنوار کے مہینہ میں دسہرہ دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ رام لیلا دکھائی جاتی ہے اور اسی لئے ہندو دیہاتی عوام کو لیلاؤں اور سوانگوں کے ایک نفسیاتی اور جذباتی لگاؤ بھی ہے جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے خواص یا دانشور عوامی اور غیر ادبی زبان اور ادب کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں لسانی طور پر ایسا بھی ہوا ہے کہ جو زبان کبھی خواص کی زبان رہی تھی اس نے اگر عوامی زبان کو تحقیر کی نظر سے دیکھا تو وہ عوام اور خواص

دونوں سے کٹ کر رہ گئی اور بعد میں خواص کو اس حقیر زبان کو ہی اپنانا پڑا۔ ایک وقت تھا کہ سنسکرت خواص کی زبان تھی پورے ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی اور سرکاری زبان بنی رہی ایک وقت آیا کہ پالی، مگدھی اور شورسینی نے سنسکرت کو عوامی اسٹیج سے نکال دیا اور وہ ایک مردہ زبان ہوگئی، پالی اور مگدھی سرکاری زبانیں تھیں لیکن وہ بھی کچھ صدیوں بعد ختم ہوگئیں۔ فارسی، انگریزی اور ادبی اردو نے بھی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کی لیکن تحقیر سے دیکھی جانے والی "ولگر ہندی" نے انھیں بھی پچھاڑ دیا اور اب سرکاری کرسی پر براجمان ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یہ لسانی قاعدہ رہا ہے کہ سرکاری زبان کبھی عوامی زبان نہ بن سکی تو اس بات کے آثار پھر پائے جاتے ہیں کہ ادبی ہندی جو آج کل سرکاری زبان ہے باوجود سرکاری سرپرستی کے اپنا حلقہ محدود کرتی جارہی ہے اور اس کی جگہ ملی جلی زبان کی ہندوستانی لے رہی ہے ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر کو کہنا پڑا تھا کہ ہندوستانی میں یہ کشش ہے کہ وہ ہر زبان کو اپناتی ہے اور ہر ایک کے دل پر اپنا سکہ بٹھاتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں خالص قدیم سنسکرت ڈراموں کا دور رہا بعد میں مجبور ہو کر سنسکرت ڈراموں میں پراکرت کو بھی شامل کرنا پڑا اور عوامی پراکرتوں کے سوانگ تماشے جیسا کہ میں پیشتر تحریر کر چکا ہوں ہمیشہ عوام کی دلچسپی کا مرکز رہے۔ انگریزی دور میں جبکہ انگریزی تقلید کو ہی تہذیب کی نشانی سمجھا جاتا ہے عوام سوانگ کو اپنائے رہے۔ انگریزی تہذیب کے مقلدوں نے کبھی ان عوامی ڈراموں کو اہمیت نہ دی اور نہ عزت کی نظر سے دیکھا حالاں کہ یورپین کلچر اور ہندوستانی کلچر میں زمین آسمان کا فرق ہے جس طرح یورپین کلچر میں بناوٹ اور دکھلاوے اور بے حیائی زیادہ ہے اسی طرح یورپین ڈراموں میں بھی ظاہرداری اور بناوٹ ہے۔ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ سوانگ نوٹنکی کسی پہلو سے بھی یورپین ڈراموں سے کم نہیں کیوں کہ ان میں ایک فطری اور نفسیاتی پن ہے۔ آج کے ہندوستانی ادبی ڈراموں کو ہم چوں چوں کا مربہ کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ نہ ان میں خالص مغربی پن ہے نہ ہندوستانی۔ وہ مغربی ڈراموں کی بھونڈی نقل معلوم ہوتے ہیں ان میں ہندوستانی روایات کو نکال دیا جاتا ہے، حالاں کہ ہندوستانی سوانگ یا نوٹنکی کو اگر مغربی کورانہ آنکھ کی تقلید سے نہ دیکھا جائے تو وہ اپنے اندر ایک انفرادیت اور فطری پن رکھتے ہیں اور اسی انفرادی اور فطری حیثیت کی بنا پر اس ٹیلی ویژن اور سینما کے دور

میں بھی سوانگ اور نوٹنکی زندہ ہے اور دیہات والوں اور عوام کی جان ہے جبکہ اسٹیج کے سینما کی چمک دمک معدوم ہو چکی ہے اور وہ صرف کتابوں کی ہی زینت بن کر رہ گئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اگر انگریزی دور حکومت کے ساتھ مغربی ڈراموں کی اندھی نقالی نہ کی جاتی اور ہندوستانی علم و ادب کو حقیر نہ سمجھا جاتا تو ادبی آرائش کے ساتھ یہی سوانگ موجودہ نام نہاد اردو ڈراموں کی جگہ لے لیتے ۔۔۔ پھر بھی ان کی ایک انفرادیت اور عمومیت یہ ہے کہ جب اردو ادب کے "شیکسپیئر" آغا حشر کے ڈرامے اور دوسرے مشہور ڈرامہ نگار مثلاً طالب بنارسی احسن لکھنوی، بیتاب بنارسی، میر غلام علی عباس، عبدالطیف، شاد ظریف لکھنوی، رونق بنارسی وغیرہ کے ڈرامے چھپنا بند ہو گئے ہیں اور ان کی طبع شدہ کاپیاں بھی مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں نوٹنکی ڈرامے برابر ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طبع ہو کر فروخت ہوتے ہیں گو وہ اردو رسم الخط کے محدود ہو جانے کی وجہ سے دیوناگری رسم خط میں شائع ہوتے ہیں لیکن ان کی زبان وہی اردو ہوتی ہے۔ سنیما کے ڈرامے بھی اسی لئے زیادہ مقبول ہیں کہ ان کی زبان عوام سے زیادہ نزدیک ہے لیکن ان کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہوتی۔ اسٹیج کے علاوہ کبھی انھیں کتابی شکل میں پسند نہیں کیا گیا پھر بھی جس طرح سنیما اور فلموں نے اردو کی خدمت کی ہے اسی طرح طویل مدت سے یہ عوامی ڈرامے اردو کو عوام میں رائج کرنے اور دیہات میں پھیلانے کا ذریعہ بنے رہے ہیں۔ یہ اردو کے لئے ان کی خاموش خدمت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس نئے موضوع کے مضمون پر دھیان دے کر تحقیقی اور تنقیدی نظر سے منظوم نوٹنکی ڈراموں کو دیکھا گیا تو ان کے مطالعہ سے فکر انگیز انکشافات ہوں گے اور تاریخ ادب میں اس نئی صنف کو جگہ دینی پڑے گی ادبی اور فنی خامیاں تو شیکسپیئر اور دوسرے مغربی ڈرامہ نگاروں اور ہندوستانی ڈرامہ نگار آغا حشر وغیرہ کے یہاں بھی ہیں ان کو نظرانداز کر کے ہمیں اس صنف ڈرامہ کی جانب بھی ادبی اور تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور ان کی اردو خدمات کو منظر عام پر لانا بھی اردو ادب کی ایک اہم خدمت ہوگی۔

نذیر احمد

مسعود اشعر کے تازہ افسانے

مسعود اشعر کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے فی الوقت مجھے اُن افسانوں تک محدود رہنا ہے جو ان کے مجموعہ "سارے فسانے" مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء میں خطِ سرطان کے زیرِ عنوان شامل ہیں۔

مسعود اشعر کے یہ افسانے سچے تخلیقی تجربے سے جنم لیتے ہیں، مشاہدہ، مطالعہ، سوچ، احساس اور تخیل کے ارتباطِ باہمی سے نئی صورت اختیار کرتے ہیں۔ واقعات کو اگر ان کے منطقی تسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے تو انہیں زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتدا و انتہا کو ملحوظ رکھا جا سکتا ہے، اتار چڑھاؤ دکھایا جا سکتا ہے۔ اور بڑی حد تک قاری کے ردِ عمل پر بھی افسانہ نگار کو قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر اس طریقے سے جو بیانیہ معرضِ وجود میں آتا ہے وہ انسانی شعور کی نامکمل تصویر پیش کرتا ہے۔

واقعات فی الحقیقت جس طرح رو میں بہتے ہوئے پردۂ شعور پر نمودار ہوتے ہیں وہ زمان و مکان کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں۔ کسی منطق کی لڑی میں نہیں پروئے ہوئے۔ کرداروں کو مکمل طور پر پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ منطق کی بجائے تخیل کا راستہ اپنایا جائے۔ ایسے واقعات جو زمانی طور پر ایک دوسرے سے دور ہوں وہ بھی شعور کی رو میں اکٹھے وارد ہو سکتے ہیں۔ خود کلامی جیسے ہم سب اپنے روزمرہ کے تجربے سے جانتے ہیں منطق سے آزاد ہوتی ہے۔ اس میں ماضی و حال اور مستقبل گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور درمیان میں تبصرہ بھی شامل ہو جاتا ہے، جن واقعات کو افسانہ نگار

تخیل کے ذریعے یادداشت کے سرد خانے سے باہر نکال کر اکٹھا کر دیتا ہے۔ وہ بلا وجہ اکٹھے نہیں ہوتے۔ ان میں کوئی نہ کوئی قرینہ یا ربط ہوتا ہے۔ اسی ربط سے معنوں کی دو سطحیں قائم ہوتی ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ہر دو صورتوں میں افسانہ نگار کہانی کی ہیئت میں تسلسل کا عنصر سمو دیتا ہے۔ اس تسلسل کے ذریعے ایک تو کہانی پن برقرار رہتا ہے۔ دوسرے افسانوی ہیئت میں شامل تمام تفصیلات مل کر علامتی مفہوم کا اشاریہ بن جاتی ہیں۔ خیال افروزی کی اس فضا سے افسانے کا اصل مفہوم ابھرتا ہے۔ مسعود اشعر نہ تو مصنوعی طور پر علامت متعین کرتا ہے اور نہ ہی روایتی علامتوں کا سہارا لیتا ہے۔ غیر محسوس طریقہ سے قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو باتیں اور واقعات افسانہ نگار پیش کر رہا ہے ان کے ظاہری مفہوم کے علاوہ بھی ایک اور مفہوم آہستہ آہستہ ترتیب پا رہا ہے، جو فکر و خیال اور جذبے کا حسین امتزاج ہے۔ بالآخر افسانوی ڈھانچہ تو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

مسعود اشعر روایتی افسانے کے عناصر ترکیبی میں واقعات پر مبنی بیانیہ، مکالمہ، کردار نگاری اور فضا سازی کو بروئے کار لاتے ہیں مگر یکسر تبدیل شدہ حالت میں۔ واقعات زمانی تسلسل کے ساتھ بیان نہیں ہوتے بلکہ ان سے ماخوذ چیدہ چیدہ ٹکڑوں کو حسب ضرورت افسانے کے تن بدن میں سمو دیا جاتا ہے۔ ان کے چناؤ کا معیار قاری کے تجسس کے بجائے افسانے کی مجموعی معنویت سے متعلق ہوتا ہے۔ باقی روایتی عناصر ترکیبی کو بھی اسی معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ اور یوں فنکار ان کا نہایت شعوری استعمال کرتا ہے۔ یہ کاوش بہت نازک ہوتی ہے۔ اس کے متناسب اور متوازن ہونے پر ہی افسانہ نگار کی کامیابی کا انحصار ہے۔

مسعود اشعر بڑی چابک دستی کا ثبوت دیتے ہیں اور اپنے تخلیقی وسائل کو مشاقانہ طور پر برتتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کہانی پن بھی باقی ہے۔ کردار اور ان کے باہمی مکالمے بھی جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ زمان و مکان کا تعین بھی ہے۔ مگر یہ سارا تجریدی عمل کسی مدعا کا غماز ہے اور مدعا یہ ہے کہ افسانہ نگار اپنے زمانے اور ماحول کے بارے میں ایک خاص تاثر پیش کرنا

چاہتا ہے۔ وہ صرف لمحۂ گزراں پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ماضی سے رشتہ تلاش کرتا ہے۔ مستقبل سے ڈانڈے ملاتا ہے، اپنے ہم وطنوں کی کیفیت اور تقدیر سے ہی نہیں بلکہ سبھی انسانوں اور ان کی تقدیر سے سروکار رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہ مسعود اشعر پہلے سے طے شدہ نقطۂ نظر کا اسیر ہے۔ وہ اس نقش کا ابلاغ چاہتا ہے۔ جس کی صورت گری کا سبب زندگی میں جاری وساری مختلف النوع عوامل ہیں، اس لحاظ سے سبھی افسانے ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور وہ مل کر ایک بڑے مفہوم کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ مفہوم کیا ہے۔ اس کا تعین ہر قاری کو خود کرنا چاہیئے۔

مسعود اشعر کے افسانوں میں جو تفصیلات شامل ہیں ان کا تعلق بالعموم کرداروں کے ذاتی اور موضوعی تجربے سے ہوتا ہے۔ اسی تجربے کی روشنی میں وہ زندگی کے بارے میں ایک تاثر قائم کرتے اور اس کا ابلاغ کرتے ہیں۔ اس تاثر کی نوعیت کیا ہے جو میرے خیال میں افسانہ نگار زندگی کو ایک بامعنی عمل سمجھتا ہے۔ مگر ہماری زندگیوں کا جو سیاق وسباق ہو چکا قائم ہوگیا ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ اس سے معنویت بالکل معدوم ہوگئی ہے۔ فرد اور اجتماع دونوں ہی تناؤ کا شکار ہیں مگر تناؤ کی اس کیفیت کو کم کرنے کی کوئی سبیل کارگر نہیں ہوتی۔ اس بے بسی کی وجہ سے ہر کوئی حزن وکرب اور غصے کی لپیٹ میں ہے۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیسویں صدی کا انسان بحیثیت مجموعی ایسی ہی صورت حال سے دوچار نظر آتا ہے اس کیفیت کے اظہار کے لئے افسانہ نگار نے جو زبان یا الفاظ منتخب کئے ہیں۔ وہ اپنے در وبست اور سیاق وسباق کے حوالے سے مفہوم کو آگے بڑھاتے ہیں، نثر سادگی کا نمونہ ہے، تشبیہات اور اسی نوع کے دیگر وسیلے اپنانے سے گریز کیا گیا ہے، اثر انگیزی کے لئے خطابت کا سہارا نہیں لیا گیا۔ کئی جگہوں پر نظرت سے ماخوذ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یوں جوڑ دیئے گئے ہیں کہ ان سے افسانے کا مرکزی موضوع یکدم منور ہو جاتا ہے ایک ایسا ہی ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"کینچوا ایک ہی جگہ پر اپنی دم جما کر اپنے سر کو آگے بڑھا رہا تھا اور اپنا نرم اور لجلجا جسم آگے اور آگے کھینچ رہا تھا۔ اس کے لچکیلے جسم میں کھینچنے

کی جتنی گنجائش تھی اس حد تک وہ جسم پہنچ چکا تھا مگر دُم تھی کہ ایک ہی جگہ جمی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا ملگجا کتھئی رنگ ہلکا سرخ اور پھر گلابی ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ذرا سا اور آگے بڑھا تو چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا کہ یک لخت اس کی دم بھی آگے کو سرک گئی اور وہ پھر چھوٹا ہو گیا۔"

(ایک ہفت پہلی کہانی)

ایک دوسرا ٹکڑا دیکھئے:

"سارے شہر کی چڑیاں ایک ہی پیڑ پر جمع ہو کر پاگلوں کی طرح شور مچا رہی تھیں صبح اور شام دونوں وقت بلا ناغہ یہ ساری چڑیاں سی درخت پر اکٹھی ہو کر شور مچاتی ہیں۔ ایک ہی لے اور ایک ہی ردیف چیخے جاتی ہیں۔ بالکل پاگل ہو جاتی ہیں۔ شور مچاتی رہتی ہیں۔ اس وقت تک جب تک دن بھر کا پرانا سورج ڈوب نہ جائے اور اس وقت تک جب تک نئے دن کا نیا سورج طلوع نہ ہو جائے۔"

(خاموشی - ۱)

یوں یہ تکنیک بیسویں صدی کی مغربی افسانوی روایت کا حصہ ہے۔ اور ہمارے ہاں بھی کئی لکھنے والوں نے اس سے کسب فیض کیا ہے۔ مگر اردو کی حد تک کسی اور افسانہ نگار نے اس تکنیک کو اتنی کامیابی سے نہیں برتا جتنا سعود اشعر نے ان کے یہاں ندرت مہارت اور انفرادیت ہے۔ ان کا فنی کمال اس تکنیک کے کامیاب برتاؤ سے ہے اسی کی بدولت پرانے موضوعات بھی نئے لگتے ہیں۔ ان میں دلپذیر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

سعود اشعر نے چند ایک کہانیاں خالصتاً محبت کے موضوع پر لکھی ہیں ان میں نہ جذبے کی فراوانی ہے اور نہ لفظوں کی محتاج رومانی فضا مگر کرداروں کا داخل اتنا ننگا ہو کر سامنے آتا ہے کہ مفہوم اور قاری کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔ ابلاغ اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ لوح آئینہ اس قسم کی کہانیوں میں سب سے زیادہ کامیاب مثال ہے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ عام بیانیہ میں اس موضوع میں وہ سحر ممکن نہیں تھا۔ جو سعود اشعر

ہادور
نے کرداروں کی شعوری رو پر انحصار کر کے پیدا کیا ہے کھلی ہتھیلی کا عذاب اور ایک
ندم بھی اسی موضوع سے متعلق ہیں مگر خاص کر پہلی کہانی ہیں معنوی توسیعات ملاحظہ
ہوں ۔ زندگی کا پھیکا پن قاری کا اپنا تجربہ بن جاتا ہے، اسے اپنی بے بضاعتی اور کچھ نہ
رپانے پر غصے اور کرب کا ایسا ہی شدید احساس ہوتا ہے۔ جیسے افسانے کے کرداروں
ورخود افسانہ نگار کو، اردو افسانوی ادب میں ہجرت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کے
اوجود اسی موضوع سے متعلق مسعود اشعر کا افسانہ "ایک بہت پرانی کہانی" نہایت
تازہ لگتا ہے، ایک کردار کے داخلی سفر کی داستان' ہجرت کے نقطۂ آغاز کے بعد گم شدگی کا
احساس، اور سب کچھ بکھر جانے کا دکھ ۔

مسعود اشعر کی افسانوی تکنیک اور ہم عصر زندگی کے بارے میں جس غالب تاثر سے
قاری کا واسطہ بار بار پڑتا ہے ۔ اس کی تفصیلات افسانوں کے متن میں تلاش کرنا چاہیئے۔

پہلے ایسے افسانے جن میں خارجی حقیقت زیادہ ٹھوس طریقے سے ابھرتی دکھائی
دیتی ہے ۔ بچھڑے کا گیت لیجئے۔ مرکزی واقعہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ کچھ لوگ ایک سایہ دار
اور شاداب درخت کو کاٹ دینا چاہتے ہیں ۔ اکثر لوگ اس واقعہ سے قطعاً متاثر نہیں ہوتے۔
ان کے معمولات میں فرق نہیں آتا ۔ مگر ایک شخص کا ردعمل نہایت شدید ہے۔ ایسے لگتا ہے
درخت کا کٹنا ایک بڑا سانحہ ہے، اور سایہ دار درخت کو برقرار رکھنے کے لئے پوری
جدوجہد کرنا چاہیئے۔ اس واقعہ کے اردگرد اور بیچوں بیچ افسانہ نگار کچھ ایسے ٹکڑے
ترتیب دیتا ہے ۔ جو بظاہر زمانے اور نوعیت کے اعتبار سے نہایت مختلف ہیں، مگر تخیل
انہیں متحد کر دیتا ہے ۔ اور یوں افسانہ نگار بامعنی ہیئت تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایسی
ہیئت جو اپنے اندر وسیع تر علامتی مفہوم کو سمیٹے ہوئے ہے۔ واشنگٹن کے پس منظر میں جون بائز
کا گیت اپنے سیاق و سباق کی وجہ سے تیسری دنیا کے سوگ کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ بچھڑے کا
مقدر قربانی اور غلامی ہے، اس کے مقابلے میں ابابیلیں آسمان کی وسعتوں میں آزادی
کا اعلان کرتی ہیں ۔

گاٹے کے بچے

اپنی آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتے
وہ اپنے جسم پر ابابیل کے پر نہیں لگا سکتے
کہ آزادی سے اڑتے پھریں۔

ظلم کا مقام بدلتا ہے۔ نوعیت برقرار رہتی ہے۔ اندرونی ماحول میں جاری زندگی کی مخالف قوتیں وسیع تر تناظر میں جاری ایسی ہی قوتوں سے ہم رشتہ ہو جاتی ہیں۔ درخت کا کٹنا انسانی خون کی ارزانی سے مشابہ نظر آتا ہے۔ بربادی کے اس منظر کے ارد گرد لکڑ بگھے باچھوں سے خون ٹپکائے ہنس رہے ہیں اور وہ جو اس بربادی کا سامان بنتے ہیں۔ ان کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں اور رفتار سست تھی جیسے وہ نہ جانے کب سے سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں اور اب تھک چکے ہیں۔ ان کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ وہ دماغ پر زور دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ پہلے سے جو بتا دیا گیا ہے بس اسی کو کافی سمجھتے ہیں اور سر ہلاتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگار حقیقی واقعات اور تفصیلات جمع کرتا ہے۔ اور ان سے ایسا علامتی مفہوم خلق کرتا ہے، جو ان کے باہم تخیلی رشتوں اور رابطوں کا مرہون منت ہے۔

مجھے چہرہ دکھا میرا کا موضوع سماجی ناانصافی، ناہمواری اور اس سے پیدا ہونے والی کش مکش ہے۔

"چمگادڑیں دو قسم کی ہوتی ہیں ـــ اور بھی کئی قسم کی ہوتی ہوں گی مگر میں دو قسم کی چمگادڑوں کو جانتا ہوں ـــ ایک وہ جو اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ جہاز کی جہاز نظر آتی ہیں۔ وہ بہت اونچے اور بہت بڑے شکار کرتی ہیں انہیں کسی نے شکار کرتے نہیں دیکھا۔ دوسری وہ ہوتی ہیں جو شام کو ابابیلوں کے ساتھ اڑتی ہیں اور دور سے ابابیل ہی نظر آتی ہیں۔ یہ چمگادڑیں رات کو گھروں کے اندر گھس جاتی ہیں، اور انہیں نکالنے کے لئے سارے گھر میں اندھیرا کرنا پڑتا ہے، کہتے ہیں یہ کان کو چمٹ جاتی ہیں اور جب تک سارا خون نہ پی لیں جان نہیں چھوڑتیں۔ مگر میں تو بڑی چمگادڑ کی بات کر رہا تھا جسے شکار کرتے

کسی نے نہیں دیکھا!"

کتنا پرانا موضوع ہے، مگر اس موضوع کا ابلاغ نہایت انوکھے پیرایے میں ہوتا ہے، مرکزی کردار کو جن خارداد ہاتھوں سے خوف ہے ان کا بھی بیان ہے۔ مگر اس کے تحت جو موضوعی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ افسانے کا محور ہے۔ اسی سے ملک اور پھر سائنس کا معاشرتی رول واضح ہوتا ہے، اور ہزاروں دلوں کا کرب سامنے آتا ہے۔ افسانہ نگار کا مقصد نہ تو زندگی کے کسی خاص منظر کی تصویر کشی ہے۔ اور نہ ہی وہ کردار نگاری پر زور دیتا ہے۔ اسے تو منتخب تفصیلات کو مفہوم کا وسیلہ بنانا ہے۔

مرکزی کردار اندر اور باہر کے خوف سے ہر دم سرگرم سفر رہتا ہے۔ مگر یوں لگتا ہے اس کا سفر حرکت اور تبدیلی سے عاری ہے۔

"اس اسٹیشن کو دیکھ کر مجھے خیال آیا ہے کہ گاڑیاں واپسی کا سفر بھی کرتی ہیں۔ جو گاڑی مجھے آگے لے جاتی ہے۔ وہی واپس بھی لے آتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ میں اسی گاڑی میں بیٹھا رہتا ہوں اس سے اترتا نہیں اسے تبدیل نہیں کرتا اور اس چکر میں گاڑیوں کی پہچان ہی بھول گیا ہوں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سی گاڑی آگے لے جائے گی اور کون سی پیچھے؟ بلکہ اب تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کون سی گاڑی میں سوار ہوا تھا اور اب کس گاڑی میں بیٹھا ہوں!! آگے جا رہا ہوں یا پیچھے —!!"

خاموشی —۳ کو دیکھئے پورے افسانے پر ایک ایسا شخص چھایا ہوا ہے جس کی آنکھیں سیاہ حلقوں میں گھری ہیں اور جس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دونوں باچھوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ دونوں کانوں تک چڑھے ہوئے دانت نہایت چمکیلے اور صاف شفاف دانت بغیر آواز کے ہنستا ہوا۔ گھپ اندھیرے میں گھرا شخص LAUGHING HYENA کی ایک اور تصویر۔ اس کی موجودگی سے لوگوں کی آپس کی بات چیت ختم ہو گئی ہے۔ انجانے خوف وہراس کا دور دورہ ہے۔

"اس کے بعد محفلوں میں فرشتے گزرنے لگے۔ لوگ باتیں کرتے کرتے

یک لخت خاموش ہو جاتے۔ اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر کہہ نہ سکتے ہوں فرشتے گزرنے والے محاورہ پر ہم پہلے بہت ہنسے تھے۔ مگر اب فرشتے گزرتے رہتے اور کسی کو ہنسی نہیں آتی۔ کوئی بات نہیں کرتا۔ تمام محفلوں میں اب فرشتے ہی فرشتے تھے اور لوگ خاموش تھے۔"

جس شخص کے اثر سے استبداد کا سماں قائم ہو چکا ہے۔ اسے اچھی طرح کوئی نہیں جانتا گو وہ تقریباً سبھی سے مل چکا ہے شہر پر آفات اور وبائیں نازل ہو رہی ہیں اور لوگوں سے سورۃ الفرقان بھی چھن چکی ہے حق و باطل کا پیمانہ گم ہو چکا ہے۔ بلاؤں کا مداوا وہ بھول چکے ہیں اور عجیب بپتا میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مرکزی کردار کی پریشانی اجتماعی پریشانی کی تصویر بن جاتی ہے۔

"اب سڑک پر کھڑا ہوں۔ تنہا۔ دور دور کوئی نہیں ہے۔ درختوں کے پتوں سے گزرنے والی ہوا بھی خاموش ہے۔ اندھیرا ہے، دور دور تک گھنا، گھنگھور اندھیرا صرف ٹریفک سگنل کی روشنی ہے، جو بہت تیزی سے جل بجھ رہی ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے آزاد ہو چکی ہے کہ اپنی حفاظت خود کرو۔"

موضوع بیان کر دینے سے افسانے کا حسن بیان نہیں ہو جاتا۔ یہ تو ایک تجربہ ہے جسے ہر قاری کو اپنے طور پر محسوس کرنا ہے۔ دوسرا تو صرف شہادت پیش کر سکتا ہے۔ جب تک ہم اپنے آپ کو افسانے کے سپرد نہیں کرتے اس کے سحر کا اندازہ ممکن نہیں تاہم یہ کہوں گا کہ اس افسانے کی تکنیک میں ایک عنصر ایسا ہے جسے کہانی نویس نے بار بار استعمال کیا ہے اور جو بڑی حد تک مسعود اشعر سے خاص ہے۔ یاد کی ڈوری کے دونوں سرے تھامے ہیں اور ان کے تضاد سے ایک جیتی جاگتی تصویر ابھاری ہے۔ لمحہ گزراں کی کیفیت کو ماضی کے تناظر میں یوں سمو دیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے روشن ہو جاتے ہیں اور ایک بڑے موضوع کے ابلاغ کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ افسانے کی اپیل احساس اور فکر دونوں سطحوں پر قائم ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور واقعات سے ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہر چیز حقیقی معلوم دیتے ہوئے بھی ایک ماورائی روپ اختیار کر لیتی ہے۔ افسانہ نگار نے افسانے کے فنی امکانات کو

کتنے عمدہ طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ تخصیص سے تفہیم کا سفر بغیر دھچکا لگے بڑی سلامت روی سے طے ہو جاتا ہے۔

اس فنی عمل کی ایک اور مثال۔ ننگا آسمان میں مرکزی کردار طوفانی بارش سے بچنے کے لئے بس میں سوار ہوتا ہے۔ جوں جوں افسانہ آگے بڑھتا ہے۔ طوفان، بس، سفر، مسافر سبھی اپنے لغوی معنوں کے علاوہ علامتی مفہوم بھی اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ بہت جلد اندازہ ہو جاتا ہے کہ بس کی سواریاں ایک جمعیت کی نمائندہ ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں انساں چھت کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں جیسے طوفان کے وقت پرندے ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اس عالم میں ایک دوسرے کی حفاظت کا واسطہ ہیں۔

"پھر تمہیں ایسا لگا تھا جیسے تم بے ہوش ہو جاؤ گے مگر تم نے سوچا تھا کہ بے ہوش ہو کر تم گرو گے کہاں؟ ان جسموں نے تو تمہیں چاروں طرف سے سہارا دے کر کھڑا رکھا ہے یہ جسم گریں گے تو تم گرو گے ورنہ اسی طرح ان کے ساتھ چپکے کھڑے رہو گے۔"

انسان جو ایک دوسرے سے چمٹے اس لئے کھڑے ہیں کہ انہیں پتہ نہیں کہ کس پہلو گریں، مختلف منزلیں رکھتے ہیں، ایک دوسرے کی جیب کاٹنے اور سینے میں خنجر اتارنے میں مصروف ہیں مرکزی کردار ان میں سے ایک ہے، ایک خواب کی وجہ سے خوف کا اسیر ہے۔

"گھپ اندھیرے میں ایک کوندہ سا لپکتا اور سارا کمرہ تیز روشنی سے بھر جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈی یخ خوشبو کا ایک بھبکا سا آتا ہے اور اور تمہارے حواس پر چھا جاتا ہے۔"

اور لوگ بھی خوف زدہ ہیں سبھی اپنے خوف کا جواز تلاش کرتے ہیں اسی اثنا میں انہیں مولسری کے پیڑ نظر آتے ہیں اور کچھ دیر کے لئے وہ ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں مگر جلد ہی خوف عود کر آتا ہے۔ سوچ کے عمل میں افسانے کے اجزا الجھ جاتے ہیں اور یہ کیفیت سامنے آتی ہے۔

"وہ روشنی جو ہر رات تمہارے اندھیرے کمرے کو ٹھنڈی یخ خوشبو سے

بھر رہتی ہے اصغری ہے۔ اور تمہارے خوف زدہ آنکھوں اور کانوں تک وہ
جو پیغام پہنچانا چاہتی ہے۔ وہ کبری ہے۔ اور تمہارا خوف اور تمہاری بزدلی حد
اوسط ہے۔ جب تک حد اوسط کو نہیں گراؤ گے اس وقت تک ..... "

ہم سبھی اس کیفیت میں غالباً شریک ہیں اپنے اپنے خوف میں گرفتار ہیں۔ اپنے خواب بھی
ڈراتے ہیں اور ہم اتنے بزدل ہیں کہ اپنے خوابوں سے بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ افسانہ نگار
کا استفسار یہ ہے۔ کیا ہم اس حد اوسط کو گرانے کے لئے تیار ہیں؟ یہی وہ دیوار ہے
وہ پردہ ہے۔ وہ مصلحت ہے جس کے پیچھے سچ ہے۔ حقیقت ہے۔

کسی حد تک "خوابوں کے زندانی" متذکرہ موضوع ہی کا ایک پہلو پیش کرتا ہے۔
ملاحظہ کیجئے:

"کالی رات کے اندھے کنوئیں سے نکلنے والی سیاہ چیخ نے ان سب
کے دلوں کو ایک ہی تار میں پرو دیا تھا۔ وہ جو اپنے آپ کو ایک ہجوم، ایک
مجمع سمجھنے تھے۔ اپنے خالص ذاتی آج کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لئے تنہا
رہ گئے تھے"

ان سب کی تخلیقی قوتیں سلب ہو گئی ہیں اور وہ محض مضحکہ خیز میکانکی حرکات کرنے پر
اکتفا کرتے ہیں۔

"اس رات ان سب نے اپنے سارے خوابوں کو جمع کیا تھا اور ان
کی ایک اونچی دیوار بنائی تھی۔ ایک مضبوط فصیل۔ ایک ناقابل تسخیر قلعہ اور
سوچا تھا کہ خوابوں پر کسی کو اختیار نہیں ہے۔ اس چٹان کو تو کوئی طاقت پیچھے
نہیں دھکیل سکتی اور پھر اس مضبوط فصیل والے قلعے کے اندر وہ خواب
بھی تو محفوظ ہے جسے ہم آج تک ملتوی کرتے آئے ہیں"

یوں خوابوں کو قلعہ بند کر کے ہم سب لوگ خالص ذاتی آج سے الجھ گئے ہیں۔ اس خواب
کا کیا بنا جسے ہم مسلسل ملتوی کرتے آئے ہیں؟

"کیا وہ نازک کشمش کی طرح

دھوپ میں سوکھ گیا؟
یا وہ پھوڑے کی طرح پکا
اور کھرنڈ بن کر ادھڑ گیا؟
کیا وہ سڑے ہوئے گوشت کی طرح بُو دے گیا؟
یا میٹھے شربت کی سطح پر
شکر کی تہہ بن کر جم گیا
ممکن ہے بھاری بوجھ کی طرح پانی کی تہہ میں بیٹھ گیا ہو۔
یا پھر ــــ وہ دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا!"

مسعود اشعر نے کئی سارے ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا ہے۔ ان میں سے 'خواب' کو لیجئے۔ لگتا ہے۔ کردار میاں بیوی ہیں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں ان میں بڑا خوش گوار تعلق خاطر قائم ہے کہ دونوں خواب دیکھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے خوابوں میں شریک ہونے پر مصر ہیں۔ بیوی اکثر اچھے خواب دیکھتی ہے۔ البتہ میاں کے خواب بڑے پریشان کن ہوتے ہیں۔ میاں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ صبح بیوی کا خواب سنے۔ یوں ان کا دن اچھا گزر جاتا ہے۔ میاں کو جب خواب سنانا پڑجاتا ہے تو وہ اپنا خواب بدل کر سناتا ہے۔ یوں اسے شک گزرتا ہے کہ کہیں اس کی بیوی بھی ایسا ہی نہ کرتی ہو۔ مگر ایک روز اس کی بیوی ایک ایسا خواب سناتی ہے کہ جو فی الحقیقت میاں کا خواب بھی ہے۔ یہی خواب کہانی کا موضوع ہے، بہت بڑی برساتی ندی ہے۔ بہت گہری اور بہت چوڑی۔ ندی بارش نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہے۔ کہانی سنانے والا اور اس کے دوساتھی ندی کے اندر کھڑے ہیں شکار کی تلاش میں نکلے ہیں ایک بندوق ان کے پاس ہے۔ اب سرسراہٹ سنائی دیتی ہے شکار کا انتظار ہے۔

"سرسراہٹ دھڑدھڑ میں تبدیل ہو رہی ہے۔ جیسے بھاری بھاری بوٹ پہنے بہت سے لوگ پکی سڑک پر دوڑ رہے ہیں۔ میرا دل پسلیوں سے باہر نکل رہا ہے،..... میں گھبراہٹ میں اپنا انگوٹھا کھڑا کرتا ہوں مگر

ابھی گھوڑے تک میرا انگوٹھا گیا بھی نہیں کہ ایک دم موٹے موٹے گھناؤنے رنگ کے سوروں کی قطار کی قطار اوپر کنارے پر نمودار ہو جاتی ہے۔ وہ آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے، جیسے سنہری مٹی کے کنارے پر بدہیئت گوشت کی دیوار کھڑی ہو گئی ہے، جو تیزی کے ساتھ سرکتی جا رہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کب گھوڑا چڑھا یا کب بلبی دہائی دھماکے کی آواز کے ساتھ مجھے ہوش آیا تو سارے سور غائب تھے اور عرفان اور چھوٹے خاں دونوں مل کر مجھے برا بھلا کہہ رہے تھے۔"

میاں بیوی ایک چھوٹی سی دنیا میں رہتے ہیں ہر وہ خواب جو دیکھ چکے ہیں وہ جھوٹا ہے، اور انہیں ایسے خوابوں کا انتظار ہے، جو سچے ہوں مگر فی الحقیقت انہیں خوف، بدصورتی اور کراہت کا سامنا ہے۔ مقابلہ غیر مساوی ہے، جو تھوڑا بہت سامانِ دفاع ان کے ہاتھ میں ہے، اس کا ٹھیک سے استعمال نہیں ہو پاتا۔ زندگی حسرت اور پچھتاوے کا ایک سلسلہ ہے ایک فریب سے دوسرے فریب تک کا سفر جس میں محبتوں اور نفرتوں کا فرق مٹ جاتا ہے، صرف ضرورتوں کا احساس باقی رہ جاتا ہے! اس انفرادی طرزِ احساس میں ہمارے اجتماعی تجربے کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہی فرد اور اجتماع کو ملانے والا پل ہے۔

بتاشوں پر چلنے والے بظاہر تو مرد اور عورت کے باہمی تعلق کی کہانی ہے، ایک ایسا تعلق جو ٹھہرا ٹھہرا رکا رکا سا ہے۔ حرارت سے عاری، کلائمکس سے خوفزدہ۔ مجموعی طور پر دونوں ہی خوابوں میں گرفتار ہیں۔ پاؤں میں خواب، آنکھوں میں خواب! بتاشوں اور ستاروں کے درمیان معلق۔ بھاگنے کی خواہش مگر اصل میں جامد۔

"دن ایسے گزر رہے ہیں جیسے لوگ چلنا پھرنا ہی بھول گئے ہوں، ان کی عادت ہی نہ رہی ہو قدم بڑھانے کی جیسے دن کا کٹ جانا ہی ان کے لئے سب سے زیادہ حیرت کی بات ہو"۔

ستاروں کی باتیں کرتے کرتے ان کے سامنے سمندر کے کنارے سورج کے ڈوبنے کا منظر ابھر آتا ہے پھر پلوٹو کی تصویر سامنے گھوم جاتی ہے، سورج سے دور سیارہ حرارت اور روشنی سے

عاری۔ اور مرکزی کردار کے باطن سے ہم آہنگ۔ سنسان میدان جہاں سائیں سائیں کی آواز بھی نہیں ہے۔ پھر یک لخت حرکت پیدا ہوتی ہے۔ قدم اٹھتا ہے۔ تاروں بھرا کھیت پلوٹا کی طرح بن جاتا ہے جن بتاشوں کے ٹوٹنے کا خدشہ تھا وہی مرد اور عورت کے لئے پتھر بن جاتے ہیں۔ اور ان سے رگڑ کھا کھا کر ان کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں اس المناک انجام کو پہنچ کر وہ تنہا نہیں۔ ایک ہجوم ہے جو ان کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔ وہ احساس اور تجربہ جو شروع میں دو افراد تک محدود تھا وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور اجتماعی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔

تخصیص سے تعمیم اور فرد سے اجتماع تک کا سفر مسعود اشعر کے افسانوں میں وسیع تر علامتی مفہوم کا آئینہ دار ہے۔ انفرادی تکنیک کا مظہر ہے۔ اس میں اپج اور تازگی ہے۔ مرکز سے محیط کی طرف پھیلتی ہوئی خوشبو کی تازگی۔ مرکزی کردار بالعموم زیادہ باشعور شخص ہوتا ہے، وہ اپنے ذاتی تجربے پر توجہ مرتکز کرتا ہے، تو گویا بصیرت کا دروازہ وا ہو جاتا ہے۔ ارد گرد کے ماحول کی خاصیت اور لوگوں کے تجربے کی نوعیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ انفرادی تجربے کی شدت اجتماعی تجربے کا پتہ دیتی ہے۔

شاہد اللہ پرنٹر پبلشر نے مشہور آفسٹ پریس جندر مگر روڈ کراچی سے چھپوا کر ۵۲ سرائی حسن کالونی
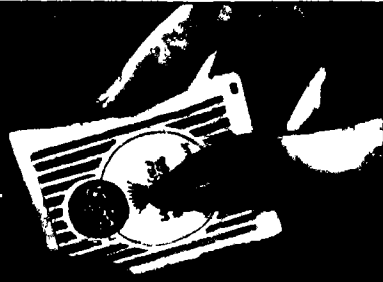
نزلہ و زکام
جوشینا سے آرام
جوشینا
نباتات سے نہایت موثر کافی وشافی
اجزا حاصل کرنا کمالِ فن ہے، دواسازی کی عظمت ہے۔ ہمدرد میں ماہرینِ فن
اس عظمت اور خدمت میں ہمہ دم اور ہمہ جہت مصروف ہیں۔
ہمدرد کی فنی محنت اور دوا سازی
کی صلاحیت کا ایک مظہر ہے
جوشینا
نزلہ و زکام - جوشینا سے آرام
کھانسی اور سینے کی جکڑن کا موثر علاج
ہمدرد
خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے
ADARTS
JOS-1/88

حسن افزا تبت ٹائلٹ سوپ
حسن اور تازگی کا
حسین انداز
تین دلفریب
خوشبوؤں میں
دستیاب
COOL & FRESH
TIBET
قیمت 3.25 روپے
تبت ٹائلٹ سوپ سے چہرہ حسین، جلد نرم و ملائم
ADARTS
TTS-1/88

سب سے اچھا سب سے اعلیٰ — سب سے زیادہ چلنے والا
چندا بیٹری سیل
CHANDA
LEAKPROOF
FLASHLIGHT
BATTERY
ٹرانسسٹر ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹارچ اور کھلونوں کی
دیرپا کارکردگی کے لئے چندا بیٹری سیل